جادو

ایم اے راحت

پہلی قسط

’’ڈاکٹر کامران!‘‘ ڈاکٹر سائرہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میری محویت ٹوٹ گئی۔ میں نے گردن گھما کر سائرہ کو دیکھا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سائرہ نے نزدیک پڑی کرسی گھسیٹی اور گہری سانس لے کر بیٹھ گئی، پھر بولی۔ ’’میرے خدا، کیسی زور کی بارش ہے۔ لگتا ہے آسمانوں کے سوتے کھل گئے ہیں۔ ایک بات کہوں۔ آج جمعرات ہے اور سنا ہے جمعرات کو شروع ہونے والی بارش ایک ہفتے تک بند نہیں ہوتی، اسے جمعرات کی جھڑی کہتے ہیں۔ اصل میں بزرگوں کے پاس بہت وقت ہوتا تھا وہ ہر بات پر توجہ دیتے اور اس کا تجزیہ کرتے تھے اسی طرح یہ روایات ظہور میں آئیں۔ ویسے کیا آپ بزرگوں کی ان باتوں پر یقین کرتے ہیں؟‘‘

مجھے ہنسی آ گئی۔ سائرہ بہترین ڈاکٹر تھی لیکن اس کے ساتھ ہی انسان، اوپر سے خاتون۔ باتونی اتنی تھی کہ جان بچانا مشکل ہو جائے۔ میں کچھ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ پھر بول پڑی۔

’’اصولی طور پر کم از کم میں بزرگوں کی باتوں پر پورا بھروسہ اور یقین رکھتی ہوں۔ اب دیکھیں نا انسان صدیوں سے جی رہا ہے اور ماضی کا انسان ہم سے زیادہ بہترین زندگی گزار گیا ہے۔ اب میڈیکل سائنس کو لے لیں، حکمت کو لے لیں یا گھریلو چٹکلوں کو کیسے تیر بہدف ہوتے تھے مختلف امراض کے لیے۔‘‘

اسی وقت بادل بہت زور سے گرجے اور ڈاکٹر سائرہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ گرج چمک سے بہت خوفزدہ ہوتی ہے۔ کچھ لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ’’خدا کی پناہ، کتنی زور کی کڑک ہوئی ہے۔ ایک بار ہم مانسہرہ گئے تھے۔ دن کا وقت تھا، چھما چھم بارش ہو رہی تھی بادل گرج رہے تھے پھر بجلی گری۔‘‘

موصوفہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ نیاز خان برتن اٹھائے آتا نظر آیا اور انہیں خاموش ہونا پڑا۔ اسپتال کی کینٹین کے ملازم نے کافی کے برتن سامنے رکھے اور بولا۔ ’’اور کچھ لاؤں کیا؟‘‘

’’نہیں نیاز بھائی شکریہ۔‘‘ پھر وہ نیاز کے جانے کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ’’میں نے دیکھا خوب بارش ہو رہی ہے اور آپ کوریڈور میں بیٹھے انجوائے کر رہے ہیں، ایسے موسم میں کافی آبِ حیات محسوس ہوتی ہے سو میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے نیاز بھائی سے اپنے اور آپ کے لیے کافی کے لیے کہہ دیا۔‘‘

’’واقعی آپ نے......!‘‘ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ سائرہ پھر بول پڑی۔ ’’آبِ حیات کی روایت پر آپ یقین رکھتے ہیں؟‘‘

’’اس حد تک ضرور کہ اس سرد موسم میں کافی کی کیتلی سے اٹھتی گرم اور سوندھی خوشبو آبِ حیات کا دوسرا روپ محسوس ہوتی ہے۔‘‘ میں نے یہ کہہ کر برتنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سائرہ نے جلدی سے ٹرے اپنی طرف سرکا لی۔

’’یہ بھی بزرگوں کی روایت ہے کہ اس طرح کے کام خواتین کو ہی کرنے چاہئیں۔ کافی میں بناتی ہوں۔‘‘ اس نے کافی کے دو کپ بنائے اور ایک میرے سامنے رکھ دیا۔

’’آپ نے جاوید انصاری کی ڈسچارج شیٹ بنا دی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہی کر کے آئی ہوں۔ وہ لوگ صبح کو آئیں گے۔‘‘

’’گڈ......! عجیب کیس ہے۔‘‘ میں نے کافی کا لمبا گھونٹ لیا اور سسک کر رہ گیا کیونکہ کافی بے حد گرم تھی۔

’’ایسا ویسا...... آپ نے پہلے کبھی ڈاکٹر رضوان کو اس طرح کسی کیس سے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے دیکھا ہے؟‘‘ خوش بختی سے ڈاکٹر سائرہ نے بھی بے خیالی میں میری طرح کافی کا لمبا گھونٹ بھر لیا تھا۔ اس طرح وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ دیکھ لی تھی۔

’’بڑا عجیب کیس ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔‘‘ میں نے کہا۔ سائرہ کے ساتھ واقعی برا ہو گیا تھا بیچاری اب بھی جواب دینے سے قاصر رہی تھی۔ گرم کافی نے اس کا حلق بھی جلا دیا تھا۔

جاوید انصاری کا کیس واقعی عجیب اور ناقابلِ فہم تھا۔ یہ شخص کافی دولت مند تھا۔ جنگلوں کی کٹائی کے ٹھیکے لیتا تھا۔ شہر کے ایک شاندار علاقے میں رہائش تھی، دو بیٹوں کا باپ تھا۔ ایک ماہ سے بیمار تھا۔ بے حد لاغر حالت میں اسپتال لایا گیا تھا۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد، آنکھوں کے گرد حلقے، صحت بہت خراب ہو گئی تھی جبکہ اس کے بڑے بیٹے نے اس کی تصویر دکھا کر کہا تھا۔ ’’ایک ماہ پہلے یہ اتنی شاندار صحت کے مالک تھے، ڈاکٹر رضوان یہ کیفیت صرف ایک ماہ میں ہوئی ہے۔‘‘

’’بے ہوش کب سے ہیں؟‘‘

’’پورے ایک ماہ سے۔ چوکھنڈی میں کام کروا رہے تھے، ایک دن واپس آئے تو بخار میں پھنک رہے تھے۔ چائے پی کر لیٹ گئے پھر گہری نیند سو گئے۔ وقت پر نہیں جاگے تو والدہ نے جگانے کے لیے پیشانی چھوئی اور بے حد تیز بخار دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ڈاکٹر احتشام ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں۔ انہیں اطلاع دی گئی، انہوں نے اسے تھکن قرار دیا البتہ انہوں نے تشخیص کی کہ اس وقت وہ سو نہیں رہے بلکہ بے ہوش ہیں۔ کچھ انجکشن اور دوائیں تجویز کی گئیں لیکن ہوش نہیں آیا۔ ہر طرح کوشش کر لی گئی تب ڈاکٹر احتشام نے آپ سے بات کی اور ہم انہیں یہاں لے آئے۔‘‘

ڈاکٹر رضوان نے انہیں تسلی دی تھی اور پھر انہوں نے جاوید انصاری کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ میں ان کا خصوصی اسسٹنٹ تھا اور وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ مریض کے بہت سے ٹیسٹ ہوئے، اس کے جسم کے خون کا رنگ بدل گیا تھا اس میں پیلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ سرخ اور سفید سیل گڈمڈ ہو کر پیلے ہو گئے تھے۔ ہر طرح کے ہیپاٹائٹس کے ٹیسٹ بھی کیے گئے لیکن اس کے جراثیم بھی نہیں ملے۔ یہ جراثیم اپنی نوعیت کے مختلف ہی تھے زندہ اور متحرک۔

ڈاکٹر رضوان نے مختلف لیبارٹریز سے رابطے کیے اور کئی قابل ڈاکٹروں سے میٹنگیں کیں لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ خود ڈاکٹر رضوان کی دلچسپی بھی اس انوکھے کیس میں بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے جاوید انصاری کے خون کے نمونے لندن بھجوائے اور رپورٹ حاصل کی لیکن بے سود۔ وہاں سے بھی کوئی تسلی بخش رپورٹ موصول نہیں ہوئی۔ ادھر مریض کا وزن روز بروز گرتا جا رہا تھا اور اس کی زندگی کو خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس سے زیادہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے جاوید انصاری کے بیٹوں سے کہا۔ ’’مجھے افسوس ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود ہم مرض کی تشخیص نہیں کر سکے۔ آپ صاحبِ حیثیت ہیں۔ مناسب سمجھیں تو انہیں ملک سے باہر لے جائیں۔ میں اس سلسلے میں ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔‘‘ جاوید انصاری کے بیٹے تیار ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر رضوان نے مجھ سے اس مریض کے بارے میں خاصی باتیں کی تھیں۔ ہم دونوں نے بارہا اس کا ہر طرح جائزہ لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ہر بار ایک عجیب احساس ہوا تھا۔ جاوید انصاری کے بائیں شانے پر تقریباً ڈیڑھ انچ کی گولائی میں ایک غدود ابھرا ہوا تھا۔ ایک انوکھا غدود جس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ ہلکا بھورا تھا اور شکل عجیب تھی۔ درمیان سے موٹا اور آس پاس شاخیں جیسی۔

’’کینسر ہو سکتا ہے سر؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’دعوے سے کہتا ہوں نہیں...... میں تجزیہ کر چکا ہوں۔‘‘ ڈاکٹر رضوان نے جواب دیا۔

’’بس یہی ایک انوکھی بات ہے، ورنہ ان کا پورا بدن کھنگال لیا گیا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا۔‘‘

’’ہاں، مگر اس نشان سے انصاری کے مرض کا کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘ ڈاکٹر رضوان نے حتمی لہجے میں کہا۔

اصولی طور پر مجھے اس خیال کو ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہیے تھا کیونکہ میں ڈاکٹر رضوان کا صرف اسسٹنٹ ہی نہیں تھا بلکہ ان کا عقیدت مند بھی تھا۔ بے مثال ذہانت کے مالک تھے اور امراض کی تشخیص میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن نہ جانے کیوں انصاری کے شانے کا یہ نشان میرے ذہن سے چپک گیا تھا۔

کئی بار دل چاہا کہ ان سے کہوں کہ سر اس غدود کو آپریٹ کریں...... لیکن یہ ان کی توہین کے مترادف تھا اس لیے خاموش رہا۔

’’کس سوچ میں ڈوب گئے ڈاکٹر کامران؟‘‘ سائرہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

’’انصاری کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’ہاں۔ قدرت اپنے راز خود ہی جانتی ہے۔ ہم انسان......‘‘ سائرہ کی زبان چل پڑی اور وہ نہ جانے کیا کیا بولتی رہی، شکر ہے کہ نیاز خان برتن لینے آ گیا، ساتھ ہی اس نے سائرہ کو ڈاکٹر فرخندہ کی طلبی کا پیغام بھی دیا تھا۔ سائرہ چلی گئی۔

میرے ذہن میں پھر جاوید انصاری کا کیس چل پڑا۔ صبح کو اسے ڈسچارج ہونا تھا۔ اس کے بیٹے اسے لینے آنے والے تھے۔ ایک بار پھر میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ کاش ڈاکٹر رضوان میری بات مان لیں۔ اگر اس غدود کا آپریشن تجرباتی طور پر ہی کر لیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ آخر وہ کیا تھا۔ پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ جاوید انصاری کے بیرونِ ملک جانے سے پہلے اگر کسی طور اس غدود کا آپریشن کر سکوں تو......!

یہ چونکا دینے والا خیال تھا۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔ میں ابھی ڈاکٹر کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر رضوان پہلے ہی تیار نہیں تھے، انہیں کیسے تیار کیا جا سکتا تھا۔ اپنے طور پر میں کیا کر سکتا تھا۔ بہت غور کیا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

دوسرے دن صبح ڈیوٹی ختم کر کے گھر واپسی کے لیے اسپتال کی پارکنگ پر آیا۔ اسی وقت ایک کار آ کر رکی اور اس سے تین افراد نیچے اترے۔ دو مرد اور ایک لڑکی۔ میں ان نوجوانوں کو پہچانتا تھا۔

یہ جاوید انصاری کے دونوں بیٹے تھے، تیسری ان کی بیٹی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر آواز دی۔ ’’ڈاکٹر کامران...... ڈاکٹر کامران۔‘‘ میں چند قدم آگے بڑھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ نوجوانوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا لڑکی نے سلام کیا۔

ایک نوجوان بولا۔ ’’ڈاکٹر کامران۔ ہم ڈیڈی کو لے جانے آئے ہیں۔ کیا ان کی ڈسچارج شیٹ بن گئی ہے۔‘‘

’’جی۔ اس وقت ڈاکٹر الیاس ڈیوٹی پر ہیں۔ آپ ان سے مل لیجیے۔ ویسے آپ نے انہیں بیرونِ ملک بھیجنے کا پروگرام طے کر لیا ہے۔‘‘

’’اتنی جلدی کہاں؟ اور پھر اس میں کچھ قباحتیں ہیں۔‘‘ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ’’ڈاکٹر کامران، کیا آپ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔‘‘

’’ضرور...... فرمائیے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’دراصل ہمارا خاندان کچھ دقیانوسی ہے۔ دادی اماں ڈیڈی کو ملک سے باہر بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جھاڑ پھونک سے ڈیڈی ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ بڑی پریشانی ہے، آپ اگر مناسب سمجھیں تو ہمارے گھر آ کر دادی اماں سے بات کر لیں، ہو سکتا ہے وہ آپ کی بات مان لیں۔‘‘

دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔ اگر ان سے درخواست کروں کہ مجھے وہ لوگ گھر میں تھوڑی سی سرجری کی اجازت دے دیں تو میں کوشش کروں۔ ویسے ان کی فرمائش بڑی معصومانہ تھی۔ میں صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ ان کی دادی اماں میری بات کیوں مانیں گی لیکن جو خیال میرے دل میں تھا، اُس نے اِس قدر شدت اختیار کی کہ میں ان کے گھر جانے پر راضی ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ’’میں دادی اماں کے پاس ضرور حاضری دوں گا۔ آپ انصاری صاحب کو گھر لے جائیں اور مجھے وقت بتا دیں کب آؤں؟‘‘

’’آج ہی کوئی وقت منتخب کر لیں۔‘‘ شاہد انصاری نے کہا جو جاوید انصاری کا بڑا بیٹا تھا۔

’’شام کی چائے آپ ہمارے ساتھ پئیں ڈاکٹر کامران...‘‘ لڑکی نے کہا۔

’’وقت ہو گا آپ کے پاس؟‘‘ دوسرا بیٹا بولا۔

’’میں پانچ بجے حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’بے حد شکریہ۔ آپ کا قیام کہاں ہے ڈاکٹر صاحب؟‘‘

’’جمشید روڈ رہتا ہوں۔‘‘

’’ہمارا پتا آپ کے پاس درج ہے، ہم محمد علی سوسائٹی میں رہائش پذیر ہیں۔ اگر حکم دیں تو میں آپ کو گھر سے پک کر لوں۔‘‘

’’میں پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔‘‘ وہ لوگ تھوڑی سی رسمی باتیں کر کے اندر چلے گئے اور میں اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ راستے میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ بس ایک بلاوجہ کا خیال تھا ورنہ میں ڈاکٹر رضوان سے زیادہ تجربے کار نہیں تھا۔ وہ اس اٹھان کو غدود قرار دے چکے تھے بلکہ یہ خیال بھی تھا میرے ذہن میں کہ میری یہ کوشش کہیں ڈاکٹر رضوان کو ناگوار نہ گزرے!

☆......☆......☆

میرا گھر بہت پیارا تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ تین بھائی ایک بہن۔ دونوں بڑے بھائیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ محبت کرنے والی بھابیاں ان کے بچے۔ بہن کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، والدہ تھیں اور میں، سب کا لاڈلا تھا۔ بڑے دونوں بھائیوں نے طارق روڈ پر گارمنٹس کی دکان کھولی ہوئی تھی، مجھے ڈاکٹر بنایا گیا تھا اور میں اسپتال میں ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر رضوان کو اسسٹ کر رہا تھا۔ والد صاحب جن کا نام مسعود احمد تھا، تین سال قبل انتقال کر گئے تھے۔ ہمارا خاصا بڑا کنبہ تھا جو آس پاس آباد تھا۔

والد انیس سو سینتالیس میں ہجرت کر کے آئے تھے اور ان تمام روایتوں سے مرصّع تھے جو ہجرت کی خونچکاں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم بہن بھائی پاکستان میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے چچا محمود احمد اب بھی ملک سے باہر تھے۔

جمشید روڈ کا یہ بنگلہ چچا محمود ہی کی ملکیت تھا لیکن بعد میں والد صاحب نے برابر کا ایک اور بنگلہ خرید کر دونوں کو ایک کر لیا تھا۔ وہیں پر پھوپھی شمسہ اپنے بچوں اور شوہر فیضان علی کے ساتھ رہتی تھیں۔ گرد و نواح میں پرداد ریاض احمد اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ آباد تھے۔ اب ہمارے دادا دادی کا انتقال ہو چکا تھا۔

یہ تھی میرے گھر کی کل کائنات۔ ہندوستان کے شہر سہارن پور سے تعلق تھا۔ والد صاحب درویش منش تھے ان کی زندگی سے عجیب و غریب واقعات وابستہ تھے جنہیں وہ دہرانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہاں اکثر راتوں کو میں نے انہیں عبادت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

غرض یہ کہ گھر آنے کے بعد میرے دوسرے معمولات شروع ہو گئے، چار بجے میں نے تیاری شروع کی اور آلاتِ جراحی لے کر گھر سے نکل آیا۔ وہ شریف لوگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا گیا۔

’’کیسی طبیعت ہے انصاری صاحب کی؟‘‘

’’کوئی تبدیلی نہیں ہے۔‘‘ بڑے بیٹے نے مایوسی سے کہا۔

’’دادی اماں کہاں ہیں؟‘‘

’’ڈیڈی کے کمرے میں ہیں۔ جب سے آئے ہیں، انہی کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی ہیں۔‘‘ شازیہ نے افسردگی سے بتایا۔

’’میں ان کے پاس جا سکتا ہوں؟‘‘

’’پہلے چائے پی لیں۔‘‘

ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے جہاں چائے کے ساتھ بہت سے لوازمات تھے۔ اس سے فارغ ہو کر ہم انصاری صاحب کے بیڈ روم میں داخل ہو گئے۔ بڑا پرسکون ماحول تھا۔ کافی صاحبِ ثروت لوگ تھے، گھر سے اندازہ ہو رہا تھا۔ ایک پروقار عمر رسیدہ خاتون کرسی پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

میرے سلام کا جواب انہوں نے سر کے اشارے سے دیا تھا، میرے لیے دوسری کرسی کھسکا دی گئی۔

دادی اماں نے تسبیح پوری کر کے کہا۔ ’’وعلیکم السلام بیٹے۔ ان لوگوں نے مجھے تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔‘‘

’’جی دادی اماں...... میرا نام کامران مسعود ہے۔‘‘

’’بالکل نوجوان ہو۔ معبود دو جہاں تمہاری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ بیٹے یہ لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ جاوید کو لندن بھیجنا پڑے گا۔ بیٹے میرا دل نہیں مان رہا۔ وہ تھوڑے دن پہلے بالکل ٹھیک تھا۔ میں اسے خود سے کیسے جدا کر دوں۔ میرا دل کہتا ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ وہ ضرور ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’یقیناً دادی جان۔‘‘ میں نے دلاسہ دیا۔ میں دل کی بات کہنا چاہتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے کہوں۔

’’آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر کامران۔‘‘ شاہد نے بات کا آغاز کیا۔

’’میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’جی...... فرمائیے۔‘‘

’’کیا آپ سب انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔‘‘ میری اس بات کو سب نے حیرت سے سنا۔ ’’میں جانتا ہوں میری اس بات سے آپ سب کو حیرت ہوئی ہے لیکن یہ میری درخواست ہے۔‘‘ میں نے دوبارہ کہا اور سب ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

اسی وقت دادی اماں کرسی سے اٹھ گئیں اور بولیں۔ ’’سب باہر آ جاؤ۔‘‘ حیران سب تھے لیکن سب کو دادی اماں کے پیچھے جانا پڑا تھا۔

’’شاہد صاحب آپ رکیں۔‘‘ میں نے کہا اور شاہد کے چہرے پر کسی قدر حیرت کے نقوش نمایاں ہو گئے۔ تاہم وہ رک گیا تھا۔

’’بات یہ ہے شاہد صاحب کہ میرے دل میں ایک خیال ہے جسے ایک عجیب خیال کہا جا سکتا ہے لیکن کچھ باتیں کمزوری بن جاتی ہیں۔ یہ خیال بھی میری کمزوری ہے۔ میں آپ سے ایک اجازت چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیسی اجازت؟‘‘ شاہد بولا۔

’’میں جاوید صاحب کی بہت معمولی سرجری کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’سرجری۔‘‘ شاہد مزید حیرت سے بولا۔

’’جی......!‘‘

’’کہاں کی...... اور کیوں؟‘‘ اس نے کہا۔

’’بس ایک ہلکا سا تصور ہے میرے دل میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔‘‘

شاہد سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’اس سے ڈیڈی کو کوئی نقصان پہنچنے کا خدشہ تو نہیں۔‘‘

’’ان شاء اللہ نہیں۔‘‘

’’آپ دیکھ لیجیے ڈاکٹر صاحب۔‘‘ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

’’کیا کہتے ہیں آپ۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ٹھیک ہے۔ کیا ابھی کریں گے۔‘‘

’’ہاں...... میں نے کہا نا بہت معمولی سرجری ہو گی۔ یہ میں اپنا بیگ اسی لیے ساتھ لایا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، بسم اللہ کیجیے۔‘‘

’’آپ کو باہر جانا ہو گا۔‘‘ میں نے کہا اور شاہد عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر آخری فیصلہ کر کے بولا۔ ’’او کے۔‘‘

وہ باہر نکل گیا تو میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر میں نے ایک چھوٹی میز جاوید انصاری کے بستر کے پاس سرکا کر رکھی اور اپنا بیگ کھول کر آلاتِ جراحی نکال لیے۔ اس کے بعد میں نے اسے سیدھا کر کے لٹایا۔ وہ سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس کی شرٹ کی ایک آستین اتار دی اور اس کا شانہ برہنہ کر دیا۔ بھورے رنگ کا غدود نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں نے میڈیکیٹڈ کاٹن نکال کر اس کو صاف کیا اور سرجری بلیڈ اٹھا لیا۔

پھر میں نے بسم اللہ پڑھ کر اس ابھرے ہوئے گوشت کو دبایا اور ایک دم اچھل پڑا۔ گوشت کے نیچے ایک کافی جاندار کلبلاہٹ ہوئی تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں۔ یہ ناقابلِ یقین سی بات تھی۔

کچھ توقف کے بعد میں نے دوبارہ اس گوشت کو دبایا تو وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اف میرے خدا اس کھال کے نیچے کوئی جاندار شے موجود تھی جو میرے چھونے سے اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے بلیڈ رکھ دیا اور پھر ذرا زیادہ زور سے اس شے کو دبایا۔

ایک انتہائی انوکھا منظر میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ کھال کے نیچے نیچے وہ عجیب شے کوئی چار انچ آگے بڑھ گئی تھی۔ میری دلچسپی اب انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ شے کہاں جا کر رکتی ہے چنانچہ میں اسے چھوتا رہا اور وہ آگے کھسکتی رہی۔ پھر وہ کلائی سے اتر کر ہتھیلی پر پہنچ گئی۔ اس سے آگے جانے کی جگہ نہیں تھی۔

اچانک ہتھیلی کی کھال پھٹی اور اس سے ایک انچ کے برابر پیلے رنگ کی مکڑی باہر نکل آئی۔ اس کے بدن پر اس کی ننھی ننھی آنکھیں نمایاں تھیں۔ یہ آنکھیں خونی انداز میں مجھے گھور رہی تھیں۔

پھر ایسی آواز آئی جیسے کیمرے سے تصویر کھینچتے وقت آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مکڑی نے ہاتھ کی انگلیوں کی طرف دوڑ لگائی پھر نیچے کود گئی۔ پھر وہ برق رفتاری سے ایک دیوار کی طرف بڑھی اور اس پر چڑھتی چلی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک کھڑکی سے دوسری طرف نکل گئی۔

میں ہکا بکا یہ انوکھا عمل دیکھ رہا تھا اور میری کیفیت عجیب تھی۔ مکڑی کا اب کوئی وجود نہیں تھا۔ پھر میں سنبھلا اور میں نے جاوید انصاری کی ہتھیلی کو دیکھا۔

اس زخم سے ہلکا ہلکا خون نکل رہا تھا جہاں سے مکڑی کھال پھاڑ کر باہر نکلی تھی۔ میں نے جھرجھری لے کر گردن جھٹکی اور پھر خود کو سنبھال لیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن ایک خیال دل میں ضرور آیا تھا وہ یہ کہ یقیناً جاوید انصاری کی کیفیت اس مکڑی کی وجہ سے ہوئی تھی جسے ڈاکٹر رضوان بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔

کسی طرح یہ زہریلی مکڑی انصاری کے بدن میں داخل ہو گئی اور اس کے زہر نے ان کی یہ حالت کر دی لیکن بس یہ ایک مفروضہ تھا۔

میں نے کاٹن سے انصاری کا زخم صاف کیا اور اس پر دوا لگا کر ٹیپ لگا دیا۔ آلاتِ سرجری واپس بیگ میں ڈال کر ملحقہ واش روم کی طرف گیا اور جا کر ہاتھ دھوئے اور انہیں تولیہ سے خشک کر کے باہر نکل آیا۔

پھر جاوید انصاری کو سنبھال کر لٹایا اور کمرے کے دروازے کے پاس جا کر اسے کھول دیا۔ سامنے ہی شاہد اور دوسرے لوگ کھڑے تھے۔

’’سب ٹھیک ہے ڈاکٹر کامران!‘‘ شاہد نے بے اختیار پوچھا۔

’’جی، اللہ کا شکر ہے۔ آپ لوگ اندر آ جائیے۔‘‘ میں نے کہا اور وہ سب اندر آ گئے۔

دادی اماں مسہری کے پاس پہنچ گئیں اور غور سے جاوید کا جائزہ لینے لگیں۔ شاہد نے ان لوگوں کو سرجری کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ مریض کے پاس بیٹھ گئیں پھر بولیں۔ ’’آپ سرجری کے بارے میں کہہ رہے تھے، کچھ کیا ہے آپ نے؟‘‘

’’ہاں بس ایک معمولی سی سرجری۔‘‘ میں نے جاوید انصاری کی ہتھیلی کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ وہ لوگ چونک کر ہتھیلی کو دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے انہیں عجیب لگا ہو گا لیکن کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

کچھ لمحوں کے بعد ناصر نے کہا۔ ’’ہم دادی اماں کو سمجھا رہے تھے کہ ڈیڈی کو بیرونِ ملک بھیجنا ضروری ہے۔ یہ دور حکیموں یا جھاڑ پھونک کرنے والوں کا نہیں ہے۔ آپ کو اسی لیے زحمت دی ہے کہ آپ ہمارے خیال کی تصدیق کر کے انہیں سمجھائیں۔‘‘

’’بات ٹھیک ہے دادی اماں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ لوگ صاحبِ حیثیت ہیں۔ بیرونِ ملک جا کر علاج معالجہ کرا سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ویسے آپ انصاری صاحب کے سلسلے میں کیا چاہتی ہیں؟‘‘

’’میرے پاکستان میں بہت سے اللہ کے پیاروں کے مزارات ہیں۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ، کس کس کے نام لوں، ملتان تو بزرگوں سے بھرا ہوا ہے پورے پاکستان میں ولی اللہ موجود ہیں۔ ان سے اپنے بچے کی زندگی کے لیے اللہ سے دعا کراؤں گی۔ یہ موئے گورے کیا اوقات رکھتے ہیں۔‘‘ دادی اماں رونے لگیں۔

’’میرے خیال میں آپ دادی اماں کی بات مان لیں۔ کچھ وقت انتظار کر لیں۔ پھر جو اللہ کا حکم ہو۔‘‘ میں نے گول مول انداز اختیار کیا۔

اسی وقت شازیہ بول اٹھی۔ ’’ڈاکٹر صاحب۔ آپ نے یہ سرجری کیسی کی ہے۔ اس کا کیا مقصد تھا؟‘‘

میں اس سوال پر گھبرا گیا تاہم جواب دینا ضروری تھا۔ میں بولا۔ ’’بس ایک خیال دل میں تھا مس شازیہ۔ جس کے لیے یہ عمل کیا ہے۔ ان شاء اللہ میرے اس اقدام سے انصاری صاحب کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ ممکن ہے بزرگانِ دین میری بھی لاج رکھ لیں۔‘‘

سب خاموش ہو گئے۔ میں نے جلدی سے اجازت لی اور پھر باہر نکل آیا۔ شاہد، ناصر اور شازیہ مجھے چھوڑنے آئے تھے۔

واپس آتے ہوئے میری ذہنی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ کیا تھا یہ سب! میں نے کئی بار ڈاکٹر رضوان سے اس غدود کے بارے میں بات کی تھی اور انہوں نے اس کا سرسری تجزیہ بھی کیا تھا لیکن انہوں نے اپنے تجربے کے مطابق اسے معمولی غدود قرار دیا تھا لیکن وہ غدود......! میرے خدا کیسی گھناؤنی شکل کی مکڑی تھی اور...... اور...... اس کا انداز، انسانی کھال جو بڑی مضبوطی سے گوشت سے چپکی ہوتی ہے لیکن مکڑی اس میں دوڑ رہی تھی۔ پھر اس نے کیسی خونی نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ کیسی مکڑی تھی وہ، اور جاوید انصاری کے جسم میں کس طرح داخل ہوئی تھی۔ جاوید انصاری کی رپورٹوں سے کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ اس کے خون کے انفیکشن کا کیا راز تھا۔

اس طرح کی باتیں گھر میں ڈسکس نہیں کی جاتیں چنانچہ میں نے انہیں دل میں ہی رکھا۔ پھر وقتِ مقررہ پر اسپتال چل پڑا، جہاں میری ان دنوں رات کی ڈیوٹی چل رہی تھی۔

معمولات شروع ہو گئے اور عارضی طور پر میں نے ان عجیب واقعات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ڈاکٹر سائرہ بھی ڈیوٹی پر تھی، اس نے بتایا کہ ڈاکٹر رضوان کو کسی ایمرجنسی کی وجہ سے اسلام آباد جانا پڑا ہے۔ شاید انہیں ایک ہفتہ وہاں لگ جائے۔

’’ان کا چارج کس نے لیا ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر پروفیسر محمود شاہ نے۔‘‘

’’میرے لیے تو کوئی میسج نہیں ہے۔‘‘

’’نہیں......!‘‘

’’او کے۔ میں بھی ایک دو دن کی چھٹی کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر محمود شاہ صاحب کو بتا دوں گا۔‘‘

’’خیریت...... آپ کی چھٹی تو ایک عجیب سی بات ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں آپ اور چھٹی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بائی دا وے خیریت تو ہے۔‘‘

’’بس کچھ طبیعت مضمحل ہے۔‘‘ مجھے یہ خوف ہوا کہ اب ڈاکٹر سائرہ کی زبان کا چرخہ چل پڑے گا لیکن اسی وقت ایمرجنسی سے سائرہ کی کال آ گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو تین بجے استقبالیہ سے مجھے کسی کی کال کی اطلاع میرے موبائل پر ملی۔ ریسپشنسٹ لڑکی نے کہا۔ ’’ڈاکٹر کامران، ایک صاحب...... جنہوں نے اپنا نام شاہد انصاری بتایا ہے آپ کا سیل نمبر مانگ رہے ہیں۔ میں نے کہا وہ اپنی ضرورت بتا دیں تو انہوں نے کہا کہ وہ آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’اوہ۔ انہیں نمبر دے دیں۔‘‘ میں نے کہا اور کسی قدر پریشان ہو گیا۔ خدا خیر کرے ایسی کیا بات ہو گئی کہ اس وقت شاہد نے مجھے فون کیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد میرے فون پر کال آ گئی۔

’’جی شاہد صاحب......!‘‘

’’ڈاکٹر کامران؟‘‘

’’جی...... میں بول رہا ہوں۔‘‘

’’معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر کامران۔ میں صبر نہیں کر سکا مجھ سے غلطی ہو گئی میں نے آپ کا نمبر نہیں لیا۔ اسپتال فون کر کے میں نے پوچھا آپ کس وقت ڈیوٹی پر آئیں گے تو ریسپشن سے پتا چلا کہ آپ اسپتال میں موجود ہیں۔ بدحواسی میں یہ یاد نہیں رہا کہ پرسوں صبح آپ سے اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب آپ ڈیوٹی آف کر کے جا رہے تھے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں شاہد صاحب۔ آپ خیریت بتائیے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ نے مسیحائی کی ہے ڈاکٹر کامران۔ ہمارے پورے گھر کی گردن آپ کے احسان سے جھک گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ ڈیڈی کو ہوش آ گیا ہے، بہت بہتر حالت میں ہیں، اپنے منہ سے چائے مانگی ہے۔ ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں ہے۔‘‘

کچھ لمحے تو میرے منہ سے آواز ہی نہیں نکل سکی۔ دوسری طرف سے شاہد کی آواز دوبارہ سنائی دی تو میں نے سنبھل کر کہا۔ ’’میں بھی آپ کے ساتھ خوشی میں ڈوب گیا ہوں۔ میری طرف سے تمام لوگوں کو مبارکباد دے دیں۔‘‘

’’ایسے نہیں ڈاکٹر کامران! اب آپ ہمارے لیے صرف ڈاکٹر نہیں رہے ہیں۔ ہمارے سب سے بڑے محسن بن گئے ہیں۔ دادی اماں تو آپ کو دعائیں دیتے نہیں تھک رہیں۔ تو جناب یہ فرمائیے کب آئیں گے، ایک فرمائش کروں؟‘‘

’’جی فرمائیے۔‘‘

’’صبح کو اسپتال سے آف کر کے آپ ادھر آ جائیے، ناشتہ ساتھ کریں گے۔‘‘

’’اس کے لیے معذرت چاہوں گا شاہد صاحب۔ میری دو عدد بھابیاں اور والدہ میرے ساتھ ناشتہ کرتی ہیں، میں بعد میں آ جاؤں گا۔‘‘

’’پھر لنچ ساتھ کر لیں۔‘‘

’’مناسب۔ ایک بجے پہنچ جاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا۔

شاہد سے رابطہ منقطع کر کے میں اپنی پسندیدہ جگہ آ بیٹھا لیکن خود میرا ذہن حیرتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس بارے میں ذرہ برابر نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیسے ہوا تھا۔

جاوید انصاری کے ہر طرح کے ٹیسٹ ہوئے تھے۔ انتہائی قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر رضوان نے بڑی ذمے داری سے اس کے مرض کی تشخیص کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے تھے۔ اس کے شانے پر ابھرے ہوئے اس گوشت کو بھی انہوں نے نظر انداز نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا۔

بس وہ غدود میرے ذہن میں اٹکا ہوا تھا اور وہی اس بیماری کا ذمے دار نکلا، اب اس اطلاع کے بعد تو کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

حکمت اور طب کی حکایتوں میں ایسی کچھ داستانیں سنی گئی تھیں کہ کسی شخص نے کھانے کے ساتھ کوئی چھپکلی یا کوئی زہریلا کیڑا نگل لیا اور وہ اس کے معدے میں زندہ رہ کر اس کی صحت کو نگل گیا یا ناک کان وغیرہ کے ذریعے کوئی کیڑا دماغ تک پہنچ گیا لیکن شانے کی کھال کے نیچے ایک زندہ مکڑی چھپی ہو اور وہ خون کو فاسد کر کے بدن کی توانائیاں چھین لے، اس کی کوئی مثال کبھی سامنے نہیں آئی تھی۔

باقی رات انہی سوچوں میں گزر گئی۔ دوسرے دن گھر جا کر معمولات میں مصروف ہو گیا۔ دو گھنٹے ناشتے کے بعد سوتا تھا پھر سہ پہر کا کھانا کھا کر دو گھنٹے مزید آرام، پھر شام کی چائے کے بعد تازہ دم ہو جاتا تھا۔

’’آج کے لیے ندا بھابی سے کہہ دیا کہ دوپہر کو لنچ پر جانا ہے مجھے ساڑھے گیارہ بجے جگا دیں۔ ندا بھابی نے ٹھیک گیارہ بجے مجھے کان مروڑ کر جگا دیا ان کا یہی انداز ہوتا تھا۔ میں نے تیاریاں کیں اور ایک خوبصورت سوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔

چھوٹی بھابی ثانیہ نے شرارت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ’’خدا خیر کرے، کچھ ہو گیا۔‘‘

’’کیا بھابی؟‘‘

’’یہ سج دھج کچھ کہہ رہی ہے مولانا کامران۔‘‘ میری بھابیاں مجھے مولانا کہتی تھیں کیونکہ بچپن ہی سے میں روزے، نماز کی پابندی کرتا تھا۔ اہلِ خاندان مجھے مسعود ثانی کہا کرتے تھے کیونکہ میں ہو بہو اپنے باپ کا ہمشکل تھا اور جوانی کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن آخری عمر میں والد صاحب پانچوں وقت کے نمازی اور تہجد گزار تھے۔

’’آپ کے کان جو سن رہے ہیں وہ غلط ہے بھابی جی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا اور باہر کی طرف چل پڑا۔

جاوید انصاری کی کوٹھی پہنچا تو وہاں عجیب ہی سماں پایا۔ سارے افراد بیرونی برآمدے میں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ حتیٰ کہ دادی اماں بھی موجود تھیں جنہوں نے سب سے پہلے میری پیشانی چوم کر دعاؤں کے انبار لگا دیے تھے۔ اچھے لوگ تھے جو احسان مند ہونا جانتے تھے۔

الغرض تمام رسمی باتوں کے بعد جاوید انصاری تک پہنچا اور خود حیران رہ گیا۔ مدقوق اور یرقان زدہ جاوید انصاری بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ کمزور تو بے شک تھا لیکن اب رخساروں پر زندگی جھلک رہی تھی۔

’’آپ ہیں ڈاکٹر کامران۔ آپ تو بالکل نوجوان ہیں، خدا آپ کو خوش رکھے۔‘‘

’’آپ کو خوش اور صحت مند دیکھ کر دلی خوشی ہوئی ہے۔‘‘ میں نے کہا تھا۔

’’مجھے کیا ہوا تھا ڈاکٹر صاحب؟‘‘

’’اس کا پتا نہیں چل سکا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’پھر آپ نے میرا علاج کیسے کیا؟‘‘

’’قدرت کی رہنمائی سے بلکہ آپ کا صحیح علاج دادی اماں کی دعاؤں سے ہوا ہے۔‘‘ اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

جاوید انصاری بے یقینی کے انداز میں مجھے دیکھنے لگا لیکن اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا وہ بالکل نارمل تھا، چہرے کی رونق بتاتی تھی کہ اب اس کے خون کا فساد بھی بہتر ہو رہا تھا۔ کافی وقت ان لوگوں کے ساتھ گزرا، عمدہ کھانا بھی کھایا۔

شاہد انصاری نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’ڈاکٹر کامران...... دادی آپ کو کچھ دینا چاہتی ہیں، میں نے کہا آپ سے پوچھ لیا جائے۔‘‘

’’آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔ محبت والے۔ میرا دل چاہتا ہے آپ لوگوں سے ملتا رہوں، اپنوں کی طرح، میرا اعتماد نہ توڑیے۔ شکر گزار ہوں گا۔‘‘ میں نے کہا اور سب کے چہروں پر شرمندگی نظر آنے لگی۔

’’سوری ڈاکٹر کامران......‘‘ شاہد نے کہا

’’ایک خاص درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ کسی واسطے سے آپ کے ڈاکٹر رضوان سے تعلقات ہیں، اگر وہ آپ سے رابطہ کر کے انصاری صاحب کی خیریت پوچھیں تو آپ انہیں میرے یا اس واقعے کے بارے میں نہ بتائیے گا بس یہ کہیں کہ اب ان کی حالت بہتر ہے۔ یہ میں صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ کچھ محسوس نہ کریں۔‘‘

’’ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ بے فکر رہیں۔‘‘

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ قصہ کیا تھا۔ ممکن ہے کبھی آگے جا کر یہ عقدہ کھل جائے۔ خود کو نارمل رکھنا ضروری ہے۔ گھر آیا تو بھابیاں چھیڑتی رہیں۔

رات کی ڈیوٹی کا آخری دن تھا۔ معمول کے مطابق اسپتال پہنچ کر ذمے داریاں انجام دینے لگا۔ ایمرجنسی میں بھی کچھ وقت دیا۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔

وقت گزرتا رہا، میرا پسندیدہ کوریڈور میرے سامنے تھا۔ سب جانتے تھے کہ مجھے وہ جگہ بہت پسند ہے۔ کوئی خاص کام نہیں تھا، چنانچہ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور میں نے رات کے بیکراں سناٹے پر نظریں جما دیں۔

بارہ بج کر ایک منٹ ہوا تھا کہ سامنے کی چھوٹی سی دیوار پر مونا نظر آئی۔ مونا بہت خوبصورت بلی تھی جو تھوڑے فاصلے پر اسپتال کے احاطے میں نرسوں کے کوارٹروں میں کسی نرس نے پالی ہوئی تھی۔ مجھے بچپن سے بلیاں اچھی لگتی تھیں۔ اس بلی کو ’مونا‘ کا نام میں نے ہی دیا تھا۔ اکثر میرے پاس آ جاتی تھی چونکہ بہت صاف ستھری رہتی تھی اس لیے میں اسے گود میں بٹھا لیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی اس کا آنا مجھے اچھا لگا۔ میرے پاس آ کر وہ میرے پیروں سے لپٹنے لگی اور میری توجہ پا کر اچھلی اور میری گود میں آ بیٹھی۔

میں اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا اور وہ ’’گھر گھر‘‘ کرنے لگی۔ ابھی بلی کو میری گود میں بیٹھے دو تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کوریڈور کے بائیں سمت سے مجھے ڈاکٹر سائرہ آتی نظر آئی۔ بائیں سمت جہاں راہداری گھومتی تھی، اسپتال کے پرائیویٹ روم تھے۔

ڈاکٹر سائرہ میری طرف ہی آ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور سمجھا کہ اب میرے کان اور دماغ کی خیر نہیں ہے۔ سائرہ کی طویل کہانیاں شروع ہو جائیں گی جن میں کسی دوسرے کردار کی انٹری کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

وہ قریب آ گئی۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ ڈاکٹر سائرہ ان لوگوں میں تھی جو ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی لیکن اس وقت نہ اس کی آنکھوں نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی بلکہ اس کی کیفیت خشمگیں تھی۔

اچانک ہی میں نے اپنی گود میں بیٹھی بلی کے انداز میں کچھ اضطراب محسوس کیا۔ وہ بے چین ہو رہی تھی اور اس کا بدن پھولتا جا رہا تھا جس طرح بلیاں کسی دوسری بلی کو دیکھ کر غصے یا خوف سے پھول جاتی ہیں۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے بلی کی پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ’’کیا ہوا مونا؟‘‘

اس دوران سائرہ اور قریب آ گئی لیکن اسی وقت بلی بھیانک آواز میں چیخی اور اس نے پوری قوت سے میری گود سے چھلانگ لگا دی۔ اس نے اس بدحواسی سے چھلانگ لگائی تھی کہ خود کو سنبھال نہ سکی اور خاصی آواز سے سامنے کی دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی اور وہ زمین پر تڑپنے لگی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بلی کی طرف لپکا میرے دیکھتے دیکھتے بلی دو تین بار تڑپی اور پھر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور زبان باہر نکل آئی۔

’’او مائی گاڈ۔‘‘ میں بلی کے پاس بیٹھ گیا اور اسے ٹٹولنے لگا۔ ایک نگاہ دیکھتے ہی پتا چل گیا کہ بلی مر چکی ہے۔

اس کی موت کا مجھے شدید افسوس تھا۔

’’پتا نہیں کیا ہوا۔ ایک منٹ پہلے یہ بالکل ٹھیک تھی اور میرے چمکارنے پر میری گود میں......‘‘ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈاکٹر سائرہ کی طرف رخ کیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بھی حیران ہو کر میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی ہو گی لیکن...... وہ نہیں آئی تھی، اور اب وہ کرسیوں کے پاس بھی نہیں تھی۔ آس پاس بھی کہیں نہیں تھی۔ ایسی کوئی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ اتنی جلدی چلی جاتی۔

میں شدید حیرانی کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

اچانک ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی اور میری گردن خود بخود گھوم گئی۔ تب میں نے مردہ بلی کو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اٹھتے ہی پنجے دبائے اور اتنی لمبی چھلانگ لگائی جو کسی عام بلی کے لیے ممکن نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے وہ کوریڈور کی دیوار پھلانگ کر دوسری طرف کود گئی اور رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

میں پاگلوں کی طرح منہ کھولے، آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ اسی وقت مجھے دور سے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی اور میں نے ان آوازوں کی طرف دیکھا۔

دوسرے لمحے میرے منہ سے نکلا۔ ’’اوہ...... میرے خدا......!‘‘

(جاری ہے)

ناقابلِ یقین منظر تھا۔

وہ ڈاکٹر سائرہ تھی جو بالکل مختلف سمت سے آرہی تھی یعنی کوریڈور میں جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں دائیں سمت سے سائرہ آئی تھی اور گم ہوگئی تھی لیکن اب وہ بائیں سمت ڈیوٹی کاؤنٹر کی طرف سے آرہی تھی اور اس کا رخ میری طرف تھا۔ دونوں راستوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور ان کے فاصلے بھی بہت زیادہ تھے۔

میں اچنبھے سے اسے آتے دیکھتا رہا اور جب وہ قریب آگئی تو غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سائرہ کے چہرے پر شگفتگی تھی جبکہ چند منٹ قبل وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آئی تھی جو اس کی فطرت کے خلاف تھا۔

''ارے کیا ہوا ڈاکٹر کامران! آپ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں، سوری کیا میں مخل ہوئی ہوں؟''

''اِیں......نہیں......آیئے!'' میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

''مجھے علم ہے کہ کوریڈور کے اس حصے سے آپ کو عشق ہے، آپ یہیں بیٹھنا پسند کرتے ہیں، میں بھی یہاں کی عادی ہوگئی ہوں اور ایک عادت میں نے اپنے آپ پر مسلط کر لی ہے۔'' وہ چند لمحے رکی پھر بولی۔ ''ذرا بتایئے کونسی عادت......! چلیں میں بتائے دیتی ہوں، وہ دیکھئے میری عادت وہ آرہی ہے۔'' اس نے سامنے اشارہ کیا۔

کینٹین کا ملازم کافی کے برتن لے کر آرہا تھا۔

سائرہ نے اب بھی مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور بولی۔ ''بڑا لطف آتا ہے اس طرح بیٹھ کر کافی پینے میں، کل سے ڈیوٹی بدل جائے گی، اس طرح یہ آج رات کی آخری کافی ہے۔''

اسے خاموش ہونا پڑا کیونکہ نیاز خان سینٹر ٹیبل پر کافی کے برتن سجا رہا تھا۔

میں البتہ احتیاط سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ کچھ لمحے پہلے پیش آنے والے واقعے سے سائرہ کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

پھر وہ کون تھی......؟

بلی اسے دیکھ کر خوف زدہ کیوں ہوگئی تھی اور مردہ بلی زندہ ہوکر کیسے بھاگ گئی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ڈاکٹر رضوان واپس آئے۔ انہوں نے ایک بار بھی جاوید انصاری کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ظاہر ہے انہیں کوئی ذاتی دلچسپی نہیں تھی۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد مجھے فون موصول ہوا، اجنبی نمبر تھا۔

''ٹھیک ہے آپ ڈاکٹر ہیں لیکن میرا خیال ہے انسانی رشتے بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔''

''کون صاحب......؟'' میں نے پوچھا۔

''جاوید انصاری!''

''السلام علیکم سر! کیسے مزاج ہیں؟''

''بالکل ٹھیک ہوں، تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''حکم فرمایئے......حاضر ہو جاؤں گا۔''

''کس وقت آسکو گے؟''

''عرض کیا نا کہ حکم فرمایئے۔''

''ڈنر میرے ساتھ کرو آج ہی......انتظار کروں گا۔''

''بہتر ہے، نو بجے پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

نو بجے میری کار جاوید انصاری کے بنگلے میں داخل ہوگئی۔ خوش اخلاق لوگوں نے معمول کے مطابق پُرتپاک استقبال کیا تھا۔ بے مروتی کی شکایتیں کی تھیں، بہترین کھانا کھلایا تھا اور پھر جاوید انصاری مجھے لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کی صحت حیرت انگیز طور پر بہترین ہوگئی تھی۔ پیلاہٹ، گلابی رنگ سے بدل گئی تھی۔

''بیٹھو! تم میری نگاہوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے ہو اس لیے کہ تم نے میری زندگی بچائی ہے اور اس لیے بھی کہ میں ایک عجیب بیماری کا شکار ہوگیا ہوں۔''

''بیماری......؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''ہاں! خوابوں کی بیماری جو میں جاگتی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔''

''یہ تو کوئی شاعرانہ سی بیماری لگتی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''افسوس یہی ہے کہ اس میں شاعری کا کوئی عنصر نہیں ہے۔'' جاوید انصاری مسکرا کر بولے۔ پھر کہنے لگے۔ ''ایک عجیب سی کہانی تمہیں سنانے لگا ہوں، براہ کرم سن لو، میری مجبوری ہے ورنہ میں تمہیں کبھی پریشان نہ کرتا۔''

''نہیں......نہیں! آپ مجھے ضرور سنایئے۔'' میں نے کہا۔ بیشک کئی دن گزر گئے تھے لیکن مجھے وہ انوکھی مکڑی یاد تھی اور میں اس کا راز جاننا چاہتا تھا۔

''میرے بارے میں شاید تمہیں بتایا گیا ہو کہ میں مختلف کاموں کے ٹھیکے لیتا ہوں، زمینوں کی خرید و فروخت بھی کر لیتا ہوں، کوئی ایک بزنس نہیں ہے میرا، بس جہاں بھی کوئی منافع بخش سودا نظر آیا، کر لیتا ہوں خیر ان دنوں کراچی کے ایک دور افتادہ حصے میں کچھ کام چل رہا تھا۔ چوکھنڈی ایک وسیع قبرستان کی حیثیت رکھتا ہے، وہاں میرے ساتھ کچھ مزدور کام کر رہے تھے انہی میں بلرام نامی ایک ہندو مزدور بھی تھا۔ ایک دن کہنے لگا کہ صاب جی! پاس کی بستی میں ایک زمین پڑی ہوئی ہے جس کا مالک بنسی راج ہے، میں نے اسے بتایا تھا کہ ہمارے مالک بڑے ٹھیکیدار ہیں تو بنسی راج نے کہا کہ اگر مالک اس کی زمین خریدنا چاہیں تو میں بات کروں، وہ بہت سستی دے دے گا، ویسے بھی اُدھر کی زمینیں اسٹیل مل والے خرید رہے ہیں مگر بنسی راج ایک ان پڑھ بندہ ہے، وہ کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا، آپ چاہیں سر جی تو وہ زمین دیکھ لیں، اگر سودا ہو جائے تو کیا حرج ہے، ہمارے بھی کچھ پیسے بن جائیں گے۔ مجھے اس کی بات اچھی لگی کیونکہ میں ایسے سودے کرتا رہتا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں گا پھر ایک دن میں بلرام کے ساتھ زمین دیکھنے چل پڑا۔ کوئی پون گھنٹے کے سفر کے بعد بلرام ایک گوٹھ میں داخل ہوا۔ چھوٹا سا گوٹھ تھا، کوئی بیس پچیس گھر ہوں گے لیکن اجڑے، ویران......! انسان نہیں نظر آرہا تھا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''بلرام! کیا یہاں کوئی نہیں رہتا؟''

''پہلے یہ بستی آباد تھی صاب جی! پھر لوگ یہاں سے چلے گئے، اب صرف بنسی راج رہتا ہے، ادھر ڈھلان میں اس کا گھر ہے۔''

میں نے جیپ اس کے اشارے کی طرف موڑ دی۔ ڈھلان کے اختتام پر ایک جھونپڑا نظر آرہا تھا۔ جھونپڑے کے گرد بے حد وسیع زمین تھی جس کے گرد اونچی اونچی جھاڑیوں کا حصار تھا، انہی میں ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔

بلرام کے اشارے پر میں نے جیپ دروازے کے پاس روک دی۔ اندر سے عجیب سی بھنبھناہٹ کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

''آیئے سرکار......!'' بلرام نے کہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ احاطے کے اندر بہت سے لوگ چادریں اوڑھے بیٹھے ہوئے تھے، ان کے جسم اور چہرے میلی چادروں سے ڈھکے ہوئے تھے اور گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہے تھے اور بھنبھناہٹ جیسی آوازیں ان کے منہ سے بلند ہو رہی تھیں۔

اسی وقت بلرام زور سے چیخا۔ ''آگئے ہیں بنسی راج......! اندر آگئے ہیں۔''

''یہ سب کیا ہے بلرام......؟'' میں نے اپنی آواز کی لرزشوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پدم کتھا ہو رہی ہے سرکار! آتے ہیں بنسی راج......!'' بلرام کے لہجے میں بھی عجیب سی تبدیلی تھی۔ میرے بدن میں سرد لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور بولتا، جھونپڑے کے اندر سے ایک شخص باہر نکل آیا۔ بڑا عجیب چہرہ تھا، بالکل سوکھے بدن کا مالک تھا لیکن آنکھیں......! خدا کی پناہ ڈاکٹر کامران......! وہ آنکھیں اس قدر بھیانک تھیں کہ رگوں میں خون جم جائے۔''

پھر اس کی منحوس آواز ابھری۔ ''کتنے ہوگئے بلرام......؟''

''تین بنسی جی!'' میں نے ایک جھرجھری سی لی اور کرخت لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کیا ڈرامہ ہے بلرام! کون سی زمین ہے اور کس کی ہے؟''

''نہ کوئی جمین ہے میاں جی! نہ آکاش......! ہم اپنے پدم پردھانی کو جگا رہے ہیں۔'' بلرام کے بجائے بنسی راج نے کہا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو تم......! کون پدم پردھانی......؟''

''ہمار شنکھار ہے۔ او کھنڈولا بن جئی رہے بیرو تو سب اوہی ہو جائے رہے جو تھا۔ ہمار جمین اوہی ہے جا پر تم نے کچھ جما لیا ہے، ایک کھنڈولا سب ٹھیک کر لے گا۔ نہ تم رہو گے، نہ ہم ہم......!'' وہ مکروہ آواز میں کہہ رہا تھا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

پھر اس نے ایک طرف رخ کر کے کہا۔ ''لے آو رے لے آؤ......انتجار کاہے کرو ہو، تیسرا پائل مل گیا ہے، ابھو چار اور تلاس کرنے ہیں۔''

پائل......! میں نے دل میں سوچا۔ مجھے ان فضول سے ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن آپ جانتے ہیں ڈاکٹر کامران کہ میری والدہ زندہ ہیں اور میں کتنا ہی مصروف ہوں، دو گھنٹے اپنے اہل خاندان کے ساتھ روزانہ بیٹھتا ہوں۔ عمر کوئی بھی ہو، اپنوں کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارنا چاہیے خاص طور سے بزرگوں کے ساتھ! کیونکہ انہیں اپنوں کی خاص ضرورت ہوتی ہے ڈھلتی عمر میں، پھر اس طرح کے رابطے میں اپنے، اپنے رہتے ہیں، کبھی غیر نہیں ہوتے۔'' وہ رکا۔

پھر بولا۔ ''سوری میں بتا رہا تھا کہ ایک بار باتیں کرتے کرتے میری والدہ نے تذکرہ کیا تھا کہ میں پائل ہوں یعنی میری پیدائش پیروں کے بل ہوئی تھی، اس طرح پیدا ہونے والوں میں کچھ خصوصیات قدرتی طور پر ہوتی ہیں اور خاص طور سے وہ جادوگروں کے لیے بڑی دلکشی کے حامل ہوتے ہیں۔ والدہ کی ہدایت تھی کہ کبھی تنہا ویرانوں میں نہ جایا کروں اور میں والدہ کے احکامات کی ہمیشہ تعمیل کرتا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے الفاظ یاد آئے کیونکہ یہ ماحول عجیب طرح کا تھا۔ میرے دل میں خوف کا ہلکا سا احساس جاگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ پلٹ کر بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن اسی وقت زمین پر بیٹھے پراسرار لوگ یکدم اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے میرے گرد حصار بنالیا۔ میں بدحواس ہوگیا تھا۔

پھر اچانک جھونپڑے سے کئی نوجوان لڑکیاں نمودار ہوئیں، ان کی تعداد تقریباً سات تھی اور وہ جوگنوں کے لباس میں تھیں۔ ان میں سے ایک نے ایک تھال سر پر اٹھایا ہوا تھا جس پر سرپوش ڈھکا ہوا تھا۔ ایک ننگ دھڑنگ لنگوٹی بند سادھو، ان کے پیچھے تھا جس کی کلائی پر الو بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکیاں مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئیں اور سادھو آگے بڑھ آیا پھر لڑکیوں نے تھال زمین پر رکھ دیا اس کے بعد انہوں نے سرپوش تھال سے ہٹا دیا کیونکہ تھال خاص طور سے میرے سامنے رکھا گیا تھا اس لیے مجھے صاف نظر آرہا تھا۔

تھال میں پیلے رنگ کی ایک بڑی بھیانک مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھی۔ الو بردار سادھو آگے بڑھا اور اس نے الو کو ٹانگوں سے پکڑ کر تھال کے عین اوپر لٹکا دیا۔ اسی وقت ایک دوسرے آدمی نے تیز دھار خنجر سے الو کی گردن کاٹ دی اور گردن مکڑی والے تھال میں گری اور اس کے بدن سے خون کے قطرے تھال میں نیم مردہ شکل میں نظر آنے والی مکڑی پر گرنے لگے۔ مکڑی کے بدن میں کلبلاہٹ ہونے لگی اور مجھے اس کی آنکھیں کھلتی نظر آنے لگیں۔

میرا سانس رکا ہوا تھا۔ یہ اجنبی طلسمی ماحول مجھے اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، یوں سمجھو ڈاکٹر کامران کہ میں کھڑے کھڑے سو گیا تھا، بس اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔

ہوش آیا تو میں اپنے گھر میں تھا اور ڈاکٹر احتشام میرا معائنہ کر رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی تو وہ کچھ نہیں بولے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میری کیا کیفیت ہے؟ تب بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے شاید شازیہ، والدہ دوسرے لوگوں کو پکارا لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے کسی کو میری آواز نہ سنائی دے رہی ہو، تب میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرا بدن کہاں تھا، میں تو پتھر اچکا تھا۔

صرف میرا ذہن جاگ رہا تھا، میں سوچ سکتا تھا، بند آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا یعنی میرے دماغ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سن سکتا تھا، سوچ سکتا تھا اور بس......! میرا علاج ہو رہا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ میری بیماری وہ منحوس پیلی مکڑی ہے جو میرے شانے پر موجود ہے۔ رات کو ٹھیک ایک بجے وہ مکڑی متحرک ہوتی اور بڑے آرام سے میرے پورے بدن میں دوڑتی پھرتی۔ وہ اپنا زہر میری رگوں میں اتارتی اور میرا بدن سن ہو جاتا۔

ڈاکٹر کامران! جب ڈاکٹر احتشام نے مجھے آپ کے اسپتال منتقل کیا اور ڈاکٹر رضوان نے میرے ٹیسٹ کرا کر مایوسی کا اظہار کیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ میری اس حالت کی اصل وجہ کیا ہے لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں تھا اور جب آپ نے ڈاکٹر کامران، میرے بازو کے اس نشان کی طرف ان کی توجہ دلائی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ شاید اب کام بن جائے لیکن انہوں نے اسے قابل غور ہی نہیں سمجھا، مجھے بے حد مایوسی ہوئی، تمام لوگوں کی باتیں میں سن رہا تھا اور میرا دل غم سے چور تھا کہ اب مجھے میرے گھر سے بھی دور کر دیا جائے گا لیکن اللہ نے مجھ پر رحم کیا اور آپ کا ذہن میرے اس نشان میں اٹک گیا مگر مجھے ایک حیرت ہے۔''

''کیا......؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''ڈاکٹر رضوان نے اس نشان کو غدود کہہ کر نظر انداز کر دیا، اس وقت اس مکڑی پر کوئی ردعمل نہیں ہوا لیکن تمہارے چھونے سے وہ گھبرا گئی۔''

''شاید اس لیے کہ میں اس ابھرے ہوئے نشان کی جراحی کرنے والا تھا لیکن......!''

''ہاں میں جانتا ہوں کہ اس کے بعد آپ کیا سوال کریں گے، یہی نا کہ یہ سب کیا تھا؟''

''یہ بات واقعی جادوئی قصے، کہانیوں والی ہے، ابھی میں نے اس پر غور نہیں کیا ہے لیکن کچھ واقعات ناقابل فہم ہوتے ہیں۔''

مجھے ڈاکٹر سائرہ اور بلی کا منظر یاد آگیا جس کی ابھی تک کوئی توجیہ نہیں ہو سکی تھی، میں نے کافی مغز زنی کی تھی لیکن کئی دن کی کوششوں کے بعد بھی سائرہ والے واقعے کا کوئی سرا نہیں مل سکا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس دن کے بعد بلی بھی نظر نہیں آئی تھی جبکہ وہ مجھ سے بہت مانوس تھی اور میری ڈیوٹی دن کی ہو یا رات کی، وہ کسی نہ کسی طرح میرے پاس پہنچ جاتی تھی۔

''کہاں کھو گئے ڈاکٹر کامران......؟''

''آپ جاگتی آنکھوں کے خوابوں کا ذکر کر رہے تھے۔''

''انوکھے خواب......بہت انوکھے! کوئی کہتا ہے تم نے اچھا نہیں کیا، پدم پردھانی کے جیون کے لیے تمہاری بلی بہت ضروری تھی، اسی طرح کے دوسرے خواب! میں جانتا ہوں کامران! تم اس بارے میں کچھ نہیں کر سکتے لیکن میں چاہتا تھا کہ تمہیں اپنے مرض کی تفصیل بتاؤں۔''

''میں واقعی حیران ہوں، ایک بات بتایئے کیا آپ دوبارہ وہاں جانے کی ہمت کر سکتے ہیں؟''

''ارے نہیں......! آپ وہاں جانے کی بات کر رہے ہیں، میں اب درختوں کی کٹائی کا کام ختم کر دوں گا اور کبھی کسی سنسان جگہ کا رخ نہیں کروں گا۔'' جاوید انصاری نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، جن مشکلات سے آپ کو گزرنا پڑا ہے، اس کے بعد یہ احتیاط ضروری ہے۔''

''بس آپ سے ایک درخواست ہے ڈاکٹر کامران! میرا خیال رکھنا اور گاہے گاہے میری خبر گیری کرتے رہنا۔''

''بہت بہتر......!'' میں نے جواب دیا۔

زندگی میں لاتعداد ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ نہیں ہو پاتی اور عقل ان عقدوں کو حل نہیں کر پاتی تب انسان کی فطری جبلّت اس کا ساتھ دیتی ہے یعنی وہ ان واقعات کو بھول کر زندگی کے ساتھ آگے کا سفر شروع کر دیتا ہے۔

یہ سب کچھ میرے لیے بہت عجیب تھا، خاص طور سے جب جاوید انصاری نے اپنے مرض کا پس منظر بتایا تھا تب سے میں اور متاثر ہوگیا تھا پھر سائرہ اور بلی کا واقعہ، جس کا مکڑی والے واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن وہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

سائرہ سے اچھی سلام دعا تھی لیکن میں نے کبھی اسے وہ سب کچھ نہیں بتایا تھا۔ بتانے کے بعد جس طرح میری جان کھائی جاتی، مجھے اس کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ دوسری بات یہ کہ خود ڈاکٹر رضوان نے مجھ سے کبھی جاوید انصاری کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

وقت گزرنے لگا اور میں ان نہ سمجھ میں آنے والے واقعات کو بھولتا گیا۔ ہاں کبھی کبھی جب جاوید انصاری یا ان کے کسی بیٹے کا فون آجاتا تو مجھے واقعات یاد آجاتے۔

پھر ایک چھٹی کے دن جاوید انصاری کا فون آیا۔ اس وقت میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا۔

جاوید انصاری سے بات کرنے کے بعد میں نے والدہ سے جن کا نام ثریا تھا، پوچھا۔ ''امی......! پائل کیا ہوتا ہے؟''

''او تمہیں اتنا بھی نہیں معلوم حالانکہ ہر تیسرے گانے میں پائل یا پائلیا کا ذکر ہوتا ہے۔'' چھوٹی بھابھی تڑ سے بولیں۔

''نہیں......! میں انسانی صفات میں جو پائل ہوتی یا ہوتا ہے، اس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''ہاں ہوتا ہے......تم خود پائل ہو۔'' امی نے جواب دیا۔

''اِیں......!'' مجھے یاد آیا کہ امی میرے پائل ہونے کا ذکر پہلے بھی کر چکی تھیں۔

''ارے ہاں وہ پائل......! ہمارے ہاں ایک ملازم رمضان ہے، وہ پائل ہے، مجھے اس وقت معلوم ہوا جب پڑوس کی ایک خاتون کے بیٹے کی کمر میں تکلیف ہوگئی اور وہ اپنے بیٹے کو لے کر رمضان کے پاس آئیں کہ وہ اس کی کمر میں لات مار دے۔ یہ کوئی ٹوٹکا ہوتا ہے کہ کوئی پائل ایسے شخص کی کمر میں لات مار دے جس کی چک چلی گئی ہو تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے کیوں امی جان! ایسا ہوتا ہے نا؟'' نویدہ بھابھی نے اپنے گھر کے ملازم کے بارے میں بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں! قدیم روایات میں ان ٹوٹکوں کی بڑی اہمیت ہے۔'' امی نے جواب دیا۔

کافی دیر تک ٹونوں ٹوٹکوں کی باتیں ہوتی رہیں اور میں اپنے بارے میں سوچتا رہا کہ میں بھی پائل ہوں۔ جاوید انصاری کی سنائی ہوئی کہانی سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ان پراسرار لوگوں کو سات پائل افراد کی تلاش تھی جن میں دو مل چکے تھے، تیسرا جاوید تھا جو میری وجہ سے بچ گیا، ابھی انہیں پانچ پائل اور درکار تھے کچھ اور باتیں بھی یاد آرہی تھیں۔ بقول جاوید انصاری کے بنسی راج کہہ رہا تھا کہ انہیں شنکھا جگانا ہے اور نہ جانے اسی طرح کی کیا کیا باتیں......!

دفعتاً ثانیہ بھابھی زور سے چیخیں اور سب چونک پڑے۔ ثانیہ بھابھی اپنی جگہ سے اچھل کر نویدہ بھابھی پر آگریں۔ وہ اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھیں۔

''ارے......ارے کیا ہوا!'' نویدہ بھابھی نے خود بھی اچھلتے ہوئے کہا۔

''مکڑا......! اتنا بڑا تھا۔'' ثانیہ بھابھی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کہاں ہے؟'' نویدہ بھابھی مکڑی سے بہت ڈرتی تھیں۔

''دیوار سے میری پیٹھ پر کودا تھا، اتنا بڑا تھا کہ مجھے اس کا وزن محسوس ہوا تھا، وہ رہا وہ......!'' نویدہ بھابھی نے ایک طرف اشارہ کیا اور میں نے اپنی آنکھوں سے اس مکڑے کو دیکھا۔

اسے مکڑی نہیں مکڑا ہی کہا جاسکتا تھا کیونکہ وہ کوئی دو انچ کے قطر میں تھا۔ وہ تیزی سے ایک دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ایک روشندان سے دوسری طرف نکل گیا۔

ان لوگوں کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوگئی۔ پتا نہیں کیسی مکڑی تھی۔

غرض وقت گزرنے لگا۔ نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔ اسپتال کی زندگی بڑی مصروف ہوتی ہے، مریضوں میں الجھ کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ میں بھی گزرے ہوئے واقعات بھول چکا تھا لیکن ایک دن مجھے نویدہ بھابھی کے والد امیر الدین اسپتال میں نظر آئے اور انہیں دور سے دیکھ کر میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

انہیں سلام کیا تو وہ جلدی سے بولے۔ ''اوہ......کامران بیٹے! میں تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔''

''خیریت چچا جان......؟''

''ہاں! خیریت نہیں ہے، میرا ایک ملازم ہے رمضان، بچپن سے میرے پاس ہے اور گھر کے بچوں جیسی حیثیت رکھتا ہے، خوب تندرست تھا کہ اچانک بیمار ہوگیا، بخار آگیا تھا، کوئی خاص بات نہ سمجھی گئی لیکن پھر اچانک اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی، ڈاکٹر کو دکھایا، وہ دوا دارو دے کر چلے گئے لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا، بڑی پریشانی لاحق ہوگئی۔ جب کوئی دو ہفتے تک اسے ہوش نہ آیا تو میں نے اپنے فیملی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے سرکاری اسپتال میں داخل کرا دیا کیونکہ گھر پر اس کی ٹھیک نگہداشت، فیڈ اور یورین وغیرہ نہیں ہو رہی تھی۔ اسپتال میں جا کر بھی اسے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کے مرض کی کوئی تشخیص ہی نہیں ہو پا رہی، اس کے خون کے ٹیسٹ کیے گئے تو پتا چلا کہ اس میں ایک نامعلوم زہر گردش کر رہا ہے اور خون بالکل پیلا ہوگیا ہے جبکہ اس میں ہیپاٹائٹس کے اثرات بالکل نہیں ہیں۔ بس ڈاکٹروں کے بارے میں کیا کہوں، غریب بچہ سمجھ کر انہوں نے اسے تختۂ مشق بنالیا اور اسی پر تجربات کرنے لگے۔ پچھلے دن نویدہ گھر آئی تو اس نے مشورہ دیا کہ اسے یہاں منتقل کر دوں، ہم لوگ اسے یہاں لے آئے ہیں، اس کے لیے کمرہ نہیں مل رہا، اب تمہیں اس کی دیکھ بھال کرنی ہے۔''

''بہتر ہے چچا جان! آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں ہے وہ......؟''

''ایمرجنسی میں ہے۔'' امیر الدین نے بتایا اور میں ان کے ساتھ چل پڑا ایمرجنسی میں، میں نے ملازم رمضان کو دیکھا۔ ایک نگاہ میں اندازہ ہوگیا کہ اس کی کیفیت سو فیصد جاوید انصاری جیسی ہے۔ دل کو دھکا سا لگا تھا، کچھ باتیں یاد آگئی تھیں۔ اس دن جب باتیں ہو رہی تھیں تو رمضان کا ذکر آیا تھا اور نویدہ بھابھی نے بتایا تھا کہ وہ پائل ہے اور پائل کی خصوصیات بھی بتائی تھیں پھر ایک مکڑا نویدہ بھابھی کی پشت پر کودا تھا اور میں نے خود اسے دیوار پر چڑھ کر روشندان سے باہر جاتے دیکھا تھا۔

انسانی ذہن آسانی سے شیطان کے شکنجے میں آجاتا ہے۔ مجھے بھی ایک طلسماتی احساس ہوا۔ یہ سب شیطانی چکر ہی لگا پھر بدن میں ایک سرد لہر کہتی ہوئی گزری کہ میں بھی تو پائل ہوں۔

''میرا خیال ہے تم سے بہتر اس کی نگہداشت اور کوئی نہیں کر سکتا، میں کوئی بہت بڑا اقدام تو نہیں کر سکتا لیکن پھر بھی اس کے لیے اگر اخراجات ہوئے تو کروں گا، بچپن سے میرے پاس پلا بڑھا ہے، ہمارے سوا اس کا کوئی نہیں ہے، بیٹے! انسانیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس جوان بچے کو اس طرح تنہا نہ چھوڑوں۔'' امیر الدین صاحب نے گلوگیر آواز میں کہا اور میں خیالات سے نکل آیا۔

''آپ فکر نہ کریں......مجھ سے جو کچھ ہو سکا، ضرور کروں گا۔''

سب سے پہلے میں نے رمضان کے لیے کمرے کا انتظام کیا۔ اس کیس کے انچارج ڈاکٹر احسان الٰہی تھے۔ ان سے رابطہ کر کے درخواست کی کہ اس مریض پر پوری توجہ دیں۔

''آپ جس طرح چاہیں اس پر کام کریں، میں آپ کو اجازت دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر احسان نے کہا۔ چنانچہ میں مصروف ہوگیا۔ میں نے اس کے سارے ٹیسٹ کرائے۔ رپورٹ یہی ملی کہ کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اس کے خون میں شدید زہریلے اجزا شامل ہوگئے ہیں اور وہ اب خالص خون نہیں رہا ہے۔

میرے خیال کی تصدیق ہوگئی تھی چنانچہ اب میں اس کے بدن کا جائزہ لینے کے لیے بے چین ہوگیا۔ نویدہ بھابھی کی کوٹھی کا ایک اور ملازم جمعہ، رمضان کے ساتھ اسپتال میں رہتا تھا۔ اس دن اسپتال کا ماحول کچھ سنسان تھا۔ میں نے موقع پا کر جمعہ کو ایک کام دے کر باہر بھیج دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے جلدی سے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

میں نے پہلے اس کے شانے کا جائزہ لیا، وہاں کچھ نہ پا کر اس کے بدن کو بے لباس کر کے ایک ایک عضو کا جائزہ لیا لیکن کہیں بھی گوشت کے ابھرے ہونے اور اس کے نیچے چھپی مکڑی کا نشان نہیں ملا۔

مایوس ہو کر میں نے اس کا لباس درست کیا اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت مجھے ایک مکروہ ہنسی کی آواز سنائی دی۔ کوئی استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ میں بے اختیار پلٹا، کمرے میں بے سدھ پڑے رمضان کے سوا کوئی نہیں تھا، وہ کومے میں تھا اور اس کے چہرے پر ہنسی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

پھر کون ہنسا تھا......؟

کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے دن ڈیوٹی پر آیا تو رمضان مر چکا تھا۔ مجھے شدید افسوس ہوا لیکن ڈاکٹر کسی کی زندگی تو نہیں بچا سکتے۔ امیر الدین بہت افسردہ تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس دن رمضان کے بارے میں جو باتیں ہو رہی تھیں اور اس کے پائل ہونے کی جو نشاندہی ہوئی تھی اور وہاں ایک مکڑی موجود تھی، رمضان کی موت کا اس سے گہرا تعلق تھا۔

لیکن یہ مکڑی......! آخر کسی مکڑی کا ان واقعات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مکڑی تو بس مکڑی ہو سکتی ہے۔ اگر جاوید انصاری کے شانے پر ابھرے ہوئے گوشت سے وہ مکڑی برآمد نہ ہوتی تو میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی تصور نہ ابھرتا۔

پھر اس خیال نے مجھے ان واقعات سے منسلک رکھا کہ میں بھی پائل ہوں۔ میرے دل میں ایک خواہش شدت سے پیدا ہوگئی کہ میں کسی ایسی شخصیت سے ملاقات کروں جو روحانیت سے تعلق رکھتی ہو اور ان پراسرار واقعات کے بارے میں میری رہنمائی کرے مگر ایسا کون ہو سکتا تھا۔

جاوید انصاری اور ان کے اہل خانہ مجھ سے بہت متاثر تھے اور اکثر ان کے فون آتے رہتے تھے۔ انہوں نے کئی بار میرے گھر والوں کو اپنے گھر مدعو بھی کیا تھا لیکن ہم نہیں جا سکے تھے پھر ایک دن جاوید انصاری اپنے اہل خانہ کے ساتھ خود ہی آگئے۔

''آپ لوگ تو آئیں گے نہیں ہمارے گھر، میں نے سوچا ہم ہی بن بلائے پہنچ جائیں۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا، مجھے بے حد خوشی ہے۔'' میں نے امی اور بھابھیوں سے ان لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کے اسپتال سے آپ کے ڈیوٹی ٹائم کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد یہ چھاپہ مارا ہے، مجھے پتا ہے کہ آج آپ کی ڈیوٹی گیارہ بجے سے ہے۔'' جاوید انصاری نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''آپ مجھے حکم دیتے، میں چھٹی کر لیتا۔'' میں مسکرا کر بولا۔

گھر کے لوگ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ بڑی اچھی کمپنی رہی، مجھے گزرے واقعات یاد آگئے۔ میں نے جاوید انصاری سے کہا۔ ''آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ دوبارہ کبھی ویرانوں کا رخ نہیں کریں گے اس لیے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آپ دوبارہ اس طرف گئے ہوں گے لیکن وہاں کے بارے میں اور کوئی بات تو نہیں معلوم ہوئی؟''

''توبہ کرو جی! ادھر کے تصور پر بھی لعنت!'' جاوید انصاری نے کہا۔

''آپ کا وہ ملازم جو آپ کو دھوکا دے کر وہاں لے گیا تھا؟''

''دوبارہ اس کا نشان بھی نہیں ملا۔''

''آپ کا وہ پروجیکٹ پورا ہوگیا؟''

''میں نے اسے ایک دوسری پارٹی کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر دیا۔''

''کونسی جگہ تھی وہ جہاں بلرام آپ کو لے گیا تھا؟ ذرا مجھے اس کی لوکیشن بتایئے۔'' میں نے کہا۔

جاوید انصاری اس جگہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے پھر چونک کر بولے۔ ''کیوں! خیریت......؟''

''بس ایسے ہی، بڑی عجیب کہانی تھی۔'' میں نے کہا۔ واقعی اس وقت میں نے یونہی بے مقصد اس جگہ کے بارے میں پوچھ لیا تھا لیکن دوسرے دن اچانک میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس انوکھی جگہ کو ذرا دیکھا جائے حالانکہ میرے دل میں خوف تھا، اس خیال سے کہ میں پائل ہوں، کہیں مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے لیکن بس وہ خیال ذہن میں بیٹھ گیا۔

رات کی ڈیوٹی تھی، دن کو فرصت تھی چنانچہ میں نے وہاں جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ صبح گھر پہنچا، دو تین گھنٹے آرام کیا پھر مطلوبہ جگہ چل پڑا۔ چوکھنڈی سے گزر کر میں اسٹیل مل کی مخالف سمت چل کر آخر کار اس ویران علاقے میں پہنچ گیا جہاں کے بارے میں جاوید انصاری نے بتایا تھا۔

ایک نگاہ میں ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ بے حد بھیانک جگہ ہے۔ ہر طرف نحوست برس رہی تھی، ڈھلان کے آخری حصے میں وہ احاطہ اور اس کے درمیان جھونپڑا نظر آرہا تھا۔ دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا لیکن قدم خود بخود نیچے لے جا رہے تھے۔

پھر میں نیچے پہنچ کر احاطے کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اندر سے خوفناک بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ ایک لمحے رک کر دروازے سے اندر داخل ہوگیا اور بھنبھناہٹ ایک دم بند ہوگئی۔ میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اچانک میرے پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ مجھے کچھ انسانی بدن لمبے لمبے پڑے نظر آئے تھے جو بالکل بے سدھ تھے، ان میں کوئی جنبش نہیں تھی۔

پتا نہیں اس وقت کی اپنی کیفیت کو میں کیا نام دوں، میرے رونگٹے کھڑے تھے، خوف کی شدت نے سخت کپکپی پیدا کر دی تھی لیکن میں اس کے باوجود ہر عمل کر رہا تھا۔ میرے قدم ان ساکت پڑے جسموں کی طرف اٹھ گئے اور میں ان کے قریب پہنچ گیا۔

ایک نگاہ میں اندازہ ہوگیا کہ وہ لاشیں ہیں، کفن میں لپٹی لاشیں......! ان کی تعداد چھ تھی اور وہ زندگی سے محروم تھے پھر ایک اور شدید جھٹکا اس وقت لگا جب میں نے ان کے چہرے دیکھے۔ ان میں ایک چہرہ میرا شناسا تھا۔ یہ نویدہ بھابھی کے ملازم رمضان کا چہرہ تھا۔

میرے دماغ میں بادلوں جیسی گرج ہو رہی تھی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ رمضان کی موت کے بعد امیر الدین کے اہل خانہ اس کی لاش لے گئے تھے۔ نویدہ بھابھی بھی بہت غمزدہ ہوئی تھیں کیونکہ رمضان بچپن سے اسی گھر میں تھا۔ بڑے بھائی اس کے جنازے میں شرکت کے لیے بھی گئے تھے پھر یہ کفن پوش لاش یہاں کہاں سے آگئی اور باقی پانچ لاشیں......!

اسی وقت مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی اور میں پلٹ پڑا۔

مجھ سے دو گز کے فاصلے پر ایک انتہائی مکروہ وجود کھڑا تھا۔ اس کا بدن بالکل ڈھانچے جیسا تھا لیکن آنکھیں......!

خدا کی پناہ کیسی دہشت ناک تھیں، مجھے جاوید انصاری کی باتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے بنسی راج کا یہی حلیہ بتایا تھا۔

اسی وقت مجھے اس کی منمناتی آواز سنائی دی۔ ''بنسی راج ہے ہمارا نام......!''

میں نے خود کو سنبھالا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''اس جھونپڑے میں تم رہتے ہو؟''

''تو......؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

''یہ لاشیں کس کی ہیں؟'' مجھے اور کوئی سوال نہ سوجھا۔

''پیلوا ہیں سرے!'' وہ بولا۔

''کہاں سے لائے ہو تم انہیں؟''

''کبرستان سے......!''

''کیوں......؟''

''سات پورے ہو جائیں تو ارتھی جلوائیں ان کا!'' وہ بے خوفی سے بولا۔

''تم نے انہیں ان کی قبروں سے نکالا ہے؟''

''تو اور کا آکاس سے لائے ہیں؟'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

اور مجھے چاروں طرف سے ہنسنے کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ تب پہلی بار محسوس ہوا کہ اطراف میں بہت سے لوگ موجود ہیں جو نظر نہیں آرہے۔

''تمہیں معلوم ہے یہ جرم ہے، تم پاکستان میں ہو؟''

''ارے اے ہی تو گلت ہوا ہے سنکھا مہاراج نے یہ بات بتائی تھی اس ہٹ دھرم کو......کہی تھی کہ لاکھوں کٹ جئی ہے، سوکٹ گئے اور تو ہار پاکستان بن گئی، مسعود مہاراج کی اچھا پوری ہوگئی، پرنت کتنے مرے......گنتی نا ہیں رے بیرا......ایک بیری بس ایک بیری سنکھا کھنڈولا بن جئی رہے پھر دیکھنا تماسا رے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم......! کون مسعود......کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں اپنے والد کا نام سن کر چونکا۔

''بہوت ہوگئی بیر بروٹھن کے کام میں نا ہیں گھست، چل جا یہاں سے، بس بہوت ہوئی گوا!'' وہ منہ بنا کر پلٹا اور جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔

میں کچھ لمحے رکا پھر واپس چل پڑا۔ جتنی ہمت کی تھی، وہ کافی تھی۔ کار میں بیٹھا اور واپس پلٹ پڑا۔

دماغ سن ہو رہا تھا، کار بڑی مشکل سے چلا رہا تھا۔ راستے طے ہوتے رہے۔ اس وقت جس جگہ سے گزر رہا تھا، وہ بہت سنسان تھی۔ شفاف سڑک کے کنارے مجھے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ کوئی عمر رسیدہ گدڑی پوش تھا شاید لفٹ مانگ رہا تھا۔ میں نے کار کی رفتار سست کر دی اور اس کے قریب جا کر رک گیا۔ بے حد ضعیف شخص تھا، لمبی داڑھی سینے پر لہرا رہی تھی۔

''شہر جا رہے ہو عزیزی......؟'' اس کی لرزتی آواز ابھری۔

''جی جی......حکم!'' میں نے کہا۔

''ہمیں لانڈھی چھوڑ دو گے؟''

''ہاں......ہاں آیئے۔'' میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور انہیں ہاتھ کا سہارا دے کر اندر بٹھالیا پھر کار آگے بڑھا دی۔

''لانڈھی کون سے نمبر جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ساڑھے چار نمبر......وہاں مسجد نور ہے، ہم اسی مسجد میں رہتے ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے کہا۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ یہ بزرگ ہیں، عمر رسیدہ ہیں۔ میں نے پہلے سوچا تھا کہ کوئی ایسا صاحب علم مجھے ملے جو ان پراسرار واقعات کی عقدہ کشائی کر سکے، ان سے تذکرہ کروں شاید یہ کچھ رہنمائی کر سکیں۔

اس خیال سے میں نے کہا۔ ''آپ یہاں اس سنسان سڑک پر کیا کر رہے تھے محترم! اس وقت تو یہاں کوئی سواری بھی نہیں ملتی؟''

''تم مل تو گئے۔'' بزرگ کی آواز میں خوشی تھی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''ایک بوٹی کی تلاش میں آیا تھا، ایک ضرورت مند کے لیے دوا بنانی تھی، آتو گیا مگر واپسی کے لیے کوئی سواری نہیں ملی تب تم کو بھیج دیا اللہ تعالیٰ نے!''

''آپ حکیم ہیں؟''

''بہت بڑا نام لیا ہے تم نے، صاحبِ حکمت تو ذاتِ معظم ہے، مجھ حقیر کو اتنا بڑا نام نہ دو۔''

''ایک مشکل ہے میری جس کے لیے مجھے کسی صاحبِ علم کی تلاش تھی، اگر آپ مجھے کچھ وقت دیں تو میری خوش نصیبی ہوگی؟''

''ہاں......ہاں کیوں نہیں، ممکن ہے مالک دو جہاں نے اس وقت مجھے تمہارے لیے ہی یہاں کھڑا کیا ہو، وہ اسی طرح اپنے بندوں کے لیے راستے بناتا ہے۔''

''بہت احسان ہوگا آپ کا!''

''نہیں بیٹے! بتاؤ کیا بات ہے؟''

''بات کچھ طویل ہے۔''

''کیا تمہارے پاس وقت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی! میں ڈاکٹر ہوں، ایک اسپتال میں نوکری کرتا ہوں، رات کو گیارہ بجے میری ڈیوٹی شروع ہوتی ہے اس لیے مجھے فرصت ہے بشرطیکہ آپ کے پاس وقت ہو۔''

''اللہ کے گھر میں رہتے ہیں جیسا ہم نے بتایا ہے، گھر کے سامنے حاجی منیر کا چائے خانہ ہے، بڑی اچھی ہوتی ہے اس کی چائے، چنانچہ ہماری طرف سے چائے کی دعوت قبول کرو، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

لانڈھی کے ایک گنجان گوشے میں مسجد نور کے سامنے جھونپڑا ہوٹل کی بنچوں میں سے ایک بنچ منتخب کر کے میں احمد علی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا جس کا اندازہ ان کے ہوٹل میں قدم رکھتے ہی ہوگیا تھا۔

چائے واقعی بہت لذیز تھی۔ میں نے فرمائش کر کے دو کپ چائے پی پھر احمد علی کے کہنے پر اپنی کہانی کا آغاز کیا۔ یہ کہانی میں نے اس وقت سے شروع کی جب جاوید انصاری اسپتال میں داخل ہوئے اور میں نے ان کے شانے پر ابھرے ہوئے گوشت کو دیکھا، پھر اس کے بعد میں نے بے کم و کاست پوری کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ پھر میں نے بلی کے ذکر کے ساتھ ساتھ پوری تفصیل اس وقت تک کی سنا دی جب میں ان بزرگ سے ملا تھا۔

احمد علی بڑی توجہ سے یہ داستان سن رہے تھے پھر انہوں نے کہا۔ ''تمہارے والد کا کیا نام تھا؟''

''مسعود احمد......!''

''دادا کا؟''

''محفوظ احمد۔''

''ہندوستان میں کہاں رہتے تھے؟''

''میں تو پاکستان میں ہی پیدا ہوا، ویسے اجداد کا تعلق سہارن پور سے تھا۔''

''ہوں......!'' احمد علی کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ''دعا تعویذ کے قائل ہو؟''

''کیوں نہیں! بفضل تعالیٰ مسلمان ہوں۔'' میں نے کہا۔

احمد علی نے اپنے لباس کی جیب سے ایک تعویذ نکالا اور اسے میری طرف بڑھا کر بولے۔ ''اسے جیب میں رکھ لو، ضائع نہ ہونے پائے، کل کچھ وقت نکال سکو گے؟''

''جی ضرور......بتایئے کب؟'' میں نے سوال کیا۔

''کل بھی رات کی ڈیوٹی ہے؟''

''جی......!''

''ظہر کی نماز کے بعد آجاؤ، کہاں رہتے ہو؟''

''جمشید روڈ پر......!''

''دوپہر کے کھانے کے بعد چل پڑنا، میں یہیں ملوں گا۔''

''بہت بہتر!'' میں نے جواب دیا۔

احمد علی نے گردن ہلا کر کہا۔ ''چلو اب اٹھتے ہیں، بہت وقت ہوگیا۔''

انہوں نے مجھے میری کار تک پہنچایا پھر بولے۔ ''مجھے یہاں تک لانے کا شکریہ! کل ملاقات ہوگی۔''

میں احمد علی کو سلام کر کے واپس چل پڑا۔ تعویذ میں نے سنبھال کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ آج سب کچھ بہت عجیب ہوا تھا۔

ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ بنسی راج کوئی بدروح معلوم ہوتا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ بدروحیں اب پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئی ہیں، خاص طور سے مجھے رمضان کی لاش یاد آرہی تھی۔ وہ وہاں کیسے پہنچ گئی۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں سرایت کر گیا۔ کیا رمضان کی لاش اس کی قبر میں نہ ہوگی، کیا اس کی قبر کھلوا کر دیکھا جائے......کیا ایسا ممکن ہے......؟

(جاری ہے)

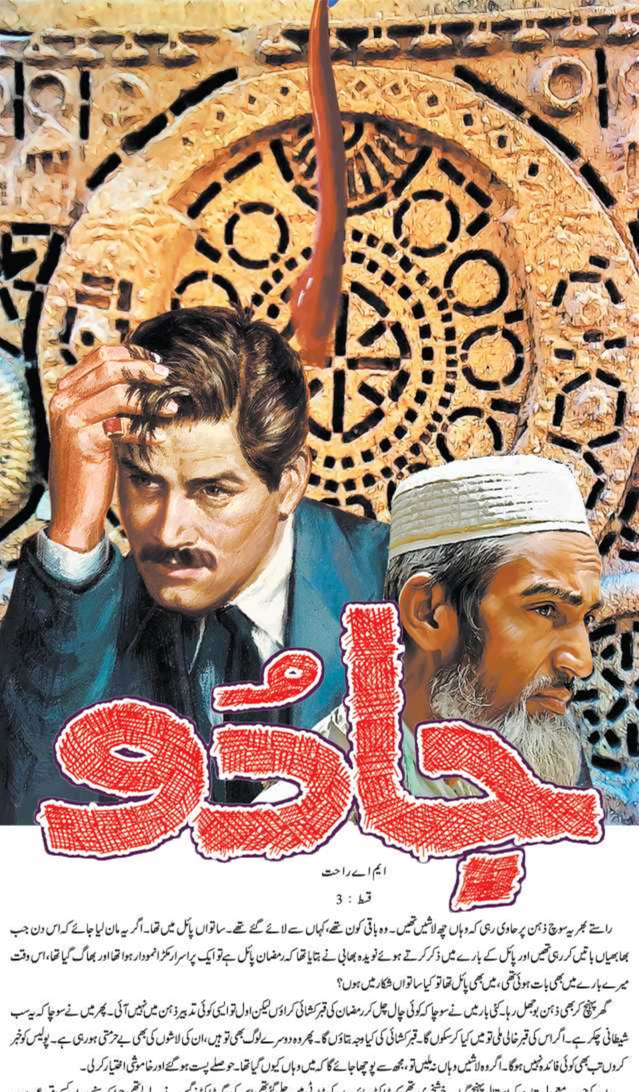

ایم اے راحت

قسط : 3

راستے بھر یہ سوچ ذہن پر حاوی رہی کہ وہاں چھ لاشیں تھیں۔ وہ باقی کون تھے، کہاں سے لائے گئے تھے۔ ساتواں پائل میں تھا۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس دن جب بھابھیاں باتیں کر رہی تھیں اور پائل کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے نویدہ بھابی نے بتایا تھا کہ رمضان پائل ہے تو ایک پراسرار مکڑا نمودار ہوا تھا اور بھاگ گیا تھا، اس وقت میرے بارے میں بھی بات ہوئی تھی، میں بھی پائل تھا تو کیا ساتواں شکار میں ہوں؟

گھر پہنچ کر بھی ذہن بوجھل رہا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ کوئی چال چل کر رمضان کی قبر کشائی کراؤں لیکن اول تو ایسی کوئی تدبیر ذہن میں نہیں آئی۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ سب شیطانی چکر ہے۔ اگر اس کی قبر خالی ملی تو میں کیا کر سکوں گا۔ قبر کشائی کی کیا وجہ بتاؤں گا۔ پھر وہ دوسرے لوگ بھی تو ہیں، ان کی لاشوں کی بھی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ پولیس کو خبر کروں تب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر وہ لاشیں وہاں نہ ملیں تو، مجھ سے پوچھا جائے گا کہ میں وہاں کیوں گیا تھا۔ حوصلے پست ہوگئے اور خاموشی اختیار کر لی۔

رات کو حسب معمول تیار ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ خوشخبری یہ تھی کہ ڈاکٹر سائرہ دن کی ڈیوٹی میں چلی گئی تھی اس کی جگہ ڈاکٹر نرگس نے لے لی تھی جو ایک سنجیدہ اور کسی قدر عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ بوجھل ماحول میں وقت گزرتا رہا۔ کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ رات کو ایک بجے میں اپنی پسندیدہ جگہ آ بیٹھا لیکن ذہن پر اداسی طاری تھی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے ایک دم احساس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا، دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ تب میری نگاہ ایک ستون کی طرف اٹھ گئی اور میرے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ سو فیصد وہی مکڑی یا مکڑا تھا جو اس دن میں نے دیکھا تھا یا اس سے پہلے میں نے جاوید انصاری کے ہاتھ سے نکلتے ہوئے دیکھا، فرق یہ تھا کہ وہ تھوڑی چھوٹی تھی لیکن اس کی آنکھیں سو فیصد ایسی ہی تھیں، ان آنکھوں نے مجھے گھور کر دیکھا تھا اور ایسی آواز ابھری تھی جیسے کسی کیمرے سے تصویر کھینچی گئی ہو۔ اس وقت بھی اس مکڑے کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ تب ہی مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔

معاً مجھے شدید خوف کا احساس ہوا، کیا یہ مکڑا اب مجھ پر حملہ آور ہونے والا ہے کیونکہ میں بھی پائل ہوں۔ مجھے ایک دم وہ تعویذ یاد آیا جو احمد علی نے مجھے دیا تھا لیکن یہ یاد کر کے میں سخت نروس ہو گیا کہ تعویذ میں دوسرے لباس کی جیب میں چھوڑ آیا تھا۔ مجھے وہ نکالنا یاد نہیں رہا تھا۔

تبھی میرے کانوں میں ایک باریک نامانوس آواز ابھری۔ ’’بھوریا چرن ہے ہمارا نام بچے۔ تو ہار پتا جی سے ہمار بڑی لاگ ڈانٹ تھی!‘‘ صاف لگ رہا تھا کہ یہ آواز مکڑے کے منہ سے نکل رہی ہے۔ ’’کہی تھی ہم نے، مسعود سے ہجارن بار منوئی کی موت کا کارن نہ بنے۔ پرنا مانا...... ایک سنکھا مرے تو اس کے ساتھ لکھن منوئی مریں ہیں۔ ارے ہمرے تو تین جنم رہیں، پر او بے چارے مارے گئے او نا ہیں واپس آئے سنسار ماں...... پر ہم آئی گوے بٹوا۔ ایک تاؤ کی کسر رہے، پر تجھے مارنا نہیں ہے۔ جو کام تیرے پتا نے نہ کیا وہ تو کرے گا۔ تو ہمیں کھنڈولا بنائے گا رے۔‘‘

آواز بالکل صاف آ رہی تھی مگر اس کا مطلب میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا اور پھر جواب بھی میں کیا دیتا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ’’سوگند بھوانی میا کی، وہ انعام دیں گے تو ہے سنسار میں کہ تو جیون بھر یاد رکھے گا۔ سن ہم سے جھگڑا نہ کر، ٹھنڈے من سے ہمارے کام کر، ہم پہلے تیرا نام بڑا کریں گے، پھر تو ہمار کام کرنا۔‘‘

اسی وقت دور سے دو نرسیں آتی نظر آئیں تو آواز ابھری۔ ’’جلدی نہیں ہے ہمیں۔ سوچ لے آرام سے، فائدے ہی فائدے ہیں۔ ہم چلتے ہیں تو اپنا کام کر۔‘‘ یہ کہہ کر مکڑا تیزی سے اوپری چھت کی طرف گیا، پھر چھت پر پہنچ کر گم ہو گیا۔

میں دم بخود تھا۔ کیا فضول باتیں سنی تھیں میرے کانوں نے۔ الفاظ نامانوس تھے لیکن غور کرنے سے سمجھ میں آتے تھے۔ دونوں نرسیں میرے پاس سے گزر گئیں۔ وہ دوسری سمت مریض کے کمروں کی طرف جا رہی تھیں۔

میرا ذہن شدید الجھن کا شکار ہو گیا۔ اب بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کچھ غیر معمولی قوتوں کا شکار ہو گیا ہوں اور وہ قوتیں ناقابل فہم ہیں۔ اب تک بڑی پرسکون زندگی گزاری تھی۔ والد صاحب کاروبار کرتے تھے اور بڑی خوشحالی تھی۔ یہ کاروبار چچا محمود کی شراکت میں تھا۔ پھوپی شمسہ، ماموں اکرام، دادا ریاض جو میرے والد مسعود احمد کے ماموں تھے۔ ایک بھرا پرا خاندان تھا جو زیادہ فاصلوں پر نہیں تھا سب ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔

والد صاحب کسی قدر درویش منش تھے، کبھی کبھی گھر میں ہندوستان کا تذکرہ ہوتا تھا جو میرے لیے غیر دلچسپ تھا اور میں نے ان باتوں کو کبھی غور سے نہیں سنا تھا۔ بڑے دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ پھر والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

میں اپنی تعلیم میں مگن رہتا تھا اور اب مجھے زندگی کی وہ ڈگر مل گئی تھی جس کے لیے میں نے محنت کی تھی لیکن یہ سب کچھ؟ کیا میں نے اس مکڑی کے معاملے کو چھیڑ کر غلطی کی تھی لیکن وہ تو میرا کارنامہ تھا۔ ڈاکٹر رضوان نے جس چیز کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا، میں نے اس پر توجہ دے کر جاوید انصاری کو اللہ کے فضل سے نئی زندگی دی تھی۔ یہ میرا فرض تھا جسے مجھے زندگی بھر سرانجام دینا تھا۔ پھر اسے غلطی کیوں کہا جائے۔

دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جسے ہمراز بناؤں اور اس سے کہوں کہ مجھے ان معاملات سے روشناس کرائے مجھے صحیح راستہ دکھائے۔

اسی وقت روشنی کی ایک کرن چمکی۔ احمد علی...... انہوں نے مجھے کل بلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ان کا دیا ہوا تعویذ یاد آ گیا تھا۔ بڑی غلطی ہو گئی۔ اب مجھے وہ تعویذ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ہوگا۔

رات گزر گئی۔ دوسرے دن معمولات سے فراغت پا کر میں نے احمد علی کے پاس جانے کی تیاری شروع کر دی۔ چھوٹی بھابھی نے میری تیاری پر مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

’’آخر کار اونٹ پہاڑ تلے آ ہی گیا۔‘‘

’’مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’یہ اڑی اڑی سی رنگت، یہ کھلے کھلے سے گیسو۔‘‘ وہ شرارت سے بولیں۔

’’ماشا اللہ...... آجکل اردو ادب کا مطالعہ ہو رہا ہے شاید اس طرح کے محاورے اردو ادب میں ہی ملتے ہیں!‘‘

’’ویسے مجھے بھی شازیہ بہت پسند ہے۔‘‘

’’جی......‘‘ میں نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

’’خاص طور سے مجھے روزانہ فون کرتی ہے۔‘‘ بھابھی نے اپنی ہانکتے ہوئے کہا۔

’’شازیہ۔‘‘ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’جاوید انصاری کی صاحبزادی۔‘‘

’’اللہ اکبر...... کیا شان بے نیازی ہے۔‘‘

’’پیاری بھابھی بلکہ بہت پیاری بھابھی۔ جھوٹ بولوں تو، تو مر جائے میرے دل و دماغ کے کسی مفلوج گوشے میں بھی ایسا کوئی احمقانہ خیال نہیں ہے۔‘‘

’’ارے، واقعی، پھر یہ معمولات میں غیر معمولی تبدیلیاں کیسی ہیں؟‘‘

’’بس۔ میں اسی دنیا کا ایک باسی ہوں، پچاس کام ہوتے ہیں۔‘‘ میں نے جواب دیا اور بھابھی کا منہ لٹک گیا۔

’’توبہ توبہ۔ سارا مزہ کرکرا کر دیا۔‘‘ وہ بولیں اور میں گہری سانس لے کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

مجھ پر جو بیت رہی تھی گھر میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر کار تیار ہو کر لانڈھی چل پڑا۔ راستے میں نہ جانے کیا کیا سوچیں دامن گیر رہی تھیں۔ طویل سفر ختم ہو گیا اور میں منزل پر پہنچ گیا۔

احمد علی چائے خانے کے ایک گوشے میں نظر آئے۔ اس وقت چائے خانہ تقریباً خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر سلام کیا اور سامنے بنچ پر بیٹھ گیا۔

’’چائے منگوا لیتے ہیں۔‘‘ وہ بولے۔

’’جی......!‘‘ میں نے کہا اور احمد علی نے چائے کے لیے کہہ دیا۔ ہم نے چائے کے دوران اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی، بس احمد علی نے میرے گھر کے لوگوں کی خیریت پوچھی تھی۔

چائے ختم ہوئی تو وہ بولے۔ ’’میں نے تمہارے مسئلے پر خوب غور کیا ہے عزیزی، میں کوئی عالم نہیں ہوں، بس یوں سمجھو ایک دینی طالب علم ہوں اور علم کی طلب کائنات کے آخری دن تک ختم نہیں ہوگی کیونکہ مالک کائنات کی کائنات بہت وسیع ہے اور عمر مختصر، جو کچھ تمہارے انکشافات سے میرے علم میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ تمہارے ساتھ پیش آنے والے واقعات عارضی یا اتفاقیہ نہیں ہیں بلکہ ان کے ڈانڈے بہت پیچھے سے ملتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟‘‘

’’جی......!‘‘

’’تمہارے والد کا نام مسعود احمد ہے نا؟‘‘

’’جی......!‘‘

’’بزرگوں میں کوئی حیات ہے۔‘‘

’’جی...... میرے چچا محمود احمد ہیں۔ والد صاحب کے ماموں ریاض احمد ہیں میری والدہ، پھوپی...... سب موجود ہیں۔‘‘

’’ماشا اللہ کافی ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سن سینتالیس سے قبل ہندوستان میں آباد ہوں گے۔‘‘

’’جی بالکل......!‘‘

’’ماضی کی باتیں دہراتے ہوں گے۔‘‘

’’ہاں جب سب اکٹھا ہو جاتے ہیں تب۔‘‘

’’کوئی ایسا واقعہ جو تمہیں عجیب لگا ہو۔‘‘

’’جو لوگ ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے وہ تقریباً اب دنیا سے جا چکے ہیں جو حیات ہیں ان کے لیے وہ بھیانک ماضی آج بھی خوفناک یادوں سے بھرا ہوا ہے، اس لئے وہ دہرانے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کوئی عجیب بات نہیں سنی۔‘‘

’’ہوں، اور کوئی ایسی بات جو تمہارے لیے حیرت ناک ہو۔‘‘

’’شدید۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’گزری رات میرے ساتھ مزید واقعات پیش آئے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا؟‘‘ احمد علی چونک پڑے اور میں نے انہیں مکڑی اور اس کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ کے بارے میں پوری تفصیل بتائی۔

احمد علی کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ’’بھوریا چرن۔ شنکھا، کھنڈولا۔ اوہ میرے مالک۔ ہماری حفاظت فرما۔‘‘

’’یہ نام کیسے ہیں محترم؟‘‘

’’نہ جاننے والوں کے لیے بے معنی ہیں لیکن اس قدر بھیانک کہ الامان الحفیظ۔ ملت اسلامی صرف دشمن سیاست کا شکار ہی نہیں ہے بلکہ دین کے دشمن بھی آج تک اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایک کھنڈولا ملت اسلام کے لیے ایٹم بم سے زیادہ خوفناک ہے۔ تمہارے پاس ایک تعویذ ہے۔‘‘

’’جی......!‘‘

’’اس وقت وہ تعویذ تمہارے پاس تھا جب وہ ملعون مکڑا تم سے محوِ گفتگو تھا۔‘‘

’’جی۔ جی نہیں۔‘‘ میں نے شرمندگی سے کہا۔

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میں اسے گھر بھول گیا تھا۔‘‘

’’ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ تمہارے والد سے اس کی لاگ ڈانٹ تھی اور جو کام انہوں نے نہیں کیا وہ تم کرو گے۔‘‘

’’جی۔ اس نے یہی کہا تھا۔‘‘

’’اس نے تمہیں لالچ بھی دیا تھا۔‘‘

’’جی!‘‘

’’بڑی تشویش کی بات ہے۔ میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں بیٹے جس قدر بھی مشکلات پیش آئیں۔ اللہ والوں کو مت بھولنا۔ ان سے رہنمائی کی درخواست کرنا۔‘‘

’’یہ بھوریا چرن، پدما، شنکھا، کھنڈولا۔ آخر کیا بلا ہیں۔‘‘

’’یہ کالے جادو کے مختلف مدارج ہیں، ان مدارج میں ساحرانہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شیطانی قوتوں کی کارفرمائی ہے۔ وہ اگر کہتا ہے کہ کھنڈولا بن کر وہ زبردست قوت حاصل کرے گا تو اس میں کچھ فیصد حقیقت ہے کیونکہ کالے جادو کے شکار بے شمار افراد نظر آتے ہیں۔‘‘

’’لیکن کیا کوئی کالے جادو کا ماہر دوسرا جنم لے سکتا ہے۔‘‘

’’ہرگز نہیں۔ ہمارے مذہب میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہم صرف روزِ قیامت نئی زندگی کا عقیدہ رکھتے ہیں البتہ شیطانی قوتوں کو شیطان کا سہارا حاصل ہے، شنکھا اور کھنڈولا وغیرہ جادو کے زور سے ممکن ہے عارضی طور پر طویل زندگی حاصل کر لیتے ہوں اور مصنوعی موت کے بعد دوبارہ اپنے مکروہ عمل جاری رکھنے کے قابل ہو جاتے ہوں۔ اصل میں روح کے پجاری ہندومت کے پیروکار ہیں، ان کے عقیدے کے مطابق جسدِ خاکی تو مر کر نذرِ آتش ہو جاتا ہے اور راکھ بن کر اڑ جاتا ہے یا مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے مگر اس کی روح (آتما) واپس پلٹ آتی ہے اور اس کے ذریعہ ایک نیا قالب وجود میں آتا ہے۔ جو پودا، درخت، پتھر، چرند پرند، کیڑا یا خونخوار درندہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو آواگون کہا جاتا ہے اور یہ سب کچھ ’’کرم‘‘ کے مطابق ہوتا ہے۔ مگر کالے جادو کے عمل میں اس کی شکل بدل جاتی ہے جیسے تم کسی پیلی مکڑی کا تذکرہ کرتے ہو جو ابھی اپنی نئی تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہے اور سات خاص مسلمانوں کے خون پی کر یہ عمل کرنا چاہتی ہے تاکہ کالے جادو کے آخری ستون کھنڈولا کی قوت حاصل کر سکے۔‘‘

احمد علی کی بیان کردہ تفصیلات نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

’’کیا اس سائنسی دور میں ایسی باتوں پر یقین کیا جا سکتا ہے۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’سائنس......‘‘ احمد علی نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ’’بس ایک بات کہہ سکتا ہوں کہ معبود کریم نے انسان کو ازل سے زندگی کے راستے سمجھائے ہیں اور اس کے لیے اسے ذہن اور سوچ دی ہے سب کچھ اسی سے عمل میں آیا ہے۔ ہاں جہاں اس نے اپنے راز راز رکھے ہیں وہاں سائنس ان رازوں کو کائنات کے آخری دن بھی حل نہیں کر پائے گی۔‘‘

’’جی!‘‘ میں نے عقیدت سے کہا پھر ہنس کر بولا۔ ’’میں بھی پائل ہوں۔‘‘

’’وہ تمہیں ضمانت دے چکا ہے لیکن میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں وہ تعویذ ایک بزرگ کا عطیہ کردہ ہے جو انہوں نے میرے تحفظ کے لیے دیا تھا، اسے احتیاط سے رکھنا۔‘‘

’’جی!‘‘ میں نے کہا۔

’’اور جس طرح بھی ممکن ہے، اپنے والد کے بارے میں اپنے بزرگوں، اپنی والدہ یا کسی ایسے شخص سے جن کا تذکرہ تم کر چکے ہو، معلوم کرنا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس خبیث روح سے ان کا کیا تعلق رہا ہے اور اب وہ شیطان تم سے کیا چاہتا ہے جیسا کہ اس کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ جو کام تیرے پتا نے نہیں کیا، وہ تو کرے گا، وہ کام کیا تھا، ممکن ہے کسی کو معلوم ہو۔‘‘

’’میں پوری کوشش کروں گا معلوم کرنے کی۔‘‘

’’اس کے علاوہ اپنی والدہ سے کہو وہ تمہارا صدقہ دیں۔ کالے جادو کا ایک طاقتور حصہ شنکھا ہے۔ اس کی تشکیل کا عمل روک دوں گا۔ اسے ساتواں پائل نہیں ملے گا۔‘‘

’’میرے لیے کیا حکم ہے۔‘‘

’’بس صدقہ دو...... اور جیسا میں نے کہا ہے کسی اللہ والے سے اپنے والد کے ماضی کے بارے میں معلوم کرو۔ میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔‘‘ احمد علی نے جواب دیا۔

پھر میں ان سے اجازت لے کر واپس چل پڑا۔ میرا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی بلا وجہ اُلجھنیں پیدا ہو گئیں۔ بس دل کو ایک بے نام سے احساس نے گھیر لیا تھا۔

یہ بھی سوچتا رہا کہ والد صاحب کے ماضی کے بارے میں کس سے پوچھوں۔ ان کے انتقال کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد بس یہ پتا چلا تھا ان لوگوں کے بارے میں کہ محمود چچا جو پہلے بیرون ملک تھے اب کراچی میں موجود تھے، تقسیم کے وقت ہمارے پورے خاندان کو انہوں نے سنبھال لیا تھا اور کسی تکلیف کا شکار نہ ہونے دیا تھا۔ بس اس کے بعد والد صاحب نے چچا کے کاروبار کو سنبھال لیا تھا اور ہم نے پُرعیش زندگی گزاری تھی۔ والد صاحب کا ماضی کیا تھا یہ کبھی میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ والدہ صاحبہ اللہ میاں کی گائے تھیں، بیحد کم گو...... صرف ضرورت کی بات کرتی تھیں۔ دونوں بھابھیاں نیک فطرت کی مالک تھیں۔ خوش گو، خوش مزاج، انہیں کسی الجھن میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شام کو البتہ ایک پریشانی ہو گئی۔ مجھے احمد علی کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ تعویذ ضرور اپنے پاس رکھنا۔ اسپتال جانے سے پہلے میں نے تعویذ کو اپنے لباس میں رکھنے کے لیے وہ کوٹ تلاش کیا جس کی جیب میں تعویذ تھا لیکن کوٹ میرے وارڈ روب میں نہیں تھا۔ پہلے میں نے اسے تلاش کیا۔

پھر والدہ صاحبہ سے پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا۔ ’’وہیں ہینگر میں تھا۔ مجھے نہیں معلوم۔‘‘

اس کے بعد سارے گھر میں کوٹ تلاش کر لیا گیا، ساری معلومات حاصل کر لی گئیں کہ کہیں وہ ڈرائی کلین کے لیے تو نہیں دے دیا گیا لیکن کوئی نشان نہیں ملا۔ کوٹ غائب تھا تعویذ کے بارے میں کس سے پوچھتا لیکن ایک خیال نے دل میں جگہ بنالی۔ کوٹ بلا وجہ نہیں غائب ہوا۔

کچھ پراسرار قوتوں نے وہ تعویذ مجھ سے دور کیا ہے۔ مگر کیوں...... کیا مجھے نقصان پہنچنے والا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت تھی کہ جو واقعات پیش آئے تھے وہ معمولی یا وہم نہیں تھے۔ احمد علی نے اپنے علم کے مطابق بہت تفصیل بتائی تھی، ویسے بھی میں کالے جادو کے بہت سے عمل دیکھ اور سن چکا تھا۔ سڑکوں پر بے شمار کالے جادو کے ماہروں کے کاروبار بکھرے ہوئے تھے۔ اخباروں میں ان کے اشتہارات چھپتے تھے۔ کچھ تو ہوگا۔ کالے جادو کے توڑ کے دعوے بھی نظر آتے ہیں لیکن پہلے کبھی ایسا کوئی عمل نہیں دیکھا تھا۔

غرض کہ تعویذ کے ساتھ کوٹ بھی گیا تھا۔ کوٹ غالباً اس لیے گم ہوا تھا کہ کالی ناپاک قوتیں اس پاک تعویذ کو ہاتھ نہیں لگا سکتی ہوں گی۔

اسپتال میں رات کی ڈیوٹی بڑی بیزار کن ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اب ہلکا سا خوف کا احساس بھی شامل ہو گیا تھا۔ اب جب حالات سے آگاہی ہوئی تھی تو سب کچھ عجیب محسوس ہونے لگا تھا اس دن ڈاکٹر سائرہ کا واقعہ۔ وہ کون تھا جو سائرہ کے روپ میں آیا تھا اور بلی کے مردہ بدن میں داخل ہو کر بھاگ گیا تھا۔

اس بار پھر سائرہ کی ڈیوٹی میرے ساتھ لگی تھی۔ آج میں اس سنسان کوریڈور میں نہیں آیا تھا جو میری پسندیدہ جگہ تھی اور جس کے باہر تاریک رات بکھری ہوتی تھی۔

کوئی خاص کام نہیں تھا، ایمرجنسی میں بھی حالات نارمل تھے۔ ڈیوٹی روم میں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر سائرہ میرے پاس آ گئی۔

’’جناب کامران صاحب، خیریت، کوئی کام نہیں ہے۔ پھر بھی آپ یہاں نظر آ رہے ہیں۔‘‘ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اس نے عادت کے مطابق کہا۔ ’’حالانکہ کوریڈور ہمیشہ آپ کے دم سے آباد رہتا ہے اور سب کا خیال ہے کہ اس کوریڈور سے آپ کا لگاؤ بلا وجہ نہیں ہے۔ کوئی بھولی بسری یاد اس سے ضرور وابستہ ہے۔‘‘

’’خیریت ڈاکٹر سائرہ، آج خلافِ توقع آپ کچھ رومینٹک ہو رہی ہیں۔‘‘ میں نے خوشدلی سے کہا۔

’’وہ تو میں ہمیشہ سے ہوں۔ آپ نے غور نہیں کیا یہ الگ بات ہے۔‘‘ ڈاکٹر سائرہ نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔ ’’کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں کیوں!‘‘

’’مجھے بھی فرصت ہے آپ وہاں جا کر بیٹھیں، میں نیاز خان سے کافی کے لیے کہہ کر آتی ہوں۔ اوکے۔‘‘ اس نے اپنی عادت کے مطابق کہا اور آگے بڑھ گئی۔ جیسے مجھے اس کی بات ضرور ماننی ہے۔

میں ایک گہری سانس لے کر کوریڈور کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا حالانکہ بلی کے واقعے کے بعد مجھے اس جگہ سے کسی قدر خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہاں بیٹھا تو پھر گزرے واقعات یاد آنے لگے۔ اس ستون کی طرف نگاہ اٹھ گئی جہاں مکڑا نظر آیا تھا اور انسانوں کی طرح بولا تھا۔

بدن میں ہونے والی سنسنی کو نہیں روک سکا تھا۔ بیٹھتے ہی محسوس ہوا تھا جیسے ایک انوکھی ٹھنڈک بدن میں سرایت کر رہی ہے۔ باہر پچھلی رات میں کچھ سائے سے چلتے نظر آ رہے تھے جیسے کوئی ادھر سے اُدھر جا رہا ہو۔ دل چاہا کہ اٹھ کر ڈیوٹی روم کی طرف دوڑ لگا دوں۔ سائرہ آتی نظر آئی تو جان میں جان آئی اور میں انتظار کرنے لگا۔

سائرہ قریب آ کر بیٹھ گئی پھر مسکرا کر بولی۔ ’’آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی ہے کامران جی۔‘‘

’’نہیں، بالکل نہیں۔‘‘

’’مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ پھر آپ رومینس کے بارے میں کیا جانتے ہوں گے۔ میرا مطلب ہے آپ نے کہا تھا کہ میں رومینٹک ہو رہی ہوں۔ آپ کو کیسے پتا چلا۔‘‘

’’غیر شعوری طور پر کہہ دیا تھا، معافی چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور ڈاکٹر سائرہ کو جیسے میرے الفاظ سن کر مایوسی ہوئی۔ میں نے دوسری طرف دیکھا۔ کینٹین کا ویٹر کافی کے برتن لے کر آ رہا تھا، یہ نیاز خان نہیں تھا۔

’’یہ کون ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نیا ویٹر ہے۔ نیاز خان آج کل دن کی ڈیوٹی پر ہے۔‘‘ سائرہ نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

ویٹر نے قریب آ کر برتن رکھے اور پھٹی پھٹی آواز میں بولا۔ ’’آپ کو ڈاکٹر ارسلان ایمرجنسی میں بلا رہے ہیں ڈاکٹرنی صاحبہ۔‘‘

’’ایں۔‘‘ سائرہ چونک پڑی۔ پھر جلدی سے کھڑی ہو کر بولی۔ ’’سوری کامران صاحب آپ کافی لیں، پتا نہیں مجھے کتنی دیر لگے۔‘‘ یہ کہہ کر ڈاکٹر سائرہ اس طرف چل پڑی، جدھر ایمرجنسی کا راستہ تھا۔

میں نے گہری سانس لی پھر کافی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کافی پاٹ پر ٹی کوزی چڑھی ہوئی تھی۔ پیالی کا گرم پانی میں نے دوسرے برتن میں ڈالا اور پھر ویٹر سے بولا۔ ’’ٹھیک ہے تم جاؤ۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے ٹی کوزی ہٹائی اور کپ میں کافی انڈیلی لیکن شدید بدبو کا ایسا بھپکا ناک سے ٹکرایا کہ چکر آ گیا۔

کافی کی کیتلی سے کالے بدبودار خون کی موٹی دھار نکل کر پیالی بھر رہی تھی۔ یہ بدبو اسی سے اٹھ رہی تھی۔ بمشکل تمام میں نے کیتلی رکھی۔ میرے اعضا مفلوج ہو گئے تھے۔ اٹھنے کی کوشش کرتا تو اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

تبھی پاس کھڑے ویٹر کی آواز ابھری۔ ’’بھوریا چرن ہے ہمرا نام میاں جی۔ سنسار میں کالے گیان کے سب سے بڑے دھرم کاری ہیں۔ کالی کے داس، تم سے باتیں کرنی ہیں اس لیے آئے رہین تو ہار پاس۔‘‘

میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب میرا بدن میرا نہیں رہا تھا۔ میں نے بے بسی سے اسے دیکھا، میری بینائی متاثر ہوئی تھی یا اس کا چہرہ ہی کہر میں لپٹ گیا تھا۔ اس کے نقوش دھندلا گئے تھے، میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

اس کی آواز پھر ابھری۔ ’’سہارن پور میں تمہارا باپ دولت کمانے کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا، ہمیں مل گیا۔ ہم نے اس سے کہا مسعود بھیا ہم سے سودا کر لے۔ ایک چھوٹا سا کام ہمار کر دے ہم تجھے دولت کے ڈھیر میں دبا دیں گے۔ اتنا مال دیں گے کہ تو ہندوستان کا سب سے بڑا رئیس بن جائے گا۔ مان لیا اس نے، پر جب ہمار کام کرنے گیا تو نیت بدل گئی۔ اس نے ہمارا کام نہ کیا۔ ہماری تو جان جل کر رہ گئی۔ وہ لوگ جو ہمیں کھنڈولا دیکھنا نہیں چاہتے تھے، اس کے ساتھ لگ گئے اور ہمار ایک جنم نشٹ بھشٹ کر دیا۔ ارے کون سا بڑا کام تھا۔ پیر پھگوا کے دوار ہمیں پہنچا دینا تھا اور بس...... سب ٹھیک ہو جاتا۔ پر ہائے ہائے۔ نا ہی مانی ہمری بات۔ بس پھر وہ رہا اور ہم۔ بیچ وارے او کا بھڑکاتے رہے اور ہم دونوں کا ناس ہو گیا تھا۔ بات یہاں تک آ گئی۔ دیکھ بالک ہم کھنڈولا تو بنیں گے جرور۔ آج نہیں کل۔ ہم تو اتنا جانت کہ پرم تیواری نے تہارا جنم بھی ہمارے ساتھ میں کرائی ہے۔ تو ہار باپ چل بسا۔ ہمارا کام ادھورا رہ گیا۔ سن بٹوا۔ سنسار کا حال عقل کی آنکھ سے دیکھ، سب ایک دوسرے کا گلا کاٹ کے جی رہے ہیں تو بھی اسی سنسار کا باسی ہے۔ اپنے لیے سوچ، خوش رہے گا۔ ہم تجھ سے ایک سودا کرنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر ہے نا۔ لوگن کا علاج کرے ہے اگر ہم تیری مدد کریں اور تو سب سے بڑا ڈاکٹر بن جائے تو کیسا رہے۔ بول ای کری ہے پہلے ہم اپنا وچن پورا کریں گے۔ پھر تو ہمارا کام کر دینا۔ بول کرتا ہے سودا، سارے کام ہم کریں گے بعد میں تو ہمار کام کر دینا۔ ہم تو کھنڈولا بن ہی جائیں گے کسی نہ کسی طرح، ابھی ہمار جنم پورا نہیں ہوا ہے۔ ادھار کے شریر لیے پھرے ہیں۔ ایک پائل اور مل جائے تو اپنے شریر میں آ جائیں گے۔ اس کے بعد ہماری تیری دوستی چلے گی۔ اپنا شریر اپنا ہی ہووے ہے۔ اس دن تو رے سامنے پہلے تہاری ڈاکٹرنی کا روپ دھارن کیا، پھر بلی کے روپ ماویاں سے بھاگے تو سسرا ایک کتا پیچھے لگ گیا اور زخمی ہونے سے بچے۔ اب ای تہار نوکر وا ہاتھ لگی ہے اصلی نوکر وا ایک کونے ما بے ہوس پڑا ہے۔ ہم جائیں گے تو وہ ہوس ما آ جائے گا۔ چلیں ہیں پر تیرے من ماں کوئی بات آئے تو ہم سے پوچھ لینا، جواب دیں گے، جات ہیں۔‘‘

وہ چراغ کی طرح بجھ گیا اور میں آنکھیں پھاڑتا رہ گیا۔ بہت سے سوالات ذہن میں آ رہے تھے مگر اس کے سامنے زبان ہی نہیں کھل سکی۔ ایک اور حیرت ناک عمل ہوا۔ کافی کے برتنوں سے اٹھنے والی بدبو ایک دم کافور ہو گئی اور اس کی جگہ سوندھی سوندھی کافی کی خوشبو مہکنے لگی لیکن جو کچھ میں نے دیکھا تھا اس کے بعد یہ کافی میرے لیے حرام ہو گئی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ بری طرح سنسنا رہا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، تبھی ایک آواز قریب سے ابھری اور میں اچھل پڑا۔

’’خیریت ڈاکٹر کامران؟‘‘ آواز ڈاکٹر سائرہ کی تھی جس کے آنے کا مجھے پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ ’’آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟‘‘

میں نے بے یقینی کے سے انداز میں سائرہ کو دیکھا۔ وہ سائرہ ہے بھی یا نہیں۔ سائرہ بولی۔ ’’ڈاکٹر کامران؟‘‘

’’ہوں...... سوری ڈاکٹر سائرہ بس...... شاید نیند آ گئی تھی۔‘‘ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

’’کافی تو برف ہو گئی۔ ایک بات بتاؤں۔‘‘

’’جی!‘‘

’’ڈاکٹر ارسلان تو آج آئے ہی نہیں۔ پتا نہیں کینٹین کے نئے ملازم نے جھوٹ کیوں بولا۔ دوسری کافی منگواؤں۔‘‘

’’نہیں...... آپ پلیز یہ کافی فوراً پھینک دیں۔ اس میں کوئی کیڑا پڑا ہوا تھا۔ شاید مکڑی۔‘‘

’’او مائی گاڈ۔‘‘ ڈاکٹر سائرہ نے منہ بنا کر کہا۔

’’پھینک میں اسے خود دیتا۔‘‘ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو سائرہ جلدی سے اٹھ گئی اس نے کافی پھینک دی۔

’’منگواؤں، پئیں گے؟‘‘ سائرہ نے پوچھا۔

’’نہیں، میری طبیعت میں کافی سے مکڑی نکلتے دیکھ کر ہی تکدر پیدا ہوا ہے۔‘‘ میں نے کہا اور سائرہ خاموش ہو گئی۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ گھر واپس آ گیا۔ دل و دماغ پر شدید بوجھ تھا۔ بھوریا چرن کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد آ رہا تھا، یہ حقیقت تھی کہ میں اپنے باپ کا ہمشکل تھا لیکن اس کا دوسرا پہلو بہت عجیب تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ احمد علی کے پاس جا کر انہیں حال دل سناؤں۔ انہیں بتاؤں کہ اس ناپاک وجود نے بڑی تفصیل سے مجھ سے بات کی ہے اور مجھے میرے باپ کے بارے میں بتایا ہے۔

دل چاہا کہ والدہ صاحبہ سے بھی پوچھوں کہ ہندوستان میں کیا ہوا تھا۔ مگر وہ اس قدر سیدھی سادی خاتون تھیں کہ کوئی تسلی بخش بات نہیں بتا سکتی تھیں۔ آخر کار تیاریاں کر کے لانڈھی چل پڑا۔ بھوریا چرن سے ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ ذہن میں گونج رہا تھا۔

لانڈھی کا طویل فاصلہ طے کر کے مسجد نور پہنچا لیکن مسجد کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر نہ جانے دل کو کیوں عجیب سا احساس ہوا تھا۔ میں نے کار چائے خانے کے پاس روکی اور نیچے اتر آیا۔ چائے خانے کے ایک بیرے کو روک کر میں نے پوچھا۔ ’’کیا ہوا ادھر، خیر تو ہے۔‘‘

’’ہاں جی۔ مولوی احمد علی فوت ہو گئے ہیں۔‘‘ بیرے نے افسردگی سے کہا۔ اور میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی۔ ناقابلِ یقین بات تھی۔ احمد علی کی صحت بہت اچھی تھی۔ بمشکل میں نے بیرے سے پوچھا۔ ’’کیسے...... کیا ہو گیا تھا انہیں؟‘‘

’’بس جی۔ مسجد کے حجرے میں اکڑے ہوئے ملے تھے۔ موت کے ہزار طریقے ہیں صاب جی۔ جیسے بھی آئے۔‘‘

رات کو کسی وقت انتقال ہوا تھا، اس وقت نماز جنازہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں ان کی تدفین میں شریک ہوا۔ بڑی عجیب کیفیت ہو رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت قریبی عزیز رخصت ہو گیا ہو۔ گھر واپس آیا تو کافی نڈھال تھا۔

اسپتال فون کر دیا کہ آج نہیں آؤں گا۔ کچھ مصروفیت ہے۔ رات کو ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اتفاق سے شمسہ پھوپھی آ گئیں وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا دل مچل گیا۔

اپنے کمرے میں لے جا کر میں نے پھوپھی سے کہا۔ ’’مجھے ابو کے ماضی کے بارے میں بتائیے پھوپی جان۔ بہت ضروری ہے یہ۔‘‘

’’خیر تو ہے۔ اصل میں پاکستان آنے کے بعد بھائی جان نے ہم سب سے کہا تھا کہ ماضی ہندوستان میں گم ہو گیا ہے۔ پیارا وطن پیارا پاکستان، اب یہی ہمارا ماضی، حال، مستقبل ہے۔‘‘ شمسہ پھوپھی نے کہا۔

’’براہ کرم۔ مجھے بتائیے۔‘‘

’’ہم سہارن پور میں رہتے تھے۔ ابو کاروبار کرتے تھے، اچھی زندگی گزر رہی تھی کہ بھیا کو ایک ہندو سادھو ملا جس کا نام بھوریا چرن تھا۔ اس نے مسعود بھیا کو سبز باغ دکھائے کہ وہ انہیں کروڑ پتی بنا دے گا، وہ ایک جادو کا پتلا ایک بڑے بزرگ پیر پھاگن کے مزار پر پہنچا دے۔ اللہ نے بھیا کے دل میں ایمان جگا دیا، انہوں نے مزار کی بے حرمتی کرنے سے انکار کر دیا۔ بھوریا چرن جو مکڑی بن جاتا تھا، بھیا کا جانی دشمن بن گیا، اس نے جادو کے زور سے ہمیں تباہ و برباد کر دیا۔ بھیا کو پھانسی کی سزا ہو گئی مگر وہ بچ گئے لیکن بہت برے حال ہو گئے۔ محمود بھائی، ماموں ریاض اور جتنے تھے سب تباہ ہو گئے بڑی مصیبتیں اٹھائیں سب نے۔ مگر بھیا نے ایمان ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ برسوں حالات خراب رہے۔ پھر اللہ نے ان کے دن پھیرے، سب بچھڑے مل گئے تھے۔ بھیا نے سادھو کو جان سے مار دیا اور ہم سب اپنے پیارے پاکستان آ گئے۔ یہاں محمود بھائی مل گئے اور انہوں نے ہم سب کو سنبھال لیا۔ یہ ہے ہماری کہانی۔‘‘

بات سمجھ میں آ گئی۔ میں والد صاحب کا ہم شکل تھا اور جادوگر بھوریا چرن نہ جانے کس چیز کا ماہر بننا چاہتا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں بھی اس مزار کی بے حرمتی کرانا چاہتا تھا اپنے کسی مذموم مقصد کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں مسلمان تھا اور بزرگان دین کی بڑائی اور تقدس پر بھرپور ایمان رکھتا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ جس طرح والد صاحب نے اپنے ایمان کو قائم رکھ کر دنیاوی مفاد ٹھکرا دیا، اسی طرح میں بھی ان کی پیروی کروں گا۔ پھوپھی شمسہ نے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں جنہیں اپنے بستر پر لیٹ کر میں دیر تک سوچتا رہا۔ پھر نیند آ گئی۔

اپنی زندگی میں، میں نے ایک آدھ بار ہی خواب دیکھا تھا۔ آج میں نے خواب دیکھا۔ خواب میں، میں نے احمد علی کو دیکھا جو اسی جھونپڑا ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔

’’پہلے بھی ایسے بہت سے حالات سے واسطہ پڑا ہے جو بڑے مشکل تھے کافر جن جو بچیوں کو پریشان کرتے تھے، ان سے نبرد آزمائی رہی لیکن اللہ کے فضل سے محفوظ رہا۔ وہ تعویذ ایک بزرگ کامل کا عطیہ تھا جونہی وہ مجھ سے دور ہوا۔ ناپاک قوتیں مجھ پر حاوی ہو گئیں۔ بھوریا چرن کو خطرہ ہو گیا تھا کہ میں اس کے راستے روکنے کی کوشش کروں گا۔ مسجد سے باہر تنہا گلی میں مل گیا اور میرے دل کو مٹھی میں لے کر دبوچ لیا۔ بس کہانی ختم ہو گئی۔ ایک کام کرنا بیٹا۔ اس کے ارادے بڑے ناپاک ہیں۔ وہ میرے جسم خاکی کو قبر سے نکال کر اسے اپنے جادو کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ تمہارے کوٹ کو اس نے تعویذ سمیت غائب کر دیا ہے، تعویذ اسی کوٹ میں ہے۔ وہ تعویذ کو اپنے ناپاک ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا، اس لیے کوٹ غائب کر کے چوکھنڈی کے قبرستان میں ایک پیپل کے درخت کی شاخ میں لٹکا دیا ہے۔ تم اپنا کوٹ وہیں سے حاصل کر لو اور اس سے تعویذ نکال کر میری قبر کے سرہانے ایک فٹ کی گہرائی میں دفن کر دینا۔ مجھے غم ہے کہ مشکل وقت میں تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔‘‘

پتا نہیں خواب تھا یا حقیقت۔ اسی وقت آنکھ کھل گئی۔ دل بے چین ہو گیا۔ ویسے ہی احمد علی کی موت کا سخت افسوس تھا، ایک ایسی شخصیت مل گئی تھی جس سے میں خود کو پیش آنے والے انوکھے واقعات پر تبادلہ خیال کر سکتا تھا اور کون تھا جسے اس بارے میں بتاتا۔ وہی مسئلہ تھا لوگ جدت پسندی کے جنون میں روحانی حقائق کا مذاق اڑاتے ہیں جبکہ لمحہ لمحہ روحانیت کا وجود ملتا ہے اور اب اس کا گواہ میں تھا۔ شمسہ پھوپھی سے والد صاحب کے بارے میں بھی علم ہو گیا تھا جو ورثے میں ایک شیطان جادوگر چھوڑ گئے تھے۔

اس خواب کے بعد نیند آنکھوں سے اُڑ گئی، باقی رات جاگتا رہا، سوچتا رہا۔ کیا اس خواب میں سچائی ہے یا یہ بھی صرف ذہن کی اختراع ہے۔ چلو اس کا بھی تجزیہ ہو جائے گا۔ دن میں تو فرصت ہی ہے، ہاں یہ عمل کس طرح کرنا ہے اس کے بارے میں پروگرام بنانا ضروری ہے۔

دوسری صبح معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر تیاریاں کیں اور گاڑی نکال کر چل پڑا۔ بڑی دلچسپ چویشن تھی، ایک ایسے عمل میں مصروف ہو گیا تھا جس کے بارے میں زندگی بھر نہیں سوچا تھا۔ جادو ٹونوں کی کہانیاں، اخباروں اور ان میں چھپے اشتہاروں کے ذریعہ نگاہوں میں آ جاتی تھیں، جن پر ہنسی آتی تھی، لیکن اب خود اس سارے عمل سے گزر رہا تھا۔

چوکھنڈی کے قبرستان پہنچ گیا۔ کار پارک کی اور اتر کر پیپل کا وہ درخت تلاش کرنے لگا جس کی نشاندہی خواب میں کی گئی تھی۔

کافی دور نکل آیا اور پھر ایک طرف نگاہ اٹھ گئی۔ ایک چھوٹے سے چبوترے پر پیپل کا درخت نظر آ رہا تھا اور...... اس کی ایک شاخ پر میرا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔

پسینہ آ گیا۔ اس قدر حقیقتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا جو مجھے پیش آ رہی تھیں لیکن ان میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو ایمان کو متزلزل کر دے۔ ناپاک قوتیں شیطانی عمل ہوتی ہیں اور شیطان کے وجود کی مذہب تصدیق کرتا ہے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ پیپل کے اس درخت کے پاس پہنچا اور چبوترے پر چڑھ گیا۔ جو کوئی چار فٹ اونچا تھا لیکن فوراً ہی واپس نیچے کودنا پڑا۔ کیونکہ چبوترے پر ایک کالا ناگ پڑا نظر آ رہا تھا۔ میں چبوترے سے تھوڑا ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

بے حد بھیانک منظر تھا سنسان اور خاموش ٹوٹی پھوٹی بے شمار قبریں نظر آ رہی تھیں۔ پھر میں نے شاخ پر لٹکے کوٹ کا جائزہ لیا۔ شاخ زیادہ اونچی نہیں تھی اور میں کوٹ بہ آسانی اتار سکتا تھا لیکن وہ سانپ......!

ایک ترکیب سوجھی۔ ایک طرف پڑا ہوا کچی مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور تاک کر سانپ کو دے مارا لیکن سانپ میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

تب میں نے اسے غور سے دیکھا اور اندازہ ہو گیا کہ وہ مردہ ہے۔ میں دوبارہ چبوترے پر چڑھ گیا۔ سانپ واقعی مردہ تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک الو اور اس سے کچھ دور ایک چیل بھی مردہ پڑی تھی۔

میں انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سرسراہٹ اُبھری جو میرے بالکل قریب تھی۔ میں اچھل پڑا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ سرسراہٹ بہت واضح تھی۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 4

میں نے بڑی مشکل سے رخ بدل کر اس سرسراہٹ کا راز جاننے کی کوشش کی تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ کالا ناگ جسے میں نے مردہ سمجھا تھا، اس وقت پھن کاڑھے کھڑا تھا۔ میرا اس سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ ایک لمحے میں وہ مجھ پر وار کر سکتا تھا۔

اور یہی ہوا۔ اچانک سانپ نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کے منہ سے زبردست پھنکار نکلی۔ میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سانپ رخ بدل کر میرے سامنے آ گیا۔ اس کی ننھی ننھی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے دوبارہ اپنی جگہ بدلی اور مجھے پھر اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ خطرہ تھا کہ جیسے ہی میں نے پیٹھ موڑی، سانپ مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دے گا۔ جان بچانے کی ایک ہی ترکیب تھی کہ میں اس کے سامنے رہ کر اس کے حملے سے خود کو بچاؤں۔ سانپ جس انداز سے میرے سامنے آیا تھا اس کی وجہ سے میرے اور اس شاخ کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا جس پر میرا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ سانپ کوٹ تک پہنچنے کا راستہ روک رہا ہے، اب کیا کروں۔

ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اچانک چبوترے کے نیچے سے کسی جانور نے چھلانگ لگائی اور چبوترے پر چڑھ آیا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ چند لمحے تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا جانور ہے، لیکن پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نیولا تھا جس نے اوپر آتے ہی اچھل کر سانپ پر حملہ کر دیا تھا۔

سانپ بے چین ہو گیا۔ پہلے اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں لیکن اب اس کا رخ نیولے کی طرف ہو گیا تھا۔ اس نے نیولے پر پھن مارا لیکن نیولے نے آسانی سے اس کا وار خالی دے دیا اور سانپ کے جسم پر حملہ کیا۔

سانپ نے بلبلا کر رخ بدلا اور دوبارہ نیولے پر حملہ کیا۔ لیکن نیولا اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا تھا۔ وہ آسانی سے اس کے وار بچا رہا تھا اور ساتھ ہی موقع ملتے ہی سانپ کے جسم پر حملے بھی کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ سانپ کا پھن پکڑ لے۔ صاف لگ رہا تھا کہ سانپ خوفزدہ ہو گیا ہے۔ اور پھر سانپ نے ہمت ہار دی۔ وہ پھن ڈال کر بری طرح بھاگا اور چبوترے سے نیچے اتر گیا۔ نیولا بھی اس کے پیچھے دوڑ گیا تھا۔

دونوں غائب ہو گئے تو میری جان میں جان آئی۔ چند لمحوں کے لیے تو میں یہاں اپنی آمد کا مقصد ہی بھول گیا تھا۔ جب وہ دونوں نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو میرے حواس جاگے اور مجھے اپنی یہاں آمد کا مقصد یاد آ گیا۔ پہلے دل چاہا کہ جہاں سے وہ دونوں نیچے گئے تھے وہاں جا کر دیکھوں کہ نیولے نے سانپ کا تیا پانچہ کیا یا نہیں، لیکن پھر خود کو سنبھال لیا۔ کیا فضول سوچ رہا ہوں۔ اپنا کام کروں اور یہاں سے بھاگوں۔

نئی ہمت کے ساتھ آگے بڑھا اور شاخ کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے صاف لگ رہا تھا جیسے نامعلوم ہوائیں مجھے ہاتھ بڑھانے سے روک رہی ہوں۔ یہ پراسرار قوتیں چیخ رہی ہوں کہ میں کوٹ نہ اتاروں۔ لیکن میں نے آگے بڑھ کر شاخ پر ہاتھ ڈالا اور مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اس اونچی شاخ کو نیچے جھکا دیا ہو تاکہ میں آسانی سے کوٹ اتار لوں۔ اور میں نے کوٹ شاخ سے اتار لیا۔

ایک عجیب سا احساس میرے رگ و پے میں اتر گیا۔ جیسے خوشی ہوئی ہو لیکن پھر کچھ اور بھی ہوا۔ مردہ سانپ کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ وہ اصل میں مردہ نہیں تھا، لیکن جونہی کوٹ میرے ہاتھ آیا اچانک زمین پر مردہ پڑا ہوا الو پھڑ پھڑایا اور پھر اس نے کریہہ چیخ ماری اور ایک دم اڑ کر پیپل کی ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ یہی عمل چیل نے بھی کیا تھا۔ یہ تمام مناظر خوف سے دل کی حرکت بند کرنے والے تھے لیکن خود پر غور کرنے سے ایک نیا احساس اور ہوا تھا۔ وہ یہ کہ ان مافوق الفطرت واقعات نے خاص حوصلہ پیدا کیا ہے اور خوف کا وہ عمل اب نہیں رہا ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ گویا مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔

آغاز اس وقت سے ہوا تھا جب میں نے جاوید انصاری کے بازو کے نشان کو چھیڑا تھا۔ اس کے بعد جو انوکھے واقعات عمل میں آئے تھے، وہ ناقابل فراموش تھے اور میں ان کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ کوٹ کی جیب کی تلاشی لی تو تعویذ اس میں موجود تھا۔ کوٹ لے کر چبوترے سے نیچے کود آیا۔ اب نہ کہیں سانپ تھا، نہ نیولا۔ ہر طرف ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ میں کار کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

وسوسے انسان کی فطرت کا حصہ ہوتے ہیں۔ میں ہرچند کہ اب مضبوط ہو چکا تھا لیکن پھر بھی دھڑکا لگا تھا کہیں کار کے اندر کوئی خطرہ نہ ہو۔ کوئی اور حرکت نہ ہو جائے بھوریا چرن کی طرف سے۔

کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ میرے علاوہ مسعود احمد، بھوریا چرن کا شکار ہو کر ساری زندگی مشکلات میں پھنسے رہے اور اب یہ عذاب مجھ پر آ پڑا تھا۔ لیکن مجھے کچھ تحفظ حاصل تھا۔ بھوریا چرن میرے پیچھے لگا ہوا ہے جن کے ثبوت جگہ جگہ مل رہے ہیں، لیکن کچھ مثبت قوتیں میری نگرانی کر رہی ہیں۔ کار کو احتیاط سے چلاتے ہوئے میں ان تمام باتوں کی ترتیب کرنے لگا۔

حال ہی کے واقعات لیے جائیں تو تعویذ کوٹ میں رکھا تھا کہ کوٹ غائب ہو گیا، اس لیے کہ بھوریا چرن کے ناپاک ہاتھ اسے چھو نہیں سکتے تھے۔ یہ تعویذ احمد علی کو ان کے مرشد نے دیا تھا تاکہ وہ بری روحوں سے محفوظ رہیں اور انہوں نے ازراہ مہربانی وہ مجھے دے دیا تھا، لیکن بے چارے ایک بری روح کا شکار ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ساتوں پائل بھوریا چرن کو نہیں دینے دیں گے۔ بھوریا چرن نے ان کا کام تمام کر دیا اور اب وہ یہ تعویذ اس لیے اپنے سرہانے دفن کرانا چاہتے تھے کہ بھوریا چرن اپنے کسی جادوئی عمل کے لیے ان کے مردہ جسم کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اوہ میرے خدا کیسی خوفناک کہانی ہے۔ انہوں نے میرے خواب میں آ کر کوٹ اور تعویذ تک رہنمائی کی۔ بھوریا چرن نے یہاں بھی مجھے تعویذ تک پہنچنے سے روکنے کے لیے کوشش کی۔ سانپ، الو اور چیل میرا راستہ روکنے کے لیے تھے، لیکن میری محافظ قوتوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ یہ یقیناً احمد علی کی روح کا کمال تھا۔

راستہ طے کرتے ہوئے میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا۔ پھر ایک دم خیال آیا کہ مجھے یہ تعویذ مرحوم احمد علی کی قبر کے سرہانے ایک فٹ کی گہرائی میں دفن کرنا ہے۔ ایک فٹ گہرا گڑھا کیسے کھودوں گا۔

ایک لمحے سوچا پھر کار میں رکھے ٹول بکس کا خیال آ گیا جسے آج تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس بات سے اطمینان ہوا اور میں لانڈھی پہنچ گیا۔ تدفین میں شریک ہوا تھا اس لیے قبر معلوم تھی۔

قبرستان کے احاطے میں کار روکی۔ ایک دکان سے پھول، اگربتیاں اور ماچس خریدی اور ٹول بکس سے لمبا پیچ کس لے کر اندر داخل ہو گیا۔ بڑا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

قبر پر پہنچ کر میں کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر قبر پر پھول ڈالے اور فاتحہ پڑھی اور احمد علی کی روح کو ایصال ثواب پہنچا کر اپنا کام کرنے قبر کے سرہانے بیٹھ گیا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پیچ کس نکال کر گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔

اس وقت اگر مجھے میرا کوئی شناسا دیکھ لیتا تو حیرت سے پاگل ہو جاتا کیونکہ میں کافی نفاست پسند شخص تھا اور ایک معزز پیشے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک بڑے اسپتال کا ڈاکٹر ایسے کام کر سکتا ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

گڑھا تیار ہو گیا اور میں نے تعویذ اس میں ڈال دیا۔ پھر گڑھے کی مٹی برابر کر کے میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کچھ لمحے رکا اور پھر واپس چل پڑا۔ ایک عجیب سی تھکن سوار ہو گئی تھی۔

گھر کے حالات معمول کے مطابق تھے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے اور یہ باتیں کسی کو بتانے کی بھی نہیں تھیں۔

رات کو معمول کے مطابق اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ رات کی ڈیوٹی میں زیادہ وقت فارغ ہی ہوتا تھا۔ معمول کے گشت، اس کے بعد آرام۔ کچھ ڈاکٹر سو بھی جاتے تھے لیکن مجھے اس کی عادت نہیں تھی۔

آج خاص طور سے میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر سائرہ کچھ کھنچی کھنچی سی ہے۔ وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن میں اس بات سے خوش تھا۔ البتہ جب میں ڈیوٹی روم میں بیٹھا تھا تو ایک دوسری نوجوان ڈاکٹر ثنا بیگ میرے پاس آ گئی۔

"کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر کامران؟" اس نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ ایک فائل دیکھ رہا تھا۔"

"کچھ گستاخی کر سکتی ہوں؟" ثنا نے کہا۔

"کیجیے۔" میں ترکی بہ ترکی بولا اور وہ ہنس پڑی۔

"اجازت کا شکریہ۔ ڈاکٹر سائرہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔"

"خیریت؟"

"اسے دل کی تکلیف ہو گئی ہے۔" ثنا نے کہا اور میں چونک پڑا۔

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"بلاؤں۔" ثنا بدستور شرارت سے بولی۔ اور میں اس کے انداز پر غور کرنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔ "آپ مذاق کر رہی ہیں یا سنجیدہ ہیں۔ سوری مجھے لگ رہا ہے جیسے!"

"اللہ ڈاکٹر کامران۔ آپ صرف ڈاکٹر ہیں یا انسان بھی ہیں۔ وہ بے چاری آپ کو حال دل سنا رہی تھی اور آپ نے کان بند کر رکھے تھے۔ آپ سے کچھ رومانس کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی اس کی اور آپ نے بے اعتنائی برتی تھی۔"

مجھے یاد آ گیا۔ اور پھر یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اسی دن سے ڈاکٹر سائرہ کچھ کھنچی کھنچی سی ہے، لیکن اس بات پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "کچھ شعبے ایسے ہوتے ہیں ڈاکٹر ثنا جو صرف کاروباری نہیں ہوتے بلکہ ان کا تعلق اہم انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ ہم اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ یہی ہمارا منصب ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم بھی عام لوگوں کی طرح صرف اپنے جذبات کی پذیرائی کریں۔"

"مجھے آپ سے اختلاف ہے ڈاکٹر کامران۔ بیشک ہماری ذمے داریاں مختلف ہیں لیکن ہم بھی ایسے گھر سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ہمارے پیار کے رشتے ہوتے ہیں اور ہم ان رشتوں سے انصاف کرتے ہیں!"

"ہاں ایسا ہے۔ لیکن....."

"چلیں چھوڑیں مجھے اندازہ ہو گیا۔"

"کیا؟"

"یہی کہ سائرہ آپ کے دل کی گہرائیوں کو نہیں چھو سکی۔"

"میرے دل کی گہرائیوں میں صرف ایک آرزو ہے ڈاکٹر ثنا.....وہ یہ کہ میں ایک بڑا ڈاکٹر بنوں۔"

"اچھی بات ہے۔" ثنا نے کہا اور بات ختم ہو گئی۔ ثنا کے جانے کے بعد میں عجیب سے احساس میں کھو گیا۔ کیا میری یہ خواہش پوری ہو گی۔ میں جس شیطانی جال میں پھنس گیا ہوں اس سے نکل سکوں گا۔ مجھ پر تو نا گہانی پڑی تھی۔ طبیعت پر ایک بوجھ سا آ پڑا اور میں مضمحل ہو گیا۔ اس گفتگو سے اور الجھ گیا تھا۔ ڈاکٹر سائرہ ہی کی بات نہیں تھی، مجھے تو زندگی کے اس رخ کی طرف آج تک رغبت نہیں ہوئی تھی۔ بھابھیاں بہت سے منصوبے بناتی تھیں میری شادی کے۔ میری پسند پوچھتی تھیں، لیکن میں انہیں ٹال دیتا تھا۔ بہت سے ایسے مواقع آئے جب لڑکیوں نے متاثر کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن میں نے کسی کی پذیرائی نہیں کی تھی۔

باہر گہری تاریک رات پھیلی ہوئی تھی۔ بے کراں سناٹا چیخ رہا تھا۔ ہرچند کہ کوریڈور کا وہ حصہ جو میری پسندیدہ جگہ تھی اب میرے لیے خوف کی علامت بن گئی تھی اور میں رات میں تنہا وہاں بیٹھنے سے گریز کرنے لگا تھا لیکن اس وقت وہیں بیٹھنے کو دل چاہا۔ اور میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

بہت سی سوچیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ باہر پھیلی تاریکی میں عجیب عجیب شکلیں نظر آنے لگیں لیکن وہ صرف احساس کے سائے تھے البتہ تھوڑی دیر کے بعد کوئی چھوٹی سی شے متحرک نظر آئی اور میں چونک پڑا۔ یہ میرے احساس کا سایہ نہیں تھا۔ وہ شے میری طرف آ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوریڈور کی چھت میں لگے بلب کی روشنی کی زد میں آ گئی اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ مونا تھی۔ میری پیاری بلی۔ اس نے چھلانگ لگائی اور کوریڈور کی چار فٹ اونچی دیوار پر چڑھ آئی۔

میں خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے منہ سے نکلا۔ "ارے مونا۔ کہاں چلی گئی تھی تُو۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھا تو وہ واپس نیچے کود گئی۔ میں کوریڈور کی دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "تُو زندہ ہے مونا۔ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ مجھ سے ڈر رہی ہے۔ اوپر آ۔"

تب میں نے غور سے مونا کو دیکھا اور اچانک میرے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ بلیوں کی آنکھیں رات میں چمکتی ہیں۔ میں نے کئی بار مونا کی آنکھیں بھی چمکتی دیکھی تھیں۔ وہ قدرتی بات تھی، لیکن اس کے چہرے پر پیار ہوتا تھا اور وہ سیدھی میری گود میں آ بیٹھتی تھی اور کھر کھر کرنے لگتی تھی۔ مونا کی آنکھیں اس وقت بھی چمک رہی تھیں لیکن ان کا رنگ گہرا سرخ تھا اور پتلیاں سیدھی کھڑی تھیں لیکن بس سبز رنگ کی لکیر جیسی۔ ان آنکھوں اور چہرے پر ایک خونخوار سی کیفیت نمایاں تھی۔

پھر اس کے منہ سے ایک کرخت آواز نکلی۔ "من تو چاہتا ہے رے کہ تیرا ٹینٹوا چبا لوں۔ کالی ماں کی سوگند۔ پر میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

آواز بھوریا چرن کی تھی۔ میرا بدن خوف سے منجمد ہو گیا تھا۔ وہ پھر بولا۔ "بات کر ہم سے چھورا۔ ہم تیرے بیری نہیں ہیں۔ بات کر ہم سے۔"

نہ جانے کہاں سے میرے اندر ہمت کی لہر سی اٹھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ میں نے کہا۔ "ہاں۔ بولو بھوریا چرن۔"

"آواز بھی تیری اپنے پتا جیسی ہے۔ ہم سے دشمنی نہ کر۔ کالی ماں کی سوگند ایسی تباہی پھیلائیں گے کہ تو سنبھالے نا سنبھال پائے گا۔"

"کھل کر بات کرو بھوریا چرن۔" میں واقعی اپنی ہمت پر خود حیران رہ گیا تھا۔

"بہت کام کھراب کر دئی۔ تہارے اس مولبی نے۔ پن اپنی جان کھو بیٹھا۔ تو کچھ ہم کہت رہیں اسے گور سے سنو۔ تم اپنا پتا کے راستے پر مت چلو۔ ہمیں کھنڈولا بننا ہے اور کالی ماں کو ردان سے ایسا کھوب کرے گا۔ پرتو نے اس مولبی کے کہنے پر گیل (راستہ) لمبی کرائی ہے۔ اس نے ہماری گیل کھوٹی کر دئی ہے۔ ارے ہم سنکھا بن جاتے تو تیرا کام سروع ہو جاتا۔"

"مجھے بتاؤ گے سنکھا کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بتا دیتے ہیں۔ ہم اوپر آئے رہن۔ ہمکا ہاتھ مت لگائی رہن۔ بیٹھ جا کرسی پر۔" وہ بولا۔

اور میں نے اس کی بات مان لی۔ میں پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

تب بھوریا چرن مونا بلی کے روپ میں اوپر آ گیا اور بلیوں کے مخصوص انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اب کچھ کم ہو گئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "سنکھا تو تھے ہم۔ کھنڈولے بن جاتے اگر تمہارا پتا ہمیں پھکو اور دوارا پہنچا دیتا۔ پر او نا ہیں مانا۔ اس نے ہمیں مار دیا اور ہماری سنکھا سکتی بھی چلی گئی۔ پر کالی کے گیان نے ہمیں نیا جیون دے دیا۔ کالے جادو کا گیان منش کو تین جنم دیتا ہے۔ اگر وہ سنکھا گیان پا لے تو اور ہم نے او گیان پا لئی ہے۔ تمہارے پتا نے ہمارا جیون چھین لیا پر ہمارا گیان مکتی چھیننا او کے بس کا بات ناتھی۔ ہم نے پھر سے جیون پا لیا ہے رے۔ پر سنکھا سکتی کی واپسی کے لیے ہمیں سات پائل منشوں کا کھون پینا جروری ہے۔ دو کا پی لئی تھا تو ٹیچ ما آ گیا اور ہمارا کام رک گیا۔ پر ایک فائدہ بھی ہوا۔ مسعود کا پریوار ہمارے سامنے آ گیا اور ہمکا ایک بار پھر امید بندھ گئی۔ پر ایک کام غلط ہو گئی رے۔ وہ مولبی تو کال گیا۔ اس نے ہمار کام کھراب کر دیا۔ اس نے اپنا جیون ہار دیا۔ ہم نے تو بدلہ تو لے لیا اس سے، پر مرتے مرتے اس نے ہمیں لوٹ لیا۔ ہمارے بیروں نے ہمیں چار پائل اور دے دیے پر مولبی نے ساتواں پائل روک دیا ہے۔ ہائے رے۔ سنکھا سکتی لے کر ہم تیرے ساتھ پھر کھنڈولے بننے کے کام سروع کر دیتے۔ پر او دھر دیر ہو گئی۔ سن رے۔ ہم آج نہیں تو کل اپنا کام کر لیں گے اور سنکھا بن جائیں گے۔ پر تو تیار ہو جا۔ متر بن جا ہمارا۔ دوستی کر لے ہم سے بھوانی ماں کی سوگند کچھ سے کچھ بنا دیں گے تجھے۔ جتنا جیون بتائے گا راجہ بن کر بتائے گا۔"

"ایک بات بتاؤ بھوریا چرن؟"

"پوچھ رے۔"

"تم احمد علی صاحب کی قبر پر بھی کچھ کرنا چاہتے تھے۔"

"ہاں رے۔ ان کی ہڈیاں نکال کر ہم منتر پڑھتے تو سنکھا بننے کا کام ہو سکتا تھا۔"

"پھر؟"

"تو نے ہمارے ساتھ دشمنی کر ڈالی۔"

"وہ کیسے؟"

"او تعویذ او کے سرہانے گاڑھ کے۔ اور اب وہ تعویذ بھی وہاں نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ارے او مولبی، بہت چالاک ہے۔ او نے او تعویذ نیچے ہی نیچے اپنی کبر ما گھسیٹ لیا رے۔ اور اب وہ اس کے سینے کے پاس رہے۔ ہم کسی مولبی اور مسلمان کی کبر نا ہیں کھود سکتے۔ ہم نے سوچا تھا کہ تو سے کہہ کر وہ تعویذ وہاں سے نکلوا لیں گے اور پھر بعد میں مولبی کی ہڈیاں نکال لیں گے۔"

"فرض کرو وہ تعویذ وہاں سے نکال لیا جاتا تو تم قبر کیسے کھودتے جبکہ تم کسی مسلمان کی قبر کھود نہیں سکتے۔"

"بات کرے ہے۔" بھوریا چرن کی آواز میں طنز پیدا ہو گیا۔ "ارے سب تیری طرح پاگل تو نا ہیں رہیں۔ تو نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ تیرے ہی دھرم والے کبریں کھود کھود کر چار پیسے ما مردوں کے کھمن، ان کے دل، جگر، پھیپھڑے، سوکھی ہوئی ہڈیاں بیچ دیویں ہیں۔ ای کونسا بڑا کام ہے۔ پر تو نے او تعویذ مولبی کے پاس پہنچا کے سب کام کھراب کر دئی رے۔ پر ٹھیک رہے۔ ہم بھی کالی ماں کے داس رہیں، مولبی کی ساری چالیں پھیل کر دیں گے۔ ایک پائل اور مل جائے پھر دیکھنا ہماری سکتی۔ مولبی بہت چالاک ہے۔ اس پر بھی وار کر دیے ہیں۔ دیکھتے ہیں او کتنی دور جائے گا۔ پر تو سے ایک بات کہیں۔"

"کہو!"

"ہم سنکھا سکتی پا لیں تو تُو ہمارا ساتھ دینا۔ کالی ماں کی سوگند تو کا سنسار ما اتنی عجت دلوا دئی رہیں کہ جیون بھر یاد رکھے گا۔ تو نے ایک بات کہی تھی اپنے گھر ما۔ یاد ہے؟"

"کیا؟"

"تو نے کہا تھا کہ تو بہت بڑا ڈاکٹر بننا چاہے ہے۔ چل ٹھیک ہے۔ ہم تو کا بہت بڑا ڈاکٹر بنائے دے رہیں۔ تو جیون کے مزے لے اور جب ہم سنکھا بن جائیں تو ہمیں پیر پھکو اکے دوار پہنچا کر ہماری سکتی پوری کر دے۔ اب جاوت رہیں، ہمیں ساتویں پائل کو تلاس کرنا ہے تو جیون کے مزے لے۔ اپنی کھوسی پوری کر۔"

بلی دیوار سے نیچے کود گئی اور پھر دوڑتی ہوئی تاریکی میں گم ہو گئی۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑتا رہا۔ اب وہاں کوئی تحریک نہیں تھی۔

سب بڑا حیرتناک تھا۔ ایک بلی انسانوں کی آواز میں بول رہی تھی۔ اس دوران کوئی آ جاتا تو کیا ہوتا۔ پورے اسپتال میں کھلبلی مچ جاتی۔ اس کے علاوہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ بے حد سنسنی خیز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ وہ میرے ذہن سے کس قدر قریب تھا۔ خدا کی پناہ۔ کیسا بھیانک کھیل چل رہا تھا۔ وہ مجھ سے ایک غیر ایمانی عمل چاہتا تھا جو میرے والد صاحب نے اس کے لیے نہیں کیا تھا اور اس کے لیے اس نے مجھے بہت بڑا ڈاکٹر بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے احمد علی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ کتنا سنسنی خیز تھا۔ احمد علی نے میرے خواب میں آ کر مجھ سے تعویذ لانے کی فرمائش کی تھی اور اس کے بعد انہوں نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا تھا۔

زندگی کے شب و روز گزرتے رہے۔ جب سے جاوید انصاری کا کیس ہوا تھا اس کے بعد سے کوئی نہ کوئی واقعہ مسلسل ہو رہا تھا لیکن یہ چند روز پُرسکون گزرے تھے۔ جس پر مجھے حیرت تھی۔

اس دن ایک نوجوان لڑکی کو اسپتال لایا گیا جس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ کافی پیاری شکل و صورت کی مالک تھی، جسے دیکھ کر پیار آتا تھا، لیکن اس کی حالت بہت خراب تھی۔ یہ ایک بڑے صنعتکار کی بہو تھی۔ بہت سے لوگ اس کے ساتھ آئے تھے جن میں اس لڑکی کا شوہر بھی تھا۔ بیچارہ بیوی کے غم میں نڈھال تھا۔

"ایک سال سے ہم شدید پریشانی کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر رضوان۔ ملک کے بڑے بڑے ڈاکٹر اس بچی کا علاج کر چکے ہیں تین مہینے پہلے ہم اسے لندن لے گئے تھے وہاں تقریباً ایک ماہ رہے۔ بیشمار ٹیسٹ ہوئے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ہم اسے واپس لے آئے۔ کسی نے آپ کے بارے میں بتایا تو ہم اسے آپ کے پاس لائے ہیں۔" لڑکی کے سسر سیٹھ جبار نے ڈاکٹر رضوان سے کہا۔

ڈاکٹر رضوان نے لڑکی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے، پھر اسے اسپتال میں ایڈمٹ کرنے کے لیے کہا۔ چنانچہ سارے انتظامات ہو گئے۔ لڑکی کو ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اور ڈاکٹر رضوان نے اس کے کئی ٹیسٹ لکھ دیئے۔

کوئی بات خلاف معمول نہیں تھی۔ میں حسب معمول ڈاکٹر رضوان کے ساتھ تھا۔ اور پورے انہماک سے کام کر رہا تھا۔ ڈاکٹر رضوان کسی قدر خشک مزاج تھے۔ بہت کم کو کبھی نہ مسکرانے والے۔ گفتگو نرم لہجے میں کرتے تھے لیکن چہرہ سخت گیر تھا۔ میرے ساتھ بھی ان کا رویہ بے حد خشک تھا۔ مگر میں ان کے مزاج کو جانتا تھا اس لیے کبھی ان کے انداز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس لڑکی کے سلسلے میں بھی انہوں نے مجھے اپنے خشک انداز میں خاص ہدایات دی تھیں اور میں ان پر عمل کر رہا تھا۔ لڑکی کا نام علینا تھا اور اس کے شوہر کا نام امتیاز۔ امتیاز صحافی تھا۔ اور اپنا ایک اخبار نکالتا تھا۔ بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور اس کی بیماری کی وجہ سے بے حد پریشان تھا۔ ہر وقت اسپتال میں رہتا تھا۔ غرض یہ کہ لڑکی کا علاج ہو رہا تھا لیکن اس کے مرض کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔

پھر ایک دن جب میں علینا کے کمرے میں اس کے انجکشن لگا رہا تھا، ایک نرس میری معاونت کر رہی تھی کہ چند افراد علینا کی عیادت کے لیے آئے۔ ان میں جاوید انصاری کا بیٹا ناصر انصاری اور اس کی بہن شازیہ بھی تھی۔ یہ لوگ ڈاکٹر رضوان کے ساتھ آئے تھے۔

"یہی تو ہیں ڈاکٹر کامران۔ میں نے انہی کے بارے میں بتایا تھا تمہیں امتیاز۔" ناصر نے مجھے دیکھ کر بے اختیار کہا۔ اور بڑے تپاک سے مجھ سے گلے ملا۔

"بہت اچھے انسان ہیں ڈاکٹر کامران۔ ہماری بہت مدد کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے عجیب کہانی سنائی ہے ان کے بارے میں۔ انہوں نے ہمیں تو ابھی تک کوئی معجز نمائی نہیں دکھائی۔" امتیاز نے غمناک لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر کامران، امتیاز میرے بچپن کا دوست ہے۔ علینا بھابھی کچھ عرصہ قبل بے حد خوش مزاج اور صحت مند تھیں، نہ جانے انہیں کیا ہو گیا۔ میں نے جب سنا کہ انکل جبار نے علینا بھابھی کو یہاں داخل کرایا ہے تو میں نے امتیاز کو بتایا کہ وہ ڈاکٹر کامران سے ملے جنہوں نے ایک پھونک ماری اور جاوید انصاری صاحب چند گھنٹوں میں صحت یاب ہو گئے اور اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔" ناصر اپنی عقیدت میں بولے جا رہا تھا اور میرا خون خشک ہو رہا تھا جبکہ ڈاکٹر رضوان بھی ناصر انصاری کی باتوں کی طرف متوجہ تھے۔ انہوں نے فوراً پوچھا۔ "کیا نام لیا آپ نے۔ جاوید انصاری۔"

"جی سر۔ میں جاوید انصاری کا بیٹا ہوں۔ وہ آپ ہی کے زیر علاج تھے۔"

"کیا حال ہے ان کا۔ وہ حیات ہیں؟"

"اللہ کا فضل ہے۔ بالکل تندرست ہیں۔"

"آپ انہیں ملک سے باہر لے گئے تھے؟"

"ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ کامران صاحب نے علاج کیا اور وہ صرف چند گھنٹوں میں صحت یاب ہو گئے۔"

ڈاکٹر رضوان نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا، پھر علینا کا چارٹ اٹھا کر اسے پڑھنے لگے۔ چارٹ پر نوٹ لکھا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

ناصر نے کہا۔ "ڈاکٹر کامران۔ پلیز آپ علینا پر خصوصی توجہ دیں۔ میں نے آپ کے بارے میں امتیاز سے بہت کچھ کہا ہے۔"

"ہم سب ان پر پوری توجہ دے رہے ہیں۔ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔" اس کے سوا میں اور کیا کہہ سکتا تھا۔

ناصر مجھ سے بہت سی باتیں کرتا رہا۔ شازیہ، علینا کے پاس بیٹھی تھی۔ دو ایک بار اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے اس کی آنکھوں میں ایک شکایت سی محسوس ہوئی تھی، لیکن میں اس وقت دوسری ہی کیفیت میں تھا۔ مجھے ڈاکٹر رضوان کی نگاہوں کا انداز پریشان کر رہا تھا۔

ابھی میں اسی کمرے میں تھا کہ ایک نرس نے آ کر کہا۔ "سر ناصر آپ ہیں؟"

"جی سسٹر۔" ناصر بولا۔

"آپ کو ڈاکٹر رضوان بلا رہے ہیں۔"

"آتا ہوں۔" ناصر نے کہا۔ پھر امتیاز سے بولا۔ "ہم چلتے ہیں امتیاز۔ تم اللہ پر بھروسہ رکھو اور ڈاکٹر کامران مسعود، پلیز آپ میری بھابھی کو ٹھیک کر دیں۔ آؤ شازیہ۔"

دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ اور میں ایک عجیب سی سنسنی کا شکار ہو گیا۔ اسی وقت امتیاز نے لجاجت سے کہا۔ "علینا ٹھیک ہو جائے گی ڈاکٹر کامران۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر تک پریشان رہا پھر ایک دم میرے اندر ایک غصہ سا ابھر آیا۔ ڈاکٹر رضوان میرے سینئر تھے، پروفیسر تھے، لیکن وہ میرے باس نہیں تھے۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں اور مستقبل میں مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں نے صرف احتراماً لوگوں سے کہا تھا کہ وہ میرے عمل کا ڈاکٹر رضوان سے تذکرہ نہ کریں تاکہ وہ اسے اپنی توہین نہ محسوس کریں۔ اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں تھی۔

پھر ڈاکٹر رضوان اس قدر بے نیاز تھے کہ انہوں نے جاوید انصاری کے جانے کے بعد ان کے بارے میں پوچھا تک نہیں تھا۔ اب ہو سکتا ہے وہ اس بارے میں مجھ سے باز پرس کریں۔ اگر انہوں نے سخت رویہ اختیار کیا۔ مجھے بھی اپنا انداز بدلنا پڑے گا۔ میں نے دل میں طے کر لیا کہ ان کے سوالات کا میں کیا جواب دوں گا۔ انسان کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے ظرف کا بڑا ہونا دوسری بات ہے۔ یہی کیفیت ڈاکٹر رضوان کی تھی۔

میری طلبی ہو گئی۔ اور میں خود اعتمادی کے ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میرے اندر داخل ہونے پر انہوں نے باہر کھڑے اردلی کو بلا کر کہا۔ "کسی کو بھی اس وقت تک کمرے میں نہ آنے دینا جب تک میں اجازت نہ دوں۔"

"یس سر!" اردلی نے کہا اور باہر چلا گیا۔

"تشریف رکھیے ڈاکٹر کامران۔" ڈاکٹر رضوان کے الفاظ میں طنز نمایاں تھا۔

"شکریہ سر۔" میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے مجھ سے اپنی اس معجز نمائی کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"خود نمائی نہیں چاہتا تھا سر۔" میرے اس جواب پر ڈاکٹر رضوان چونک پڑے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ان کے استفسار پر میری گھگھی بندھ جائے گی۔ میں شرمندہ ہو جاؤں گا۔

چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھا۔"

"ایک چھوٹا سا کام کیا تھا میں نے سر۔ اس کا اظہار کر کے میں کسی فوقیت کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"وہ چھوٹا سا کام آپ یہاں اسپتال میں بھی کر سکتے تھے۔ اس کے لیے آپ خصوصی طور پر ان کے گھر گئے اور وہاں جا کر اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑے۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں، انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے ان سے کتنی رقم وصول کی؟"

بڑی چھوٹی بات کی تھی ڈاکٹر رضوان نے۔ میں تلملا گیا۔ میرے اندر آگ بھر گئی۔ تاہم میں نے خود پر قابو رکھا اور خاموش رہا۔

"آپ نے جواب نہیں دیا ڈاکٹر کامران۔"

"کون سی بات کا جواب دوں سر۔ رقم لینے کی بات کا یا اسپتال والی بات کا؟"

"دونوں کا۔"

"دولت کمانے کے لیے میرے پاس زندگی پڑی ہے سر۔ بہت کچھ کماؤں گا۔ نیز یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہوں اور دولت کے لیے پریشان نہیں ہوں۔ دوسری بات کا جواب یہ ہے سر کہ ہمارے ہاں احترام کا مفہوم بدل دیا گیا ہے۔ ہم سینئر کے احترام کے دائرے میں قید کر دیے جاتے ہیں اور اپنی کوئی صحیح رائے بھی اپنے سینئر کو نہیں دے سکتے کہ وہ توہین کے زمرے میں آ جاتی ہے۔"

"مطلب؟" ڈاکٹر رضوان نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"سر۔ جاوید انصاری کے شانے پر ایک غدود تھا۔"

"ایں۔ ہاں۔"

"میں نے کئی بار آپ کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔"

"اس کے ٹیسٹ کرائے گئے تھے۔" ڈاکٹر رضوان کا انداز بدل گیا۔

"بس میں نے اس کا چھوٹا سا آپریشن کر کے اسے نکال دیا تھا۔"

"ارے۔ اور وہ ٹھیک ہو گئے۔"

"جی سر۔"

"پتا چلا وہ کیا تھا؟"

"نہیں سر۔"

"وہ غدود پھینک دیا تم نے۔"

"جی۔ بالکل۔"

"اف۔ کتنا غلط کیا۔ اسے لیب لانا چاہیے تھا۔ اس کی تحقیق ہونی چاہیے تھی۔"

"اول تو آپ آؤٹ آف سٹی چلے گئے تھے، دوسرے آپ اس سرگری کو پسند نہ کرتے۔ میں نے کئی بار آپ کو اس طرف متوجہ کیا تھا اور آپ نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ اس سے زیادہ میں ڈاکٹر رضوان کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اور اگر بتاتا تب بھی تو اس کا مذاق ہی اڑتا۔ ڈاکٹر رضوان کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "شکریہ آپ جا سکتے ہیں۔"

میں خاموشی سے باہر نکل آیا، لیکن اپنے رویے پر میں مطمئن تھا۔ میں نے بگڑی والا معاملہ بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ڈاکٹر رضوان کا رویہ میرے ساتھ کیسا رہتا ہے۔

اس کا اندازہ دوسرے دن ہی ہو گیا۔ ڈاکٹر رضوان نے میری جگہ دوسرے نوجوان ڈاکٹر مسرور کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا اور میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا، لیکن ناصر انصاری اور علینا کے شوہر امتیاز نے جس طرح مجھ سے تعاون مانگا تھا اسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر مسرور سے میری اچھی سلام دعا تھی۔

اس نے خود ہی مجھ سے کہا۔ "ڈاکٹر رضوان آپ سے کچھ ناراض ہیں ڈاکٹر کامران۔"

"ہاں۔ وجہ نہیں پتا چل سکی۔ شاید کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہو گئی ہو گی۔ کچھ کہہ رہے تھے تم سے۔"

"نہیں۔ ان کے انداز سے پتا چل رہا ہے۔"

"روم نمبر تیس میں جو مریضہ ہے وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ اس کا خصوصی خیال رکھنا ہے اور اس کی رپورٹوں سے مجھے آگاہ رکھنا ہے۔ ڈاکٹر مسرور۔ پلیز۔"

"بالکل بے فکر رہو۔ ویسے بھی ڈاکٹر رضوان تین دن تک میڈیکل کیمپ کی میزبانی کریں گے اور وہاں مصروف ہوں گے۔ ہم پورا خیال رکھیں گے۔"

ڈاکٹر رضوان نے مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کے علاوہ میں ایک اور احساس کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ جاوید انصاری کا کیس بھی ایسا ہی تھا جس کے بارے میں مجھے بعد میں خود ان کی زبانی پتا چل گیا تھا اور اب میں ان خباثتوں کا قائل ہو چکا تھا کیونکہ خود میرا ان سے واسطہ تھا۔ اب دو خیال میرے ذہن میں تھے۔ ایک یہ کہ کہیں علینا کے بدن کے کسی حصے میں کوئی مکڑی نہ چپی بیٹھی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ پائل تو نہیں ہے۔ دونوں مرحلے مشکل تھے۔ ایک خاتون کے بدن کو کھول کر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نہ ہی کسی سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ پائل تو نہیں ہے۔ بھلا یہ کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

کشمکش جاری تھی۔ اس دن میں ایک مریض کے کمرے سے نکل رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر شازیہ نظر آ گئی۔ ان لوگوں سے غیر رسمی رابطہ ہو گیا تھا، اس لیے میں خود اس کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو مس شازیہ۔"

"السلام علیکم ڈاکٹر کامران۔"

"خیریت۔ اس طرف کیسے۔ کیا علینا کا کمرہ تلاش کر رہی ہیں۔"

"نہیں۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے کہ کمرہ بھول جاؤں۔ آپ کو تلاش کر رہی تھی۔ ڈاکٹر مسرور نے مجھے بتایا کہ آپ اس طرف آئے ہیں۔"

"اوہ۔ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"اب کوئی نہیں۔ شاہد بھائی مجھے چھوڑ گئے ہیں واپسی پر لے لیں گے۔"

"چائے پئیں۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" شازیہ نے مسکرا کر کہا اور میں اسے کینٹین لے آیا۔

چائے کے دوران میں نے پوچھا۔ "علینا کی کیفیت کچھ بہتر لگی آپ کو؟"

"پتا نہیں۔ میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر مسرور نے بتایا ہے کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ اسے جگانا مناسب نہیں ہو گا۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہ بہتر ہے؟"

"ابھی وقت لگے گا۔"

"ایک بات پوچھوں ڈاکٹر کامران؟"

"جی!"

"کیا ڈاکٹر صاحبان سے اسی وقت ملاقات ہو سکتی ہے جب انسان بیمار ہو۔ ایسا ہے تو میں بیمار ہونا چاہتی ہوں۔"

"ارے۔ خدانخواستہ۔" میں نے کہا۔

"حالانکہ ہم لوگ آپ سے اپنوں کی طرح ملے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ نے ابو کو نئی زندگی دی تھی، لیکن دوبارہ آپ کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔"

"ایک ڈاکٹر کی زندگی کا تجزیہ کر کے دیکھیے۔ آپ کو اس پر ضرور رحم آئے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"قابل رحم تو دوسرے بھی ہوتے ہیں۔ وہ جنہیں کسی کا انتظار ہو۔ آپ اپنے گھر تو جاتے ہی ہوں گے تھوڑا سا وقت اگر ہمیں بھی مل جائے۔ بطور دوا ہی سہی۔"

"ضرور حاضری دوں گا۔" میں نے روا روی میں کہا۔ اور کیا کہتا اس سے۔ ثنا بھابھی نے اس کا نام مجھ سے منسلک کرنے کی کوشش کی تھی لیکن حسن و عشق کے راستے تو مجھ سے بہت دور تھے۔ میں مافوق الفطرت قوتوں کے گرداب میں پھنسا ایک عجیب و غریب کردار تھا۔ شازیہ دیر تک میرے ساتھ رہی پھر میں اس کے ساتھ علینا کے پاس آ گیا جو ابھی تک سو رہی تھی۔ امتیاز پاس ہی موجود تھا۔ اس سے سلام دعا ہوئی تو اس نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں علینا کی کیفیت کچھ بہتر ہے؟"

"یہ ٹھیک ہو جائیں گی ان شاءاللہ۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے تین چار دن کے لیے آؤٹ آف سٹی جانا ہے۔ جا سکتا ہوں؟"

"ضرور امتیاز صاحب۔ ہم یہاں ان کی بہت دیکھ بھال کر رہے ہیں۔"

"اوکے تھینکس۔"

شاہد آ گیا اور شازیہ نے دوسری بار اس کے سامنے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ شاہد نے بھی اصرار کیا اور میں نے ٹالنے والے انداز میں ان سے ہاں کہا تھا۔

صورت حال کچھ بہتر ہوئی۔ ڈاکٹر رضوان میڈیکل کیمپ میں مصروف ہو گئے۔ امتیاز جس کا زیادہ وقت علینا کے کمرے میں گزرتا تھا، شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ ان دنوں بھی میری رات کی ڈیوٹی تھی۔ علینا کے کمرے کی دیکھ بھال ڈاکٹر نجمہ کے سپرد تھی۔ یہ بہترین موقع تھا۔ رات کے دو بجے جب سناٹا تھا میں علینا کے کمرے میں گھس گیا۔

اس بات کا مجھے اندازہ تھا کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود میں کسی بھی طور پر ایک خاتون کے جسم کو نہیں ٹٹول سکتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ علینا ایک ہیوی ڈوز میڈیسن کے زیر اثر بے ہوشی جیسی کیفیت میں ہے لیکن اس کے باوجود یہ غیر اخلاقی عمل نہیں کر سکتا تھا۔

ایک موہوم سی امید پر میں نے مدھم آواز میں کہا۔ "بھوریا چرن۔ اگر تم آس پاس ہو تو مجھے جواب دو۔"

ایک لمحہ نہیں گزرا تھا کہ مجھے ایک منمناتی آواز سنائی دی۔

"بھوانی سوگند ٹھنڈ پڑ گئی من ما۔ ارے ہمارا متر ہمیں آواز دے اور ہم جواب نہ دیں۔ اوپر ہیں نا۔ چھت پر۔"

میری آنکھیں بے اختیار چھت کی طرف اٹھ گئیں۔ چھت سے ایک مکڑا چپٹا ہوا تھا۔

"شکریہ بھوریا چرن۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

"پوچھو متر۔"

"کیا تم اس لڑکی کے بدن سے چمٹے ہوئے ہو۔ کیا یہ پائل ہے؟"

"نا ہیں رے۔ ای پائل نا ہے۔ اور نہ ہی ہمارے کسی مطبل کی ہے۔ ای بیمار ہے اور متر تو سے ایک بات کہیں؟"

"ہاں۔ بولو۔"

"ہم نے تو سے ایک بات کہی تھی۔ ہم تیری ایک کھوسی پوری کریں گے۔ تو بہت بڑا ڈاکٹر بن جائے گا اور جب ہم سنکھا بن جائی رہے تو، تو ہمارا کام کر دئی رے، پھر جب ہم کھنڈولا بن جائیں تو کالی ماں کی سوگند تو ہے سنسار کا سب سے بڑا ڈاکٹر بنا دئی رہین۔ پوری دنیا میں تمہارا نام کی جے جے کار ہو گی۔ ہمارو وچن رہے۔"

"کیا یہ لڑکی ٹھیک ہو جائے گی؟"

"بڑے آرام سے، تو اس کے سر کے پاس جا کر اس میں جھانک۔ ای کا جگر کے پاس ایک چھوٹی سی گانٹھ نجر آئی ہے جو جگر کے نیچے چھپی رہے۔ کاٹ پیٹ کرا و کا نکال دے۔ اے ہٹی کٹی ہو جئی ہے اور تو ہار نام کی جے جئی ہے۔"

میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ بھوریا چرن کہہ رہا ہے۔ ایک کالے جادو کا ماہر جس کی جادوئی قوتیں بے شمار ہیں اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہا جو قابل عمل نہ ہو۔

"ٹھیک ہے۔ ہم جات ہیں۔" بھوریا چرن نے کہا اور میں نے مکڑی کو چھت پر چلتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ ایک روشندان سے باہر نکل گئی۔

میری کیفیت بہت عجیب تھی۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج کی سی حالت تھی۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر علینا کو دیکھا، پھر آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اس پر نگاہ ڈالی اور دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے والا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے علینا کے بدن سے سفید سفید دھواں خارج ہو رہا ہے۔ پھر اس کے اندرونی اعضا نمایاں ہونے لگے۔ بالکل ایکسرے کی طرح یہ سب ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے جگر پر نگاہیں جما دیں۔ میری آنکھیں جگر کے نیچے اتر گئیں اور میں نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس چھوٹی سی گلٹی کو دیکھ لیا جس کی نشاندہی بھوریا چرن نے کی تھی۔

بتا نہیں سکتا اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔ رعشہ طاری تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یونہی کھڑا رہا۔ پھر ایک دم چونک پڑا۔ مجھے اس طرح یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ اول تو یہ میرا مریض نہیں تھا، دوسرے یہ خاتون تھی۔ اگر ڈاکٹر نجمہ یا دوسری نرس آ گئی تو بلاوجہ مشکوک ہو جاؤں گا۔ چنانچہ باہر نکل آیا اور اپنی مخصوص راہداری میں جا کر بیٹھ گیا۔

سر چکرا رہا تھا۔ سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کیا کروں؟ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ ڈیوٹی آف کر کے گھر چل پڑا۔ معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن رات بھر جاگنے کے باوجود آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔

علینا، ڈاکٹر رضوان کی نگرانی میں تھی اور ڈاکٹر رضوان کا رویہ میں دیکھ چکا تھا حالانکہ سیٹھ جبار، جاوید انصاری کے کہنے پر علینا کو میری وجہ سے یہاں لائے تھے لیکن میرے لیے مشکلات تھیں۔ البتہ بھوریا چرن نے جو کچھ کہا تھا اس سے میرا اعتماد بڑھ گیا تھا اور ساری رات سوچنے کے بعد آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر رضوان سے بات کروں گا۔

تین دن انتظار کرنا پڑا کیمپ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر رضوان نے ایک دن آرام کیا، پھر اسپتال آ گئے۔ دوپہر کو مجھے موقع ملا تو میں ان سے اجازت لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

"آئیے ڈاکٹر کامران۔ آئیے۔ مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"جی سر!" میں نے کہا۔

"تشریف رکھیے۔" ڈاکٹر رضوان نے کہا۔ ان کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا لیکن مجھے بھی فیصلہ کن گفتگو کرنی تھی چنانچہ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر رضوان کی آنکھوں میں کینہ توزی تھی۔

(جاری ہے)

’’سر! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟‘‘ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

’’آپ ڈیوٹی کے اوقات میں ذاتی گفتگو فرما رہے ہیں ڈاکٹر کامران! شاید آپ میرے اصولوں کو بھول گئے ہیں۔‘‘

’’نہیں سر! اس بات چیت کا تعلق اسپتال کے مسئلے سے ہی ہے۔‘‘

’’جی فرمائیے......؟‘‘

’’سیٹھ جبار نے مجھے کچھ ذمہ داریاں سونپی ہیں اپنی بہو کے سلسلے میں، آپ نے وہاں سے میری ڈیوٹی ختم کردی ہے، میں علینا کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’آپ کے خیال میں اس کا مناسب علاج نہیں ہو رہا، ہم لوگ لاپروائی برت رہے ہیں، آپ یوں کریں اس سلسلے میں اسپتال کے چیئرمین سے شکایت کردیں، وہ آپ کی خواہش کے مطابق انتظام کردیں گے۔‘‘

’’سر! آپ میرے استاد ہیں، میں آپ کی زیرِ ہدایت کام کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’اوہو......! اس طرح جیسے آپ نے جاوید انصاری کے گھر جاکر اس کا علاج کیا اور انہیں صحت یاب کردیا، اس کیس میں بھی آپ یہی کرنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’میں چاہتا ہوں سر کہ مسز امتیاز کے علاج کی مکمل ذمہ داری آپ مجھے دیدیں۔‘‘ میں نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ بولے۔ ’’اس بدتمیزی پر میں آپ کے خلاف ایسا ایکشن لے سکتا ہوں کہ آپ کا سارا کیریئر ختم ہوجائے گا، میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس سے مطمئن ہوں، آپ میری کارروائی کو چیلنج کرسکتے ہیں۔‘‘

’’میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا سر! بس آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔‘‘

’’گیٹ آؤٹ، گیٹ آؤٹ، گیٹ آؤٹ!‘‘ ڈاکٹر رضوان آپے سے باہر ہوگئے۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے سینئرز کی ہمیشہ عزت کی تھی، خاص طور سے ڈاکٹر رضوان تو میرا آئیڈیل تھے لیکن اس وقت انہوں نے میری سخت توہین کی تھی۔ مزید بے عزتی اس وقت ہوئی جب میں علینا کے روم کے دروازے پر پہنچا اور مجھے گارڈ نے روک لیا۔

’’سوری سر! آپ اندر نہیں جاسکتے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

’’معافی چاہتا ہوں سر! ڈاکٹر رضوان نے میری ڈیوٹی یہاں لگائی ہے اور کہا ہے کہ ڈاکٹر کامران کو اس کمرے میں نہ جانے دیا جائے۔‘‘

’’ہوں......!‘‘ میں نے کہا لیکن میرا خون کھول گیا تھا۔ ڈاکٹر رضوان اس حد تک چلے جائیں گے، میں نے نہیں سوچا تھا۔ بہت دیر تک ایک گوشے میں تنہا بیٹھا رہا۔ چیئرمین مسٹر نصر اللہ شاہ بہت اچھے انسان تھے لیکن کسی جونیئر کا سینئر کے بارے میں شکایت کرنا بہت دور کی بات تھی۔ آخرکار میں نے وہی فیصلہ کیا جو جاوید انصاری کے سلسلے میں کیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے شاہد انصاری کا سہارا لیا تھا۔

’’میں خاص طور سے سیٹھ جبار سے ملنا چاہتا ہوں شاہد صاحب!‘‘

’’ہاں...... ہاں ضرور......! خیریت؟‘‘

’’علینا کے علاج کے سلسلے میں کچھ مشکلات پیش آگئی ہیں، ان کا حل سیٹھ صاحب سے ملاقات کے بعد ہی مل سکتا ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر کامران! اگر علینا بھابھی کو کچھ ہوگیا تو امتیاز خودکشی کرلے گا، وہ انہیں بہت چاہتا ہے، میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔‘‘

شاہد انصاری کے ساتھ میں سیٹھ جبار کی کوٹھی پہنچ گیا جو سوگوار تھی۔ امتیاز کہیں مصروف تھا لیکن بھاگم بھاگ کوٹھی آگیا تھا۔

’’میں بہت پریشان ہوگیا ہوں ڈاکٹر کامران! بتائیے کیا بات ہے؟‘‘

’’جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں، وہ غیر مناسب ہے لیکن مجبوری ہے، ہر شعبے میں کچھ اسی طرح کا عمل ہوتا ہے، بہت اچھے لوگ بھی کبھی انا کا شکار ہوجاتے ہیں، میں ڈاکٹر رضوان کی بات کر رہا ہوں، بہت اچھے انسان اور بے حد ذہین ڈاکٹر ہیں لیکن ایک جونیئر کو وہ آگے بڑھتے نہیں دیکھ سکتے، جاوید انصاری صاحب کے مسئلے میں وہ مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں کہ میں نے ان سے ہٹ کر وہ کیس کیوں لیا، میں علینا بھابھی کا ایک آپریشن کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے راستے روکے جا رہے ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب......!‘‘ سیٹھ جبار، امتیاز اور شاہد کے منہ سے بہ یک وقت نکلا۔

’’مجھے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایک ناخوشگوار عمل کرنا پڑ رہا ہے، ڈاکٹر رضوان میرے استاد ہیں، اس کے علاوہ میں اسپتال کا ایک وفادار ملازم ہوں اور وہاں موجود ہر شخص کی عزت کرتا ہوں لیکن میں ایک نیک نام خاندان کا فرد بھی ہوں اور ایک مقدس پیشے سے وابستہ ہوں، ہمارا کام انسانوں کی زندگی بچانا ہے اور اس کے لیے ہمیں ہر رشتہ نظرانداز کردینا ضروری ہوتا ہے۔‘‘

’’جی بیشک ڈاکٹر کامران!‘‘ شاہد نے کہا۔

’’بات کیا ہے بیٹے! مجھے اختلاج ہونے لگا ہے۔‘‘ سیٹھ جبار نے شدید پریشانی سے کہا۔

’’جاوید انصاری صاحب کے کیس میں ایک چھوٹا سا خیال میرے ذہن میں آیا تھا جس کا اظہار میں نے ڈاکٹر رضوان سے کیا لیکن ان کی تحقیق مجھ سے متفق نہیں ہوئی اور مجھے خاموش ہونا پڑا پھر خوش نصیبی سے ڈاکٹر رضوان نے اس کیس سے دستبرداری کا اعلان کردیا اور شاہد صاحب نے انصاری صاحب کو اسپتال سے نکال لیا اور انہیں باہر لے جانے کی تیاری کرنے لگے، میں نے شاہد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے اپنے طور پر جاوید صاحب کے ساتھ کچھ وقت دیدیا جائے اور انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے یہ وقت دیدیا، میں نے اپنے خیال کے مطابق عمل کیا اور اللہ نے مجھے سرخرو کیا لیکن میں نے شاہد صاحب سے درخواست کی تھی کہ اس کا تذکرہ ڈاکٹر رضوان سے نہ کیا جائے، وہ میرے اس عمل کو اپنی توہین تصور کریں گے، بات ختم ہوگئی لیکن اس دن اتفاق سے ناصر صاحب نے اس بات کا انکشاف کردیا جسے ڈاکٹر رضوان نے اس طرح محسوس کیا جیسا میرا خیال تھا۔ انہوں نے شدید ناراضی کا اظہار کیا اور میری جگہ دوسرے ڈاکٹر کو علینا بھابھی کے روم پر متعین کردیا یہاں تک کہ ان کے کمرے پر گارڈ کھڑا کردیا جسے ہدایت کردی گئی ہے کہ مجھے ان کے کمرے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔‘‘

’’انتہا ہے، میں ڈاکٹر رضوان کو اس عمل کی بدترین سزا دلواؤں گا، انہیں کورٹ میں گھسیٹ لوں گا۔‘‘ سیٹھ جبار نے شدید غصے کے عالم میں کہا۔

’’میں اپنے اخبار میں یہ پوری کہانی لکھوں گا اور حکومت سے درخواست کروں گا کہ ایسے سرپھروں کے خلاف بدترین کارروائی کی جائے۔‘‘ امتیاز کی کیفیت بھی سیٹھ جبار سے کم نہیں تھی۔

’’اس وقت مسئلہ علینا بھابھی کی صحت کا ہے اس لیے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، میں نے جس مقصد کے لیے آپ کو زحمت دی ہے، براہِ کرم اس پر توجہ دیجیے۔‘‘

’’یہ غصہ غیر فطری نہیں ہے لیکن اس وقت صبر سے کام لینا ہوگا، آپ بتائیے ڈاکٹر کامران! اب ہمیں کیا کرنا ہے۔‘‘ شاہد نے کہا۔

’’میرے خیال میں علینا کو فوراً اس اسپتال سے نکال کر کسی اور اسپتال میں منتقل کردیا جائے جہاں کامران اس کا اپنے طور پر علاج کریں۔‘‘ سیٹھ جبار نے کہا۔

’’نہیں انکل جبار! یہ میرے ایگریمنٹ کے خلاف ہوگا، مزید اس طرح اسپتال کی بدنامی بھی ہوگی۔‘‘

’’پھر بتاؤ کیا کیا جائے؟‘‘

’’ڈاکٹر رضوان نے میرے ساتھ کافی بدسلوکی کی ہے، میں بھی انسان ہوں، فرشتہ نہیں، میں بس اتنا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اسپتال کے چیئرمین ڈاکٹر نصر اللہ صاحب سے بات کریں اور کہیں کہ مجھے علینا بھابھی کا ایک آپریشن کرنے کی خصوصی اجازت دی جائے۔‘‘

’’میں آج ہی یہ کرلوں گا، آپریشن اسپتال میں ہی کروگے؟‘‘ سیٹھ جبار نے پوچھا۔

’’جی......!‘‘

’’میں دیر نہیں کروں گا، امتیاز تم میرے ساتھ چلوگے، ڈاکٹر نصر اللہ اس وقت کہاں ہوں گے؟‘‘

’’شاید اسپتال میں۔‘‘

’’ہم انہیں کہیں سے بھی ٹریس کرلیں گے پاپا!‘‘ امتیاز نے کہا۔ پھر معذرت سے بولا۔ ’’ڈاکٹر کامران! آپ جتنے اچھے انسان ہیں، مجھے یقین ہے ہماری اس وقت کی پریشانی کو ذہن میں رکھیں گے اور یہ نہ سوچیں گے کہ ہم نے آپ کی کوئی خدمت نہیں کی۔‘‘

میں ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ ’’آپ میری توہین کا انتقام لینے جا رہے ہیں، باقی باتیں تو ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔‘‘

پھر میں اور شاہد وہاں سے واپس چل پڑے۔ راستے میں شاہد نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ اس نے کہا۔ ’’ڈاکٹر کامران! ابو کا کامیاب علاج کرکے آپ نے ہمارے گھر میں اپنا بہت بڑا مقام بنالیا ہے، میری درخواست ہے کہ ہمیں اپنے شناساؤں میں ہی جگہ نہ دیں بلکہ کسی بھی بے نام رشتے سے منسلک کرلیں۔‘‘

’’میں ہر کوتاہی کا خیال رکھوں گا۔‘‘ میں نے کہا لیکن دل میں یہ ضرور سوچا کہ آپ کے گھر میں ایک ایسا کردار ہے جو ہمارے تعلقات کے درمیان رکاوٹ بن سکتا ہے، وہ ہے شازیہ جس کی آنکھوں میں ایسی کیفیت دیکھی ہے جس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔

خیر......! دوسرے دن دوپہر کو مجھے ڈاکٹر نصر اللہ شاہ نے اپنے آفس میں طلب کیا اور میں دل کی دھڑکنوں کو سمیٹ کر ان کی طرف چل پڑا۔ بے حد قابل اور نہایت پُررعب شخصیت کے مالک تھے لیکن ان کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ نے پُراخلاق لہجے میں میرے سلام کا جواب دے کر مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

’’بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں نوجوان ڈاکٹر! جو کسی بہت قریبی ہمدرد یا بزرگ کو بھی بتانے میں ہچکچاہٹ ہوتی ہے اس لیے میں آپ سے کوئی تفصیل یا ماضی کی کوئی بات نہیں پوچھوں گا، سیٹھ جبار کے بیٹے کی اہلیہ ایک پُراسرار سی بیماری کا شکار ہوکر اس خیال سے ہمارے اسپتال میں داخل ہوئی ہیں کہ یہاں کے قابل ڈاکٹر ان کا تسلی بخش علاج کرسکیں گے جبکہ انہیں انگلینڈ میں بھی کوئی خاطرخواہ رسپانس نہیں ملا، ڈاکٹر رضوان کی ماہرانہ تشخیص پر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے، وہ بے حد قابل ڈاکٹر ہیں اور میں ان پر پورا بھروسہ کرتا ہوں لیکن سیٹھ جبار اور اس لڑکی کے شوہر نے مجھ سے ملاقات کرکے اس بات کی خواہش کی ہے کہ ان کے مریض کا علاج نوجوان ڈاکٹر کامران کرے، ڈاکٹر کامران! کیا آپ یہ ذمہ داری قبول کریں گے؟‘‘

’’جی!‘‘ میں نے بلاجھجک کہا۔

’’تنہا......؟‘‘

’’جی سر!‘‘ میں نے پھر اسی اعتماد سے کہا۔

’’آپ کے اس جواب سے مجھے بے حد خوشی ہوئی، ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’حکم سر......!‘‘

’’یہ علاج یا آپریشن آپ اسی اسپتال میں کریں گے؟‘‘

’’سو فیصد سر! میں اسی اسپتال کا ڈاکٹر ہوں۔‘‘ میرے اس جواب سے ڈاکٹر نصر اللہ کو جتنی خوشی ہوئی تھی، اس کا اندازہ ایک لمحے میں ہوگیا تھا۔

’’ٹھیک!‘‘ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ پھر انہوں نے ایک فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ ’’اس کاغذ میں انہوں نے مکمل اختیار دیا ہے کہ مسز امتیاز کا علاج ڈاکٹر کامران کریں، وہ ہر رسک قبول کریں گے، یہ بہت بڑی بات ہے، ہمارے لیے اعزاز!‘‘

’’شکریہ سر......!‘‘

’’اب میں کچھ ذاتی بات کروں؟‘‘

’’جی سر!‘‘ میں نے گردن خم کرکے کہا۔

’’اس آپریشن کے لیے کوئی خاص بات ذہن میں ہے؟‘‘

’’جی......؟‘‘

’’کچھ اسی طرح کی جیسے جاوید انصاری کے سلسلے میں تھی؟‘‘

’’جی......!‘‘ میں نے کہا۔

’’میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں، اپنے اسسٹنٹ کے لیے کس کا انتخاب کروگے؟‘‘

’’کسی کا نہیں سر......! بس کسی نرس کو ساتھ لے لوں گا۔‘‘

’’اوکے! میری طرف سے اجازت ہے، ہم سب کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے، آپ تیاری کریں۔‘‘

وہ رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ بھوریا چرن نے اپنی کالی قوتوں سے مجھے علینا کے مرض سے آگاہ کردیا تھا لیکن بار بار یہ خیال بھی دل میں آجاتا تھا کہ یہ آپریشن کامیاب ہوگا یا نہیں! اگر اس میں ناکامی ہوئی تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ ایک بھیانک خیال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ڈاکٹر رضوان اس کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے، میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے دوسرے دن دو بجے کا وقت اس آپریشن کے لیے مخصوص کردیا تھا۔ فجر کی نماز میں بڑے خشوع وخضوع سے خالقِ کائنات کے حضور دعا مانگی کہ میرے مالک! میری نیت کو تو جانتا ہے، میری لاج رکھنا۔ دن میں ڈاکٹر سائرہ نے مجھ سے ملاقات کرکے پیشکش کی کہ وہ مجھے اسسٹ کرے۔ اس نے کہا۔ ’’پورے اسپتال میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے اور لوگ آپ کی کامیابی کے منتظر ہیں لیکن کوئی ڈاکٹر آپ کو اسسٹ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ اسے ڈاکٹر رضوان کا خوف ہے۔‘‘

’’ڈاکٹر رضوان! میرے استاد ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، میں کسی کے لیے رسک نہیں لوں گا، سسٹر جمیلہ میری معاونت کریں گی۔‘‘ میں نے کہا اور سائرہ کا چہرہ اتر گیا۔

نرس جمیلہ اسپتال کی سب سے بدصورت نرس تھی۔ کوئی اسے منہ نہیں لگاتا تھا یہاں تک کہ مریض بھی درخواست کرکے اسے تبدیل کرالیا کرتے تھے جس پر وہ اداس رہتی تھی۔ میری بات سن کر وہ دنگ رہ گئی پھر اس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی کیونکہ آج میں اسپتال میں ہیرو بنا ہوا تھا۔

ٹھیک دو بجے میں آپریشن تھیٹر پہنچ گیا۔ میری ہدایت کے مطابق جمیلہ نے تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ آپریشن ٹیبل پر مریضہ کو لٹا کر میں نے اس کے بدن کا جائزہ لیا اور میری آنکھوں میں ایک سفید سی دھند پھیل گئی۔

پھر وہ دھند صاف ہوئی تو مجھے علینا کے اندرونی نظام کا ایک ایک حصہ نظر آنے لگا۔ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد میں نے کیا کیا۔ میرے ہاتھ متحرک تھے اور میں علینا کے جگر کے نیچے سے وہ گانٹھ نکال رہا تھا۔ بڑی مہارت کا آپریشن تھا جو میں نے کامیابی سے کرلیا۔ فارغ ہوتے ہی میں ہوش میں آگیا اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے علینا کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر زندگی تھی۔

’’ڈاکٹر کامران!‘‘ جمیلہ کی لرزتی آواز ابھری۔

’’جی سسٹر! سب ٹھیک ہے، آپ کو اس مریضہ پر مستقل ڈیوٹی دینی ہوگی۔‘‘

’’میں چوبیس گھنٹے ان کے پاس رہوں گی۔‘‘ جمیلہ نے کہا۔

باہر نکلا تو ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ آپریشن تھیٹر کے باہر مجمع لگا ہوا تھا۔ نہ صرف سیٹھ جبار کا پورا خاندان جمع تھا بلکہ جاوید انصاری کے اہلِ خاندان بھی موجود تھے۔ میں نے مناسب الفاظ میں انہیں بتایا کہ آپریشن کامیاب ہوگیا ہے اور اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ علینا ٹھیک ہوجائے گی۔

ہر چہرہ خوشی سے گلنار ہوگیا تھا۔ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کیے جانے لگے لیکن میں نے ان کے جواب دینے سے معذرت کرلی۔ ڈاکٹر رضوان اس وقت اسپتال میں موجود نہیں تھے البتہ ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نصر اللہ شاہ نے مجھے آفس طلب کیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا سوالات کریں گے۔ میں نے اپنے ذہن میں طے کرلیا کہ میں ان کے سوالات کے کیا جواب دوں گا۔ ظاہر ہے میں کسی کو بھوریا چرن کے بارے میں بتاکر اپنا مذاق نہیں اڑوا سکتا تھا لیکن میں نے جگر کے نیچے سے نکلنے والی وہ گانٹھ جمیلہ کے پاس محفوظ کرادی اور اسے ہدایت کردی کہ اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھے اور اگر ڈاکٹر نصر اللہ اسے طلب کریں تو لے کر ان کے آفس میں آجائے۔

میرا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے کامیاب آپریشن ضرور کرلیا تھا لیکن یہ بعد میں مریض کی حالت سے پتا چل سکتا تھا کہ اس آپریشن سے اسے کوئی فائدہ ہوا ہے یا نہیں! ڈاکٹر شاہ بہت سنجیدہ تھے۔

’’ہاں! کیا رہا......؟‘‘

’’آپریشن کامیاب رہا ہے سر!‘‘

’’خیر میں نے تمہیں اس آپریشن کی خود اجازت دی تھی جبکہ سیٹھ جبار اسپتال کے ڈسپلن کے خلاف مجھ سے کوئی کام نہیں کرا سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ مریض کو کسی دوسرے اسپتال لے جاتے لیکن میں نے تمہیں موقع دیا جبکہ ڈاکٹر رضوان ہمارے اسپتال کے معتبر ترین ڈاکٹر ہیں۔‘‘

’’میں انہیں اپنا استاد مانتا ہوں سر! لیکن انہوں نے میرے لیے مریضہ کے کمرے میں جانے کی ممانعت کردی تھی اور کمرے پر گارڈ کی ڈیوٹی لگادی تھی اور اسے ہدایت کردی تھی کہ مجھے اندر جانے سے روک دیا جائے۔‘‘

’’ہاں! یہ حکم بھی ڈسپلن کے خلاف تھا، خیر میں تم سے اس آپریشن کے سلسلے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔‘‘

’’مریضہ کے جگر کے نیچے ایک چھوٹی سی رسولی تھی جو اس کی اس کیفیت کی وجہ تھی، میں نے وہ رسولی نکال دی ہے۔‘‘

’’جگر کے نیچے......؟‘‘ ڈاکٹر نصر اللہ نے حیرت سے کہا۔

’’جی سر!‘‘

’’کیا وہ ایکسرے یا الٹراساؤنڈ میں موجود ہے؟‘‘

’’نہیں سر......!‘‘

’’کیا مطلب! پھر وہ تمہیں کیسے نظر آگئی؟‘‘

’’مجھے احساس ہوا تھا سر!‘‘

’’کیا یہ ایک غیر معمولی احساس نہیں تھا؟‘‘

’’بیشک تھا سر! لیکن مجھے اس کا خیال آیا تھا۔‘‘

’’ایک انوکھا خیال تھا، اب تو مجھے مریضہ کی فائل دیکھنا پڑے گی اور ہاں پلیز ڈاکٹر کامران! کیا وہ رسولی تم نے لیبارٹری بھیج دی؟‘‘

’’نہیں سر......! وہ میں نے آپ کو دکھانے کے لیے رکھی ہوئی ہے۔‘‘

’’شکریہ ڈاکٹر کامران! آپ ساری رپورٹیں اور فائل منگوالیں۔‘‘ میں نے باہر کھڑے چپراسی کو بلاکر اسے ہدایت دی کہ نرس جمیلہ سے کہے کہ مکمل آپریشن رپورٹ اور رسولی لے کر چیئرمین صاحب کے کمرے میں آجائے۔

چند منٹ کے بعد جمیلہ آگئی۔ ڈاکٹر نصر اللہ کافی دیر تک اس رسولی کا جائزہ لیتے رہے پھر انہوں نے سارے ایکسرے اور رپورٹیں دیکھیں اور گہری سانس لے کر بولے۔ ’’کہیں سے بھی اس کا پتا نہیں چلتا، اس کیفیت میں ڈاکٹر رضوان بھی بے قصور ہیں، میں حیران ہوں کہ آپ کو اس کا پتا کیسے لگا جبکہ آپ نے ایک اور مریض جاوید انصاری کو بھی اسی طرح صحت یاب کردیا تھا، آپ کی اجازت سے میں رسولی لیبارٹری بھجوادوں؟‘‘

’’سر! آپ یہ اجازت مجھ سے لے رہے ہیں، میں اس میں طنز محسوس کر رہا ہوں۔‘‘

’’شاید ایسا ہے کیونکہ آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو اس کا پتا کیسے چلا جبکہ کسی بھی ٹیسٹ سے اس رسولی کا پتا نہیں چلتا، خیر کبھی بتانا چاہیں تو ضرور بتادیجیے گا، آرام کریں۔‘‘

ڈاکٹر نصر اللہ نے کہا اور میں ان کو سلام کرکے باہر نکل آیا۔

ان لوگوں کی طرف سے دل کافی خراب ہوگیا تھا اور ایک عجیب سی بدگمانی ہوگئی تھی۔ بہت دیر تک نہ جانے کن کن سوچوں میں ڈوبا رہا۔ ایک لمحے کو دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں علینا کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے، کیوں نہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کروں۔

امتیاز وغیرہ یہیں موجود تھے لیکن یہ بہت مشکل کام تھا۔ اسپتال سے مکمل غداری اور پھر کچھ بھی سہی لیکن کون اس حد تک جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر مسیحا ہوتے ہیں، قاتل نہیں! ہاں! ایک فیصلہ اس دوران ضرور کرلیا، وہ یہ کہ اگر علینا ٹھیک نہ ہوئی تو اس اسپتال سے استعفیٰ دیدوں گا کیونکہ یہاں خوب مذاق اڑے گا۔ اسی سوچ میں تھا کہ ایک مانوس منمناتی آواز سنائی دی۔

’’تو ہار سوچ بھی ٹھیک اہے بروا، اور سن کونو کا مجال نا ہیں کہ اس چھوکریا کو نکسان پہنچائی دے، ہم جمے داری لیتے ہیں۔‘‘

میں نے نگاہیں اٹھاکر دیکھا تو چھت سے ایک مکڑی چپکی نظر آئی۔ بھوریا چرن کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

’’مولبی نے لٹیا ڈبو دی، نہیں تو ہم سنکھا سکتی لے چکے ہوتے، اس نے سارے راستے بند کردیے، پر ٹھیک ہے دیکھت رہیں کب تک او کا کھیل چلی رہے، سنکھا بھی بنیں گے اور کھنڈولا بھی! کب تک روکے گا، جاتے ہیں تو آرام سے اپنے کام کرتا رہ، ہم تو ہار ساتھ ہیں۔‘‘

مکڑی نے اپنی جگہ چھوڑی اور پھر ایک روشندان سے باہر نکل گئی۔ میں بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ عجیب وغریب خیالات دل میں آرہے تھے۔ ایسا انوکھا مسئلہ تھا کہ کسی سے بات بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بے چارے احمد علی ملے بھی تو وہ اپنے علم کا شکار ہوگئے۔

موت برحق ہے اور اپنے وقت پر آتی ہے۔ خدا جانے کالے جادو کو انسانی زندگی پر کتنی دسترس حاصل ہے لیکن جاوید انصاری کیس نے مجھے حیران کر رکھا تھا۔ بھوریا چرن مجھ پر مہربان ہے، اس سے فائدے ہو رہے ہیں تو ہونے دو...... بعد میں جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

دیکھو علینا کا کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہوگئی تو بڑی واہ واہ ہوگی۔ ایک اور فیصلہ کیا میں نے کہ جو کچھ آگے کروں گا، اس کی تفصیل کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا چاہے اس کے لیے کسی کی ناراضی کیوں نہ مول لینی پڑے۔ علینا کے لیے ایسا تجسس دل میں تھا کہ گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔

دوسرے دن دو رپورٹیں ملیں۔ پہلی رپورٹ لیبارٹری کی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ اس رسولی میں اتنا خطرناک زہر بھرا ہوا تھا کہ اگر وہ پھٹ جاتی تو بیشتر اعضا اس طرح گل جاتے جیسے تیزاب میں گلا دیے گئے ہوں۔ دوسری یہ تھی کہ علینا کی حالت بہت بہتر ہے اور طویل عرصے کے بعد اس نے گھر والوں سے بات کی ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

علینا کے کمرے کے سامنے پہنچا تو اس کا پورا خاندان جمع تھا جو مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ بہت دعائیں دے رہے تھے وہ لوگ! میں ان سے دو ایک رسمی باتیں کرکے اندر چلا گیا۔ اندر امتیاز، سیٹھ جبار اور علینا کے ایک بزرگ عزیز موجود تھے۔ علینا کی دیکھ بھال ڈاکٹر سائرہ کر رہی تھی۔

اس نے مجھے دیکھ کر جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’سوری ڈاکٹر کامران! ایم ایس صاحب نے میری ڈیوٹی یہاں لگائی ہے۔‘‘

’’جی ڈاکٹر سائرہ! پلیز چارٹ۔‘‘ میں نے متانت سے کہا۔ چارٹ دیکھ کر میں نے علینا سے بات کی۔ ’’جی بھابھی صاحبہ! میں آپ کا نیا دیور ہوں، اتفاق سے ڈاکٹر بھی ہوں، آپ بتائیے کہ بولنے میں تکلیف تو نہیں ہو رہی؟‘‘

’’میں آپ کو ڈاکٹر کہوں یا چھوٹا بھائی......؟‘‘ علینا نے مسکرا کر پوچھا۔

’’جب تک آپ یہاں ہیں، ڈاکٹر ہی کہیں، یہاں سے جاکر جو دل چاہے کہیں، کیسی طبیعت محسوس کر رہی ہیں؟‘‘

’’بہت بہتر! صحیح اظہار تو نہیں کرسکتی لیکن یوں لگ رہا ہے جیسے کسی شدید بوجھ کے دباؤ سے باہر نکل آئی ہوں۔‘‘

’’دو ایک دن میں آپ مزید ٹھیک ہوجائیں گی۔‘‘

’’ہم تمہارا احسان کبھی نہیں بھولیں گے ڈاکٹر کامران!‘‘ سیٹھ جبار نے کہا۔

’’نہیں سر! یہ میرا زندگی بھر کا فرض ہے۔‘‘

’’ہم تمہاری کیا خدمت کریں؟‘‘

’’براہِ کرم میری توہین نہ کریں، مجھے اسپتال سے تنخواہ ملتی ہے، وہی میرے لیے سب کچھ ہے، ہاں ایک وعدہ کرتا ہوں ساری زندگی اسی طرح اپنی بساط بھر اپنا فرض نبھاتا رہوں گا اور کسی سے کوئی ناجائز اعزازیہ قبول نہیں کروں گا۔‘‘

چار دن کے بعد علینا اسپتال سے رخصت ہوگئی۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی تھی۔ تین دن تک کچھ نہیں ہوا۔ چوتھے دن اتوار تھا، ہفتے کی رات علینا کا فون موصول ہوا۔

’’چھوٹے بھائی! اپنا قول بھول گئے، کہا تھا گھر جاکر جو دل چاہے کہوں، میرے اسپتال سے آنے کے بعد کوئی خبر نہیں لی؟‘‘

’’مجھے اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا کہ آپ ٹھیک ہوں گی۔‘‘

’’کل آپ کا اسپتال سے آف ہے، آپ ہمارے ساتھ ڈنر کریں گے، آپ کی پوری فیملی آپ کے ساتھ ہوگی۔‘‘

’’یہ مناسب نہیں ہوگا، آپ کو علم ہے کہ آپ کے معاملے میں میرے سینئر ڈاکٹر رضوان مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔‘‘

’’یعنی وہ نہیں چاہتے کہ میں زندہ رہوں؟‘‘ علینا شکایتی لہجے میں بولی۔

’’یہ بات نہیں، کوئی بھی ڈاکٹر کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ کسی مریض کو کوئی نقصان پہنچے، بس ایک معمولی سا اختلاف ہوگیا تھا۔‘‘

’’آپ لوگ نہیں آئے تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔‘‘

’’کچھ وقت گزر جانے دیں پھر حاضری دوں گا۔‘‘ میں نے کہا اور علینا مان گئی لیکن امتیاز کے اخبار نے غضب ڈھا دیا۔ اس نے اخبار میں اتنا کچھ لکھا میرے بارے میں کہ میں دنگ رہ گیا۔ اپنی دعوت کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ میں نے اس لیے قبول نہیں کی کہ وہ احسان کے بدلے کے زمرے میں آتی ہے۔

میرے موبائل پر فون کالوں کی بھرمار ہوگئی۔ ڈاکٹرز ایسوسی ایشن نے مجھے مبارکباد دی تھی اور کہا تھا کہ میں نے اس پیشے کو بہت بڑا مقام دیا ہے۔

غرض خوب ہنگامہ آرائی ہوئی۔ میری والدہ بھی بہت خوش تھیں لیکن میرے دل میں ایک خلش سی بیدار ہوگئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اس تعریف وتوصیف کا حقدار نہیں ہوں کیونکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے، جس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ مستقبل میں مجھے کیا کرنا پڑے گا تاہم جو ہوگا، اس کے بارے میں بعد میں سوچوں گا فی الحال اگر میری وجہ سے کچھ لوگوں کو زندگی اور صحت مل جائے تو میری خوش بختی ہوگی۔

نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا اور ہر نماز میں یہی دعا کرتا تھا کہ مالکِ کائنات! میری حفاظت فرما، میرے ایمان کو داغدار نہ ہونے دینا۔

امتیاز نے اپنا اخبار گویا میرے نام کردیا تھا۔ ہر روز بڑی بڑی خبریں لگوا رہا تھا۔ کچھ دوسرے واقعات بھی ہوئے مثلاً کئی پرائیویٹ اسپتالوں کے سربراہوں نے مجھے پیغامات بھیجے کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ دو حضرات نے ملاقات بھی کی اور پیشکش کی میں ان کے اسپتال کا کوئی بڑا عہدہ قبول کرلوں۔

میں نے عاجزی سے کہا کہ اسی اسپتال سے میری شناخت وابستہ ہے اس لیے بذاتِ خود میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن میں تھوڑا سا بددل بھی تھا۔ ڈاکٹر رضوان کا مسئلہ اپنی جگہ تھا لیکن ڈاکٹر نصر اللہ بھی مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ خدا جانے اس کی وجہ کیا تھی۔ کوئی اہم کیس مجھے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ بڑی غیر اہم جگہوں پر میری ڈیوٹی لگائی جاتی تھی جو سراسر میری توہین تھی پھر ایک دن ڈاکٹر نصر اللہ نے مجھے طلب کرلیا۔

’’تم خوش ہو ڈاکٹر کامران......؟‘‘

’’نہیں سر!‘‘ میں نے غیر متوقع جواب دیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔ ’’تم نے غلط طریقہ اختیار کیا ہے، کوئی بھی مشکل مریض اسپتال آتا ہے، اسے کوئی پیچیدہ بیماری ہوتی ہے جو سمجھ میں نہیں آتی تو ڈاکٹروں کا پینل بیٹھتا ہے، مشاورت ہوتی ہے اور مسئلے کا حل تلاش کیا جاتا ہے لیکن تم نے دونوں کیس تنہا کیے ہیں، بیشک تم ان میں حیرت انگیز طور پر کامیاب ہوئے لیکن یہ طریقہ کار میرے نزدیک غیر مناسب تھا، تمہیں یہ کام اپنے سینئرز کے ساتھ حل کرنا چاہیے تھا۔‘‘

’’میرے لیے کیا حکم ہے سر......؟‘‘ میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نصر اللہ مجھے غصیلی نظروں سے دیکھنے لگے پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ ’’آؤ میرے ساتھ!‘‘

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے وی آئی پی پورشن لے چلے پھر کمرہ نمبر بارہ کے سامنے رک گئے۔ دور سے اس طرف کے ڈاکٹروں نے ہمیں دیکھا اور اس طرف دوڑ پڑے۔ اندر کمرے میں ایک اہم سیاسی شخصیت بستر پر دراز تھی اور دو بڑے نامور لوگ وہاں موجود تھے۔

’’آؤ۔‘‘ ڈاکٹر نصر اللہ نے کہا۔ دوسرے ڈاکٹروں نے بقیہ لوگوں کو پیچھے ہٹا دیا۔

’’اب آپ اپنی جادوگری دکھایئے، انہیں تو آپ پہچان گئے ہوں گے، تین دن سے بے ہوش ہیں، سارے جتن ہوگئے ہیں، دو دو دفعہ سٹی اسکین، دل، دماغ کے سارے ٹیسٹ ہوچکے ہیں، کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، ان کے بارے میں انکشاف فرمایئے۔‘‘ نصر اللہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔

میں نے مریض پر نظر دوڑائی اور غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ میری آنکھوں میں وہی مخصوص دھواں بھر گیا اور مریض کے سارے اعضا نظر آنے لگے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی اور میرے اندر پریشانی کی ایک لہر جاگ اٹھی لیکن اسی وقت مجھے اپنی گردن کے پاس سرسراہٹ محسوس ہوئی اور میرا ہاتھ بے اختیار گردن کی طرف اٹھ گیا تبھی ایک مخصوص منمناہٹ میرے کانوں میں ابھری۔

’’نا ہوا نا! ہم تو ہار ساتھ بھوریا چرن...... چھتانہ کرا اور جو ہم کہیں سن۔‘‘

اس نے مجھے اس مریض کے بارے میں بتایا پھر بولا۔ ’’سمجھ میں آگئی ہوگی تمہیں بات، اب اپنا کام کرا۔‘‘ گردن کی سرسراہٹ کندھے پر آئی۔ میرے سوا اور کوئی اس مکڑی کو نہیں دیکھ سکا جو کندھے سے گزر کر میری کلائی پر آئی پھر نیچے کود کر ایک طرف چلی گئی۔

ڈاکٹر نصر اللہ میرے انہماک سے اکتا کر بولے۔ ’’کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے آپ ڈاکٹر کامران......؟‘‘

’’سر! اب تک یہ کس کی نگرانی میں رہے ہیں؟‘‘

’’ڈاکٹر عمران ان کے معالج ہیں، میں نے اور ڈاکٹر رضوان نے بھی ان کا معائنہ کیا ہے، ان کی رپورٹوں سے کچھ پتا نہیں چل سکا، آپ کوئی معجزہ دکھایئے۔‘‘

مجھے غصہ آگیا۔ کمال کے لوگ ہیں، حسد سے مرے جا رہے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں بغاوت ابھر آئی۔ میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ دو انسانوں کو زندگی ملی تھی۔ ڈاکٹر کے لیے سب سے خوشی کی بات یہی ہوسکتی ہے لیکن یہ سب اپنی انا کا شکار ہوگئے تھے۔

اس وقت پہلی بار میں نے سوچا کہ مجھے یہ اسپتال چھوڑ دینا چاہیے۔

’’میں نے ان کے مرض کا پتا چلالیا ہے سر!‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا لیکن اتنی زور سے کہ ڈاکٹر عمران اور ان لوگوں نے بھی سن لیا جو سیاستدان کے ساتھ تھے۔

ڈاکٹر نصر اللہ کا منہ کھلا پھر بند ہوگیا لیکن مریض کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ ’’آپ ڈاکٹر کامران ہیں؟‘‘

’’جی......!‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’میں نے آپ کے بارے میں اخبار میں پڑھا ہے، میں خصوصی طور پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہمارے لیڈر پر اسی طرح توجہ دیجیے جس طرح آپ نے اپنے پہلے مریضوں پر دی ہے، ہم آپ کو منہ مانگی فیس دیں گے۔‘‘

’’آپ نے اخبار میں یہ بھی پڑھ لیا ہوگا کہ میں صرف اس تنخواہ کو جائز سمجھتا ہوں جو مجھے اسپتال سے ملتی ہے۔‘‘

’’مسٹر اختیار احمد! اس وقت فیس وغیرہ کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی آپ کو، ڈاکٹر کامران! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، آپ بتائیے کیا اندازہ لگایا ہے آپ نے؟‘‘

’’بتایئے مسٹر کامران! آپ نے کافی نمبر بنائے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر نصر اللہ کے تن بدن میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔

’’ان کا ٹی ایم سی کیا جائے جو ساری حقیقت واضح کردے گا، ایک روایتی کیڑا ہوتا ہے جسے پرانے لوگ ’کان سلائی‘ کہتے ہیں، کسی دھاگے کی طرح باریک اور سفید......! تقریباً چار سے پانچ انچ لمبا ہوتا ہے، یہ کیڑا کان میں داخل ہوکر دماغ کی طرف سفر کرتا ہے پھر دماغ کے کسی حصے میں جاکر دماغی رگوں سے لپٹ جاتا ہے اور اپنی جگہ بنالیتا ہے، دماغ کا گودا اس کی غذا ہوتی ہے اور یہ اسی غذا کے بل زندہ رہتا ہے، یہ اسی کا شکار ہیں اور اسی کے تحت بے ہوش ہیں۔‘‘

’’گڈ! آپ کے کہنے کے مطابق یہ دھاگے کی طرح باریک ہوتا ہے؟‘‘ نصر اللہ شاہ نے غرائی آواز میں پوچھا۔

’’جی سر......!‘‘

’’یہ آپ کو کہاں سے مل گیا؟‘‘ ڈاکٹر شاہ کا لہجہ بدستور وہی تھا۔

’’اس کا جواب آپ لوگ دیجیے۔‘‘ میں نے اپنی تشخیص واضح کردی اور سیاستدان کے ساتھی میرا مطلب سمجھ گئے۔

ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا۔ ’’ڈاکٹر شاہ! ہم لوگ اس نوجوان ڈاکٹر پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنا مریض ان کی تحویل میں دیتے ہیں، بہتر ہے آپ مسٹر کامران کو کام کرنے دیں، اخباری خبروں کے مطابق یہ دو انسانوں کا حیرت انگیز علاج کرچکے ہیں جن کے لیے آپ نے ہاتھ اٹھادیے تھے۔‘‘

’’اوکے!‘‘ ڈاکٹر شاہ نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹے۔

اختیار احمد نے ان کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ’’آپ نے یہ رویہ رکھا تو آپ کے بارے میں دوسرا انداز بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، ذرا اس کارڈ پر نظر ڈال لیجیے۔‘‘ اختیار احمد نے ایک کارڈ جیب سے نکال کر ڈاکٹر شاہ کے سامنے کیا۔

ڈاکٹر شاہ کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ انہوں نے کچھ بولنا چاہا تو اختیار احمد نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’آپ سے ایک جائز تعاون طلب کیا جا رہا ہے جو آپ کا فرض ہے، مکمل خاموشی اختیار کیجیے اور ڈاکٹر کامران کی ضروریات پوری کیجیے۔‘‘ اختیار احمد نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔

ڈاکٹر شاہ کا چہرہ بری طرح تمتما رہا تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے کہا۔ ’’ڈاکٹر عمران! ڈاکٹر کامران کی تمام ضرورتیں پوری کردیں، چارٹ دیجیے۔‘‘

ڈاکٹر عمران نے جلدی سے چارٹ ان کے سامنے کردیا۔ اس پر ڈاکٹر شاہ نے ہدایات لکھ دیں جسے اختیار احمد نے خاص طور سے دیکھا تھا پھر اسے میرے سامنے کردیا۔

اب کسی تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈاکٹر رضوان کے رویے کی بنا پر میں ڈاکٹر شاہ سے ملا تھا۔ وہ بھی بہت اچھے اور مہربان انسان تھے لیکن نہ جانے مجھ سے کیوں برگشتہ ہوگئے تھے۔

میری خواہش کے مطابق تمام ٹیسٹ ہوئے۔ ماہرین نے میری نشاندہی پر بڑی باریک بینی سے ان خصوصی ایکسروں کا جائزہ لیا اور آخرکار دماغ کے خلیوں کے درمیان بکھری باریک رگوں میں وہ جگہ تلاش کرلی جو غیر معمولی اور بے ترتیب تھی۔

جائزہ لینے والے ڈاکٹروں کی گہری سانسیں نکل گئیں۔ لیب انچارج نے مجھ سے اجازت لی کہ یہ رپورٹیں ڈاکٹر شاہ کو دکھائی جاسکتی ہیں تو میں نے کہا۔ میں ان کے سامنے طفلِ مکتب ہوں۔

رپورٹیں ڈاکٹر شاہ کو دکھائی گئیں تو انہوں نے مجھے طلب کرلیا۔ ’’بہت خوب! بڑا کام کیا ہے آپ نے، آپ یہ آپریشن ملک میں کرانا پسند کریں گے یا انہیں کسی دوسرے ملک بھیجنا چاہیں گے؟‘‘

’’میں خود یہ آپریشن کروں گا۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

صرف ایک لمحے کے لیے ڈاکٹر شاہ کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہوگئی۔ پھر وہ بولے۔ ’’بڑی مبارکباد اس جرأت پر! بہت باریک اور مشکل آپریشن ہے جس کی اجازت آپ جیسے جونیئر اور ناتجربے کار ڈاکٹر کو نہیں دے سکتا، آپ کو تحریری طور پر اس کی کامیابی اور ناکامی کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔‘‘

’’مجھے کیا کرنا ہوگا؟‘‘ میں نے متانت سے پوچھا۔

’’ڈاکٹر عمران آپ کو بتائیں گے۔‘‘ ڈاکٹر نصر اللہ شاہ نے کہا۔

ضروری کارروائی ہوئی۔ مجھے ایک فارم بھرنا پڑا جس میں اس آپریشن کی اجازت لی گئی تھی نیز یہ کہ سیاستدان کے اہلِ خاندان نے دستخط کیے کہ وہ مجھے مکمل اختیارات دے رہے ہیں جبکہ موت زندگی بہرطور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے خاص طور سے کسی اعلیٰ سرکاری ادارے کے کسی بڑے رکن اختیار احمد نے گواہ کی حیثیت سے دستخط کیے تھے۔

ڈاکٹر عمران نے کہا۔ ’’ڈاکٹر کامران! میں آپ کو اسسٹ کرنا چاہتا ہوں، یہ بھی عرض کردوں کہ اس کی خفیہ ہدایت مجھے ڈاکٹر رضوان نے کی ہے۔‘‘

’’ظاہر ہے، میں معذرت کروں گا، میرے ساتھ صرف سسٹر جمیلہ ہوں گی۔‘‘

خود شاید ڈاکٹر عمران بھی اس مشکل میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میرے انکار نے اسے سکون دیا البتہ نرس جمیلہ کے تاثرات دیکھنے کے قابل تھے۔

تمام تیاریوں کے بعد مریض کو آپریشن تھیٹر میں پہنچادیا گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ خالقِ کائنات! بیشک ایک برے شخص نے میری مدد کی ہے لیکن میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، میں صرف اپنے پیشے کے مطابق عمل کر رہا ہوں، میری مدد کر!

یہ آپریشن بیشک تمام ترطبی اصولوں کے خلاف تھا کیونکہ اتنے بڑے آپریشن کے لیے کئی ماہر ڈاکٹروں کا گروپ ہوتا ہے لیکن یہاں ذاتی اختلاف کی بنیاد پر ایک انوکھا آپریشن کیا جا رہا تھا۔

میں نے کام شروع کردیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سسٹر جمیلہ نے پورے گروپ کی ذمہ داریاں سنبھال رکھی تھیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہترین کارکردگی کی حامل ہے اور شاید اس لیے بھی کہ دوسروں نے اسے کوئی مقام نہیں دیا تھا۔

میں نے اپنی اوقات اور صلاحیتوں سے بڑھ کر عمل کیا۔ غیر مرئی قوتیں میری مدد کر رہی تھیں۔ میں بہت معمولی سی کوشش سے مطلوبہ جگہ تک پہنچ گیا۔

حیرت انگیز بات تھی کہ جب تک میں نے آپریشن شروع نہیں کیا تھا، میرا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا لیکن آپریشن شروع کرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو، جیسے غیر مرئی قوتیں مجھے دلاسہ دے رہی ہوں اور جیسے کوئی انتہائی ماہر برین سرجن اور نیورولوجسٹ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کے ذریعے متحرک کر رہا ہو۔

پورے چار گھنٹے اس آپریشن میں لگ گئے لیکن جیسے ہی میں اپنے کام سے فارغ ہوا، میرا بدن شدت سے کپکپانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی سحر سے آزاد ہوگیا ہوں۔ اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے میں آپریشن تھیٹر سے باہر نکلا تو وہاں بہت کچھ تھا۔

پریس کو دور رکھا گیا تھا لیکن باقی بہت سے لوگ تھے۔ میں نے اختیار احمد سے کہا۔ ’’سر! آپریشن کامیاب رہا ہے، میں نے جس چیز کی نشاندہی کی تھی، وہ دماغ سے نکالی ہے، سسٹر اسے لیبارٹری کے حوالے کردیں گی، آپ میری اتنی مدد کردیں کہ اس وقت میں پریس کا سامنا نہیں کرسکتا، بعد میں اگر ضروری ہوا تو میں ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے ڈاکٹر کامران! آپ آرام کریں۔‘‘ اختیار احمد نے کہا اور مجھے میڈیا سے بچالیا گیا۔

طبیعت پر ایک عجیب سا بوجھ آپڑا تھا۔ بخار سا محسوس ہو رہا تھا لیکن کچھ گھنٹوں کے بعد ٹھیک ہوگیا۔

میں گھر آگیا۔ جاوید انصاری اور سیٹھ جبار کی فیملیاں میری مداح ہوگئی تھیں لیکن میں جانتا تھا کہ دنیا کیا ہے۔ اگر ان سے زیادہ ربط رکھا گیا تو نہ جانے کیا کیا کہانیاں منظرِ عام پر آجائیں اور پھر ڈاکٹر کی ذمہ داری ہی یہ ہے کہ ہر مریض کو اپنا عزیز تصور کرکے اس کا مقدور بھر علاج کرے اور اسے صحت یاب کردے بعد میں وہ مریض کے خاندان سے تو دوستیاں نہیں کرتا پھرتا۔

غرض دوسرے ہی دن نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ رات کے کسی حصے میں مریض کو ہوش آگیا۔ اس کے پاس اختیار احمد تھا۔ دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر خالد علی تھے جو ایک تجربہ کار بزرگ اور بے حد سنجیدہ اور مخلص انسان تھے۔ انہوں نے مریض کی حالت بے حد تسلی بخش بتائی تھی۔

دوسری صبح میں پھر ’’دولہا‘‘ بنا ہوا تھا۔ میڈیا کو چند سوالات کے جواب دیے۔ ایک رپورٹر نے تو بڑا دلچسپ سوال اٹھایا۔ ’’سر! آپ نے دونوں کامیاب آپریشن سسٹر جمیلہ کے ساتھ کیے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟‘‘

’’ہاں! سسٹر جمیلہ آپریشن سے پہلے نماز پڑھ کر اللہ کے حضور اس آپریشن کی کامیابی کے لیے دعا مانگتی ہیں، اس طرح مجھے کامیابی کا یقین ہوجاتا ہے۔‘‘

میرے جواب نے رپورٹر کی زبان بند کردی ورنہ وہ شاید سسٹر کی شکل وصورت کا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔

ویسے بھی معاملہ بڑی شخصیت کا تھا اس لیے اخبارات نے نت نئی سرخیوں کے ساتھ خبریں لگائی تھیں اور مجھے درویش صفت قرار دیا تھا۔ میں ان خطابات سے بہت خوف زدہ تھا۔ والد صاحب کی قبر پر تو حاضری دیتا ہی تھا لیکن لانڈھی جاکر احمد علی کی قبر پر بھی باقاعدگی سے حاضر ہوتا تھا۔

اسپتال کے تمام ڈاکٹر میرے مداح ہوگئے تھے لیکن پتا نہیں ڈاکٹر نصر اللہ شاہ کو کیا ہوگیا تھا۔ جس طرح میرے راستے روکے جاسکتے تھے، روکے جا رہے تھے۔ میں بھی فیصلے کر رہا تھا، آخرکار میں نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔

اسپتال میں کھلبلی مچ گئی۔ تقریباً سارے ڈاکٹر میرے گرد جمع ہوگئے۔ یہاں تک کہ جو ڈیوٹی پر بھی نہیں تھے، وہ بھی اپنے گھروں سے آگئے۔ سب مجھے روک رہے تھے۔ ڈاکٹر شاہ نے میری ایگریمنٹ فائل نکال لی لیکن ہاتھ مل کر رہ گئے کیونکہ ایگریمنٹ پیریڈ ختم ہوگیا تھا، پھر بھی وہ بولے۔ ’’میں تمہارا استعفیٰ منظور نہیں کروں گا۔‘‘

’’نہیں سر......! آج اسپتال میں میرا آخری دن ہے۔‘‘

’’تم نے بہتر فیصلہ نہیں کیا، کون سا اسپتال جوائن کروگے؟‘‘

’’ابھی فیصلہ نہیں کیا لیکن وقت ضائع نہیں کروں گا، پتا نہیں کسے اور کہاں میری ضرورت ہوگی۔‘‘

گھر آگیا۔ گھر والوں کو بتایا۔ سب حیران رہ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کچھ لوگ میری کامیابی سے ناراض ہوگئے ہیں، میں جلد کسی دوسرے اسپتال چلا جاؤں گا۔

مختصر یہ کہ چند ہی روز میں مجھے ایک بے حد شاندار اسپتال سے آفر ملی اور میں نے وہ آفر قبول کرلی۔ مجھے بڑے احترام سے خوش آمدید کہا گیا۔

پھر فوری طور پر میرے امتحان کا وقت بھی آگیا۔ اس مریض کو پنجاب کے ایک شہر سے لایا گیا تھا۔ ان لوگوں تک بھی میری شہرت اخبارات کے ذریعے پہنچی تھی۔ بڑے دولت مند زمیندار لوگ تھے۔

’’میں تنہا ان کا معائنہ کروں گا۔‘‘ میں نے کہا۔

کسی کو اعتراض نہیں ہوا، چنانچہ انتظام کیا گیا۔ اس مریض کی جو ہسٹری مجھے معلوم ہوئی تھی، وہ عجیب وغریب تھی۔ اس میں کچھ اشارے جاوید انصاری کے کیس سے ملتے جلتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کیس میرے لیے دوسرے کیسوں سے زیادہ اہم تھا۔

(جاری ہے)

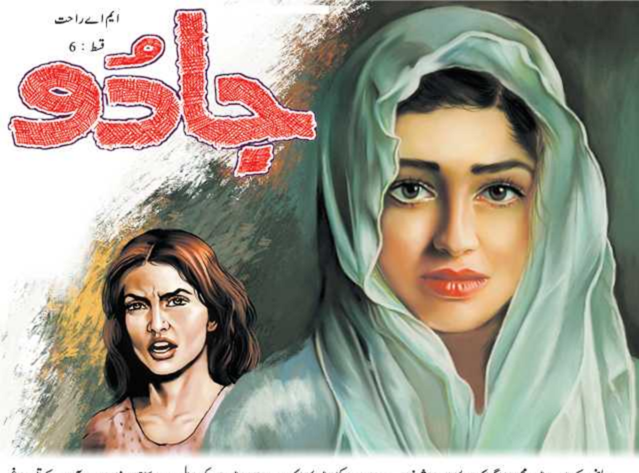

مریض کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ اس کا نام رانا شیر نواز ہے، ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک ہے، نیاز پور میں اس کی حویلی بے حد وسیع اور شاندار ہے، آموں کے تین باغ ہیں جن کے آم دبئی اور امارات کے دوسرے ممالک میں ایکسپورٹ ہوتے ہیں۔

دیکھنے میں شیر نواز خوب تندرست و توانا نظر آتا تھا لیکن ایک دن وہ سونے لیٹا تو پھر نہیں جاگا۔ اس کا جسمانی نظام ٹھیک تھا، تنفس بہترین تھا، جسم کے دوسرے اعضاء بھی ٹھیک کام کر رہے تھے لیکن بس وہ بے ہوش تھا۔

اس کے بیٹے رانا علی نواز نے بتایا۔ ’’ڈاکٹر صاحب! خدا کے فضل سے ہمیں کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہے، بابا آرام سے زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک سو گئے پھر نہیں جاگے، ہماری بستی میں ایک حکیم صاحب ہیں، وہی پوری بستی کا علاج کرتے ہیں، ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تو ہم انہیں لاہور لے گئے، وہاں ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا، سب کی رپورٹیں موجود ہیں، ان کے جسمانی نظام میں کوئی خرابی نہیں ہے، یہ بہترین ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہے۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ان کے جسم نے کوئی غذا قبول نہیں کی۔ وہ بغیر غذا کے زندہ ہیں اور تندرست ہیں، آپ خود ان کا جائزہ لے لیں۔‘‘

’’اوہ! کتنے عرصے سے انہیں غذا نہیں ملی؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

’’پورے دو ماہ ہو گئے۔‘‘

ناقابل یقین بات تھی۔ میں نے اپنے طور پر اس کا معائنہ کرنے کا انتظام کیا اور اس کا فوری بندوبست کر دیا گیا۔ تب میں اسے تنہا کمرے میں لے گیا اور بستر پر لٹا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے اس کے بدن پر توجہ دی تو اس کا پورا اندرونی نظام میری آنکھوں کے سامنے آ گیا لیکن کئی بار گہری نگاہوں سے جائزہ لینے کے باوجود کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔ تبھی ایک دیوار سے باریک منمناتی آواز سنائی دی۔

’’ای تو ہار معاملہ ہے بٹوا......! اکوئی جن بادساہ ہے جس سے ای کا جھگڑا ہوئی ہے، ای ہمار معاملہ نہ ہے رے!‘‘

’’جن بادشاہ......؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’ہاں! مولبی سے بات کر، اوہی مدد کرے گا۔‘‘ بھوریا چرن کی روٹھی روٹھی آواز سنائی دی۔ میں نے دیوار سے چمٹی مکڑی دیکھ لی تھی پھر مکڑی نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور چلتی ہوئی ایک کھڑکی سے باہر نکل گئی۔

میں دیر تک بستر پر پڑے شیر نواز کو دیکھتا رہا پھر مجھے بھوریا چرن کے الفاظ دوبارہ یاد آئے۔

’’مولبی سے بات کر!‘‘ میں سمجھ گیا کہ وہ کون سے مولوی کی بات کر رہا ہے۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نفرت تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ احمد علی کے علاوہ کسی کی بات نہیں کر رہا تھا۔ مولوی صاحب ایک دم یاد آئے تھے۔ اکثر قبرستان جا کر ان کی قبر پر حاضری دیتا تھا۔ نئے اسپتال آنے کے بعد مصروفیات شدید ہو گئی تھیں، اس لیے قبرستان نہیں جا سکا تھا۔

ایک بار پھر میں نے شیر نواز پر نگاہ ڈالی۔ خاموش پُرسکوت چہرہ تھا۔ کیا قصہ ہے، کیسے پتا چلے گا، کیا کروں؟ نیا اسپتال تھا اور یہ پہلا چیلنج تھا اگر میں شیر نواز کا علاج نہ کر سکا تو بڑی ذلت اٹھانی پڑے گی۔ اسپتال والوں نے بڑی چاہت سے بلایا ہے، آرام سے دھکے دے کر نکال دیں گے، گھر کا رہوں گا نہ گھاٹ کا......! کسی کو بتا بھی نہیں سکوں گا کہ معاملہ کیا ہے۔ ایسا انوکھا ڈاکٹر کوئی نہیں ہوگا جو دواؤں یا سرجری کے بجائے کالے جادو کے ایک ماہر کی مدد سے علاج کرتا ہو۔

اسپتال کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ایک رکن نے کہا۔ ’’ایک بڑے زمیندار کا معاملہ ہے ڈاکٹر کامران! اسپتال کو ایسے مریضوں کا انتظار رہتا ہے، آپ کی مہارت ہمارے اسپتال کو چار چاند لگا دے گی، ویسے آپ نے اس کا معائنہ کیا، کوئی اندازہ ہوا اس کے بارے میں......؟‘‘

’’بڑا عجیب کیس ہے، سب سے حیرتناک بات یہ ہے کہ اتنے طویل عرصے سے وہ بھوکا پیاسا ہے لیکن مکمل تندرست ہے۔‘‘ میں نے تشویش سے کہا۔

’’اس پر پوری توجہ دیں ڈاکٹر کامران! ہم نے آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔‘‘

’’جی!‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔

میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ یہ بڑی خطرناک بات ہو گئی تھی۔ پہلے اسپتال میں ڈاکٹر رضوان کے ساتھ کام کر رہا تھا، اچھی عزت تھی کہ سارا معاملہ خراب ہو گیا۔ یہ اسپتال بہترین تھا لیکن خالص کمرشل، جس کا اندازہ آج ہو گیا تھا تاہم اپنی جیسی کوشش کر لینا چاہتا تھا۔

اسپتال سے فرصت ملتے ہی سیدھا لانڈھی چل پڑا۔ قبرستان میں داخل ہو کر احمد علی کی قبر پر پہنچا، پھول ڈالے، اگربتیاں سلگائیں۔

فاتحہ خوانی کے بعد اللہ تعالیٰ سے احمد علی کی مغفرت کی دعا مانگی پھر بڑی دلسوزی سے کہا۔ ’’مولوی صاحب! سو بار لعنت بھیجتا ہوں شیطان بھوریا چرن پر، تھوکتا ہوں اس شہرت پر جو کسی کالے علم کے ماہر کے ذریعے حاصل ہو، اپنے ایمان کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں، کیا کروں، سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، کوئی شہرت نہیں چاہیے مجھے، بس ایک بار میری رہنمائی فرما دیں۔‘‘

جھوٹ تھا نہ خود فریبی......! اچانک ایک اجنبی خوشبو میرے اردگرد پھیل گئی۔ یہ خوشبو ان اگربتیوں کی نہیں تھی جو میں نے جلائی تھیں۔ بہت دیر تک قبر پر رہا، پھر احمد علی صاحب کو سلام کر کے واپس چل پڑا۔

دل پر بوجھ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ گھر پہنچا تب بھی پریشانی چہرے پر سجی ہوئی تھی۔ بھابیوں سے خوش گپی کر کے دل بہلانے کی کوشش کی لیکن سکون ناپید تھا۔ رات کا کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی، سونے کی کوشش کرتا رہا۔ خدا خدا کر کے تین بجے تب کہیں جا کر پلکیں جڑیں اور پھر ایک عجیب عمل شروع ہو گیا۔

میں اسے کسی قیمت پر خواب نہیں کہہ سکتا بس ایک عجیب عالم تھا۔ میری ساری حسیات جاگ رہی تھیں۔ سوتے ہوئے کسی نے میرا شانہ زور سے ہلایا اور میں جاگ گیا۔

’’کون ہے؟‘‘ میرے کانوں نے اپنی آواز سنی۔

’’اٹھو......!‘‘ یہ ایک اجنبی آواز تھی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ’’آؤ!‘‘ آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں بغیر کچھ سوچے سمجھے اٹھ گیا۔

ایک دم دماغ کی چرخی گھومی اور میں نے ٹرین کی وسل سنی۔ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، پورے بدن کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ منظر پھر بدل گیا۔ اب میں ایک تانگے میں بیٹھا تھا، دن کی روشنی تھی اور تانگہ ایک ناہموار سڑک پر جا رہا تھا۔ ہلکی سردی تھی، کوچوان منہ پر کپڑا لپیٹے بیٹھا تھا۔

’’کتنی دور ہے؟‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

’’آ گئے بس! کون سی حویلی جاؤ گے، نئی یا پرانی......؟‘‘ تانگے والے نے کہا۔

’’پرانی حویلی!‘‘ میری آواز دوبارہ نکلی۔

تانگے کا سفر ایک شہری آبادی میں ختم ہوا۔ زندگی رواں دواں تھی، ہر چیز مٹے مٹے نقوش میں نظر آ رہی تھی۔ تانگہ ایسی جگہ جا کر رکا جہاں دو بڑی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ دو حویلیاں تھیں، ایک پرانی اور بوسیدہ دوسری نئی!

میں بڑے اعتماد سے نیچے اترا، تانگے والے کو پیسے دیے اور پرانی حویلی کے ٹوٹے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک بوڑھا آدمی آتا نظر آیا۔ میرے قریب آ کر اس نے سلام کیا اور بولا۔ ’’ادھر آ جاؤ۔‘‘

بڑا اپنائیت بھرا انداز تھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ حویلی باہر سے بوسیدہ نظر آتی تھی لیکن اندر سے بالکل ٹھیک تھی۔ ایک طویل غلام گردش سے گزر کر وہ ایک کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا اور پھر ایک دیوار کے پاس رک گیا۔ اس نے دیوار کے پاس کوئی عمل کیا اور ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ دیوار کی ایک سل ہٹ گئی اور ایک گول دروازہ نمودار ہو گیا، جس کے دوسری طرف سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔

بوڑھے نے مجھے دیکھا اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ کافی وسیع تہہ خانہ تھا جس میں پیلے رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ ایک طرف کچھ برتن، چولہا اور کھانے پینے کے سامان کے ڈبے رکھے تھے۔

بانوں کی دو چارپائیاں تھیں جن میں ایک پر ایک عورت دراز تھی، دوسری چارپائی پر میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ ہمارے قدموں کی آہٹ پر لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور سر پر دوپٹہ درست کرنے لگی۔ چارپائی پر لیٹی عورت بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

’’مہمان آئے ہیں چھوٹی دلہن! انہیں اپنی بپتا سنا دو، شاہ صاحب کا حکم ہے، میں چلتا ہوں۔‘‘ بوڑھے نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

لڑکی اپنی چارپائی سے اٹھ گئی اور دور جا بیٹھی۔

’’ہماری بپتا سنو گے بیٹے! تقدیر کے ستائے ہوئے ہیں، میرا نام مہرالنساء ہے اور یہ میری بدنصیب بیٹی نورالنساء ہے، معصوم اور بھولی بھالی، کوئی قصور نہیں ہے اس مظلوم کا، رانا شیر نواز میرے جیٹھ ہیں اور نورالنساء کے تایا! میرے شوہر طاہر نواز، رانا کے چھوٹے بھائی تھے لیکن سوتیلے! بڑے رانا نے دو شادیاں کی تھیں، طاہر نواز مرحوم چھوٹی بیوی سے تھے۔ بڑی بیگم نے میری ساس عالیہ بیگم کو زہر دے کر ہلاک کر دیا، اس وقت میرے شوہر چار سال کے تھے۔ اتنی بڑی حویلی میں ہر بات چھپ جاتی ہے، میری ساس کی موت بھی آسانی سے چھپ گئی۔ میرے شوہر نوکرانیوں کے ہاتھوں میں پلے۔ بڑے رانا جی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ طاہر نواز جوان ہو گئے۔ ادھر رانا شیر نواز سوتیلے بھائی سے بہت نفرت کرتے تھے۔ طاہر نواز کو احساس تھا کہ حویلی میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور ان کا پرسان حال کوئی نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کر لی۔ میرے والد درویش منش تھے اور عبادت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے میری شادی سادگی سے کر دی مگر ہمیں نئی حویلی میں جگہ نہیں ملی، شیر نواز نے ہمیں پرانی حویلی میں رہنے کا حکم دیا۔ طاہر نواز صلح جو انسان تھے، انہوں نے احتجاج نہیں کیا۔ نورالنساء اسی حویلی میں پیدا ہوئی، شیر نواز کے دو بیٹے ہیں، علی نواز اور دل نواز! دل نواز اپنے باپ اور بھائی سے مختلف مزاج رکھتا ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں اسے تعلیم کے لیے ولایت بھیج دیا گیا مگر وہ جب بھی پاکستان آتا، یہاں پرانی حویلی میں ضرور آتا تھا۔ اسے بہت چھوٹی عمر میں ہی نورالنساء سے بہت پیار تھا، دونوں جوان ہو گئے پھر اچانک رانا طاہر نواز پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہم ماں، بیٹی اب دشمنوں کے رحم و کرم پر رہ گئے اور بڑی بے کسی کے عالم میں زندگی گزارنے لگے، ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس بار دل نواز پاکستان آئے اور ہم سے ملنے آئے تو انہیں طاہر نواز کی موت کا پتا چلا۔ انہیں کسی نے سوتیلے چچا کی موت کے بارے میں بتایا تک نہیں تھا جس پر وہ بہت برہم ہوئے، آخر کار انہوں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ وہ نورالنساء سے شادی کریں گے۔ اس بات پر حویلی میں کہرام مچ گیا۔ میری جٹھانی نے دھمکی دی کہ وہ زہر کھا لیں گی جس پر دل نواز نے کہا کہ یہ ان کا معاملہ ہے، بیشک وہ زہر کھا لیں۔ دل نواز، نورالنساء سے نکاح کر کے مجھے اور اسے ولایت لے جائیں گے اور اپنے پاس رکھیں گے۔ وہ یہ بات کہہ کر وقت سے پہلے واپس چلے گئے۔ جاتے ہوئے کہہ گئے کہ اب وہ اپنے بل پر یہاں آئیں گے اور نورالنساء کو بیوی بنا کر لے جائیں گے۔ پھر ہمیں شیر نواز کے عتاب سے بچانے والا کون تھا۔ شیر نواز نے بظاہر ہمارے ساتھ اچھا سلوک شروع کر دیا لیکن ایک دن ہم سو کر جاگے تو ہم نے خود کو یہاں پایا۔ ہم دنگ رہ گئے، کوئی بات جو سمجھ میں آئی ہو۔ اٹھارہ گھنٹے کے بھوکے پیاسے تھے کہ اس تہہ خانے کے دروازے سے جسے ہم کھولنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو چکے تھے، رانا شیر نواز اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ قہر و غضب بنے داخل ہوئے۔ انہوں نے ہم دونوں کو خوب برا بھلا کہا اور بولے کہ جو خواب ہم دیکھ رہے ہیں، وہ کبھی پورا نہیں ہوگا، اب ہمیں زندگی کے باقی دن اسی تہہ خانے میں کاٹنے ہوں گے، تب سے ہم یہاں پڑے ہیں۔‘‘

میں حیرت سے ظلم کی یہ کہانی سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ’’آپ کو یہاں کتنے دن ہو گئے؟‘‘

’’تین مہینے دس دن! ہم دن گنتے رہتے ہیں۔‘‘

’’کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟‘‘

’’نئی حویلی کے دو جلاد نما آدمی آٹا، دال اور دوسری چیزیں دے جاتے ہیں، کبھی کبھی شاہ جی ضرورت کی چیزیں بھجوا دیتے ہیں۔‘‘

’’شاہ جی کون ہیں؟‘‘

’’ہمیں نہیں معلوم، کوئی اللہ کے نیک بندے ہیں، یہیں حویلی میں رہتے ہیں، ہماری خبرگیری رکھتے ہیں، ہاری بیماری ہو تو دوا دارو بھجوا دیتے ہیں۔‘‘

’’آپ کو ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم......؟‘‘

’’نہیں! کبھی سامنے نہیں آئے، یہی بابا صاحب آ جاتے ہیں، ان کی بھجوائی چیزیں لے کر۔ انہیں کی زبانی شاہ جی کا نام سنا ہے۔‘‘

’’یہ بابا صاحب شیر نواز کے نوکر ہیں؟‘‘

’’ہمیں نہیں معلوم، کبھی ان سے ان کے بارے میں پوچھا تو زبان ہی نہیں کھولی۔‘‘

میں خاموش ہو گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ قید خانے کے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ بابا صاحب اندر آئے تھے۔ انہوں نے اسی سرد اور بے تاثر لہجے میں کہا۔ ’’آؤ!‘‘

میں نے اچانک کسی خیال کے زیر اثر کہا۔ ’’بابا صاحب! ہم ان دونوں کو تہہ خانے سے نکال کر نہیں لے جا سکتے؟‘‘

’’آؤ!‘‘ بابا صاحب نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔

میں نے ہمدردی کی ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی۔ وہ حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں بابا صاحب کے ساتھ تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔

وہ حویلی کے گیٹ کی طرف جانے کے بجائے بائیں سمت چل پڑے۔ اس طرف ایک برج نما جگہ نظر آ رہی تھی جس میں دروازہ تھا۔ بابا نے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں مشینی انداز میں اندر داخل ہو گیا۔ خاصی بڑی جگہ تھی لیکن بالکل خالی! وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

تبھی ایک گونجدار آواز سنائی دی۔ ’’ڈاکٹر کامران! میں تم سے تمہارے مریض شیر نواز کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو، شیر نواز اور اس کی تین نسلیں اسی حویلی میں قیام پذیر رہی ہیں، اسی طرح میری تین نسلیں بھی اسی حویلی میں رہی ہیں، میرا نام امام علی ہے اور میں آتش زادہ ہوں، ہم لوگوں میں کافی یگانگت رہی ہے اور ہم نے ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ وقت گزارا ہے، میں نے مہرالنساء کے والد غیاث احمد سے تعلیم حاصل کی ہے، وہ میرے استاد محترم تھے، مہرالنساء میری استاد زادی ہیں، میرے لیے بڑی محترم! ان کے ساتھ اس حویلی میں بہتر سلوک نہیں ہوا لیکن ہم بڑی مشکل کا شکار رہے۔ اس خاندان کو بھی ہم کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ طویل عرصہ قبل یہ لوگ نئی حویلی میں منتقل ہو گئے پھر وقت گزرا، نئے عوامل سامنے آئے اور پھر شیر نواز نے ان ماں بیٹی کے ساتھ یہ بدسلوکی کی، مجھے اپنی استاد زادی کے ساتھ یہ سلوک بہت برا لگا لیکن مجھے سخت اقدام کی اجازت نہیں ملی البتہ تھوڑا بہت شیر نواز کو سبق دینے کی اجازت مل گئی تاکہ اسے راہ راست پر لایا جا سکے۔ ڈاکٹر کامران! وہ جس کیفیت کا شکار ہے، وہ بہت دلچسپ ہے، بظاہر وہ سو رہا ہے لیکن وہ جاگ رہا ہے، بظاہر وہ صحت مند ہے لیکن اندر سے شدید بھوکا پیاسا ہے، وہ سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے شاید اپنی کیفیت پر پچھتا بھی رہا ہو، اس کا منصوبہ تھا کہ جب اس کا بیٹا واپس آئے گا تو یہ اسے استاد زادی اور اس کی بیٹی کی بے راہ روی کی کہانی سنائے گا اور کہے گا کہ وہ کسی امیر زادے کے ساتھ فرار ہو گئی ہیں، میری نگاہوں میں استاد محترم بھی ہیں اور اس خاندان سے کئی نسلوں کی رفاقت بھی! میں اگر چاہتا تو استاد زادی کی تحقیر کے جرم میں شیر نواز کو کوڑھی بھی کر سکتا تھا لیکن میں نے اسے موقع دیا ہے، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اسے اس کے جرم سے آگاہ کرو اور اس سے عہد لو کہ وہ بیٹے کی واپسی پر نورالنساء کی شادی مکمل عزت و احترام سے کرے اور ان کو بیرون ملک روانہ کر دے گا۔‘‘

’’بہتر ہے جناب!‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’خادم حسین! ڈاکٹر صاحب کو احترام سے چھوڑ آؤ۔‘‘

’’آؤ!‘‘ بزرگ نے مخصوص لہجے میں کہا اور میں خاموشی سے واپس مڑ گیا۔ ایک عجیب سی گڑگڑاہٹ دماغ میں گونجی اور میں جاگ گیا۔ باہر کوئی گاڑی اسٹارٹ ہو رہی تھی۔ اسی وقت پاس کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔

’’اللہ اکبر......اللہ اکبر......!‘‘

’’اللہ اکبر!‘‘ میرے منہ سے بے اختیار نکلا پھر دل میں مسرت کی ایک لہر پھوٹ پڑی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھ پر گزری تھی، وہ نیند کی کیفیت میں نہیں گزری تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ ساری رات جاگا تھا اور میری رہنمائی ہوئی تھی۔ میرا ایمان تھا کہ جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔

بستر چھوڑ دیا، وضو کیا، نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ بہت لطف آیا تھا نماز میں۔ اپنی کامیابی کی دعا مانگی پھر فارغ ہو کر سوچ میں ڈوب گیا کہ اب کیا کروں؟ کس طرح اپنے کام کا آغاز کروں۔ سوچتا رہا اور کچھ طے کر لیا۔

مقررہ وقت پر اسپتال پہنچ گیا۔ رات کی نرس سے رپورٹ لی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دن کو گیارہ بجے اسپتال کے ایم ڈی حفیظ اللہ نے طلب کر لیا۔ یہاں سب میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتے تھے۔

’’جی ڈاکٹر کامران! میں آپ سے شیر نواز کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، ہمارے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ شیر نواز کی بیماری دنیا کی سب سے انوکھی بیماری ہے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے، مجھے سب سے بڑا خدشہ اس کی بھوک کا ہے، مصنوعی ذریعے سے اسے خوراک دینے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے، سب کو حیرت ہے کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہے اور زندہ بھی اس طرح کہ اس کی صحت بھی بحال ہے، میں اس کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، اگر ہم اسے صحت یاب کرنے میں کامیاب ہو گئے تو اسپتال کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے، مالی بھی اور دوسرے بھی! آپ اس کے بارے میں اپنی رائے دینا پسند کریں گے؟‘‘

’’ان شاءاللہ! وہ ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’اوکے!‘‘ ایم ڈی صاحب نے کہا پھر ایک دم بولے۔ ’’آپ ان کا کیا ٹریٹمنٹ کریں گے؟‘‘

’’میں آج کوشش کروں گا۔ ممکن ہے آج ہی آپ کو اس کا رزلٹ دے سکوں۔‘‘ میں نے گول مول جواب دیا۔

’’اوہ! بڑا سسپنس پیدا کر دیا ہے آپ نے، خیر ہم انتظار کریں گے۔‘‘

بات ختم ہو گئی۔ میرے اندر اب ایک اعتماد سا پیدا ہو گیا تھا جبکہ بات خواب جیسی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

آخر کار میں شیر نواز کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اس کے پاس اس کا بڑا بیٹا علی نواز اور اس کی بیوی موجود تھے۔

علی نواز کسی قدر مغرور آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ ’’ہم آپ کے بارے میں بہت کچھ سن کر آئے ہیں ڈاکٹر کامران! لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہو سکا۔‘‘

’’آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟‘‘ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

’’دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عام سا علاج ہو رہا ہے، خیر آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔‘‘

’’آپ کے چھوٹے بھائی انگلینڈ سے نہیں آئے؟‘‘ میں نے بے تکا سوال کیا اور علی نواز چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

’’میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھا؟‘‘ اس نے کہا۔

’’حیرانی کی بات ہے کہ شیر نواز کی اس نازک حالت کے باوجود وہ نہیں آئے۔‘‘

’’کیا مرض کی تشخیص کے لیے ہمارے خاندانی حالات کی چھان بین بھی ضروری ہے؟‘‘

’’جی، بہت ضروری ہے، خیر آپ لوگ باہر جائیے۔‘‘ پھر میں نے ڈیوٹی نرس کو پکارا۔ ’’نرس......!‘‘

’’یس سر......!‘‘ نرس مستعدی سے میرے پاس آ گئی۔

’’جب تک میں اجازت نہ دوں، کمرے میں کسی کو نہ آنے دیا جائے۔‘‘ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

’’یس سر! آئیے سر......!‘‘ اس بار نرس نے علی نواز کو مخاطب کر کے کہا۔

علی نواز کے چہرے پر ناگواری صاف محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ نرس میرے اشارے پر خود بھی باہر چلی گئی۔ تب میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اب مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میں شیر نواز کے پاس آ کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر مکمل بے ہوشی کے آثار تھے۔

تب میں نے کہا۔ ’’شیر نواز......! میں امام علی کے حوالے سے تم سے آنکھیں کھولنے کی درخواست کرتا ہوں، تم سن رہے ہو رانا شیر نواز......! دیکھو امام علی نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، تم آنکھیں کھولو اور مجھ سے بات کرو۔‘‘ میں غور سے شیر نواز کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اس وقت میرا دل زور سے دھڑکا جب میں نے شیر نواز کی آنکھوں کے پپوٹے ہلتے دیکھے۔

میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہونی ہو رہی تھی۔ شیر نواز کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں ماحول سے اجنبیت تھی پھر اس نے زبان نکال کر ہونٹوں پر پھیری اور اس کے منہ سے انتہائی نحیف آواز نکلی۔ ’’پانی......پانی!‘‘

’’نہیں شیر نواز! تمہیں پانی نہیں ملے گا۔‘‘

’’پانی......آہ پانی! میں مر جاؤں گا۔‘‘

’’تمہیں خوراک اور پانی دونوں چیزیں ملیں گی لیکن اس سے پہلے تمہیں اپنے گناہوں پر غور کرنا پڑے گا، ان مظلوم ماں، بیٹیوں کو یاد کرنا پڑے گا جنہیں تم نے حویلی کے تہہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔‘‘

’’مجھے تھوڑا سا پانی دے دو۔‘‘

’’کاش! میں دے سکتا، تم نے یہ کانٹے خود بوئے ہیں، امام علی کا نام یاد ہے تمہیں؟‘‘

’’اِیں......ہاں......شاید......!‘‘

’’اور مہرالنساء اور نورالنساء کا!‘‘

’’وہ تو اب تک مر چکی ہوں گی۔‘‘ شیر نواز کے حواس واپس آ رہے تھے۔

’’تم زندہ ہو؟‘‘ میں نے سوال کیا اور وہ جیسے خود پر غور کرنے لگا۔

پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ’’میں......! پتا نہیں۔ شاید مر گیا ہوں، لیکن مرنے کے بعد بھی کیا بھوک اور پیاس لگتی ہے اور پھر میرے بدن پر تو کفن بھی نہیں ہے، تم کیا فرشتے ہو؟ مجھے بتاؤ کیا میں مر چکا ہوں؟‘‘

’’مجھے تم سے ہمدردی ہے شیر نواز! تم نے زندگی بھر اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بدسلوکی کی ہے، بیشک وہ سوتیلا تھا لیکن انسان تو تھا اور پھر اس کی موت کے بعد اس کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا، وہ یاد ہے تمہیں! نورالنساء تمہارا خون تھی، اگر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو کیا بگڑ جاتا تمہارا! تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ بھوک، پیاس کیا ہوتی ہے، تم نے ان پر ظلم کیا ہے جو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔‘‘

’’ہاں! ایسا ہوا ہے مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔‘‘

’’وہ دونوں زندہ ہیں، تم بھی زندہ ہو، بولو کیا چاہتے ہو، کیا اب بھی تم ان کے ساتھ اپنا ظلم جاری رکھنا چاہتے ہو؟‘‘

’’نہیں! میں نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے۔‘‘ شیر نواز کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

’’تم اپنے کیے کا ازالہ کر سکتے ہو شیر نواز! نورالنساء کو اپنے پیار کے سائے میں جگہ دو، اس پر شفقت کرو، اسے اپنی بہو بنا لو، کیا تم ایسا کر سکو گے؟‘‘

’’میں زندہ ہوں نا......؟‘‘

’’ہاں......!‘‘

’’تم کون ہو؟‘‘

’’ڈاکٹر ہوں، تمہارا علاج کر رہا ہوں۔‘‘

’’تمہیں یہ تفصیل کیسے معلوم ہوئی؟‘‘

’’امام علی سے۔ لیکن تم اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گے اور میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے!‘‘

’’ہاں! میں نے سزا پالی ہے، میں وہی کروں گا جس کا حکم مجھے ملا ہے، امام علی ہماری خاندانی روایت ہیں مگر میری آنکھیں بند تھیں، بہت کچھ کھو دیا ہے میں نے، نہ جانے کیوں!‘‘

’’اب کیا چاہتے ہو، کیا کھاؤ گے؟‘‘

’’کچھ نہیں! میری بھوک، پیاس ختم ہو گئی، احساس گناہ ہے مجھے، اب اور کوئی احساس نہیں ہے، تم سے ایک سوال کروں؟‘‘

’’ہاں بولو!‘‘

’’کیا تم بھی آتش زادے ہو؟‘‘ اس سوال پر مجھے ہنسی آ گئی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’نہیں رانا صاحب! بس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے بہرہ ور ہو رہا ہوں، اس نے مجھے بڑے اعزازات بخشے ہیں، چلو بات ختم ہو گئی، تم اب صحت یاب ہو، میں چلتا ہوں۔‘‘ میں نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور کمرے کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

علی نواز نے ناخوشگوار نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’آپ انہیں ان کی پسند کی ہر چیز کھلا سکتے ہیں، انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔‘‘ یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں میاں، بیوی پریشان نظروں سے مجھے دیکھتے رہ گئے۔

مجھ پر ایک عجیب انبساط کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ کیا اعزاز عطا کیا ہے مجھے مالکِ کائنات نے! یہ احسان تو مجھ پر بھوریا چرن نے بھی نہیں کیا تھا لیکن میری رہنمائی ہوئی تھی۔

میں ڈیوٹی روم میں جا بیٹھا۔ یہاں کچھ مریضوں کی فائلیں رکھی ہوئی تھیں، میں ان کا جائزہ لینے لگا۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک میں نے علی نواز کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا آ رہا تھا۔ میرا دل دھک سے ہو گیا۔ خدا خیر کرے۔ میں نے سوچا۔

علی نواز نے مجھے دیکھا اور میری طرف لپکا۔ قریب آ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا، بری طرح بدحواس ہو گیا تھا، اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ ’’معاف، معاف! معاف کر دیں، غلطی ہو گئی، بڑی غلطی ہو گئی، ڈاکٹر صاحب آپ درویش ہیں، مجھے معاف کر دیں، آپ نے......آپ نے!‘‘

اس کے الفاظ سن کر مجھے اطمینان ہوا۔ گویا سب ٹھیک ہے۔ میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ’’میری طرف سے رانا صاحب کی نئی زندگی کی مبارکباد قبول کرو۔‘‘

پھر اس سے بھی بڑا اعزاز اس وقت ملا جب تھوڑی دیر بعد میں نے ایم۔ ڈی کو چند دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ اسی طرف آتے دیکھا۔

میں جلدی سے ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا تو وہ مسکرا کر بولے۔ ’’آخر تم نے شیر نواز کو ٹھیک کر دیا، مبارکباد! ہاں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، تم نے شیر نواز کے بیٹے سے کہا ہے کہ وہ اپنے باپ کو اس کی پسند کی چیزیں کھلائے؟‘‘

’’جی سر......!‘‘

’’اس کا سسٹم تو نالیوں یا ڈرپ کے ذریعے خوراک تک قبول نہیں کر رہا تھا، کیا وہ ہیوی ڈائٹ لے سکتا ہے؟‘‘

’’آپ نے اس کی تمام رپورٹیں دیکھی ہیں سر! اس کا پورا جسمانی نظام فٹ ہے، ہلکی خوراک اسے مطمئن نہیں کر سکے گی، اگر ہوش آنے کے بعد ہم اسے طاقتور خوراک نہیں دیتے تو اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔‘‘ میں نے زبردستی کی تاویل پیش کی۔

ایم۔ ڈی خود بھی ایک بڑے ڈاکٹر تھے، میری بات سے بالکل متفق نہیں تھے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ’’خیر تم اگر مطمئن ہو تو ٹھیک ہے، میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا، میں تمہارے اس کارنامے کا قائل ہو گیا، کاش تم ہمیں اپنے طریقہ علاج کے بارے میں بتا دیتے۔‘‘

’’سر......! آپ مریض میرے سپرد کیجیے، میرے طریقہ علاج کی جستجو کے چکر میں نہ پڑیے۔‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

ظاہر ہے ایم۔ ڈی کو میرا یہ جواب پسند نہیں آیا ہوگا لیکن شیر نواز کے ذریعے جو رقم اسپتال کو موصول ہوئی تھی، اس نے ایم۔ ڈی کو زیادہ برا نہ ماننے دیا۔ اسپتال میں مجھے بڑی عزت دی جاتی تھی۔ کئی ایسے کیس مجھے دیے گئے جن میں صحیح مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی تھی لیکن میری آنکھیں صحیح مرض کی شناخت کر لیتی تھیں اور مریض کے جسم میں جہاں کہیں کوئی ایسا نقص ہوتا جو عام ٹیسٹ نمایاں نہ کر پاتے، مجھے ان کا پتا چل جاتا تھا، البتہ میرے اندر ایک اضطراب ہمیشہ رہتا۔

مجھے احساس تھا کہ میری یہ قوت ایک خبیث روح کی مرہون منت ہے۔ میں ایک مسلمان گھرانے کا فرد تھا اور ابتداء سے ہی عبادت گزار تھا۔ میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ عمل تھا کہ میں بھوریا چرن کی مدد سے امراض کی شناخت کروں لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بھوریا چرن کے عمل سے کچھ لوگوں کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ یہ چیز مجھے الجھا دیتی تھی اور میں اضطراب کا شکار ہو جاتا تھا۔

وقت گزرتا رہا، البتہ اس دوران بھوریا چرن کسی شکل میں میرے سامنے نہیں آیا تھا جبکہ شیر نواز کا کیس بھی بالکل الگ نوعیت کا تھا۔

پھر ایک دن امتیاز احمد میرے پاس آیا۔ میں نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔

’’اصولی طور پر مجھے آپ کے پاس گھر آنا چاہیے تھا لیکن ناصر انصاری نے منع کیا کہ آپ اپنے احسانمندوں سے گھر پر ملاقات نہیں کرتے۔‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے امتیاز صاحب! معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ دنیا بہت مختلف انداز میں سوچتی ہے، میرے ذریعے میری بہن کہہ لیجیے یا بھابی کو اللہ تعالیٰ نے صحت دے دی، یہ اس کا انعام ہے مگر دنیا یہ سوچ سکتی ہے کہ میں اس کے بعد کسی ذاتی مفاد کے لیے آپ سے ملتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ بڑے انسان ہیں، میں نے اپنے اخبار میں غلط نہیں لکھا۔ اداریہ لکھا ہے میں نے آپ پر، جس کا عنوان تھا ڈاکٹر یا درویش!‘‘

’’اوہ خدا کے لیے ایسا نہ کریں، کہیں منہ کے بل زمین پر نہ گرنا پڑے، یہ خالق کائنات کی کرم نوازی ہے کہ اس نے سرخرو کیا ہے، میں بے حد خوف زدہ رہتا ہوں۔‘‘

’’خیر وہ آپ کے بارے میں میرے جذبات ہیں، میں اس وقت ایک اہم کام سے آپ کے پاس آیا ہوں، کچھ وقت دے سکیں گے؟‘‘

’’ہاں......ہاں! کیوں نہیں، ویسے یہ غلط ہے کہ آپ میرے پاس گھر آنے سے گریز کریں، گھر میں میری والدہ ہیں، بھابیاں ہیں، آپ علینا بھابی کے ساتھ ضرور تشریف لائیے۔‘‘

’’بے حد شکریہ! میں حاضری دوں گا، میرے دفتر میں میرے اکاؤنٹینٹ وارث علی ہیں، دس سال سے میرے ساتھ کام کرتے ہیں، نہایت شریف اور اعلیٰ نسب ہیں، ایک مشکل کا شکار ہو گئے ہیں بے چارے، بیٹی ہے ان کی تقریباً اکیس سال کی...... غیر شادی شدہ ہے، کسی دماغی عارضے کا شکار ہے، اکثر اس پر دورے پڑتے ہیں اور عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں، تعویذ گنڈوں کے قائل نہیں ہیں، ان کا خیال ہے کوئی پیچیدہ دماغی بیماری ہے، آپ کو دکھانا چاہتے ہیں لیکن یہ مہنگا اسپتال افورڈ نہیں کر سکتے، آپ یقین کریں میں نے انہیں مالی پیشکش بھی کی تھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کی، آپ سے یہ درخواست میں نے ذاتی طور پر کی ہے۔‘‘

’’سر آنکھوں پر......حکم فرمائیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ بتائیے جیسے آپ چاہیں، میں اس کا یہاں بھی علاج کرانے کے لیے تیار ہوں، اخراجات میں کروں گا، بس وارث علی یہ قبول نہیں کریں گے، اگر کسی طرح وہ تیار ہو جائیں تو آپ ذرا توجہ فرما کر دیکھ لیں۔‘‘

تھوڑے سے تبادلہ خیال کے بعد طے ہو گیا کہ میں خود وارث علی کے گھر جا کر ان کی بیٹی کو جس کا نام شائلہ تھا، دیکھوں گا۔ اس کے لیے وقت مقرر ہو گیا۔

مقررہ وقت پر امتیاز نے مجھے اسپتال سے لے لیا۔ وہ اپنی کار میں تھا اور میں اپنی گاڑی میں! کچھ دیر کے بعد ہم ایک درمیانے درجے کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ ایک سو بیس گز پر بنے ہوئے اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں وارث علی نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ امتیاز احمد کی آمد کا سن کر دنگ رہ گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر تو ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

’’میں آپ کا تعارف کرا دوں وارث علی صاحب!‘‘ امتیاز احمد نے کہا۔

وارث علی بولے۔ ’’ڈاکٹر صاحب کی تصویریں میں نے اپنے اور دوسرے اخباروں میں دیکھی ہیں لیکن کبھی یہ گھر بھی ان کے قدموں کی برکت سے بہرہ ور ہوگا، یہ سوچا بھی نہیں تھا۔‘‘

’’یہ شائلہ کا علاج اپنے اسپتال میں کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن میری درخواست پر اسے دیکھنے آئے ہیں۔‘‘

’’بیٹے! آپ کا اسپتال تو بہت بڑا ہے، وہاں تو کروڑ پتی ہی جا سکتے ہیں۔‘‘ وارث علی بولے۔

’’آپ نے مجھے بیٹے کہہ کر پکارا ہے، کیا اس کے بعد یہ گنجائش ہے کہ میری بہن کا علاج اس کا بھائی ضرورت کے مطابق نہ کرے، اگر شائلہ کو اسپتال کی ضرورت ہوئی تو اس کا علاج وہیں ہوگا۔‘‘

وارث علی کچھ نہ بولے لیکن میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو آتے ہوئے دیکھے تھے، پھر وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گئے یہ کہہ کر کہ میں چائے کا بندوبست کرتا ہوں۔

’’وارث علی صاحب کے بیٹے نہیں ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں! بس دو بیٹیاں ہیں، ایک شائلہ سے چھوٹی ہے۔‘‘ امتیاز نے بتایا۔

چائے کے دوران شائلہ کے بارے میں مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ بیماری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پہلے کبھی کبھی دورے پڑتے تھے مگر اب مسلسل ایک ہی کیفیت کا شکار تھی اور مسلسل دورے کی حالت میں رہتی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد میں وارث علی کے ساتھ گھر کے اندرونی کمرے میں آیا جہاں شائلہ موجود تھی۔

وارث علی کی بیگم پردہ نشین تھیں، وہ کمرے کے دوسرے دروازے کے پیچھے کھڑی تھیں۔ شائلہ ایک مسہری پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ سرخ و سفید رنگت، بے حد جاذب نگاہ نقوش، سب سے حیرتناک چیز اس کے بال تھے جو لازمی طور پر اس کی پنڈلیوں تک ہوں گے، بے حد خوبصورت اخروٹی رنگ والے، ایک نگاہ میں وہ کسی معمولی گھر کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔

’’مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہائی درکار ہے۔‘‘ میں نے کہا اور وارث علی نے گردن خم کر دی۔ وہ اس اندرونی دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور شاید بیگم صاحبہ کو بھی وہاں سے ہٹا دیا۔

شائلہ اسی طرح ساکت پڑی تھی۔ میں نے پورے اعتماد سے اس کا جائزہ لیا۔ بھوریا چرن نے جو قوت میری آنکھوں کو دی تھی، وہ بدستور موجود تھی اور میں اس سے مسلسل کام لے رہا تھا۔ اس وقت بھی میری آنکھوں میں شائلہ کا اندرونی نظام روشن ہو گیا اور میں اس کے پورے بدن سے گزر کر اس کے دماغ تک پہنچ گیا۔ میں نے اس کے دماغ کا دیر تک جائزہ لیا لیکن کہیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی پھر اچانک میں اچھل پڑا۔

شائلہ کے حلق سے بے اختیار ایک قہقہہ آزاد ہو گیا تھا لیکن انتہائی بھونڈی اور مکروہ آواز تھی۔

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا، اسی وقت شائلہ نے آنکھیں کھول دیں۔ بے حد حسین آنکھیں تھیں لیکن اس وقت ان کے ڈھیلے گہرے نارنجی رنگ کے ہو رہے تھے۔

پھر اس کے منہ سے ایک بھیانک مردانہ آواز نکلی۔ ’’دیکھ لیا میاں جی! اور دیکھ لو۔ اس کے بعد ہمارے سامنے مت آنا، نہیں تو دھوبی کا کتا بنا دیں گے۔‘‘

میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ بھوریا چرن کو دیکھا تھا، بنسی راج کو دیکھا تھا اور بھی کچھ پراسرار واقعات پیش آئے تھے لیکن یہ اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ تھا جب کوئی بدروح براہ راست مجھ سے ہمکلام ہوئی تھی۔

شائلہ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ عام حالات ہوتے اور بھوریا چرن کو نہ دیکھ چکا ہوتا تو زمانہ جدید کے نوجوانوں کی طرح کبھی اس طرح کے واقعات پر یقین نہ کرتا لیکن سب کچھ ہی تو دیکھ چکا تھا۔ جاوید انصاری کا واقعہ اور اس کے بعد سے اب تک جانے کیا کیا! فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی اور ہی چکر ہے لیکن ان چکروں کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اب کیا کروں؟ شیر نواز کا معاملہ اور تھا اس نے ایسے مظلوموں پر ہاتھ ڈالا تھا جن کی سرپرستی موجود تھی اور شیر نواز بمشکل اپنی جان بچا سکا تھا۔ لیکن یہ لڑکی......؟

کیا کہوں ان لوگوں سے! کیا ہاتھ کھینچ لوں مگر کیا کہہ کر......؟ پھر ایک دم احمد علی کا خیال آیا۔ پتا نہیں کیوں ان پر ایک اعتماد ہو گیا تھا۔ اس خواب کے بعد تو دل میں ان کا مقام اور بڑھ گیا تھا۔ ابھی انہیں دوٹوک جواب دینا مناسب نہیں تھا۔ کوئی گول مول سا جواب دے دوں بعد میں دیکھوں گا کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔

میں نے وارث علی کو آواز دی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ وارث علی کسی دوسرے دروازے سے باہر نکل آئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں امتیاز موجود تھا۔

’’میں نے شائلہ کا معائنہ کر لیا ہے، کچھ وقت لوں گا اس کے بعد ان کا علاج تجویز کروں گا، میرا خیال ہے انہیں اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔‘‘

’’اس کی جان کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے ڈاکٹر صاحب......؟‘‘ وارث علی نے پوچھا۔

’’ان شاءاللہ نہیں، یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔‘‘

کچھ دیر کے بعد ہم وارث علی کے گھر سے نکل آئے۔ امتیاز نے پوچھا۔ ’’آپ گھر جائیں گے یا اسپتال......؟‘‘

’’میں اب گھر جاؤں گا۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

امتیاز نے کہا۔ ’’میں دفتر جاؤں گا، آپ سے شائلہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔‘‘

’’ان شاءاللہ بہتر ہوگا، فکر کی کوئی بات نہیں۔‘‘ میں نے گول مول سا جواب دیا۔

ہم دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر چل پڑے لیکن میں شائلہ کے ساتھ پیش آنے والے ان لمحات سے عجیب سی وحشت کا شکار ہو گیا تھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں تھا بس تقدیر نے عجیب کھیل کھیلا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈاکٹر ہی رہنا چاہتا تھا، فقیر یا درویش بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔

اپنے پیشے سے بہت مخلص تھا اور دل سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ایک بڑا ڈاکٹر کہلاؤں جس پر میرے اہل خاندان فخر کریں۔ ایسا وقت سے بہت پہلے ہو گیا تھا اور ہر طرف میرا نام گونج رہا تھا لیکن یہ ذریعہ غلط تھا۔ میں اس ذریعے سے نام نہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

نہ جانے کس طرح کار کا رخ لانڈھی کی طرف ہو گیا۔ احمد علی کی قبر پر جا کر ہمیشہ سکون قلب حاصل ہوتا تھا۔ طویل فاصلہ طے کر کے لانڈھی کے قبرستان پہنچ گیا۔ احمد علی کی قبر پر پھول چڑھائے، فاتحہ خوانی کی۔ دعائے مغفرت کے بعد میں نے کہا۔ ’’محترم بزرگ! ہر بات آپ کے علم میں ہے، اس بچی کے علاج کے لیے میری رہنمائی کریں، آپ کی رہنمائی کا انتظار کروں گا۔‘‘

بہت دیر تک وہاں رکا پھر واپس چل پڑا۔

اس رات خواب میں کسی رہنمائی کا منتظر رہا لیکن نیند ہی نہیں آئی تھی، خواب کہاں سے آتا البتہ ایک بات نہ جانے کہاں سے ذہن میں گھس آئی تھی۔ کہیں یہ لڑکی شائلہ پائل تو نہیں ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے بے چین ہو گیا اور دوسری صبح ناشتے کے فوراً بعد موبائل فون پر امتیاز کو کال کیا۔

’’امتیاز صاحب! میں ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں، آپ سو تو نہیں رہے تھے؟‘‘

’’بالکل نہیں! آفس جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔‘‘

’’ایک زحمت دینی ہے آپ کو، جیسے بھی بن پڑے آپ وارث علی سے رابطہ کر کے ان سے معلوم کریں کہ شائلہ ’’پائل‘‘ تو نہیں ہے، یہ بات ان کی بیگم بتا سکیں گی۔‘‘ میں نے پائل کے بارے میں امتیاز کو تفصیل بتائی اور امتیاز نے کہا کہ وہ فوری طور پر مجھے جواب دیتا ہے۔ میرے اسپتال روانہ ہونے سے پہلے ہی مجھے امتیاز کا فون موصول ہو گیا۔

’’نہیں ڈاکٹر کامران! وہ پائل نہیں ہے۔‘‘

اسپتال میں مصروفیات نے سب کچھ بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے مرض کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ بڑے بڑے ذہین اور تجربہ کار ڈاکٹر یہاں موجود تھے۔ شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹر کنسلٹنٹ کی حیثیت سے جز وقتی یہاں بیٹھتے تھے۔ سب کے الگ الگ مزاج تھے۔ کچھ پیچیدہ امراض میں مجھ سے رابطہ کر کے رائے لیتے تھے اور کچھ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے مریض سے کوئی رابطہ رکھوں۔ ہاں کچھ ایسے لوگ جو میری شہرت سے واقف ہو جاتے، آ کر خصوصی طور سے مجھ سے رابطہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے میں اسپتال کا سب سے مہنگا ڈاکٹر بن چکا تھا لیکن اسپتال کے مالکان میری بے نیازی کی تعریف کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اگر میں چاہتا تو منہ مانگے معاوضے وصول کر سکتا تھا لیکن میں کبھی کوئی پیشکش قبول نہیں کرتا تھا۔ میری اس بے نیازی کے بارے میں جاننے کی خفیہ کوششیں بھی کی گئی تھیں لیکن میں غلط راستوں کا راہی نہیں تھا۔

دو دن گزر گئے پھر ایک صبح امتیاز کا فون موصول ہوا۔

’’ڈاکٹر کامران! آپ ٹھیک ہیں، آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔‘‘

’’ہاں! کچھ مصروفیت تھی، خیریت، بتائیں؟‘‘

’’خیریت نہیں ہے، کل رات شائلہ پر سخت دورہ پڑا ہے، پہلے اس نے گھر میں ہنگامہ برپا کیا، بہت توڑ پھوڑ کی پھر گھر سے نکل بھاگی اور بے تحاشا سڑک پر دوڑ پڑی جس کے نتیجے میں سبزیوں کی ترسیل کرنے والے ایک ٹرک سے ٹکرا کر زخمی ہو گئی، اسے سرکاری اسپتال پہنچا دیا گیا، پولیس کیس بن گیا ہے۔ پولیس کو بتایا گیا ہے کہ وہ نیند میں چلنے کی مریضہ تھی، اس لیے اس عالم میں گھر سے نکل گئی اور حادثہ ہو گیا، میری مداخلت سے پولیس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔‘‘

’’اوہ! اس وقت کہاں ہے؟‘‘

’’اسپتال میں ہے۔‘‘

’’اسے یہاں لے آئیں امتیاز صاحب! ہم اسے یہیں رکھیں گے۔‘‘

’’میں خود بھی یہی چاہتا تھا اور باقی......!‘‘

’’نہیں باقی کچھ نہیں، آپ بے فکر ہو کر اسے یہاں لے آئیے۔‘‘

’’اوکے!‘‘ امتیاز نے کہا۔ فون بند کر کے میں شائلہ کے لیے کمرے کا بندوبست کرنے لگا۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی جب چیئرمین نے خوشدلی سے کہا۔ ’’ڈاکٹر کامران! آپ پورا حق رکھتے ہیں جسے چاہیں اسپتال میں ایڈمٹ کریں، آپ کہتے ہیں وہ ایک غریب لڑکی ہے، آپ اپنے کوٹے پر کسی کا بھی بلا معاوضہ علاج کر سکتے ہیں۔‘‘

امتیاز، وارث علی اور بیگم وارث علی کے ساتھ ایک ایمبولینس میں آ گئے۔ شائلہ بے ہوش تھی۔ اس کے سر اور بازوؤں پر چوٹ تھی۔ میں نے اسے ایمرجنسی میں دیکھا، بہتر حالت تھی، کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا چنانچہ اسے کچھ انجکشن دے کر کمرے میں منتقل کر دیا۔

میں نے وارث علی کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ’’شائلہ کی طرف سے آپ بالکل مطمئن ہو جائیں، ان شاءاللہ یہ ہنستی بولتی اپنے قدموں پر چل کر اپنے گھر جائیں گی۔‘‘

وارث علی بے اختیار رو پڑے تھے۔ میں نے یہ کہہ تو دیا تھا لیکن ان الفاظ کی لاج کیسے رہے گی، یہ نہیں جانتا تھا۔

میں نے اس کا علاج شروع کر دیا لیکن یہ عام علاج تھا جو اس کی موجودہ حالت کے لیے کیا جا رہا تھا لیکن میرے ذہن میں وہ لمحے محفوظ تھے جب شائلہ اچانک ایک بھیانک آواز میں بول پڑی تھی۔ اس بیماری کا میں کیا علاج کروں گا۔

شائلہ کی بہتر نگہداشت ہونے لگی۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی اور پرسکون نظر آ رہی تھی۔ بیگم وارث علی دو بار اسے دیکھنے آئی تھیں، وارث علی نے بھی کئی چکر لگائے تھے اور شائلہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے کیونکہ اس نے ماں، باپ سے ہوشمندی کی باتیں کی تھیں۔

’’اس کی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے ڈاکٹر کامران! وارث علی بے حد خوش ہیں، آپ کتنے احسانات کریں گے ہم پر!‘‘ امتیاز نے تاثر انگیز لہجے میں کہا۔

’’دعا کریں امتیاز صاحب! میں اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔‘‘ میں نے کہا۔

امتیاز کچھ نہ سمجھا لیکن مجھ پر وہ وقت آ گیا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 7

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔ بھیگی بھیگی فضا تھی۔ میں اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ میں معمول کے مطابق شائلہ کے کمرے میں پہنچا تو اس نے مسکرا کر میرا خیر مقدم کیا۔ اور بولی۔ ''مجھے اسپتالوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، لیکن ان کے بارے میں جو سنا ہے وہ زیادہ اچھا نہیں سنا، مگر یہاں تو صورت حال ہی کچھ اور ہے۔''

''کیا؟'' میں کرسی لے کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے، بس وہ کسی آسیب کا شکار ہے اور مشکل یہ تھی کہ میں کوئی درویش یا عالم نہیں تھا بس ڈاکٹر تھا۔

''ہر شخص خلوص کا پیکر ہے۔ ہر طرح خیال رکھا جا رہا ہے۔ خاص طور سے آپ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔''

''آپ اپنے علاج سے مطمئن ہیں شائلہ؟''

''پتا نہیں۔ لیکن آپ کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے جیسے کوئی اپنا آ گیا ہو۔ مجھے ابھی تک نہیں معلوم کہ بیماری کیا ہے۔ ہاں جب یہاں سے جاؤں گی تو ایک بیماری ضرور ساتھ لے کر جاؤں گی۔'' شائلہ کا لہجہ رومانوی ہو گیا تھا۔

''ہم آپ کو تن درست کر کے بھیجیں گے مس شائلہ۔'' میں نے اس کے الفاظ کو نظر انداز کر کے کہا۔

''تن درست۔ شاید۔ لیکن کیا اس میں ''من درستی'' بھی شامل ہو گی؟'' وہ بولی۔ پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔ یوں لگا تھا جیسے اس کے دماغ کو کوئی جھٹکا لگا ہو۔

میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایک دم کسی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے نقوش بدلنے لگے۔ سچی بات ہے کہ میرے بدن میں خوف کی ایک لہر اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ نارنجی ہوتا جا رہا تھا اور ان میں چمک بڑھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس کے پاس سے ایک شدید بدبو دار دھواں ابھرنے لگا اور میں نے بے اختیار چٹکی سے اپنی ناک دبا لی۔

پھر اچانک اس کے منہ سے ایک مکروہ آواز ابھری۔ ''نہ رے نا۔ یہ ٹھیک نہ رہے۔ یہ غلط ہے۔ اس من میں تیرا پریم گھر کرنے لگا ہے۔ پریم شکتی توڑ بن سکتی ہے یہ ہم نا ہونے دیں گے۔''

یہ آواز شائلہ کی نہیں تھی۔ یہ وہی مکروہ آواز تھی جو ایک بار پہلے میں نے شائلہ کے منہ سے سنی تھی۔ اچانک میرے دل سے خوف دور ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کوئی اور قوت سما گئی ہو۔ کچھ لمحے قبل جو کپکپاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ ختم ہو گئی۔

میں نے ان بھیانک نارنجی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''کیسا توڑ بن سکتی ہے پریم شکتی؟''

''یہ ناری تجھے سندر لگے ہے۔''

''ایک بہن کی طرح۔'' میں نے جواب دیا۔

''ایں'' ۔ آواز میں اچانک حیرت در آئی تھی۔

''میں ڈاکٹر ہوں۔ میرا ہر مریض سے ایک پاکیزہ رشتہ ہوتا ہے بوڑھی ہو تو ماں جیسی، جوان ہو تو بہن جیسی، یہی کیفیت مردوں کے لیے ہوتی ہے اپنے ان بہن بھائیوں کو ہم صحت اور زندگی دینا چاہتے ہیں۔''

''تُو تو بڑھیا چھورا ہے رے۔ پر او کے من میں تیرا پریم جاگ رہا ہے تُو اس کے پریم کا جواب مت دیجیو، نہیں تو ہمارا کام کھراب ہو جائے گا۔ اور سن، اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ پر اس کے جیون کے اب سو دن باقی ہیں۔ سو دن کے بعد یہ مر جائے گی اور ہم اسے لے جائیں گے۔ اب وہ ہماری ہے بیرن۔ اس کے علاج کا کوئی فائدہ نا رہے۔''

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم...... چھیرہ کنڈی کے نمبردار، بھگندر ناتھ۔ بھگندر ناتھ ہیں ہم۔''

''زندہ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

جس کے جواب میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر شائلہ کے منہ سے مکروہ قہقہہ برآمد ہوا۔ ''بکری کا بچہ لگے ہے تُو۔ کیسا مجے کا سوال کیا ہے۔ جندہ ہوتے تو کیا اس کے شریر میں ہوتے۔ آتما ہیں ہم۔ پلیگ سے مرے تھے ارتھی تک نہ جلی ہماری۔ سارے کے سارے بھٹک رہے ہیں کوئی کہیں کوئی کہیں۔ ہم نے چھیرہ کنڈی کی دھرم شالہ میں استھان بنا لیا۔ یہ دھرم شالہ آئی۔ رات وہاں رکی، بال دیکھو اس کے، شریر دیکھو پاگل کرنے والا ہے۔ ہم بھی پاگل ہو گئے۔ اب اسے چھوڑنے کو من کس کا چاہے گا۔ سو دن ہیں اس کے جیون کے۔ اس کے بعد یہ ہماری ہو گی۔ کون اسے ہم سے بچائے گا۔ لے جائیں گے ہم اس کو۔ جمین میں نا جانے دیں گے ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔''

''کیا کرو گے۔ کیا بندوبست کر لیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''مر جائے گی۔ اس کے گھر والے اس کی ارتھی لے کر کبرستان جائیں گے۔ کبر کھودی جائے گی اس کی، پھر ہم ایک دم اس کے مرے ہوئے شریر میں گھس جائیں گے اور یہ اٹھ کر دوڑ لگا دے گی۔ ہاہاہا۔ پھر کون مائی کا لعل اسے پکڑے گا۔ بس پھر ہم ہوں گے اور یہ۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور مستقبل میں پیش آنے والا ایک ایک منظر میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

''چلیں ہیں۔ اس کی دوا دارو چھوڑ۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ سو میں سے کئی دن کم ہو گئے ہیں آرام کرنے دے اس کے بعد اسے سنسار چھوڑنا پڑے گا۔'' شائلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ ہوش میں آ جائے گی۔ میں نے بھی وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی لمحے میں باہر آ گیا۔ نرس کو میں نے اندر بھیج دیا۔ یہ سب سے بڑی پریشانی تھی میرے لیے، جوانی دیوانی ہوتی ہے ایسے جملے مجھے بازاری لگتے تھے لیکن اب تجربہ ہو رہا تھا کہ یہ بھی زندگی کا ایک حصہ ہے شازیہ، ڈاکٹر سائرہ اور اب یہ سحر زدہ خاتون جو نہ جانے کیا کر بیٹھی تھیں۔ شائلہ کی اصل بیماری کا پتا چل چکا تھا اس کا کیا علاج کروں اور اگر کوشش بھی کروں تو ڈاکٹر کے بجائے تعویذ گنڈوں والا سنیاسی باوا بن جاؤں، سارا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ بہت غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ شائلہ کو واپس اس کے گھر بھیج دیا جائے، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ اس کی حفاظت کرے۔

امتیاز سے رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ مجھ سے ملاقات کرلے۔ امتیاز اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے میرے پاس آ گیا۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ ''امتیاز میں آپ سے شائلہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی ڈاکٹر کامران......''

''اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ میں نے اس کا ہر پہلو سے جائزہ لے لیا ہے۔ وہ آسیب زدہ ہے۔ پچھلے چند تجربات سے مجھے اس بارے میں اندازہ ہو گیا ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں عامل نہیں ہوں۔ اگر آپ حکم دیں گے تو میں اسے مستقل اسپتال میں رکھنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس میں کوئی دقت نہیں ہو گی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے کسی عامل کو دکھانا ضروری ہے۔ میں اسے صرف دعائیں ہی دے سکتا ہوں۔''

امتیاز کے چہرے سے افسردگی ٹپکنے لگی۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے ہم اسے لے جائیں گے۔''

اسی دن امتیاز، وارث علی کے ساتھ آ کر شائلہ کو لے گیا۔ بہت خوبصورت بہت پیاری لڑکی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا تھا لیکن ان سارے معاملات میں قطعاً ناکارہ وجود تھا۔ مجھے اپنی منزل کی تلاش تھی۔ میں ایک بڑا ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن میرے راستے رک گئے تھے، میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا۔

اسپتال کی زندگی بہت متحرک ہوتی ہے۔ ہر لمحہ نئے لوگ اور ان کے دکھ۔ ان سے دلی ہمدردی ہی ان کے دکھوں کا شریک کرتی ہے، ایک ڈاکٹر صرف ایک ڈاکٹر ہی نہیں انسان بھی ہوتا ہے۔ فرض اور انسانیت مل کر ہی اسے ڈاکٹر بناتے ہیں۔ میری زندگی میں کچھ کردار ایسے آئے تھے جو انوکھے تھے اور ان کا تعلق کسی مرض سے نہیں تھا۔ میری خوش نصیبی تھی کہ ان کی شفا میں مجھے بھی حصہ مل گیا تھا۔ میں انہیں بھول نہیں سکتا تھا۔ جاوید انصاری تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن شائلہ کے لیے میں کچھ نہیں کر سکا تھا۔ مگر وقت کے فیصلے کبھی کبھی ہماری سوچ کے برعکس ہوتے ہیں۔

پندرہ دن ہوئے تھے شائلہ کو اسپتال سے گئے ہوئے۔ اس دوران اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ نہ ہی میں نے جاننے کی کوشش کی تھی۔ پھر ایک دن امتیاز ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں مل گیا، علینا بھابھی کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں بہت خوش ہوئے۔ علینا نے کہا۔ ''کامران بھائی۔ کسی ڈاکٹر کو ایک عام انسان بنانے کا کوئی طریقہ بتائیے۔''

''ارے۔ یہ تو ایک نیا انکشاف ہے۔ بھابھی کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتا؟'' میں نے اس دلچسپ سوال پر مسکرا کر کہا۔

''انسان کسی بھی منصب پر فائز ہو، محبت کے رشتوں کی قدر تو کرتا ہے۔ خاص طور سے میری نگاہوں میں ایک مسیحا ہی کی طرح نہیں، ایک بھائی کی طرح آپ کا مقام ہے۔ لیکن میں اپنے بھائی سے بھی یہ نہیں کہہ سکتی کہ بھائی کبھی کبھی بہن کی خبر لے لیا کریں۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے علینا بھابھی کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

''ارے...... علینا بھابھی۔ میں شرمندہ ہو رہا ہوں اور اب اس کی گنجائش نہیں رہ گئی کہ میں آپ سے اپنی مصروفیت کا رونا روؤں۔''

''مناسب بھی نہیں ہو گا کیونکہ آپ اپنے گھر تو جاتے ہی ہوں گے۔'' علینا نے کہا۔

''ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی چھت پر ریستوران ہے جہاں بڑی اچھی کافی ملتی ہے۔ تو کیوں نہ میں آپ کو کافی کی پیشکش کروں۔'' میں نے کہا۔

اور ہم تینوں خود کار سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ بہترین خوشبو دار کافی کے سپ لیتے ہوئے میں نے امتیاز سے اس کے اخبار کے بارے میں پوچھا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک چل رہا ہے۔ ایک بڑا المیہ ہو گیا ہے۔'' امتیاز کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''خیریت؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''اصل میں وارث علی صرف میرے اخبار میں نوکری نہیں کرتے بلکہ ہمارے خاندان کے ایک فرد کی مانند ہیں۔ ہم ان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ ان دنوں ان پر قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ بیچارے دو دن کارڈیالوجی میں رہ کر آئے ہیں۔''

''خدا خیر کرے، کیا ہوا؟''

''شائلہ گھر سے غائب ہو گئی ہے۔''

''اوہ......''

''آپ کو پتا ہے کہ ایک رات وہ گھر سے نکل گئی تھی اور زخمی ہو گئی تھی۔ نو دس دن پہلے وہ اسی طرح گھر سے نکلی پھر واپس نہیں آئی۔ اب تک اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔''

''اوہ میرے خدا۔ پولیس میں رپورٹ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کرنے دی وارث علی نے۔ میرے پاؤں پکڑ لیے کہ میں پولیس میں رپورٹ نہ کروں۔ ان کا خاندان بہت ظالم ہے انہیں جینے نہیں دے گا۔ وہ سب کچھ برداشت کر لیں گے بدنامی نہیں۔ شائلہ کا معاملہ اب انہوں نے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔''

''اسی لیے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''

''ہاں جو کچھ ان لوگوں پر بیت رہی ہے بڑا دردانگیز ہے۔''

''آفس تو نہیں آ رہے ہوں گے۔''

''نیم مردہ ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ ہر لمحہ ان کی خبر گیری رکھتے ہیں، رات کو وہیں کھانا کھاتے ہیں ورنہ شاید وہ کھانا بھی نہ کھائیں۔''

''اچھا، رات کو میں ان سے ملنے آؤں گا۔ ہاں ایک بات بتائیں انہوں نے شائلہ کو کسی عامل کو دکھایا؟''

''عامل...... یہاں لوٹ مار کرنے والے قدم قدم پر مل جاتے ہیں اور جو سچ مچ باعمل ہوتے ہیں وہ گمنامی ہی پسند کرتے ہیں۔ ہمیں کوئی اچھا عامل نہیں مل سکا۔''

''آپ یقین کریں اگر اسے کوئی ذہنی عارضہ ہوتا تو میں سر توڑ کوشش کرتا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' امتیاز نے کہا۔ کافی دیر ہم وہاں رہے پھر رات کو وارث علی کے گھر آنے کا وقت طے ہوا اور ہم رخصت ہو گئے۔ لیکن میرے دل پر ایک بوجھ آ پڑا۔ میں حقیقتوں کا شناسا تھا، ان سے گریز اور روگردانی کا پہلے کوئی احساس نہیں تھا لیکن وارث علی کی کیفیت نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دن بھر کشمکش کا شکار رہنے کے بعد آخر میں نے کچھ فیصلے کیے اور مقررہ وقت پر وارث علی کے گھر پہنچ گیا۔ باہر امتیاز کی کار موجود تھی۔ وارث علی کی صورت نہیں پہچانی جا رہی تھی، بے حد لاغر ہو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بچوں کی طرح رو پڑے۔

میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ان شاء اللہ وہ نہ صرف واپس آ جائے گی بلکہ ٹھیک بھی ہو جائے گی، آپ بھروسہ رکھیں۔''

امتیاز نے پرتکلف کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ سب نے مل کر کھانا کھایا پھر میں نے خصوصی نشست جمائی۔ ''میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں وارث علی صاحب۔''

''جی بیٹے؟''

''چھیرہ کنڈی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟''

''چھیرہ کنڈی۔ ایک علاقے کا نام ہے مگر اب وہ ایک ویران علاقہ ہے، کسی زمانے میں وہاں آبادی تھی مگر یہ تقسیم سے بہت پہلے کی بات ہے اب وہ ایک ویرانہ ہے۔''

''اتفاق سے میں بھی چھیرہ کنڈی کے بارے میں جانتا ہوں۔ اخبار میں اس کے بارے میں ایک بہت دلچسپ فیچر چھپا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ چھیرہ کنڈی ایک آسیبی بستی ہے جہاں بے شمار آتماؤں کا بسیرا ہے۔ اس آبادی میں بہت عرصہ پہلے طاعون کی وبا پھیلی تھی جس نے پوری آبادی کو نگل لیا تھا۔ مرد عورتیں بوڑھے بچے غرض آبادی کا ہر شخص لقمۂ اجل بن گیا تھا۔ وبا اس قدر ہولناک تھی کہ امدادی ٹیمیں بھی وہاں نہیں پہنچیں اور وہاں طاعون زدہ لاشیں سڑتی رہیں۔ طویل عرصہ کے بعد وہاں سے سیکڑوں انسانی پنجر، بلاتخصیص مذہب سمیٹ کر تلف کر دیے گئے۔ یہ تفصیل تھی چھیرہ کنڈی کی۔''

''یہ جگہ ہے کہاں؟''

''کراچی سے کوئی نوے کلومیٹر۔ اس سے دس کلومیٹر آگے گوٹھ چھیرہ ہے۔ راستہ چوکھنڈی سے گزرتا ہے۔ گوٹھ تک جانے کے لیے کوئی پکی سڑک نہیں ہے۔'' اس بار وارث علی نے بتایا۔

''آپ وہاں گئے ہیں۔''

''ہاں۔ یہی بتا رہا تھا۔ گوٹھ چھیرہ میں میرے ایک عزیز رہتے ہیں۔ ایک دو بار وہاں گیا ہوں۔''

''کچھ عرصہ قبل آپ لوگ وہاں گئے تھے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''میں تو نہیں گیا تھا۔ لیکن میری بیگم اور شائلہ وہاں گئے تھے۔ شائلہ کی کچھ سہیلیاں بھی گئی تھیں، گوٹھ چھیرہ میں ان کی ایک دوست کی شادی تھی، جس میں انہوں نے شرکت کی تھی۔'' وارث علی نے بتایا۔

''چچی جان آپ بھی ساتھ گئی تھیں؟''

''ہاں۔ شائلہ کو ہم اکیلے کہیں نہیں جانے دیتے تھے۔ اسے خود بھی میرے بغیر کہیں جانے کی عادت نہیں تھی۔'' بیگم وارث علی بولیں۔

''اب غور کر کے میرے سوال کا جواب دیجیے۔ گوٹھ چھیرہ سے واپسی میں آپ کہیں راستے میں رکے تھے؟''

''ہاں بیٹے۔ شائلہ کی سہیلیوں میں سے ایک لڑکی اپنی کار میں گئی تھی۔ ہم اسی کے ساتھ تھے۔ واپس چلے تو موسم بہت خراب تھا۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ ساتھ میں طوفانی ہوائیں بھی تھیں۔ کار لڑکی خود ہی چلا رہی تھی چنانچہ گھبرا گئی اور سڑک کے کنارے اس نے کار روک دی۔ وہاں تھوڑے فاصلے پر ایک چھوٹی سی ہندوانہ طرز کی عمارت بنی ہوئی تھی۔ ہم سب شدید بارش اور طوفان سے گھبرا کر اس عمارت کی طرف بھاگے اور اس میں گھس کر بارش سے پناہ لی۔ لڑکی نے اپنے گھر موبائل پر فون کر دیا تھا کہ وہ آج نہیں آ رہے، کل صبح آئیں گے، اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اس طرح راستے میں رک گئے ہیں کہ کہیں اس کے گھر والے پریشان نہ ہو جائیں۔''

''کتنے افراد تھے۔''

''چار لڑکیاں، ایک میں۔''

''مرد کوئی نہیں تھا؟''

''نہیں۔''

''رات اسی عمارت میں گزاری۔''

''ہاں۔''

''اس دوران لڑکیاں کیا کرتی رہیں۔''

''بس اِدھر اُدھر گھومتی رہیں۔ انہیں چین کہاں تھا۔''

''عمارت میں جھاڑ جھنکار بھی تھے؟''

''ہاں۔ بڑی ویران جگہ تھی۔ نحوست برس رہی تھی۔'' بیگم وارث علی نے بتایا۔

''یہ وہی جگہ چھیرہ کنڈی تھی جس کے بارے میں آپ نے پوچھا تھا اور چھیرہ کنڈی میں سڑک کے ساتھ ایک دھرم شالہ ہے جسے آسیب زدہ کہا جاتا ہے۔'' وارث علی نے کہا۔ اور پھر ایک دم وحشت زدہ ہو گئے۔ پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تو کیا......؟ تو کیا......؟ اوہ میرے خدا۔ امتیاز صاحب نے بتایا تھا کہ آپ نے ان سے کہا ہے کہ شائلہ کو کوئی بیماری نہیں ہے، اسے کسی عامل کو دکھایا جائے اور اس نے ایک رات چھیرہ کنڈی کی آسیب زدہ دھرم شالہ میں گزاری تھی۔ کیا یہ سب کچھ......؟''

پھر وارث علی صاحب بے اختیار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ ''خدا کے لیے میری بچی کے لیے آپ کچھ کریں۔ آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ آپ کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ آپ ہمارے لیے کچھ کریں۔''

''آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں، میں وہی ہوں جو نظر آتا ہوں۔ اس سے الگ کچھ اور نہیں۔ امتیاز صاحب میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے بارے میں کوئی ایسی بات کبھی نہ لکھیں۔ میری شخصیت مسخ ہو جائے گی۔''

''تعمیل کروں گا۔ لیکن چھیرہ کنڈی کا ذکر بے معنی تو نہیں ہے۔'' امتیاز نے کہا۔

''کوئی دعویٰ نہیں، کوئی وعدہ نہیں، لیکن میں پوری کوشش کروں گا کہ شائلہ کی بازیابی اور اس کی مکمل صحت یابی کے لیے کچھ کروں اور وارث علی صاحب! آپ سے عرض ہے کہ اس وقت تک مایوس یا بددل نہ ہوں، جب تک میں آپ کے پاس آ کر یہ نہ کہہ دوں کہ میں ناکام ہو گیا ہوں۔''

اس رات شدید اضطراب رہا۔ تہجد کے وقت جاگ گیا۔ بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی۔ ''معبود کریم میرے ایمان کو سلامت رکھنا اور نیک کام میں میری مدد کرنا۔'' وارث علی کی حالت نے مجھے شدید متاثر کیا تھا۔ میں نے پروگرام بنا لیا کہ تنہا جاؤں گا اور قسمت آزماؤں گا۔

دوسرے دن میں نے اسپتال جا کر چھوٹے موٹے کام سرانجام دیے، پھر معاون ڈاکٹر کو ہدایت دے کر اسپتال سے نکل آیا۔ کار اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ راستے میں ایک پیٹرول پمپ سے ٹنکی بھروائی، پھر سفر طے کر کے لانڈھی رکا۔

قبرستان جا کر احمد علی کی قبر پر فاتحہ پڑھی، ان سے دعا کی درخواست کی اور چوکھنڈی چل پڑا۔ اس علاقے سے بہت سے واقعات منسلک تھے، لیکن اچانک دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کچی سڑک کے درمیان ایک عجیب سے حلیے کا آدمی کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس شخص نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے پھر مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور سڑک کے درمیان سے ہٹ گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر کار روک دی تو وہ میرے قریب آ گیا۔

''بنسی راج ہے ہمارا نام۔ پران پردھانی نے آپ کی سیوا کی آگیا دی ہے۔ ہمیں آپ کے ساتھ جانے کے لیے کہا ہے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''چھیرہ کنڈی۔ بھگندر ناتھ کے نام سندیس دیا ہے انہوں نے، آپ کی سہائتا کے لیے۔''

میں نے حیرانی سے اس کی بات سنی۔ دل نے کہا یہ تائید غیبی ہے۔ اسے قبول کر لیا جائے۔

''آؤ۔ بیٹھو۔'' میں نے کہا۔ وہ کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ وہ سب ہو رہا تھا جو میں چاہتا تھا نہ مجھے اس سے کوئی واقفیت تھی۔

خیر تھوڑی دیر تک میں خاموشی سے کار چلاتا رہا۔ راستے میں ایک دوشاخہ سڑک آئی تو میں نے کار کی رفتار سست کر دی۔ پھر ایک سمت کار رخ کیا تو پیچھے بیٹھے بنسی راج نے جلدی سے کہا۔ ''نہ مہاراج نہ۔ دوسری سڑک پر چلنا ہے۔''

''اچھا بنسی راج۔'' میں نے کہا اور کار دوسرے راستے پر موڑ دی۔ تھوڑے فاصلے پر جا کر میں نے پوچھا۔ ''تم بھگندر ناتھ کو جانتے ہو بنسی راج؟''

''جنگ بھنڈاری ہے۔ کالی آتما۔ چھیرہ کھنڈی کا نمبردار تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے کنڈی اور آس پاس بڑی ہاہاکار مچا رکھی تھی۔ بھتیرے مار دیے پھر پلیگ پھیلی اور مر گیا۔ بس اس کی آتما بھٹک رہی ہے، کوئی اس کے پھیر میں آ جائے ہے تو اسے نقصان پہنچاوے ہے۔ ادھر موڑ لو۔ وہ نئی سڑک نظر آوے ہے بس وہیں دھرم شالہ ہے۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر میں نے سڑک سے کچھ دور وہ پراسرار عمارت دیکھ لی۔ آخر کار اس عمارت کے پاس کار روک کر میں نیچے اتر آیا۔ بنسی راج میرے ساتھ تھا اور مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ عمارت میں داخل ہو کر اس نے آواز لگائی۔ ''باہر آ رے بھگندر ا۔ باہر آ۔ پران پردھانی کا سندیس لائے ہیں ہم۔ باہر آ جا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی پھر کھڑ بڑ کھڑ بڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے بعد ایک دروازے سے ایک کریہہ صورت آدمی باہر آ گیا۔ اس نے خونی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا، پھر بولا۔ ''کاہے رے؟''

''وہ چھوکری واپس دے دے جسے تو نے بند کر رکھا ہے۔''

''کیوں رے۔ تیری بہنیا لگے ہے کیا وہ؟ تو کون ہووے ہے؟''

''بھوریا چرن مہاراج نے کہا ہے کہ چھوکری واپس دے دے۔''

''ہونہہ۔ بھوریا چرن کیا ہے وہ اب۔ نہ سنت نہ سادھو۔ نہ منکانہ شنکھا۔ کچھ بھی تو نہ ہے وہ۔''

''سنکھا بننے والا ہے اور کھنڈولا بھی۔ سوچ لے تیرا کیا ہو گا۔''

''ارے جا جا۔ سنکھا بھی نہ ہے وہ۔ بھگندرا ہے ہمارا نام۔ وہ چھوکری ہمیں پسند ہے۔ مر جائے گی وہ تھوڑے دنوں میں۔ بس پھر وہ ہماری ہو گی پوری کی پوری۔''

''لے آ اسے بھگندر ناتھ۔ نہیں تو تیار ہو جا مہاراج نے تیرے لیے بہت کچھ بھیجا ہے۔ بول کیا کہتا ہے۔''

''چلا جا ادھر سے۔ یہ ہماری ترتھ شالہ ہے۔ ابھی بھنگے چھوڑ دیں گے تو ناچتا پھرے گا۔ جا بھاگ جا اسے ساتھ لے کر۔ چل۔'' بھگندر ناتھ نے ہاتھ جھٹک کر کہا، اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

اسی وقت بنسی راج نے دونوں ہاتھ سامنے کیے اور دو زنجیریں اس کے ہاتھوں سے نکلیں اور بھگندر ناتھ کے پیروں میں جا پھنسیں۔ بھگندر ناتھ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس نے پلٹ کر خونی نظروں سے بنسی راج کو دیکھا اور پلٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ دوسرے لمحے اس کی جگہ ایک کالا ناگ نظر آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پھن کاڑھ کر ہماری طرف لپکے قریب سے کچھ اینٹیں گریں اور اس کا پھن کچل گیا۔ سانپ بل کھانے لگا۔ اسی وقت قریب کی ایک چھوٹی دیوار نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور پوری کی پوری سانپ کے بدن پر آ پڑی۔ سانپ اس دیوار کے نیچے دب گیا تھا۔

''چلو اس کی سمادھی بن گئی۔'' بنسی راج نے کہا۔

''یہ ختم ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کھتم تو یہ پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اب اس کی آتما بھی کید ہو گئی اسی دیوار کے نیچے۔ ہونہہ مہاراج سے منہ موڑ رہا تھا۔''

''اب یہ یہاں سے نہیں نکلے گا؟''

''کبھی یہ دیوار ہٹی اس کے سر پر سے تو نکل آئے گا۔ یہ بھی مسکل ہو گا۔ مہاراج کی سنکھا سکتی واپس آ گئی تو ویسے ہی اس کے جل ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ ان کی آگیا نہ ماننے کی سجا، ان کے بیر ہی اسے دے دیں گے۔''

''وہ لڑکی اس کے پاس ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اسی کے پاس ہے۔ آؤ دیکھیں۔'' شائلہ دھرم شالہ کے نیچے ایک قید خانے میں مل گئی۔ یہ تہہ خانہ بھی بنسی راج نے تلاش کیا تھا۔ بڑی ہیبت ناک جگہ تھی۔ تاریک اور بدبودار، دو دو فٹ لمبے جالے چھت اور دیواروں سے لپٹے ہوئے تھے۔ ہر طرف چمگادڑوں کی بیٹ پھیلی ہوئی تھی۔

ایک جھلنگا چارپائی پر شائلہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اس کا شانہ ہلایا، لیکن وہ نہ جاگی تو بنسی راج نے کہا۔ ''اسے اٹھا کر کھلی جگہ لے جاؤ، تب یہ ہوس میں آئے گی۔ اب تمہارا کام ہے۔ ہم چلتے ہیں۔''

''کہاں؟ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے؟''

''ناہیں۔ ہمیں اور کام ہیں۔ پران پردھانی نے ہمیں یہ کام دیا تھا، سو ہم نے کر دیا۔ اب تمہیں کوئی کھترہ نہیں ہے۔ اسے لے جاؤ۔ تمہارا راستہ کسی نے روکا تو ہم دیکھ لیں گے۔'' بنسی راج نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر واپسی کے لیے مڑ گیا۔

میرا دماغ کسی حد تک ماؤف تھا۔ میں ایک اجنبی احساس کے ساتھ چھیرہ کنڈی کی اس دھرم شالہ کی تلاش میں چل پڑا تھا۔ کسی کو ساتھ لانے کی زحمت تک گوارہ نہیں کی تھی۔ اپنے اندر اس اعتماد کی وجہ بھی نہیں تلاش کر سکا تھا، لیکن کام ہو گیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے ہو گیا تھا۔ شائلہ میرے سامنے تھی۔

ایک بار پھر شائلہ کو ہلایا جلایا مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ چنانچہ میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور تہہ خانے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ تہہ خانے سے باہر آ کر میں اس منحوس عمارت میں ایک لمحہ نہیں رکا اور تیز رفتاری سے باہر نکل کر کار کے قریب پہنچ گیا۔ شائلہ کو پوری احتیاط سے پچھلی سیٹ پر لٹایا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

کار درمیانہ رفتار سے سفر کر رہی تھی اور اب میرے حواس صحیح معنی میں جاگ گئے تھے۔ اب تک میں کسی دباؤ کے زیر اثر کام کر رہا تھا، لیکن اب ذہن کسی حد تک آزاد ہو گیا تھا۔ یہ میں نے کیا کیا ہے۔ مجھ سے پوچھا جائے گا کہ شائلہ مجھے کہاں سے ملی تو کیا بتاؤں گا۔ کتنی خوفناک بات ہے۔ لوگ کچھ اور بھی سوچ سکتے ہیں۔ کوئی بھی غلط بات۔ میری کیا حیثیت ہو گی۔ ایک دم خوف سا طاری ہو گیا۔ فیصلہ کرنا ہے۔ شہر پہنچنے سے پہلے فیصلہ کرنا ہے۔ خود کو بھی بچانا ہے۔ اپنی عزت بھی محفوظ رکھنی ہے۔ آخر کار ایک فیصلہ کیا۔ موبائل فون نکال کر امتیاز کو کال کی۔ دوسری طرف نمبر مل جانے پر میں نے کہا۔ ''امتیاز صاحب کہاں ہیں آپ؟''

''آفس میں ہوں ڈاکٹر کامران۔ فرمائیے۔'' امتیاز نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔

''فوری ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کے آفس کے سامنے ایک سینما ہاؤس ہے، وہاں پہنچ جاتا ہوں۔''

''آپ آفس آ جائیے۔ اگر مناسب نہیں ہے تو میں وہیں آ جاتا ہوں۔''

''آپ آ جائیے پلیز۔'' میں نے کہا اور پھر مزید دو چار باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ شہر میں داخل ہوا اور پھر اس سینما ہاؤس کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب کار روک دی۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ امتیاز سامنے سے آتا نظر آیا اور میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے کار سے باہر نکل کر اس سے ملاقات کی، وہ متجسس نظر آ رہا تھا۔ میرے حلیے کو غور سے دیکھ کر بولا۔ ''خیریت ڈاکٹر کامران، کہیں دور سے آ رہے ہیں۔ کار کی حالت دیکھ کر بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ کوئی لمبا سفر کر کے آ رہے ہیں۔'' اس نے کار پر نگاہ ڈالی اور اسے پتا چل گیا کہ کار کی پچھلی سیٹ پر کوئی لیٹا ہوا ہے۔

''آئیں۔'' میں نے کہا اور خود واپس اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ امتیاز بھی گھوم کر میرے برابر والی سیٹ پر آ گیا۔ اب اس کا تجسس اور بڑھ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''امتیاز آپ نے غور نہیں کیا کہ پچھلی سیٹ پر کون ہے؟''

''مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔''

''وہ شائلہ ہے۔''

میرے اس انکشاف نے امتیاز پر سکتہ طاری کر دیا۔ اس نے گردن گھمائی اور دیر تک شائلہ کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میری طرف رخ کیا۔

''میں کسی تمہید کے بغیر آپ کو سب کچھ بتا رہا ہوں۔ شائلہ ایک بدروح کے زیر اثر تھی۔ میں نے اس وقت چھیرہ کنڈی کے بارے میں پوچھا تھا۔ گوٹھ کنڈی سے واپسی پر یہ لوگ ایک ویران دھرم شالہ میں رکے تھے، وہیں شائلہ ایک ہندو خبیث روح کا شکار ہو گئی تھی۔ میں اسے وہیں سے لایا ہوں۔ اب یہ اس روح کے اثر سے نکل گئی ہے۔ آپ اسے گھر پہنچا دیجیے۔ یہ کام میں آپ کے بغیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قدرت نے کس طرح رہنمائی کی، اس کے بارے میں تفصیل نہ پوچھیے۔ ایک اور درخواست ہے کہ اخبار میں خدارا کوئی روحانی شخصیت نہ بنا دیجیے مجھے۔ میں سخت عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔''

''آپ کیا ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔ مجھے حکم دیں میں کیا کروں۔''

''شائلہ گھر جا کر ہوش میں آ جائے گی۔ یہ یقیناً آپ کو اپنی کیفیت کے بارے میں بتائیں گی۔ آپ اپنی کار میں انہیں ان کے گھر پہنچا دیں۔ میں شکر گزار رہوں گا۔ وارث صاحب سے عرض کر دیں کہ میرا شکریہ ادا کر کے میری خدمتِ خلق کے ثواب کو خراب نہ کریں۔''

''بہت بڑے انسان ہو، ڈاکٹر کامران۔ اور کیا کہوں؟'' امتیاز نے کہا۔ پھر سب میری خواہش کے مطابق ہو گیا۔ امتیاز اپنی کار لے آیا۔ شائلہ کو اس میں منتقل کیا اور میں نے انہیں رخصت کر دیا۔

بڑا سکون ملا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرے ذریعے ایک اور خاندان کو بدترین المیے سے بچا لیا تھا، بس کرب یہ تھا کہ بدبخت بھوریا چرن کے حوالے سے یہ کام ہو رہے تھے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ میرا ضمیر مطمئن تھا کہ اس بھیانک وجود کے زیر اثر ہی سہی، میں نے کسی کی بہتری کے لیے یہ کام کیے تھے۔

پھر کافی دن پُرسکون گزر گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ اسپتال کے معاملات بہترین چل رہے تھے۔ میری آنکھوں کی وہ خاصیت برقرار تھی۔ کسی مریض کو دیکھتا تو اس کی بیماری واضح ہو جاتی اور اس بنیاد پر اس کا علاج کیا جاتا تھا۔ اسپتال میں بڑے بڑے قابل ڈاکٹر تھے۔ میں ان کا دلی احترام کرتا تھا، ان سے سیکھتا تھا، ان کے دلوں میں کچھ بھی ہو، لیکن ان کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔

پھر اسپتال میں ایک مریض لایا گیا۔ رام سروپ نام تھا۔ کوئی بڑا بزنس مین تھا، کئی افراد ساتھ تھے۔

اس کے بڑے بیٹے نے بتایا۔ ''سانس کی تکلیف ہے تین برس سے، کبھی کبھی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے۔ کل سانس بالکل بند ہو گئی تھی۔ سب رو پیٹ رہے تھے۔ پر اچانک سانس واپس آ گئی۔ آپ کے اسپتال کی بڑی تعریف سنی ہے۔ روپے پیسے کی کوئی پروا نہیں، علاج بڑھیا ہونا چاہیے۔''

یہ سیدھا سادا کیس تھا۔ سانس کا مریض تھا۔ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر آفاق مرزا ابتدائی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑے سے متلون مزاج انسان تھے، چونکہ کیس انہیں دیا گیا تھا، اس لیے انہوں نے مجھے اس کے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ مجھے ان کے انداز پر ہنسی آ رہی تھی۔ شام کو چیئرمین نے مجھ سے نئے مریض کے بارے میں پوچھا۔ مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ ڈاکٹر مرزا نے مجھے رام سروپ کے پاس نہیں جانے دیا۔

چیئرمین بری طرح چراغ پا ہو گیا۔ اس نے آفاق مرزا کو بلا کر خوب جھاڑا اور کہا کہ یہ سب اسپتال کے مفاد کے خلاف ہے اور ڈاکٹر کامران کا راستہ روکنے والے اسپتال کے وفادار نہیں سمجھے جائیں گے۔ پھر انہوں نے اس مریض کا چارج مجھے دے دیا۔ میں نے حسب معمول مریض کا جائزہ لینے کے انتظامات کیے۔ اس کے آکسیجن ماسک لگی ہوئی تھی۔

میں اس کے پاس پہنچا تو اچانک اس نے گردن چٹختے ہوئے کہا۔ ''دروا جا بند کر دے بروا۔ او ای سریا کو ہمار منہ سے ہٹا۔''

مجھے چکر آ گیا یہ آواز بھوریا چرن کی تھی۔ سو فیصد اسی کی تھی۔ وہ اپنے منہ سے ماسک نوچنے لگا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر دروازہ بند کیا۔ اس دوران رام سروپ اپنے منہ سے آکسیجن ماسک نوچ چکا تھا۔

''او اگر رات تک نہ جاتا تو ہم اسے نگنی کا ناچ نچائی دیتے۔ جان ہی نا چھوڑ رہا تھا۔''

''یہ تم ہو بھوریا چرن۔''

''ہاں رے۔ تیرے پاس آنا تھا اس طرح۔ ای منوئی کا دیہانت ہو گیا سو ہم اس کے سریر ما آ گئے۔ اور اس کے گھر والے سمجھے کہ ای جیوت ہے۔''

''مگر تم تو ویسے بھی آ جاتے تھے؟'' میں نے کہا۔

''کام تھارے تو سے۔''

''کیا کام تھا؟'' میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ ''ایک بات بتا۔ اب تک ہم نے تو پر جتنے احسان کیے تو مانے ہے کہ نا۔ او بھگندر ناتھ پکا بھوت تھا۔ دس بیس کو لے کر مرتا اور مر تو وہ چکا ہی تھا پر اس کی کالی سکتی بڑی سخت تھی۔ وہ تو ہم تھے جس نے اس کا کریا کرم کر دیا۔ ورنہ کس کی مجال تھی کہ اس سے اس چھکریا کی جان چھڑا لیتا۔ اور ای تو کچھ نا ہے ہم اپنی سنکھا سکتی لے لیں اور تو ہمیں پیر پھکوا دوا رالے جائے تو ہم کھنڈولا بن جائیں گے۔ پھر یہ سمجھ لے کہ سنسار ہم دونوں کا ہو گا، سارے سنسار میں وہ ہو گا جو ہم چاہیں گے۔''

''مجھ سے کیا کام ہے تمہیں؟''

''بڑا اجروری کام ہے۔ مسکل ہے پر تجھے کرنا ہو گا۔'' اس کے لہجے میں ایک عجیب سی سختی پیدا ہو گئی۔ پھر وہ بولا۔ ''تیرے اس اسپتال میں ایک بچہ پیدا ہوئی ہے او پائل ہے۔ وہ کمرہ نمبر بیس میں ہے۔ بس تجھے او بچہ ہمارے پاس لانا ہے۔ باقی کام ہمارے۔ ہم کا کری رہے۔ اس مولبی نے ہمارے راستے بند کر رکھے ہیں۔ نہیں تو ابھی تک ہم آگے کا کام کر چکے ہوتے۔''

میں اپنی اس وقت کی کیفیت کے بارے میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے بدن کا خون خشک ہو گیا۔ اسپتال میں ایک معصوم بچہ پیدا ہوا ہے جو پائل ہے اور اسے اس شیطان تک پہنچانے کی ذمہ داری میری ہے۔ اس سے زیادہ مکروہ عمل اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنی زندگی کی قیمت پر بھی یہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ہم جانت رہیں تورے من کی بات۔ پر تو بتا۔ کتنے لوگا کا جیون بچایا ہے تو نے۔ کیسے؟ ہمارے وردان سے۔ ایک منوئی کا جیون مانگ رہے ہیں ہم تو سے۔ کونسی بڑی بات رہے۔''

''یہ کام مجھے کیسے کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو ڈاکٹر ہے۔ بچے کو دیکھ۔ او کے ماتا پتا سے کہہ کہ تو اس کا معائنہ کرے گا۔ تو اسپتال کا سب سے اعتبار والا ڈاکٹر ہے، کون تجھے منع کرے گا۔ تو اسے ادھر لے آ۔ باقی کام ہمارا ہے۔ ہم اپنا کام کر کے رام سروپ کے روپ میں ٹھیک ہو جائیں گے اور یہاں سے نکل جائیں گے بس۔''

''یہ کام آج تو نہیں ہو سکتا۔''

''کل کر۔ پرسوں کر۔ اتنی جلدی نا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دستک سنائی دی اور اس نے فوراً ہی آکسیجن ماسک اپنے چہرے پر لگا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

چیئرمین صاحب رام سروپ کے دو رشتے داروں کے ساتھ اندر آئے۔ چیئرمین صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''قابل ڈاکٹر کیا کہتے ہیں رام سروپ کے بارے میں؟'' یہ کہہ کر چیئرمین صاحب نے مجھے آنکھ ماردی۔

''صورت حال کا جائزہ لے رہا ہوں۔ جو ہو گا بہتر ہو گا۔'' میں نے کہا۔

چیئرمین صاحب نے فوراً بات لپک لی۔

''ویری گڈ۔ اس کا مطلب سمجھ رہے ہیں آپ، میری طرف سے مبارک ہو۔''

رام سروپ کے رشتے دار خوش ہو گئے۔ مگر میرا دل دکھنے لگا۔ جس رام سروپ کی زندگی کی انہیں آس ہوئی تھی وہ بے چارہ تو کب کا مر چکا تھا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ باہر نکل آیا، لیکن آج میری حالت ہمیشہ سے زیادہ خراب تھی، گھر میں بھی بے حد نڈھال رہا۔ سب مجھ سے میری طبیعت کا حال پوچھ رہے تھے۔ آج سے زیادہ کبھی پریشان نہیں رہا تھا۔ میں نے کبھی اس منحوس وجود کا سہارا نہیں چاہا تھا۔ ڈاکٹر رضوان کے جونیئر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے خوش تھا اور رفتہ رفتہ کامیابی اور مہارت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ جو کچھ ہوا صرف اتفاق تھا۔ میں جاوید انصاری کے بازو کے اس نشان پر توجہ دیتا نہ نوبت یہاں تک پہنچتی۔ بیشک اس کے بعد بہت سی زندگیاں بچی تھیں۔ بہت سے گھرانوں کو خوشی حاصل ہوئی تھی، خود میرے اہل خانہ میری کامیابیوں سے بے حد خوش تھے۔ دونوں بھائیوں کے بہت سے کام میرے نام کی وجہ سے پورے ہوئے تھے۔ لیکن میرے دل کی خلش نے مجھے ہمیشہ بے چین رکھا تھا۔

میں خوش نہیں تھا، بلکہ کبھی کبھی یہ سوچتا تھا کہ آخر کار بھوریا چرن سے اختلاف ہو جائے گا اور میں ان تمام صفات سے محروم ہو جاؤں گا۔ اس وقت بڑی سبکی ہو گی۔ ایسی سوچوں کے وقت خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتا تھا کہ وہ زندگی مجھے اس زندگی سے زیادہ پسند ہو گی۔ اس ناپاک وجود کے رحم و کرم پر زندگی نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ اور پھر جو مکروہ عمل میرے باپ نے نہیں کیا، وہ میں کیسے کر سکتا تھا۔

اس رات ایک لمحے کے لیے نیند نہیں آئی۔ تہجد کے وقت وضو کر کے جائے نماز بچھا کر بیٹھ گیا۔ اس سے اچھا عمل کوئی نہیں تھا۔ انسان کتنے ہی اضطراب کا شکار ہو، اللہ کے حضور جھک جائے تو سکون کا سمندر موجزن ہو جاتا ہے۔ میں نے بڑی عاجزی سے دعا کی کہ معبود عظیم میری سوچ جواب دے چکی ہے۔ میں دوراہے پر کھڑا ہوں۔ میں بے بسی کا شکار ہو گیا ہوں۔ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ کیا کروں۔ سو بار زندگی دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس معصوم کی زندگی کبھی نہیں لوں گا۔ کچھ بھی ہو جائے۔

خدا کی قسم اندر سے ایک عجیب سکون ابھرا تھا۔ بہت دیر تک دعا مانگتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور سونے کے لیے جا لیٹا۔ نیند چند لمحوں میں آ گئی تھی۔ خوب دیر تک سویا۔ ناشتے پر خیال آیا تھا کہ کیا کروں۔ کس طرح بھوریا چرن سے یہ کام کرنے سے انکار کروں۔ اس پر کیا ردعمل ہو گا۔ وہ خونخوار ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے۔ جو بھی کرے گا اسے برداشت کیا جائے گا۔ احمد علی بھی یاد آئے تھے جنہوں نے کہا تھا کہ ساتواں پائل اسے کبھی نہیں حاصل ہونے دیں گے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

آخر کار اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر فریدہ کے ساتھ راؤنڈ پر نکلا۔ ڈاکٹر فریدہ نے بتایا۔ ''ڈاکٹر کاظم نے بتایا ہے کہ روم نمبر چالیس کا مریض رات کو بہت بے چین رہا ہے۔ اسے تین بار خواب آور انجکشن دیے گئے، لیکن وہ نہیں سویا۔ اس نے آکسیجن ماسک بھی اتار کر پھینک دیا تھا۔''

''میں اسے دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور چالیس نمبر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رام سروپ اسی کمرے میں تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے دروازہ بند کیا اور بھوریا چرن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، جو خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

''کیا بات ہے رام سروپ؟''

''دیکھیں گے۔ ارے دیکھ لیں گے اس مولبی کو۔ کب تک روکے گا او ہمارے راستے۔ کب تک روکے گا وہ ہمیں۔''

''کیا ہو گیا؟ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کا نا ہیں پتا۔ ارے کاہے من جلائے ہے ہمارا۔ تو کا نا ہیں پتا۔'' وہ بپھرے لہجے میں بولا۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 8

میں حیرانی سے رام سروپ کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ کیوں بپھرا ہوا ہے، مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ”جانت ہیں ہم اچھی طرح جانت ہیں، کھود اس چھورا کی جان لے لئی، اے کوئی بات ناہیں، ہمارا کام ہو جاتا تو بری بات تھی۔“

”جان لے لی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں چھنا کا ہوا۔ ”چھورا کی جان لے لی۔“ کہیں یہ اس بچے کی بات تو نہیں کر رہا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”میں گھر سے آ کر سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں رام سروپ! مجھے نہیں معلوم کیا ہوا ہے۔“

”او پائل چھوکرا رات کو مر گیا اور ہم جانت ہیں او اپنی موت نا مرا، اسے مارا گیا ہے کہ وہ ہمارے کام نہ آ سکے۔“

”کس نے مارا ہے اور کیسے مارا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مولبی نے بڑوں سے بات کری، ای بولا ان سے کہ ای گندی آتما کھنڈولا بن گیا تو ہاہا کار مچا دے گا سنسار میں، اسے کھنڈولا بننے سے روکنے کے لیے ایک چھورا کا جیون لے لیا جائے تو اچھا ہے۔“

”بکواس کر رہے ہو بھوریا چرن! زندگی خدا کی امانت ہوتی ہے اور کوئی سچا مسلمان کسی مسلمان کی جان کبھی لینے کی کوشش نہیں کرتا، چاہے اس کے پاس کتنی ہی دنیاوی یا روحانی قوت ہو۔“

”ارے چھوڑ۔ ای سب اس مولبی کا کیا دھرا ہے۔“

”میں کبھی نہیں مانوں گا، معلوم کرتا ہوں کہ اس بچے کی موت کیسے ہوئی۔“ میں نے کہا۔

”ارے اب ہمکا کا لینا ہے اس سے، بھاڑ میں جھونک اس کو، دیکھیں گے اب آگے کا کرنا ہے۔“

”ایک بات بتاؤ کسی مردہ پائل سے تمہارا کام نہیں بن سکتا؟“ بظاہر یہ سوال میں نے عام سے انداز میں کیا تھا لیکن پس پردہ یہ خیال تھا کہ یہ ناپاک روح کہیں بچے کی لاش کی بے حرمتی نہ کرے۔

”ناہیں رے ہمیں جیتے جاگتے پائل کا خون چاہیے ہوتا ہے، مرے ہوئے سر کا کوئی کام نا رہے۔“

”اب تم کیا کرو گے بھوریا چرن؟“

”نکل جائیں گے اس کے سریر سے، تُو اپنا ٹھکانہ کر لے، ای چھوکرا تو پہلے ہی مر چکا ہے، تُو بدنامی مول مت لے، ہم چلے جائیں گے تو اس کی ماٹی رہ جائے گی۔“

”ہوں......!“ میں نے کہا۔ صورتحال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بچہ مر گیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال ڈاکٹر انور کے سپرد تھی۔ معلوم کروں گا بچے کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ اس کی موت سے خوشی تو نہیں ہونی چاہیے لیکن فطری طور پر وہ تردد دور ہو گیا تھا جس نے رات بھر بے چین رکھا تھا۔

میں نے رات کو خلوص دل سے دعا مانگی تھی کہ کائنات کے مالک! میں کسی کی جان کیسے لے سکتا ہوں، میری مدد فرما......! اور میری مدد ہو گئی۔ وہ نامراد کالے جادو کا ماہر اپنے مقصد میں ناکام ہو گیا تھا۔ قدرت نے خود اس کا حل پیش کر دیا تھا۔ میں تو قیامت تک اس بچے کی جان نہ لیتا، چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔

اب بہت سے فیصلے کرنے تھے، چنانچہ میں نے کہا۔ ”رام سروپ! ابھی کہوں گا تمہیں ابھی! تم خود جانتے ہو کہ بچے کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے، ابھی کچھ دیر یہ بدن نہ چھوڑنا، میری لاج رہ جائے گی۔“

”تیری برائی کا کوئی کام نہ کریں گے، تجھ سے تو ہمیں بڑا کام لینا ہے رے...... جا کام کر لے اپنے!“

میں باہر نکل آیا۔ کوریڈور میں مجھے ڈاکٹر انور مل گیا۔ میں نے اس سے بچے کے بارے میں پوچھا تو ڈاکٹر انور نے کہا۔ ”بے حد افسوسناک کہانی ہے، بچہ بالکل تندرست تھا، ماں ناتجربہ کار تھی، اس کا پہلا بچہ تھا، اس نے بچے کو فیڈ کراتے ہوئے سینے سے بھینچ رکھا تھا، بچے کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گیا، ماں نیم پاگل ہو گئی ہے بے چاری!“

”میں اسے دیکھ سکتا ہوں ڈاکٹر انور......؟“

”اب کہاں! وہ لوگ رات کو تین بجے چلے گئے۔“

”اوہ! واقعی افسوسناک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔ پھر میں دوسرے مریضوں میں مصروف ہو گیا۔ دن کو ڈھائی بجے کے قریب ڈاکٹر برہان کا پیغام موصول ہوا۔ انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ ڈاکٹر برہان اسپتال کے چیئرمین کا نام تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس رام سروپ کے دونوں بیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ چیئرمین صاحب نے میرے سلام کا جواب دے کر مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر بولے۔ ”ان سے تعارف ہے آپ کا......؟“

”جی نام نہیں معلوم! یہ رام سروپ کے بیٹے ہیں، اتنا معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”پریشان ہیں دونوں، اپنے باپ کی خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں، میں نے بتا دیا ہے کہ رام سروپ صاحب کی نگہداشت آپ کر رہے ہیں۔“

”بہت سے گھریلو جھگڑے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب! پتاجی ایک دم بیمار ہو گئے، کاروبار اور جائداد کے بارے میں بھی فیصلے نہیں ہو سکے، ان کی حالت کچھ بہتر ہو تو ان سے کئی اہم کاغذوں پر دستخط کرانے ہیں۔“ رام سروپ کے ایک بیٹے نے کہا۔

میں نے گہری سانس لی تو اصل تشویش یہ تھی۔ اب جواب دینے میں آسانی ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”میں آپ لوگوں کو صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ رام سروپ جی اب چند گھنٹوں کے مہمان ہیں، ان کا اندرونی نظام فیل ہونے لگا ہے، آپ چاہیں تو انہیں اسپتال میں رکھیں، چاہیں تو گھر لے جائیں۔“

میرے جواب پر چیئرمین صاحب چونک پڑے۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ رام سروپ کے دونوں بیٹے پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”آپ کیا کہتے ہیں ڈاکٹر برہان!“

”میں خود ان کا جائزہ لیتا ہوں، آپ لوگ چاہیں تو باہر انتظار کریں۔“ یہ کہہ کر چیئرمین صاحب نے اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ ”آیئے ڈاکٹر کامران!“ مریض کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے چیئرمین نے کہا۔ ”معذرت کے ساتھ آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ڈاکٹر کامران!“

”جی سر......!“

”یہ پرائیوٹ اسپتال ہے، ہم لوگ پورے خلوص کے ساتھ اپنے ہر مریض کا علاج کرتے ہیں اور کوئی غیر ضروری تاخیر نہیں کرتے لیکن ہمارے اسپتال کا ایک معیار ہے، اسے قائم رکھنے کے لیے ہم اپنے اخراجات بھی مناسب رکھتے ہیں جو ہمارے لیے ضروری ہیں، اگر رام سروپ کی حالت خراب بھی ہے تب بھی ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا مطلب آپ یقیناً سمجھ رہے ہوں گے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

رام سروپ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹر برہان اسے چیک کرتے رہے۔ انہوں نے کچھ دوسرے ڈاکٹروں کو بھی طلب کر لیا تھا اور ان سے رام سروپ کے بارے میں مشورے کرتے رہے تھے۔ پھر کچھ دیر مشوروں کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”میرے اندازے کے مطابق تو حالت پہلے سے بہتر ہے، آپ کو اس کی موت کا شبہ کیوں ہوا؟“

”بس ایک اندازہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ چیئرمین صاحب نے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم رام سروپ کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

میں اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اور چیئرمین صاحب اپنے آفس چلے گئے لیکن کوئی پندرہ منٹ کے بعد ہی مجھے چیئرمین صاحب کا پیغام موصول ہوا۔ انہوں نے مجھے رام سروپ کے کمرے میں طلب کیا تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ طلبی کیوں ہوئی ہے۔ کمرے میں پہنچا تو رام سروپ کے بیٹے، دو اور ڈاکٹر اور خود ڈاکٹر برہان اندر موجود تھے۔ یہ لوگ رام سروپ کا معائنہ کر رہے تھے۔ برہان صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں ان کے قریب پہنچ گیا۔

”یہ مر گیا۔“ ڈاکٹر برہان نے سرگوشی میں کہا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بعد میں ڈاکٹر برہان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حقیقت یہ ہے ڈاکٹر کامران کہ بعض اوقات آپ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ لگتے ہیں، آپ جس کا علاج کرتے ہیں، وہ ٹھیک ہو جاتا ہے، آپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ رام سروپ مر جائے گا، وہ کچھ دیر کے بعد مر گیا۔“

”میں ایک گناہگار انسان ہوں سر!“ میں نے جواب دیا۔

”ہمیں آپ پر فخر ہے، بڑا معتبر نام بن گیا ہے ہمارے اسپتال کا، آپ کی وجہ سے!“

”بے حد شکرگزار ہوں۔“

زندگی کے شب و روز رواں دواں تھے۔ گھر کے حالات باہر کی دنیا سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ اپنی لگن اپنی جگہ، گھر والوں کی سوچ الگ......! بھابھیاں اپنا راگ الاپتی رہتی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب! ہم آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔“ ثانیہ بھابھی شرارت سے بولیں۔

”کیوں بھابھی......؟“

”یار! شادی وادی کر لو۔ ورنہ لوگ کہیں گے کہ بھابھیوں کو دیور جی کی پروا ہی نہیں ہے۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے بھابھی!“

”اس بہت کچھ میں شادی بھی شامل کر لو۔“ ثانیہ بھابھی بھی ہار ماننے والی کہاں تھیں۔

”بھابی! شادی کے بعد انسان کچھ اور کرنے کے قابل کہاں رہتا ہے، بیوی ہتھکڑی کی طرح ہوتی ہے، دونوں ہاتھ بندھ جاتے ہیں پھر بچے بیڑیاں بن جاتے ہیں، پتا نہیں انسان اتنی خوشی سے یہ عمر قید کیوں قبول کر لیتا ہے۔“

”ارے ارے۔ ہمارے منہ پر ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہو، سن رہی ہیں ندا بھابھی......؟“

”کہنے دو، کہنے دو...... ان شاءاللہ اونٹ بہت جلد پہاڑ تلے آئے گا۔“ ندا بھابھی نے مسکرا کر کہا۔

گھر کا ماحول زندگی میں شگفتگی پیدا کر دیتا تھا۔ دونوں بھابھیاں میرے لیے بہت کچھ سوچتی رہتی تھیں لیکن میری سوچ ان سے بہت مختلف تھی۔ میں اپنی محنت اور لگن سے کچھ بننے کا ارادہ رکھتا تھا کہ درمیان میں یہ مصیبت آ گئی تھی۔ وہ بدروح خود مجھ تک آ گئی تھی اور میری شہرت کی وجہ بن گئی تھی جبکہ میں نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا اور اب میں بندھ کر رہ گیا تھا۔ کیا کرنا چاہیے مجھے، جو کچھ ہوا تھا اس سے کیسے بچنا چاہیے، اب اس سے نجات کیسے ملے......؟

کوئی دو ماہ گزر گئے۔ بھوریا چرن کو ایک لمحے کے لیے نہیں بھول سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے جس مریض پر بھی نگراں مقرر کیا جاتا تھا، اس کی بیماری مجھے پتا چل جاتی تھی اور میرے علاج سے وہ ٹھیک ہو جاتا تھا۔

اس دن بھی ایک مریضہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ میرے طریق کار کے مطابق اسے معائنے کے لیے خاص کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں چونک پڑا تھا۔

تبھی وہ مکروہ لہجے میں بولی۔ ”ہاں! ہم ہی ہیں۔“ اس کی آواز میں نے پہچان لی تھی۔ ”بات کرنی ہے تو سے، بڑا سمے بیت گیا رے، پریسان ہو گئے ہیں ہم، سمجھ گئے ہیں ہم کہ تُو ہمارا کام کرنا ہی نہیں چاہتا پر بروا......! ای تو تجھے کرنا ہی ہوگا۔“

”مجھے ایک بات بتاؤ بھوریا چرن! کیا تمہارا کام کوئی دوسرا نہیں کر سکتا، مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

”وچن دیا تھا ہم نے کالی دیوی کو، سات سڑتی ہوئی لاشوں کی بھینٹ دی تھی تورے پتا کے نام کی، کالے جادو کے پھیر ہو ویں ہیں یہ سب! تیرا باپ دولت کی تلاش میں پھر رہا تھا، ہم نے کہا ہمیں کھنڈولا بنا دے، ہم تورے چرنوں میں دولت کے ڈھیر لگا دیں گے، مان گیا، ہمیں وچن دیا اس نے کہ ہمیں پیر پھگو ادوار پہنچا دے گا، ہم نے سارا انجام کر لیا، دیوی کو بھینٹ دے دی، تین موقع ملیں بس۔ اس کے بعد سب کچھ ختم! تو ہار پتا وچن دے کر مکر گیا، لاکھ جتن کر لیے نا مانا، خوب کھون کھرابا ہوا پھر اس کا کام بن گیا اور ہم ہار گئے، دوسرے جنم کے لیے ہماری سنکھا سکتی بھی چلی گئی پھر ٹُو مل گیا، تُو اپنے پتا جیسا ہے، ہمارا کام تجھ سے بن جائے گا، دیکھ لے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے تیری کیسی جے جے کار ہو رہی ہے، ہمیں کھنڈولا بن جانے دے سارے سنسار میں تیرا نام نہ گونجے تو ہمارا بھی نام نہیں۔“

”تم نے یہ روپ کیوں دھارا ہے؟“

”تیرے پاس آنا تھا۔“

”یہ لڑکی کون ہے......؟“

”بیمار ہے، دوا دارو دے دے، ٹھیک ہو جائے گی، اب تُو ہماری وہ بات سن لے جس کے لیے ہم تیرے پاس آئے ہیں۔“

”کیا بات ہے......؟“

”ہم نے آج تک تجھے فائدے ہی پہنچائے ہیں پر تُو نے من سے ہمارا کوئی کام نہیں کیا، اب ایک بڑا کام ہم تو ہے دے رہے ہیں، بس تو ہے او کام کرنا ہے۔“

”کیا کام ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میرا دل بڑی زور سے دھڑ کا تھا۔

”او ای کام تو ہے کرنا ہے، جرور کرنا ہے، نہیں تو تیری ہماری دوستی ختم ہو جائے گی۔“

”کام تو بتاؤ؟“ میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔

”تیرا مولبی ہماری جان کا روگ بن گیا ہے، او ہمارے ہاتھوں سے مارا گیا ہے، تیں اس کی آتما ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہے، او ہمیں سنکھا ناہیں بننے دے رہا کہ ہم کھنڈولا بنیں، جگہ جگہ ہمیں روک رہا ہے اور اس کا ایک ہی حل نکالا ہے ہم نے، بتائیں تو کا......؟“

”ہاں بتاؤ......!“ میں نے کہا۔

”ہم جانت ہیں بروا! تورے من میں کا ہے، پر پگلا ہے تُو، بول سارے جیون تورے پتا کو کا ملا؟“

”تم اس بات کو چھوڑو، مجھے بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو؟“

”رات کو تین بجے مولبی کی کبر پہ جا، ہم باہر ایسا ماحول بنا دیں گے کہ کوئی کبرستان کے پاس بھی نہ پھٹکے، تو اندر جا کر مولبی کی کبر کھودے گا اور اس کی ساری ہڈیاں جمع کرے گا، ان ہڈیوں کو لے کر تُو چھکنڈی بنسی راج کے پاس جائے گا، باکی کام بنسی راج تجھے بتا دے گا اور سن کھاس طور سے تو اس تاویج کا کھیال رکھیو، اسے ہاتھ مت لگائیو، اسی نے ساری کھرابی کری ہے، نہیں تو اب تک مولبی کی کبر کبھی کی کھالی ہو گئی ہوتی۔“

”کیا مطلب......؟“ میں نے چونک کر پوچھا اور لڑکی طنزیہ انداز میں ہنس پڑی۔

بھوریا چرن کو میں نے پہلی بار ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے اسی مکروہ آواز میں کہا۔ ”ارے مکدر ہی کھراب تھا ہمارا کہ کالی دیوی سے تیرے پتا کی بات کر بیٹھے، تیرے سہر میں بہتیرے ہمارے کام کے لیے تیار ہو جاتے، تو ہے پتا ہے کہ ناتو ہارے سہر میں بہتیرے ایسے ہیں جو مُردوں کی ہڈیاں، ان کے دل، گردے، آنکھیں، انتڑیاں نکال کر بیچ دیویں ہیں، ہم نے ان سے بات کی تھی کہ مولبی کی ہڈیاں نکال لائیں، بڑی دولت دی تھی ہم نے انہیں۔ پن......!“

”پر کیا......؟“ میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

”آگ لگ گئی سسروں کے سریر میں، بھسم ہو گئے ہوتے پر مولبی نے رحم کر دیا ان پر، بچ گئے پر بری طرح جل گئے۔“

”اوہ......!“ میں نے اطمینان کی سانس لی پھر کہا۔ ”تو اب تم مجھے خاک کرنا چاہتے ہو؟“

”نا ہو گا تو کھاک......! ہم نے اپنے گیان سے پتا کر لیا ہے، ای کام بھی تیرے علاوہ اور کوئی نا کر سکے ہے، مولبی تجھ پر بھروسہ کرے ہے، اے ہی بھروسہ تیرے کام آئے گا اور تو اوکی ہڈیاں نکال لائے گا۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے منہ سے ہچکی سی نکلی اور میرے دل سے آواز ابھری۔ ”احمد علی صاحب! اپنا سب کچھ قربان کر دوں گا آپ پر، سو زندگیاں بھی ملیں گی تو واردوں گا آپ کے قدموں میں، آپ کی حرمت کبھی داغدار نہ ہونے دوں گا، خدا کی قسم مٹی میں مل جاؤں گا لیکن آپ کو......!“ میں رونے لگا۔

بھوریا چرن نے لڑکی کے روپ میں چونک کر مجھے دیکھا پھر اس کی آنکھوں سے قہر و غضب نمایاں ہو گیا۔ ”کہا نا ہم نے تو سے، تو ہار من کی باتیں ہمیں معلوم رہیں، کا ناہیں کیا ہم نے تیرے لیے، راجہ بنا دیا، تو نے ہمارے لیے کا کیا...... ایک کام جو کیا ہو، ای تو ہے کرنا پڑے گا چھوکرا......! نا ہیں تو پھر نتیجے کا بھگتان تو بھگتے گا۔“

لڑکی نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سکتے کے عالم میں دیر تک کھڑا رہا پھر کچھ دیر کے بعد باہر نکل آیا۔ احمد علی بری طرح یاد آ رہے تھے۔ دل بے چین ہو گیا پھر اسپتال میں نہ رکا گیا۔ میں نے اپنی جگہ دوسرے ڈاکٹر کی ڈیوٹی لگائی، کچھ دوائیں اور انجکشن لڑکی کے لیے تجویز کیے اور باہر نکل آیا۔

کچھ دیر کے بعد میری کار لانڈھی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ راستے بھر نہ جانے کیا کیا سوچیں دامن گیر رہی تھیں۔ آخر کار میں قبرستان پہنچ گیا۔ آج جمعرات تھی، قبرستان میں لوگ نظر آ رہے تھے۔ میں نے دور سے احمد علی کی قبر کی طرف دیکھا۔ وہاں چہار دیواری کھنچی ہوئی تھی جس میں دروازہ لگا تھا۔ اس وقت یہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے اس تبدیلی کو حیرت سے دیکھا۔ پھول خریدے، اگربتیاں لیں اور قبر کے پاس پہنچ کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر کچھ لوگ فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔ ان میں کچھ لوگ مجھے اس وقت سے جانتے تھے، جب میں احمد علی کے پاس آتا تھا اور وہ مجھے مسجد کے سامنے والے چائے خانے میں چائے پلاتے تھے۔

ان سے سلام دعا ہوئی۔ امجد خان نامی ایک شخص نے کہا۔ ”بہت دن کے بعد آئے ہیں ڈاکٹر صاحب......؟“

”ہاں بھائی! کچھ مصروفیت تھی، یہ چار دیواری کب کھنچی؟“

”کیا بتائیں ڈاکٹر صاحب! قیامت قریب آ گئی ہے، انسان جانور بن چکے ہیں، خوف خدا دل سے نکل چکا ہے، آپ نے ٹی وی پر دیکھا ہوگا کئی گروہ ایسے ہیں جو مُردوں کی ہڈیاں، تازہ اعضاء کا کاروبار کرتے ہیں، پہلے یہ مردود صرف کفن چراتے تھے، اب یہ پورا مردہ چرا لے جاتے ہیں۔ دوبار ان کم بختوں نے احمد علی صاحب کی قبر کھودنے کی کوشش کی تھی لیکن کیفر کردار کو پہنچ گئے۔“

”کیسے......؟“ میں نے پوچھا۔

”آگ بھڑک اٹھی تھی، موت نے بھی انہیں قبول نہیں کیا، زندہ ہیں وہ مگر مُردوں سے بدتر! پورے بدن گل سڑ گئے ہیں، آپ انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے اتنی بری حالت ہے۔ خیر ہم لوگوں نے فوراً پیسے جمع کر کے یہ چار دیواری بنوا دی اور ایک چوکیدار بھی پہرے پر بٹھا دیا۔“

”اس میں میرا حصہ بھی شامل کر لو امجد بھائی! میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں۔“ میں نے خاصی معقول رقم امجد کو دی۔

احمد علی کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر ان سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگی۔ بہت دیر وہاں رکا پھر واپس چل پڑا۔ ملعون بھوریا چرن بھلا احمد علی کو کیا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ دل کو بڑا اطمینان ہوا تھا۔ یہ مکروہ کام تو میں سو بار مر کے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر میں واپس آ گیا۔

اب بھوریا چرن سے کھلم کھلا لڑائی کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی جبکہ اس نے کئی جگہ میری مدد کی تھی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ مجھ سے تشخیص کی قوت چھین لے گا، چھین لے، میں نے کون سی اس کی خواہش کی تھی۔ جتنی اوقات ہے، اس کے مطابق کام کروں گا۔

کئی دن انتظار کرتا رہا مگر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ بھوریا چرن نے مجھ سے کوئی باز پرس بھی نہیں کی تھی، نہ ہی کسی شکل میں نظر آیا تھا۔ پھر یہ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے۔ بھوریا چرن ذہن سے تو نہیں نکلا تھا لیکن اب میں اس کے خوف میں مبتلا نہیں تھا۔ میری وہ صفت بھی برقرار تھی اور میں انسان کے بدن میں جھانک کر اس کی بیماری تلاش کر لیتا تھا۔ میری شہرت آسمان کی بلندیاں چھو رہی تھی۔

کوئی پانچ ماہ بعد کی بات ہے کہ ڈاکٹر برہان نے مجھ سے ملاقات کی اور مسکرا کر بولے۔ ”ڈاکٹر کامران! میری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے۔“

”شکریہ! کس سلسلے میں؟“

”ایک میڈیکل فاؤنڈیشن کا نیورو سرجری سیمینار دہلی میں ہو رہا ہے، آپ کو ہمارے اسپتال کے حوالے سے اس میڈیکل کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے، یہ ایک بڑا اعزاز ہے ہمارے لیے!“

”آپ کو بھی مبارک ہو ڈاکٹر برہان!“

”شکریہ! آپ تیاریاں کر لیں، ویسے آپ کی شہرت دور تک پہنچ گئی ہے، ہندوستان سے ایک بہت بڑے ہارٹ سرجن ڈاکٹر سی پی بھلا نے مجھے فون کیا ہے اور آپ کے بارے میں پھیلی شہرت کی تصدیق کی ہے، ویسے ڈاکٹر کامران! ہم نے آپ کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ آپ ہمیں اپنے طریقۂ تشخیص کے بارے میں بتائیں لیکن میڈیکل کانفرنس میں آپ سے یہ سوالات ضرور کیے جائیں گے۔“

”میں معذرت کر لوں گا۔“

”آپ سے انسانیت کی بھلائی کے نام پر درخواست کی جائے گی۔“

”مجبور تو نہیں کیا جائے گا؟“

”آپ کی خاموشی یا انکار کو ناپسند ضرور کیا جائے گا۔“

”میں سوچ کر جواب دوں گا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر برہان کو احساس ہو گیا کہ میں نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے چنانچہ اس شام وہ پہلی بار ہمارے گھر آ گئے۔ انہوں نے بھائیوں سے مل کر بات کی اور ان سے کہا کہ یہ دعوت نامہ اور اس کانفرنس میں شرکت بڑا اعزاز ہے۔ غرض یہ کہ خاصی باتیں ہوئیں اور میرا ہندوستان جانا طے ہو گیا۔

پھر ہندوستان کے سفر کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ڈاکٹروں کا بڑا گروپ تھا، ڈاکٹر برہان بھی میرے ساتھ تھے اور سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر رضوان بھی اس گروپ میں شامل تھے۔ میں نے انہیں دور سے دیکھا اور ایئرپورٹ لابی میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔

”ایک بار بھی دل نہیں چاہا کہ مجھ سے ملو؟“ انہوں نے کہا۔

”ڈرتا تھا سر......! آپ مجھ سے ناراض جو تھے۔“

”ہاں! وہ میری غلطی تھی۔“

”نہیں سر! مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔“

”خوب ترقی کی ہے، خوب نام کمایا ہے، شاید یقین نہ کرو اخبارات میں تمہاری تعریفیں پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔“

”آپ میرا آغاز ہیں سر! میں نے الف، بے آپ سے سیکھی ہے۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔

”اور الف مذ برآ......؟“ ڈاکٹر رضوان نے کہا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

مجھے بہت خوشی ہوئی۔ نئی بات تھی کسی نے کبھی ڈاکٹر رضوان کو مسکراتے نہ دیکھا ہوگا۔ خود ان کے اسپتال کے دوسرے ساتھی ڈاکٹروں نے چونک کر ڈاکٹر رضوان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بولے۔ ”جہاز میں میرے پاس بیٹھنا۔“

”جی سر......!“ میں نے سعادت مندی سے کہا پھر میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اس بات کو ڈاکٹر برہان نے کسی قدر ناگواری سے دیکھا تھا۔ ان کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا لیکن میں ان فضول باتوں کی پروا نہیں کرتا تھا۔

راستے میں وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ دہلی تک کا سفر طے ہو گیا۔ ہمارا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا تھا۔ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا، بہترین خاطر مدارات کی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے ہم سے ملاقات کی تھی۔

ان میں ایک بہت ہی خوبصورت خاتون ڈاکٹر نیمو ملہوترہ تھیں۔ برین اسپیشلسٹ تھیں اور بڑے نام کی حامل تھیں۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن بے حد پرکشش خاتون تھیں۔ کہنے لگیں۔ ”آپ کو جو پراسرار حیثیت حاصل ہے ڈاکٹر کامران! اس نے مجھے آپ کا دیوانہ بنا رکھا ہے، آپ یقین کریں جب سے پتا چلا کہ آپ بھی سیمینار میں شرکت کے لیے آ رہے ہیں تو میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں، میں نے اس وقت سے اب تک کا وقت لمحہ لمحہ گن کر گزارا ہے۔“

”بڑا اعزاز دیا ہے آپ نے مجھے ڈاکٹر نیمو!“ میں نے ان بیباک الفاظ کو نظرانداز کر کے کہا۔

”آپ کے بارے میں ہمارے اخبارات بھی وہ سب کچھ چھاپتے رہے ہیں جو پاکستان کے اخبارات میں چھپتا تھا۔“

”یہ آپ لوگوں کا پیار ہے۔“

یہ پیار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ ڈاکٹر نیمو ہر وقت مجھ پر مسلط رہنے لگی۔ وہ صبح نو بجے میرے کمرے میں آ جاتی، ناشتہ میرے ساتھ کرتی اور پھر سارا دن میرے پیچھے لگی رہتی۔ میں نے پاکستان سے آنے والے کچھ ڈاکٹروں کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھی تھی۔

دوسرے دن اور اس کے بعد بھی اس نے وہی انداز برقرار رکھا تو میں پریشان ہو گیا۔ کانفرنس شروع ہونے میں شیڈول کے مطابق ابھی پانچ دن مزید باقی تھے۔ اس دوران ہمیں کبھی مشترکہ اور کبھی انفرادی طور پر خصوصی اسپتالوں کے دورے کرائے جا رہے تھے۔ نیمو چونکہ خود بھی ڈاکٹر تھی، اس کے علاوہ وہ پاکستان سے آنے والے ڈاکٹروں کی افسر استقبالیہ بھی تھی، اس لیے وہ ہمیشہ ساتھ ہوتی تھی لیکن بس انداز وہی تھا یعنی اس نے صرف مجھے ہی پاکستان سے آنے والا ڈاکٹر سمجھ لیا تھا اور ہر لمحہ میرے ساتھ رہتی تھی۔

پھر ایک رات، جب موسم کافی حد تک سرد تھا اور وقت بھی کافی ہو گیا تھا۔ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اس وقت کسی کی آمد غیر متوقع تھی چنانچہ کسی قدر ناگواری سے اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا۔

دروازے پر ڈاکٹر نیمو کھڑی تھی۔ مجھے اس وقت اس کی آمد بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔

”ہم لوگ ڈاکٹر ہیں، مسٹر کامران! لیکن دل کسی کے سینے میں بھی ہو، اس کمبخت کی جارحیت سب کے ساتھ یکساں ہوتی ہے۔“

”جی......!“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اس وقت، بہت دور سے آئی ہوں، بس دل چاہا تھا کہ آپ کے ساتھ ایک کپ کافی پیوں، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے دل کے ساتھ یہ واردات نہیں پیش آئی ہوگی مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں پسپا ہو گئی، جس کے لیے سوری!“

میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی بات پر نہیں بلکہ اس کے مسلسل بولنے پر مجھے ڈاکٹر سائرہ یاد آ گئی تھی۔

”شکر ہے دل آخر مسکرا ہی دیا، میں روم سروس کو کافی کے لیے کہہ کر آئی ہوں، چلیے چھوڑیے یہ بتایئے آپ کے بارے میں جو افواہیں اڑی ہوئی ہیں کہ آپ جادوگر نما ڈاکٹر ہیں، ان میں کیا صداقت ہے؟“

”افواہیں تو افواہیں ہی ہوتی ہیں، ان پر کان نہ دھرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ جو آپ ہی کا محاورہ ہے کہ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”یہ اس محاورے کا خالق ہی بتا سکتا ہے۔“

”پھر بھی یہ کہانیاں کچھ نہ کچھ بنیاد تو ضرور رکھتی ہوں گی، کسی بھی مرض کی تشخیص کے لیے آپ کا طریق کار کیا ہوتا ہے؟“

”وہی جو آپ کا ہے۔“ میں نے ناگوار لہجے میں کہا جسے اس نے بھی محسوس کر لیا۔ البتہ بات آگے نہ بڑھی کیونکہ ویٹر کافی لے آیا تھا۔

کافی کے دوران خاموشی طاری رہی تھی۔ نیمو کو میرے ناگوار لہجے کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے مزید کوئی بات نہیں کی لیکن کافی ختم ہوتے ہوتے مجھ پر شدید نیند کا حملہ ہوا اور میری پلکیں جڑنے لگیں۔ مجھے فوراً کسی خاص بات کا احساس ہوا لیکن پھر میرے اعصاب شل ہوتے گئے اور چند لمحوں میں دنیا میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ہوش اس وقت آیا جب کوئی زور زور سے میرے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا۔ میں نے حیرانی سے دیکھا تھپڑ مارنے والا ایک موٹے بدن کا پولیس آفیسر تھا جس کی آنکھوں سے خشونت جھلک رہی تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سامنے ہی ڈاکٹر برہان، ڈاکٹر رضوان کھڑے تھے۔ مجھے اپنے قریب مسہری پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو میں نے اُدھر دیکھا۔

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرے قریب ڈاکٹر نیمو لیٹی ہوئی تھی لیکن عجیب انداز میں اس کے بدن پر چادر پڑی ہوئی تھی، اس کا لباس دور صوفے پر پڑا ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ ہولناک بات اس کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

”آپ اٹھنا پسند کریں گے ڈاکٹر صاحب!“ پولیس آفیسر نے زہریلے لہجے میں کہا اور میں بستر سے نیچے اتر آیا۔

بعد کی کارروائی خواب جیسی تھی۔ ہوش کے عالم میں ایسا کوئی عمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ قتل ڈاکٹر نیمو کا ہوا تھا جسے زیادتی کے بعد گردن دبا کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ سب کچھ ثبوتوں کے ساتھ تھا۔ میں نے نشے کے عالم میں یہ عمل کیا تھا۔ شراب کی آدھی بوتل مل گئی تھی۔ نیمو بے لباس تھی اور میڈیکل رپورٹ میرے خلاف تھی۔ بس ایک نکتہ میرے حق میں جاتا تھا وہ یہ کہ ڈاکٹر نیمو بے لباس تھی جبکہ میرا پورا لباس میرے بدن پر تھا لیکن یہ کوئی مؤثر ثبوت نہیں تھا۔ میری ذہنی کیفیت خراب تھی۔ اس بارے میں سوچتا تو جنون سوار ہو جاتا تھا۔ میرا کردار ہمیشہ بے داغ رہا تھا، اب تک کی زندگی میں کوئی رسوائی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ اچانک ہوا تھا لیکن کیوں ہوا تھا۔

بڑے بھائی پاکستان سے آ گئے، مجھ سے جیل میں ملاقات کی۔ جس وقت وہ میرے پاس آئے، میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ سلام پھیر کر انہیں دیکھا تو دل عجیب سا ہو گیا۔ میری آنکھیں خشک تھیں، میں سلاخوں کے پاس آ گیا، انہیں سلام کیا اور پھر بولا۔ ”کیا میں نے ایسا کیا ہوگا؟“

”نہیں......!“ بھائی جان نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”خدا کا شکر ہے، گھر میں سب سے کہہ دیں میں ایک غیور باپ کا بیٹا ہوں، ایک باکردار پاکستانی ہوں بس چاند کی طرح گرہن میں آ گیا ہوں، میرے لیے دعا کریں۔“ بھائی جان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے جیل میں مجھ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ ان کے سامنے میری تین پیشیاں ہوئیں اور مجھ پر فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ مجھے ڈاکٹر نیمو کا قاتل قرار دیا گیا اور یہ اندازہ ہو گیا کہ آخر کار مجھے سزائے موت دی جائے گی۔ اب صرف عدالت کو آخری فیصلہ سنانا تھا۔ بھائی جان واپس چلے گئے۔ مجھے تسلی دے کر گئے تھے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا، حکومتی سطح پر حکومتِ ہندوستان سے اپیل کی جائے گی لیکن وکیلوں کی بحث سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔

پھر ایک رات میں تہجد پڑھ کر سو گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں گہری نیند آ گئی تھی جبکہ عموماً میں بے خوابی کا شکار رہتا تھا۔ حلیہ بھی بالکل بدل گیا تھا، چہرے پر گھنی داڑھی آ گئی تھی، کچھ دبلا بھی ہو گیا تھا۔

صبح جاگا تو سورج خوب چمک رہا تھا۔ جیل کی جس کوٹھری میں بند تھا، وہاں دھوپ کا کوئی گزر نہیں تھا۔ نہ جانے کب سے دن کے اجالے کی چمک نہیں دیکھی تھی، پھر یہ دھوپ کہاں سے آ گئی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دھوپ کے مرکز کو دیکھنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ یہ جیل کی کوٹھری نہیں ہے۔

بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یقین کرنے کی کوشش کی کہ جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہ خواب نہیں ہے۔ اندازہ ہو گیا کہ یہ خواب نہیں ہے پھر کیا ہے، ایسا کیسے ہو گیا۔ میری جگہ بدل گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھنے لگا۔ یہ جیل کی عمارت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ جیل کی کھردری زمین نہیں تھی بلکہ ایک نرم فوم کا گدا تھا، مسہری تھی جو ایک بڑے سے کمرے میں تھی اور کمرہ بھی بڑی نفاست سے آراستہ تھا۔ ہو گیا، کوئی بڑا کام ہو گیا۔ ایک ہی بات دماغ میں گونجی تھی لیکن کیا ہوا ہے، یہ سمجھنا آسان نہیں تھا۔

ہمت کر کے مسہری سے نیچے اتر آیا۔ وسیع کمرے میں دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے لازمی طور پر کسی سازش کے تحت لایا گیا تھا اور اس کمرے میں قید کر دیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں دروازے کے کھلے ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن انسانی فطرت ایسے حالات میں امکانات کو کہاں قبول کرتی ہے چنانچہ میں دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ حیرانی کی بات تھی لیکن حیرانی کی تو ساری باتیں تھیں۔ میں باہر نکل آیا۔ سرخ پتھروں کی سلوں سے بنا فرش تھا، شفاف اور ٹھنڈا! دیواریں بھی انہی پتھروں سے بنی ہوئی تھیں۔ یہ بیحد وسیع دالان تھا، آگے کے حصے میں سرسبز و شاداب گھاس کا لان نظر آ رہا تھا جس میں بے شمار پپیتے کے درخت نظر آ رہے تھے اور ان کی میٹھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لان کے اختتام کے بعد پھر ایسی ہی عمارت نظر آ رہی تھی جہاں میں اس وقت موجود تھا۔ یاالٰہی! کونسی جگہ ہے، میں کہاں اور کیسے آ گیا۔

سب کچھ یاد تھا، قتل کا مجرم قرار دیا گیا تھا، سزائے موت سنائی جانے والی تھی۔ جیل سے میں یہاں کیسے آ گیا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بدن پر جیل ہی کا لباس تھا، پاؤں بھی ننگے تھے۔ کچھ اور آگے بڑھا اور دالان کی سیڑھیاں اتر کر لان میں آ گیا۔ ٹھنڈی گھاس نے سرور کی کیفیت بیدار کر دی۔ سب سے پہلے خود کو یہ یقین دلایا کہ ہوش میں ہوں اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہ خواب نہیں ہے۔ اب خود کو سنبھال کر آگے دیکھنا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔

لان عبور کر کے عمارت کے دوسرے حصے میں پہنچ گیا۔ چاروں طرف نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔ کسی انسان کا وجود نہیں تھا، یہاں تک کہ پرندے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ بے حد پراسرار اور پرسکوت ماحول نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی دوسری طرف کے برآمدے جیسی سیڑھیاں تھیں جنہیں عبور کر کے میں برآمدے میں پہنچ گیا۔

برآمدے کی دیوار میں ایک بڑا دروازہ نظر آ رہا تھا جو دوسری طرف کے دروازے سے مختلف تھا۔ یہ اُدھر کی نسبت بہت بڑا تھا اور اس میں پیتل کی کیلیں جڑی نظر آ رہی تھیں۔ اس دروازے کے پاس آ کر میں نے اسے دھکیلا، قوت استعمال کرنی پڑی تھی، ”چوں چر“ کی آواز کے ساتھ یہ دروازہ بھی کھل گیا۔

دروازے کے دوسری طرف ایک بے حد وسیع ہال تھا، پرسکوت اور نیم تاریک! لیکن ہال کے بیچوں بیچ کالے پتھر سے بنا ایک بت ایستادہ تھا، بھیانک اور وحشت ناک بت جو کالی دیوی کا تھا۔ بہت سے ہاتھ جن میں مختلف ہتھیار ترشول اور کلہاڑے وغیرہ۔ سرخ خون آلود زبان باہر لٹکی ہوئی تھی جس سے اس وقت بھی خون کے قطرے ٹپک کر اس کے پیروں کو بھگو رہے تھے۔ اس سے زیادہ خاص بات یہ تھی کہ اس کے پیروں کے پاس نصف دائرے کی شکل میں سات لڑکیاں سر جھکائے ہاتھ باندھے بیٹھی تھیں۔ ان کے جسموں پر رنگین لباس تھے۔ چہرے چونکہ کالی دیوی کے بت کے سامنے جھکے ہوئے تھے، اس لیے نظر نہیں آ رہے تھے۔

کالی دیوی کے اس مجسمے کو میں نے اکثر ہندوستانی فلموں میں دیکھا تھا، اس لیے مجھے اس کے بارے میں اندازہ ہو گیا تھا۔ ابھی پوری طرح اس ماحول کا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ ہال کے ایک دور دراز گوشے میں ایک اور دروازہ کھلا اور کوئی اس سے باہر نکل آیا۔ نیم تاریکی کی وجہ سے اس کے نقوش نمایاں نہیں تھے لیکن جونہی وہ قریب آیا، میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ بنسی راج تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کیا اور بولا۔ ”بنسی راج ہیں مہاراج ہم...... پہچان لیا؟“

بہت دن کے بعد بھوریا چرن یاد آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ آہ اب تو میں بھوریا چرن کی سرزمین پر تھا۔ یہ سب کچھ جو میرے ساتھ ہوا تھا، اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

”نہیں پہچانا مہاراج......؟“

”پہچان لیا بنسی راج۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”مہمان ہیں آپ ہمارے، آیئے۔“ اس نے کہا۔

میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اب میری حیرت رفع ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کونسی جگہ ہے بنسی راج......؟“

”ماتا بھون، کالی ماتا کا استھان...... آیئے!“ اس نے کہا اور اسی طرف مڑ گیا جدھر سے آیا تھا۔

میں نے اس کے پیچھے قدم اٹھا دیئے تھے۔ اس دروازے پر پہنچ کر وہ رکا اور مجھے دیکھنے لگا۔ میں قریب پہنچا تو وہ اندر داخل ہو گیا، میں نے بھی اندر قدم رکھ دیئے لیکن اندر داخل ہو کر یوں لگا جیسے کسی فلم کا منظر بدل گیا ہے۔ یہ بالکل جدید کمرہ تھا۔ بہترین پینٹ کی ہوئی دیواریں، اعلیٰ درجے کا فرنیچر، صوفے وغیرہ۔

”بیٹھیے مہاراج! دیوی جی آ رہی ہیں۔“ بنسی راج نے کہا اور ایک دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا۔

میں احمقوں کی طرح کچھ دیر کھڑا رہا پھر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں یہ دیوی جی کون تھیں اور کیا کرنے والی تھیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسی دروازے سے دیوی جی اندر داخل ہوئیں جس سے بنسی راج اندر داخل ہوا تھا۔ میری نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ انہیں دیکھ کر میرے سر میں جیسے بم پھٹ گیا تھا۔ خوبصورت گلابی ساڑھی میں ملبوس، ماتھے پر سرخ بندی لگائے، حسین نقش و نگار کی مالک ڈاکٹر نیمو چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا اور نغمہ بار آواز میں بولی۔ ”ہیلو ڈاکٹر کامران!“

”آپ زندہ ہیں ڈاکٹر نیمو......؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”نہیں تو!“ اس نے کہا اور ہنس پڑی۔

”کیا مطلب......؟“ میں حیرت سے بولا۔

”آپ نے مجھے مار جو دیا تھا۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

میں کچھ دیر خاموش رہا پھر میں نے کہا۔ ”مجھے بتانا پسند کریں گی نیمو کہ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”یہی بتانے کے لیے آپ کے پاس آئی ہوں، بھوریا چرن مہاراج نے کہا ہے کہ آپ کو بڑی وضاحت سے سب کچھ بتایا جائے۔“

”بھوریا چرن......!“ میرے منہ سے گہری سانس کے ساتھ آواز نکلی۔

”آپ انہیں بھول گئے لیکن وہ آپ کو نہیں بھولے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ ہی ان کی امیدوں کے مرکز ہیں، بھوریا مہاراج نے سارا جیون امرشکتی پانے کے لیے جدوجہد کی ہے، امرشکتی یعنی زندہ جاوید رہنے کے لیے۔ وہ کالی ماتا کے داس ہیں اور کالی ماتا نے انہیں کھنڈولا بننے کا وردان دیا ہے، کالے جادو کے بہت سے درجے ہوتے ہیں، ان میں بیر، بھیر، بھیروں، چنڈال، چڑیل، لونا چماری، اکشک، شنکھا اور آخر میں کھنڈولا ہیں، کھنڈولا کبھی نہیں مرتا، اسے پورے سنسار پر ادھیکار ہوتا ہے، سنسار کے کونے کونے میں وہ جو چاہتا ہے، کر سکتا ہے۔ بھوریا چرن مہاراج شنکھا شکتی تک جا پہنچے تھے، اس کے لیے انہوں نے سارا جیون تپسیا میں بتا دیا تھا، وہ سارے جتن کیے تھے جو کھنڈولا بننے کے لیے کیے جاتے ہیں اور وہ اس سیڑھی تک جا پہنچے تھے۔ کالے جادو کے اصولوں کے مطابق کھنڈولا بننے کے لیے انہیں کالی ماتا کو ایک وچن دینا ہوتا ہے، اور وچن یہ ہے کہ وہ ایک ایسے مہان درویش کے دھرم کو بھشٹ کریں گے جس نے سارے جیون عبادت کی ہو، جس نے ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنا جیون نیک کاموں میں گزارا ہو، کبھی کسی کا دل نہ دکھایا ہو اور لوگوں نے ہمیشہ اس سے فیض حاصل کیا ہو، ایسے مہان مسلمان درویش پر بھی مہاپُرش کا گن جی ہیں، وہ سنسار سے پردہ کر گئے ہیں مگر روحانیت کے سنسار میں زندہ ہیں۔ کالی ماتا سے وچن یہ ہے کہ شنکھا کوئی روپ دھارن کر کے اس درویش کے دوار پہنچ جائے اور وہاں اپنا راج جمالے، وہاں پہنچ کر وہ درویش کے عقیدت مندوں کی اچھائیاں پوری کرے، ظاہر ہے وہ مسلمان ہوں گے، وہ یہی سمجھیں گے کہ درویش ان کی آرزوئیں پوری کر رہے ہیں مگر یہ کام شنکھا مہاراج کریں گے اور کالے دھرم والوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، جب مطلوبہ تعداد پوری ہو جائے گی تو کالی ماتا کھنڈولا کو امرشکتی کا تاج پہنا دیں گی۔“

”کالی دیوی......؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہاں!“

”ایک بات بتایئے نیمو دیوی!“

”جی......!“

”خود کالی دیوی امر ہیں؟“

”دیوی دیوتا تو ہوتے ہی امر ہیں، اس میں کسے شک ہے، سنسار بھر میں کالا جادو پھیلا ہوا ہے، کیا آپ کو نہیں معلوم کالے جادو کے اثر میں ہی سارے کالے کام ہوتے ہیں۔ منش، منش کو جانوروں کی طرح کاٹ ڈالتے ہیں، بچوں کو بموں سے اڑا دیتے ہیں، ابلاؤں کی عزت لوٹ لیتے ہیں، ماؤں، بہنوں کے کپڑے اتار کر انہیں بستیوں میں نچاتے ہیں۔ جتنے ہولناک کام ہوتے ہیں، وہ کالی شکتی کے بل پر ہی ہوتے ہیں۔“

”اوہ......!“ میں نے لرزتے ہوئے کہا۔

”کالی شکتی ہر من پر قبضہ جما لیتی ہے، اس میں دین دھرم کا فرق نہیں ہوتا، وہ اپرم پار ہے۔“

”میں ان کی امیدوں کا مرکز کیوں ہوں؟“

”آپ کے پتا مسعود جی اماوس کی رات اس سمے پیدا ہوئے تھے، جب راہو اور کیتو سنکٹ کنڈل میں بند ہوتے ہیں، ایسے سمے پیدا ہونے والا منش کالی دیوی کے لیے سب سے کام کا ہوتا ہے، اسے خوب چھان پھٹک کر منتخب کیا جاتا ہے اور پھر وچن کی بات آ جاتی ہے، شنکھا کالی دیوی کو وچن دیتا ہے کہ اس نے جسے کالے کام کے لیے منتخب کیا ہے، وہ اس کا کام کرے گا، اس پر چھاپ لگا دی جاتی ہے پھر یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے، اگر وہ نہ کرے تو شنکھا شکتی بھی چھن جاتی ہے اور اسے دوبارہ پانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، ایسا ہی ہوا۔ آپ کے پتاجی امیر بننا چاہتے تھے اور ایسے ذریعے تلاش کر رہے تھے جن سے وہ ہاتھ پاؤں ہلائے بنا امیر بن جائیں، بھوریا مہاراج سے انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ان کا کام کریں گے مگر سمے آنے پر انہوں نے اس کام سے انکار کر دیا اور دونوں میں ٹھن گئی، یہاں تک کہ انہوں نے بھوریا مہاراج کو مار دیا، وہ سو گئے مگر شنکھا تین جنم لیتا ہے، بھوریا مہاراج نے دوسرا جنم لے لیا پر وہ شنکھا نہ رہے، انہیں نئے سرے سے شنکھا بننے کے لیے جتن کرنے تھے سو انہوں نے جتن شروع کر دیئے جن کی تفصیل آپ کو معلوم ہے، آپ تو اتفاق سے مہاراج کو مل گئے پھر پتا چلا کہ آپ مسعود جی کے پتر ہیں اور حیرانی کی بات یہ کہ آپ بھی اماوس کی رات پیدا ہوئے جب راہو کیتو سنکٹ کنڈل کے قیدی تھے اسی لیے آپ کی شکل بھی اپنے پتاجی سے ملتی ہے جبکہ آپ کے دوسرے بھائی، بہنیں الگ صورت رکھتے ہیں، آپ بھوریا جی کے من کے میت بن گئے اور انہوں نے آپ کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا لیا۔ پر آپ نے بھی اپنے پتاجی کی طرح مہاراج سے بیر باندھ لیا، آپ ہی کو یہ کام کرنا ہے، آپ ڈاکٹروں کے ساتھ واپس یہاں آئے اور انہی کے ساتھ آپ کو جانا تھا مگر مہاراج آپ کو روکنا چاہتے تھے اس لیے آپ کو دوسروں سے الگ کرنا پڑا۔“

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے میں پوری طرح کمبخت مردود شیطان کی گرفت میں آ گیا تھا۔ کالا جادو شیطان ہی کا تو عمل ہے۔ بہت سے واقعات میرے ذہن میں چکرانے لگے۔ میں نے پوچھا۔ ”اور تم ڈاکٹر نیمو! تم کالا جادو جانتی ہو، تمہاری موت کا کیا کھیل تھا؟“

”اسے جانے دو۔“ وہ بولی۔

”کیوں......؟“ میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میں ڈاکٹر نیمو نہیں ہوں، وہ مر چکی ہے، یہ اس کا شریر ہے جو اس سمے میرے قبضے میں ہے۔“

”او تم کون ہو......؟“

”میں پورنی ہوں، شنکھا کی پورنی!“

”مگر بھوریا چرن تو اب شنکھا بھی نہیں بن سکتا؟“

”ایسی بات نہیں ہے، وہ شنکھا بن چکے ہیں، تمہارے دیس کے ایک مولوی نے ان کی شنکھا شکتی باندھ دی تھی اور انہیں ساتواں پائل نہیں مل رہا تھا، پر مہاراج وہاں سے یہاں آ گئے اور انہیں ساتواں پائل مل گیا۔“

”مل گیا......؟“ میرے دل کو دھچکا لگا تھا۔ مجھے مولوی احمد علی یاد آ گئے تھے۔

”ہاں! اور وہ آج کل شنکھا شکتی کے عمل سے گزر رہے ہیں جو جلدی پورا ہو جائے گا پھر وہ آپ سے ملیں گے۔“

میں نے صبر و سکون سے یہ کہانی سنی لیکن میرے ذہن میں اپنے لیے کچھ نہیں تھا۔ یہ سب کچھ میں نہیں جانتا تھا۔

وہ بولی۔ ”آپ کے آرام کا پورا بندوبست کر دیا جائے گا، آپ کو نوے دن گزارنے پڑیں گے اور جب شنکھا مہاراج کا سمے پورا ہو جائے گا تو وہ آپ سے مل کر آگے کی بات کریں گے۔“

”کیا مطلب! مجھے نوے دن تمہارا قیدی رہنا پڑے گا؟“

”کس بھول میں ہو ڈاکٹر جی! پورے ہندوستان کی پولیس تمہیں تلاش کرتی پھر رہی ہے، باہر نکلے تو گولی سے اڑا دیئے جاؤ گے۔“

”کیوں......؟“ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

نیمو یا پورنی نے دروازے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ ”بنسی ارے او بنسی......! ادھر آ۔“

پتا نہیں وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ میں انتظار کرنے لگا۔ دوسرے دروازے سے بنسی راج اندر داخل ہو رہا تھا۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 9

بنسی راج کے ہاتھ میں کچھ دبا ہوا تھا جو اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ اخبارات کا بنڈل تھا جسے میں نے حیرت سے دیکھا تو نیمو کی ہمشکل پورنی بولی۔ ''اسے دیکھو ڈاکٹر مہاراج!''

میں نے پرتجسس انداز میں اخبارات کا بنڈل کھولا اور پہلے اخبار پر نظر دوڑائی۔ ہندی، اردو اور انگریزی کے اخبارات تھے۔ میرے سامنے انگریزی اخبار تھا، جس کی ہیڈ لائن تھی۔

''پاکستانی جاسوس کامران مسعود جیل سے فرار!''

''پاکستانی جاسوس......؟'' میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔

پورنی ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ''پوری خبر پڑھو مہاراج!''

میں دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اخبار پڑھنے لگا۔ مجھے پاکستانی جاسوس قرار دیا گیا تھا جو ایک مایہ ناز ڈاکٹر نیمو بنرجی کے قتل میں ملوث تھا۔ اس نے آبرو ریزی کے بعد ڈاکٹر نیمو کو گردن دبا کر ہلاک کر دیا تھا۔

اسے سزائے موت سنائی جانے والی تھی کہ وہ جیل کے محافظوں کو شدید زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں اس کا پورا گروپ موجود ہے۔ جس نے اسے فرار میں مدد دی۔ پولیس اسے چپے چپے پر تلاش کر رہی ہے۔

مختلف تاریخوں کے اخبارات تھے، جن میں میرے خلاف نہ جانے کیا کیا لکھا گیا تھا۔ اخبارات کا جائزہ لے کر میں نے پورنی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

''اب تمہیں اس سنکٹ سے صرف کھنڈولا مہاراج ہی نکال سکتے ہیں۔''

''کیسے......؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''جیسے تم یہاں آ گئے ہو۔''

''جادو کے زور سے......؟''

''تو اور کیا......!''

''جب جادو کے زور سے مجھے جیل سے نکالا گیا ہے تو پھر وہاں کے سپاہیوں کو کیوں زخمی کیا گیا؟''

''تاکہ پولیس تمہاری تاک میں رہے اور تمہارے بھاگنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔''

''اس پتھر کے قید خانے سے کیسے نکل کر بھاگا جا سکتا ہے؟''

''یہ کھنڈولا مہاراج ہی جانتے ہیں۔''

''مگر وہ کھنڈولا بنا کہاں ہے، تم نے اسے کھنڈولا کہنا شروع کر دیا؟''

''اب ہمارے مہاراج کو کھنڈولا بننے سے کون روک سکتا ہے، تمہارے کھانے پینے کے لیے درختوں پر پھل لگے ہیں اور پھل اچھی غذا ہوتے ہیں، میں چلتی ہوں، اس عمارت میں تم آرام سے گھوم پھر سکتے ہو، کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''یہ عمارت کیا ہے؟''

''مغلوں نے بنائی تھی، نور باندی کہلاتی ہے مگر اب کالی کنڈ ہے، چلتی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گئی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوئی، میرا دل بڑی شدت سے دھڑک اٹھا۔ اس لق و دق عمارت میں تنہا کیسے رہوں گا اور وہ بھی نوے دن......! کتنی ہولناک ویرانی ہے۔ دونوں طرف ایسا ہی سنسان ماحول تھا بلکہ اُدھر کالی کا ہیبت ناک بت تھا جسے دیکھ کر جان نکلتی تھی۔

جانے مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی تھی۔ پاس پڑے اخبارات منہ چڑا رہے تھے۔ باہر قدم قدم پر موت میرے تعاقب میں تھی۔ کیا واقعی یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

اچانک بنسی راج کا خیال آ گیا۔ وہ اندرونی کمرے سے باہر نکلا تھا۔ میں اس کمرے کی طرف چل پڑا۔ دروازے سے اندر داخل ہوا۔ بے حد وسیع کمرہ تھا لیکن وہاں پتھریلی دیواروں اور ایسے ہی سنگی فرش کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کوئی دوسرا دروازہ بھی نہیں تھا۔ مایوس ہو کر باہر نکل آیا۔

ہمت کرنا تھی۔ ایسے گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کالی کے بت والے ہال سے باہر آ گیا، اس کے بعد میں لان عبور کر کے دوسرے حصے میں پہنچ گیا۔ اس کے چپے چپے کو دیکھ ڈالا۔ عجیب بھول بھلیاں تھیں، گھوم پھر کر وہیں آ جاتا تھا۔

آخر کار تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، نیند آ گئی اور میں وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ آنکھ کھلی تو گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گویا رات ہو گئی تھی۔

شدید بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ صبح سے کھیل تک منہ میں اڑ کر نہیں گئی تھی لیکن یہ گہری کالی رات اور باہر پھیلی ویرانی......! بھوک، پیاس کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صبر کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا البتہ رات سوتے جاگتے گزری تھی۔

صحیح معنوں میں یہ جادو نگری تھی۔ ساری رات قدموں کی آہٹیں، چیزیں گرنے کی آوازیں، ہنسی کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ کئی بار یوں لگا جیسے کوئی مجھے جھک کر دیکھ رہا ہو۔ دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ سوچیں تھیں کہ دماغ پھاڑے دے رہی تھیں۔

نوے دن اس عقوبت خانے میں قید رہوں گا، پھر کیا ہوگا؟ بھوریا چرن کے شنکھا بن جانے کا عمل پورا ہو جائے گا پھر وہ مجھے پیر پھاگن کے مزار پر جانے کے لیے کہے گا، کیا کروں گا میں......؟

ایک دم دل میں حوصلہ سا جاگا۔ زندگی اللہ کی امانت ہے، ہر قیمت پر اسے واپس جائے گی۔ طریقہ کار کیسا بھی ہو، پھر خوف کی کیا بات ہے، جب اور جیسے چلی جائے۔ ایک مزار پاک کا تقدس کسی قیمت پر پامال نہیں کروں گا، چاہے سو بار مرنا پڑے۔

بس یہ سوچ کر آنکھیں بند کیں تو صبح ہو گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خوف کو ذہن سے جھٹک کر سنجیدگی سے سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ احاطے میں **پپیتے** کے درخت دیکھے تھے۔ میٹھی میٹھی خوشبو بتاتی تھی کہ درختوں پر پھل لگے ہوئے ہیں، انہی سے پیٹ بھرنا ہوگا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا، پھر پوری عمارت میں آوارہ گردی شروع کر دی۔

ایک جگہ کنواں نظر آیا۔ ڈول اور رسی سے اندازہ ہوا کہ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ کھانے پینے کا بندوبست ہے۔ ڈول کنویں میں ڈال کر پانی کھینچا۔ پہلے منہ دھو کر چند گھونٹ پانی پیا پھر **پپیتے** کے ایک درخت پر قوت آزمائی کی۔ میٹھے **پپیتے** نے بھوک مٹائی۔

اس کام سے فارغ ہو کر پھر عمارت گردی شروع کر دی اور پوری عمارت کا جائزہ لے کر یہ اندازہ قائم کیا کہ مغل اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ ایک ایسی عمارت بناتے جس میں کوئی دروازہ ہی نہ ہو۔ عمارت میں باہر جانے کا کوئی دروازہ نہیں تھا، یہ عمل جادو کے زور سے کیا گیا تھا۔ بھوریا چرن لافانی زندگی چاہتا تھا۔ شیطانی قوتیں حاصل کر کے پوری دنیا پر اجارہ داری کا خواہشمند تھا۔ احمق تھا، کائنات کی تاریخ میں کتنے آئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون میں رخنہ انداز ہونے کی کوشش کی اور دنیا کے لیے عبرت بن گئے بلکہ ایمان مستحکم کر گئے کہ ذات باری کے حکم سے انحراف ایک مضحکہ خیز سوچ ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ فانی ہے، ہر شے اس کی امانت ہے اور اسی کو واپس جانی ہے۔ اس میں تبدیلی کا خواہشمند صرف اپنی جان کھونے کے سوا کچھ نہیں پاتا۔

عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے اس وقت میں ایک در کے پاس سے گزر رہا تھا جس کی ڈاٹ گول تھی۔ در کے عین سامنے دیوار تھی جس کے دونوں طرف پتلے راستے نظر آ رہے تھے۔

ایک لمحے توقف کے بعد میں نے در کے اندر قدم رکھ دیئے۔ ایک دم گلاب کے پھولوں کی خوشبو محسوس ہوئی، یوں لگا جیسے وہاں گلاب اگے ہوں۔ پتلے راستے کو جو صرف چند قدم کا تھا، عبور کر کے دوسری طرف پہنچا تو ایک وسیع جگہ نظر آئی جس کے بیچوں بیچ ایک پکی قبر نظر آ رہی تھی۔ قبر پر کتبہ لگا ہوا تھا جس کے الفاظ پر مٹی کی تہہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس ظلمت کدے میں یہ مزار کس کا ہے، آس پاس کہیں پھول نظر نہیں آ رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ خوشبو اس پاک مزار سے آ رہی ہے۔ آگے بڑھ کر قمیض کے دامن سے مٹی صاف کی تو تحریر نظر آئی، لکھا تھا۔

سید غلام غوث علی۔

از غام البراس سن وفات 16 رشعبان 917ھ

فوراً ہی ہاتھ اٹھ گئے اور میں نے فاتحہ خوانی شروع کر دی۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں ایک دم دل میں ایسی خوشی ابھری جیسے دیار غیر میں اچانک کوئی اپنا مل جاتا ہے۔ بڑے خشوع خضوع سے فاتحہ خوانی کی۔

تبھی ایک سرسراتی ہوئی آواز ذہن میں گونجی۔ ''ڈر رہا ہے؟''

''ہاں!'' بے اختیار ذہن نے جواب دیا۔ زبان جنبش نہیں کر رہی تھی۔

''کیوں......؟''

''نحوستوں میں گرفتار ہوں۔''

''ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے، بھول جاتے ہو کہ تمہیں کتنا بڑا تحفظ حاصل ہے، اس وقت جب تم دنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، تمہارے علم میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا، تمہارا پہلا رشتہ اس ذات ایزدی سے قائم ہوتا ہے، تمہارے کان میں اذان کہی جاتی ہے 'اللہ اکبر، اللہ اکبر' اور تم تحفظ کے حصار میں آ جاتے ہو، اس سے واقف ہو جاتے ہو جو تمہاری ہر سانس کا ضامن ہے، ازل سے ابد تک وہ تمہیں اپنی عنایتوں سے نوازتا ہے، تم اسے بھول جاتے ہو، وہ تمہیں کبھی نہیں بھولتا، مانگو اس سے، وہ ضرور دیتا ہے۔''

''میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔'' میرے دل سے آواز اٹھی۔

''تو نکل جاؤ، کیا رکاوٹ ہے؟''

''یہاں کوئی دروازہ نہیں ہے۔''

''کوئی دیوار بھی نہیں ہے۔'' جواب ملا اور میرے سامنے سے جیسے کوئی رکاوٹ ہٹ گئی۔ ایک دم ماحول کھلا کھلا محسوس ہوا۔ ''سبحان اللہ، سبحان اللہ!'' میں اس عمارت میں نہیں تھا۔ عین سامنے جامع مسجد دہلی نظر آ رہی تھی۔ ایک لمحے میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ میرا رواں رواں لرز رہا تھا۔ اپنی اس وقت کی کیفیت کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بس ساکت و جامد کھڑا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر کی رونق دیکھ رہا تھا۔

اس عمارت کا دور دور تک پتا نہیں تھا جہاں چند لمحے پیشتر تھا۔ یہ ایسا معجزہ تھا کہ سارا وجود ہل کر رہ گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' سلام کی آواز سن کر چونک پڑا۔

پلٹ کر دیکھا تو ایک بزرگ سامنے کھڑے تھے۔ شیروانی پائجامے میں ملبوس، پاؤں میں سلیم شاہی اور سر پر دو پلی ٹوپی! مکمل دہلوی لگ رہے تھے۔

''عزیزی! اسلام کا جواب نہیں دو گے، ہمیں یقین ہے مسلمان ہو، مرزا ابراہیم بیگ کے صاحبزادے کو ہم نہ پہچانیں گے تو اور کون پہچانے گا!''

''وعلیکم السلام جناب! میرے بارے میں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے آپ کو علم ہے کہ ہر جھوٹ گناہ ہوتا ہے، چاہے وہ کسی بھی عمل کے تحت بولا جائے، آیئے آپ کو ناشتہ کرائیں، وہ دیکھئے بنے میاں کی نہاری کی دیگ سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں اور وہ تازہ روٹیاں! آیئے ہم بے قابو ہو گئے ہیں۔'' خوش مزاج بزرگ نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''آپ یقین کر لیجیے، میں ابراہیم بیگ کا بیٹا نہیں ہوں۔''

''ناشتہ تو کرتے ہو گے اور کسی نہ کسی کے صاحبزادے ضرور ہو گے، آیئے!''

وہ مجھے جس طرح ہوٹل کی طرف گھسیٹ رہے تھے، بڑا عجیب تھا۔ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے، چنانچہ اس طرف چل پڑا۔

بنے خان کا نہاری ہوٹل بھی قدیم روایتوں کا امین تھا۔ اس کے برابر مشہور کریم ہوٹل تھا۔ مجھے یاد تھا، کراچی میں کسی مریض نے مجھے جامع مسجد دہلی کے سامنے کریم ہوٹل کے بارے میں بتایا تھا۔ خیر بنے میاں یا بنے خان کے ہوٹل میں لکڑی کی بھدی کرسیوں پر بیٹھ کر کھولتی ہوئی اور مرچوں بھری نہاری نے جو لطف دیا، اسے شاید زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ بھوکا بھی تھا صرف پپیتہ کھایا تھا، دو روٹیاں کھا کر پانی پیا اور شکم سیر ہو گیا۔

''ہمارا نام ارشاد علی ہے۔ حکیم ارشاد علی! ابا کی زبانی یہ نام ضرور سنا ہوگا، ہم سترہ سال آگرے میں رہے ہیں، بڑی کامیاب حکمت کی ہے اللہ کے کرم سے، آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، اگر اجازت ہو تو!''

''جی فرمایئے۔''

''ماں، باپ پانی کے بلبلے ہوتے ہیں بیٹے! اولاد ہی آنکھوں کی بینائی ہوتی ہے، چلے جاتے ہیں تو بس تصویریں رہ جاتی ہیں، بے آواز تصویریں جو کبھی نہیں بولتیں بس تکتی رہتی ہیں، مانتے ہو؟''

''جی ہاں......!''

''ان سے ناراضی بجا نہیں، مرزا جی تڑپ رہے ہیں تمہارے لیے، مجھے ٹیلیفون پر کہا ہے کہ سلیم بیگ کو دہلی میں دیکھا گیا ہے، اسے تلاش کر کے واپس آگرہ لے آئیں، بیٹے! اللہ نے یہ سعادت ہمیں بخشی ہے، ہماری لاج رکھ لو...... ماں، باپ کے پاس واپس چلو، ہم تمہیں خود وہاں چھوڑ کر آئیں گے۔''

''محترم! آپ نے فرمایا تھا کہ ہر جھوٹ گناہ ہوتا ہے، چاہے وہ کسی بھی عمل کے تحت بولا جائے، میں جھوٹ در جھوٹ بول کر گناہوں کے انبار نہیں لگاؤں گا اور پھر اب تو آپ کا نمک بھی کھا لیا ہے، میں سلیم بیگ نہیں ہوں، میرا نام کامران مسعود ہے۔''

''ایں......!'' ارشاد علی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ بغور دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ''اب کچھ تبدیلی لگ رہی ہے، ہم نے تمہیں میرا مطلب ہے سلیم بیگ کو دو سال پہلے دیکھا تھا، جب تاج گنج میں ہماری سالی کی شادی ہوئی تھی، اچھا......! حیرت انگیز مماثلت ہے نقوش میں، اللہ تمہاری عمر دراز کرے، کہاں رہتے ہو؟''

میں ایک دم سنبھل گیا۔ وہ اخبارات یاد آ گئے تھے جن میں میرے بارے میں خبریں چھپی تھیں۔ اپنی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ کوئی بات بنانی تھی چنانچہ جلدی سے بولا۔ ''میں دہلی کا رہنے والا نہیں ہوں۔''

''اوہ گویا دہلی میں نو وارد ہو، کہاں سے آئے ہو؟''

''سس...... سہارن پور کا رہنے والا ہوں۔'' میرے منہ سے نکلا۔ والد واقعی سہارن پور کے تھے۔

''یہاں کہاں قیام ہے؟''

''ابھی کہیں نہیں، ہم میں......!'' میری زبان لڑکھڑا گئی۔

ارشاد علی کسی سوچ میں گم ہو گئے، پھر کہنے لگے۔ ''نوکری وغیرہ کی تلاش میں آئے ہو، اصل میں صاحبزادے! ہر شخص میں کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں، میں حتی الامکان جھوٹ سے گریز کرتا ہوں اس لیے سچ بول رہا ہوں کہ میری بھی ایک کمزوری ہے، اگر کوئی دل کو بھا جائے تو کوشش کرتا ہوں کہ اسے سینے میں سمیٹ لوں، تم میرے دوست کے بیٹے کے ہمشکل ہو اور دلی تک کا سفر کرنے والے بھی! میں تمہارے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں، پہلے یہ بتاؤ کوئی نوکری وغیرہ کی تلاش کا معاملہ ہے نا؟''

میں مسکرا دیا تو وہ جلدی سے بولے۔ ''دیکھا کیسا پکڑا، آخر ہم بھی حکیم ارشاد علی ہیں۔''

''آپ حکمت کرتے ہیں؟''

''کرتے تھے، اب تو عظیم اللہ خان صاحب کے دست و بازو ہیں، وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتے، کہتے ہیں ارشاد علی تمہارے بل پر جی رہے ہیں، ہمیں چھوڑ و گے تو جینا چھوڑ دیں گے، اب بتایئے اس کے بعد انسان کیا کرے؟''

''اب آپ حکمت نہیں کرتے؟''

''گنجائش کہاں رہ گئی ہے حکمت کی، اس کے لیے وقت بھی نہیں ہے، عظیم الشان کاروبار اور جائیدادیں ہیں عظیم اللہ خان صاحب کی، قدیم نوابی خاندان سے ہیں۔ بس ساری دیکھ بھال ہمارے کندھوں پر ہے۔''

''خوب......!'' میں نے کہا۔

''اب تمہاری باری ہے، تم بتاؤ دلی میں کوئی عزیز داری ہے؟''

''نہیں......!''

''پھر قیام کہاں کرو گے؟''

''کوئی سستا سا ہوٹل تلاش کروں گا۔''

''خوب! ابھی بیروزگار ہو، نوکری تلاش کرو گے، کب ملے گی، کچھ نہیں کہا جا سکتا، جیب میں جو کچھ ہے، پر لگا کر اڑ جائے گا، حالات سے واقف نہیں ہو، اگر جیب میں کچھ ہے تو سنبھال کر رکھو، ہزار ضرورتیں پیش آ جاتی ہیں۔''

''میں......!'' میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ''جو کہہ رہا ہوں، اسے غور سے سنو، میری کسی بات میں تمہیں لالچ نظر آئے تو کم نسل سمجھ لینا، کسی ریا فریب کے بغیر پیشکش کر رہا ہوں، بہتر ملازمت مل جائے تو اپنی پسند کی رہائش تلاش کر لینا، چنداں مداخلت نہیں کروں گا، اس سے پہلے میرے ساتھ قیام کرو۔''

میں حیران رہ گیا۔ اس وقت میں لمحہ لمحہ زندگی کے عذاب سے گزر رہا تھا، ہر طرف موت رقصاں تھی۔ کسی بے لوث ہمدرد کا مل جانا تصور سے باہر تھا۔ اس طرح تو ارشاد علی کی یہ پیشکش امداد غیبی تھی، فوری طور پر چھپنے کی جگہ مل رہی تھی لیکن فوری آمادگی بھی معیوب سی بات تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ بہت اچھے انسان ہیں حکیم صاحب! لیکن اس طرح پتھروں کو اٹھا کر گھروں میں لے جانا دانشمندی نہیں ہوتی۔''

''اس ماں کی بے حرمتی ہے تمہیں پتھر سمجھنا یا کہنا جس نے تمہیں جنم دیا، اس باپ کی توہین ہے جس نے تمہیں شریفانہ اور مہذبانہ انداز سکھایا، ان دونوں کے دل سے پوچھو پتھر ہو کہ ہیرے......! اب اچھا کہانیاں ختم تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے کامران میاں! اچھوں چرا کی گنجائش نہیں۔''

میں نے گردن جھکا دی تھی۔

ہوٹل کے پیسے ادا کر کے حکیم صاحب باہر نکل آئے، پھر ایک رکشہ میں بیٹھ کر رکشے والے کو قرول باغ چلنے کے لیے کہا۔ رکشہ چل پڑا۔

میرا ذہن بری طرح چکرا رہا تھا۔ جو کچھ مجھ پر بیت رہی تھی، میرا دل ہی جانتا تھا۔ اس بات کا شدید خوف تھا کہ دہلی پولیس میری تلاش میں ہے، کہیں میری وجہ سے بے چارے حکیم صاحب کسی مشکل کا شکار نہ ہو جائیں۔ مجھے فوراً پاکستانی جاسوس قرار دے دیا گیا تھا۔ اگر میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو میرا جو حشر ہوگا، میں جانتا تھا چنانچہ خاموش ہو گیا۔

عظیم اللہ خان کی حویلی قدیم طرز تعمیر کا حسین نمونہ تھی۔ اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا۔ ''یہ عظیم اللہ خان کی حویلی ہے، کوئی دو سو سال پرانی ہے لیکن اسے اندر سے دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔'' میں نے تعریفی نظروں سے حویلی کو دیکھا تھا۔

رکشہ حویلی کے اطراف سے ہو کر اس کے پیچھے آ رکا۔ یہ بھی حویلی ہی کا ایک حصہ تھا لیکن اس سے بالکل الگ! حکیم صاحب نیچے اترے تو میں نے بھی ان کی تقلید کی۔ پیسے ادا کر کے حکیم صاحب نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور بڑے دروازے کے قریب ایک دوسرے چھوٹے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔

''میاں رکو! میں دروازہ کھولتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ کچھ ہی لمحوں میں دروازہ کھل گیا۔ خاصا وسیع کمرہ تھا۔ وہ بستر نفاست سے لگے ہوئے تھے، سامنے ٹوائلٹ کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ بیرونی مہمانوں کے لیے اس سے عمدہ انتظام مشکل تھا۔ اگر ذہنی سکون ہوتا تو یہ مہمان خانہ میرے لیے بے حد دلکشی کا حامل تھا کیونکہ اس دور میں ایسی کلاسیکل رہائش گاہیں نہیں ہوتیں۔

''پوری تسلی سے آرام کرو، وہ غسل خانہ ہے...... منہ، ہاتھ وغیرہ دھولو، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔''

''جی......!'' میں نے کہا اور حکیم صاحب اندر چلے گئے۔ منہ، ہاتھ دھونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جن حالات کا شکار ہو گیا تھا، ان میں تو بس دل چاہ رہا تھا کہ خاموش جگہ آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں اور کبھی آنکھ نہ کھولوں۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا، ایک ناگہانی تھی کہ بدروح کا شکار ہو گیا تھا اور اب گھر سے اتنا دور ہو گیا تھا کہ گھر واپسی کا تصور بھی ہولناک تھا۔ کیا حال ہو گا میرے گھر والوں کا، ایک ایک بات کی خبر ہو گئی ہو گی سب کو، مجھے ایک گھناؤنے جرم کا مرتکب قرار دیا گیا تھا اور اب میں ایک مفرور ''قاتل''، ایک پاکستانی تخریب کار قرار پا گیا تھا۔ پتا نہیں اس کے اثرات میرے گھر والوں پر کیا ہوئے ہوں گے، ان سے میرے بارے میں معلومات تو ضرور کی جا رہی ہوں گی۔

اچانک کسی کی آمد نے خیالات سے چونکا دیا۔ آٹھ نو سال کی خوبصورت بچی تھی۔ چہرے پر معصومیت اور شرارت کا امتزاج تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں شرم اور شرارت بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے ادب سے مجھے سلام کیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی چپلیں میرے پاس رکھ دیں۔

''آپ منہ دھولیں۔'' اس کی پیاری سی آواز ابھری۔ بچے کائنات کا سب سے حسین سرمایہ ہوتے ہیں، ان کا وجود اندر کے تکدر کو ایک لمحے میں دھو دیتا ہے۔ اس معصوم آواز نے ایک دم میرا مزاج بدلا تھا۔

''بے حد شکریہ! میں آپ کو باجی کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''باجی......؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''مگر آپ تو مجھ سے بڑے ہیں۔''

''ایں...... ہاں! یہ تو ہے پھر آپ بتایئے کیا کہیں؟''

''سیدھی سی بات ہے، جمیلہ کہہ لیجیے۔''

''بہتر ہے۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔

''اور ہم آپ کو بھائی جان کہیں گے۔''

''یہ بھی سیدھی سی بات ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''چلئے مسئلہ حل ہو گیا، اب ہم چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور واپس اندر چلی گئی۔ دل سے تھوڑا سا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا، چنانچہ چپلیں پہن کر غسل خانے کی طرف چل پڑا۔ باہر آیا تو حکیم صاحب چائے سمیت بیٹھے تھے۔

''ناشتے کا بندوبست اس لیے نہیں کیا کہ بنے خان کی نہاری کی توہین ہوتی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی نہاری کھانے کے بعد کسی اور ناشتے کی ضرورت رہے تو ان پر چار لفظ! مطلب یہ کہ لعنت......! لیکن چائے ایک تبرک ہے جس سے گریز بھی گناہ ہے۔''

چائے کے چند گھونٹ لیے تھے کہ دروازے کا پردہ ہلا اور ایک پُر وقار خاتون اندر داخل ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ حکیم صاحب کی بیگم ہیں۔ میں نے سلام کیا۔ وہ جواب دے کر بیٹھ گئیں تو حکیم صاحب بولے۔ ''یہ ہماری چالیس سالہ مونس ہیں، انیسہ بیگم نام ہے، تمہارا تعارف میں کرا چکا ہوں، چائے کے بعد میں چلا جاؤں گا، انیسہ اور بچیاں تمہارا خیال رکھیں گی۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ کامران میاں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' انیسہ بیگم واقعی ماں کی طرح ہمدرد محسوس ہوئیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی چار بیٹیاں ہیں، بیٹا کوئی نہیں ہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ مجھے آرام کرنے کے لیے کہہ کر چلی گئیں اور میں بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے احساس ہوا جیسے میں گہرے کنویں میں ڈوب رہا ہوں، واقعی ایسی ہی کیفیت تھی۔ دیار غیر میں بے یار و مددگار، خونخوار دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔

یہاں کی پولیس چپے چپے پر مجھے تلاش کر رہی تھی۔ دوسری طرف وہ منحوس سادھو بھوریا چرن تھا جس نے مجھے اپنی خباثتوں کا شکار بنا کر اس حال کو پہنچا دیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کروں؟ اب اتنا سادہ لوح بھی نہیں تھا کہ صحیح صورتحال کا اندازہ نہ ہو سکے۔

سفارت خانے سے رابطے کی کوشش بے سود تھی، گھر سے بھی رابطہ نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ لوگ بھی عذاب میں گرفتار ہو جاتے۔ اب بھی پتا نہیں کیا ہو رہا ہوگا۔ بہت غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب وقت کے فیصلے کا انتظار کیا جائے۔

نیکی کی قوتوں نے بھی مجھے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت اس عمارت سے باہر آنا تھا جسے کالی کھنڈ کا نام دے کر میرا قید خانہ بنا دیا گیا تھا۔ مجھے کتنی آسانی سے اس قید خانے سے رہائی دلا دی گئی تھی۔ خاموشی سے یہ باتیں سوچ رہا تھا اور سوچتے سوچتے نیند آ گئی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ کسی آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ چونک کر دیکھا تو جمیلہ تھی جس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی اور اس کے ہاتھ سے گلاس گرا تھا۔ مجھے دیکھ کر شرمندگی سے بولی۔

''وہ جو کہتے ہیں عذر گناہ بدتر از گناہ، غلطی ہو گئی، مناسب سمجھیں تو معاف کر دیں۔''

''ارے بڑی بی! اتنی بڑی باتیں، کیا ہو گیا؟''

''پینے کا پانی رکھنے آئے تھے آپ کے لیے، ٹھوکر لگی، گلاس گر گیا اور آپ جاگ گئے، ویسے آپ سے کچھ پوچھنا بھی تھا۔''

''ارشاد فرمایئے!''

''دوپہر کو کیا کھانا پسند فرمائیں گے دال، سبزی یا گوشت یا پھر چاول وغیرہ؟''

''یہ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''فیصلہ تو خیر ہو ہی جائے گا، ہم ایک بات ضرور کہیں گے وہ یہ کہ آپ بہت اچھے بھائی جان ہیں، اس کی وجہ پوچھئے؟''

''بتا دیجیے۔''

''آپ ہنسنا مسکرانا جانتے ہیں، ایک وہ تھے، جان کا عذاب!''

''کون......؟''

''ارے وہی علیم احمد، امی جان کی خالہ زاد بہن کی نند کے لڑکے جو کسی کام سے دہلی تشریف لائے تھے، ایک ہفتہ رہے، ایک بار بھی نہیں مسکرائے، صورت پر جھاڑو پھری رہتی تھی، اللہ کی مار دن گنتے تھے ہم لوگ کہ کب جائیں۔''

''جمیلہ......!'' ایک بھنچی بھنچی سرزنش کرتی ہوئی آواز ابھری اور جمیلہ نے دانتوں تلے زبان دبالی، پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دروازے پر گئی، سرگوشیوں میں کچھ مذاکرات ہوئے پھر واپس آ گئی۔

''خطرہ ٹل گیا، اب منافقت تو نہیں کی جا سکتی، سب ہی عاجز تھے، جو دل میں ہے، وہ بتا رہی ہوں اس کے بعد اور سنیے، خدا خدا کر کے ٹلے اور گھر جا کر پتا ہے کیا گل کھلایا؟''

''اچھا! کوئی گل بھی کھلایا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں! صائمہ باجی کے لیے رشتہ بھیج دیا، آپ صائمہ باجی کو جانتے ہیں نا؟''

''نہیں......!''

''ارے ہاں! ابھی آپ نے دنیا میں دیکھا کیا ہے، صائمہ باجی منجھلی باجی ہیں، صورت شکل درمیانی ہے، رنگ صاف ہے، بس ناک ذرا موٹی ہے اور جب چشمہ لگاتی ہیں تو پوری بی ملانی لگتی ہیں، بی ملانی جو سپارہ پڑھانے آتی ہیں۔''

''جمیلہ!'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی پھر انیسہ بیگم کی آواز سنائی دی۔ ''کہاں ہے جمیلہ......!''

''ارے مارے گئے، اب شکایت ہو جائے گی۔'' جمیلہ نے کہا، پھر جلدی سے بولی۔ ''بہتر ہے بھائی جان! میں دردانہ باجی کو بتائے دیتی ہوں کہ آپ کو قیمہ بھرے کریلے بہت پسند ہیں۔'' یہ کہتی ہوئی وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ قیمہ بھرے کریلوں کی کہانی جمیلہ نے خود گھڑی تھی لیکن حیرت تک بات یہ تھی کہ مجھے واقعی قیمہ بھرے کریلے پسند تھے۔

تین دن گزر گئے۔ اتنی اپنائیت، اتنا پیار دیا تھا ان لوگوں نے مجھے کہ سوچ کر آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ بس دل کو سمجھاتا رہتا تھا کہ ہر صبح کی آخر شام ہوتی ہے، مالک کائنات میری مشکل کا حل ضرور دے دیں گے۔

نماز پوری پابندی سے پڑھتا تھا اور حکیم صاحب میری اس پابندی سے بہت خوش تھے۔ ان لوگوں نے مجھے چند جوڑے لباس اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی دی تھیں جو اس وقت میرے لیے بہت ضروری تھیں۔ میں نے حجام سے داڑھی مخصوص انداز میں ترشوائی تھی جس سے میری شکل و صورت کافی بدل گئی تھی۔ چند فیصلے بھی کیے تھے میں نے، وہ یہ کہ کوئی بھی جدوجہد میرے لیے عذاب بن سکتی ہے۔ مردود بھوریا چرن شنکھا بننے کے مراحل میں ہے، وہ شنکھا بننے کے بعد مجھے تلاش کرے گا۔ میرے محافظ جنہوں نے مجھے تحفظ عطا کیا تھا، میرے لیے کیا راستہ منتخب کرتے ہیں، یہ انہی پر چھوڑ دیا جائے۔

گھر والے اور مجھ سے محبت کرنے والے میرے کردار سے اچھی طرح آشنا تھے۔ لاکھ میرے کردار پر داغ لگائے گئے تھے لیکن انہیں مشکل سے ہی یقین آئے گا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بھوریا نے یہ انتقامی عمل کیوں کیا ہے۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق جواد علی کی قبر کی بے حرمتی سے گریز کیا تھا۔

اس آخری فیصلے نے مجھے مطمئن کر دیا۔ اس دوران حکیم ارشاد علی کی اور ان کے گھرانے کی محبتوں سے سرشار تھا۔ صائمہ اور دردانہ بھی سامنے آ چکی تھیں۔ شکیلہ کو ابھی نہیں دیکھا تھا۔ سب بچیاں اعلیٰ کردار کی حامل تھیں۔

چوتھے دن میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے حکیم صاحب؟''

''کس سلسلے میں......؟''

''وقت مہمانی ختم ہو چکا ہے، آج چوتھا دن ہے۔'' میں نے کہا۔

حکیم صاحب کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔ ''جانا چاہتے ہو یہاں سے؟'' ان کے لہجے میں اداسی تھی۔ میں شرمندہ ہو گیا تو وہ دوبارہ بولے۔ ''کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ مصنوعی گفتگو نہ کی جائے، مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے، نہ ہی ہمیں، بس یہ رسمیات ہیں۔ میں، میری بیوی اور بچے چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ رہو جب تک ممکن ہو، باقی تمہاری مرضی!''

''میں اس طرح نہیں رہنا چاہتا، مجھے اپنی مصروفیات میں شریک کیجیے۔''

''چند روز گزر جانے دو عظیم اللہ خان لدھیانہ گئے ہیں، واپس آ جائیں تو تمہارے لیے بات کروں گا، بلکہ اگر ممکن ہوا تو بیگم صاحبہ سے بات کر لوں گا۔ اور سنو جب تک کوئی اہم بات نہ ہو جائے، تمہارا قیام یہیں رہے گا، بڑی ڈھارس ہو گئی ہے تمہارے آنے سے!''

میں خاموش ہو گیا۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں دنیا میں...... میں کون ہوں، کیا ہوں، کس کردار کا انسان ہوں، کچھ جانے بغیر انہوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ بڑی بات تھی۔

انہوں نے کہا تھا کہ جب تک کوئی اہم بات نہ ہو جائے، میں یہیں قیام کروں۔ اہم بات تو ہو گی۔ بھوریا چرن آخر کار اپنے علم سے میرے بارے میں پتا چلائے گا اور پھر کوئی کہانی شروع ہو جائے گی۔ کوئی حل ہوتا تو ضرور جدوجہد کرتا۔ صورتحال واضح تھی، کوئی ٹھکانہ ضروری تھا، اس سے بہتر جگہ کونسی تھی۔ نیک اور دیندار لوگ تھے، میرے مزاج کے مطابق، اپنی بہتری کے لیے دعائیں کروں اور وقت کی آواز کے سہارے یہ مشکل لمحات گزاروں۔ اس آخری فیصلے کے بعد اور کچھ سوچنا بے معنی تھا۔

اس دن بیگم صاحبہ کسی عزیز کے ہاں مدعو تھیں۔ مجھ سے کہہ کر گئی تھیں کہ واپسی کے وقت کا تعین نہیں ہے، میں آرام سے گھر پر رہوں، بچیاں میرے پاس آتی جاتی رہیں گی۔ کھانے کا وقت ہو رہا تھا کہ اچانک دروازے پر سرسراہٹ ہوئی پھر پردہ ہٹا اور ایک خوبصورت سی لڑکی نیچی نگاہیں کیے اندر آ گئی۔ عمر بیس سال کے قریب ہوگی، کھلتا ہوا چمپئی رنگ، بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں، متناسب بدن...... میں سنبھل گیا۔

''کھانے کا وقت ہو گیا تھا، وہ دونوں شریر لڑکیاں حویلی چلی گئی ہیں، کھانا لائی ہوں، یوں بھی امی نے مجھے آپ کے سامنے آنے کی اجازت دے دی ہے۔''

''آپ شکیلہ ہیں؟''

''جی ہاں! اور یہ قیمہ کریلے ہیں۔'' شوخ لہجے میں کہا گیا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا پھر جمیلہ کی اس دن کی شرارت یاد آ گئی۔ ''مجھے علم ہے آپ کو پسند ہیں، میں نے بڑے شوق سے بنائے ہیں۔''

''بہت شکریہ!''

''لیجیے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔''

''ایں...... ہاں! میں کھا لوں گا۔''

''ابھی کھایئے، میرے سامنے!'' لہجے میں جو کچھ تھا، اندازہ ہو گیا اور میں سنبھل گیا۔ حکیم صاحب کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی۔

اول تو میری زندگی کے راستے ہی دوسرے تھے۔ کردار میں کوئی لچک نہیں تھی خدا کے فضل سے، لیکن یہاں تو صورتحال ہی مختلف تھی۔ ایک لفظ کی لغزش ہو گئی تو کائنات ہل جائے گی، بھرم ٹوٹ جائے گا۔ ارشاد علی نے آنکھیں بند کر کے بھروسہ کیا تھا، اس بھروسے کا بھرم اللہ کا قرض تھا۔ کچھ کہنا ضروری تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے کھانا کھا لیا شکیلہ......!''

''ابھی نہیں۔''

''تو جایئے، آپ بھی کھانا کھا لیجیے۔''

''میں آپ کو کھاتے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا اور بیٹھ گئی۔ ناچار میں نے کھانا شروع کر دیا۔ وہ بیٹھ کر میٹھی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر جب میں نے کھانا ختم کر لیا تو اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ہمیں پوچھا بھی نہیں؟''

''چھوٹی بہنیں بھائیوں سے شکایت نہیں کرتیں۔'' میں نے کہا اور اس کا چہرہ یکدم اتر گیا۔

''کامران صاحب!'' اس کی لرزتی آواز ابھری۔

''بھائی جان...... صرف بھائی جان! بڑے بھائیوں کے نام نہیں لیے جاتے، تم بہت پیاری بہن ہو میری، تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے، کیا میں تمہیں بھائی کی حیثیت سے اچھا نہیں لگا؟''

وہ آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھتی رہی پھر بے اختیار رو پڑی۔ سسکیوں کے دوران اس کی آواز ابھری۔ ''خدا کی قسم...... خدا کی قسم، میرا قصور نہیں ہے۔ ابو نے امی جان سے کہا تھا کہ کامران بہت اچھا لڑکا ہے، ملازم بھی ہو جائے گا، اگر ہماری کوئی بیٹی ٹھکانے لگ جائے تو اچھا ہے، امی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے سامنے جاؤں اور...... میرا قصور نہیں ہے۔ ابو، امی ہمارے لیے پریشان رہتے ہیں کہ ہمارے رشتے نہیں آتے۔'' وہ سسکیاں لے رہی تھی اور میرا دل پگھل رہا تھا۔ اس ایسے سے آشنا نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ حقیقت تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں حکیم صاحب سے جھگڑا کروں گا، انہوں نے میری پیاری بہن کو سمجھا کیا ہے، میں خود اپنی بہن کے لیے رشتہ تلاش کروں گا۔ واہ، میری بہن ایسی گئی گزری نہیں ہے کہ اس کی مجھ جیسے فضول آدمی سے شادی کی جائے۔''

''خدا کے لیے کامران بھائی! ابا جان سے کوئی بات نہ کریں، آپ کو میری قسم ہے، ابا جان ویسے ہی پریشان رہتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب تم آرام کرو، کریلے بہت اچھے پکے تھے، جانے تم نے مجھے کیا کیا دلا دیا ہے۔'' اس نے مجھ سے اور کچھ نہیں پوچھا اور برتن اٹھا کر باہر چلی گئی۔

ابھی میں کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک برتن گرنے کا چھناکا سنائی دیا اور میں بے اختیار اچھل پڑا، پھر میر ابر ابر والے کمرے میں داخل ہونا ایک اضطراری عمل تھا۔ دوسرے کمرے کا منظر دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ ارشاد علی زمین پر سجدہ ریز تھے۔ میں ان کے قریب پہنچ گیا اور میں نے انہیں جھنجھوڑا۔ انہوں نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں، ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

''کیا ہوا حکیم صاحب......؟'' میں نے پریشانی سے پوچھا۔

''شادی مرگ ہو گیا ہے، مجھ جیسے گناہگار کو اللہ نے کیسا نوازا ہے، میرے خلوص کا کیسا بھرم رکھا ہے، آؤ بیٹھو، دل ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔'' میں بیٹھ گیا۔

شکیلہ برتن سمیٹنے لگی تو وہ بولے۔ ''بعد میں اٹھا لینا بیٹی! ابڑا فخر ہے مجھے اپنی بیٹیوں پر، تو بڑا مان بڑھ گیا ہے کامران بیٹے پر، میں نے اتفاق سے سب کچھ سن لیا ہے اور اپنی خوشیوں پر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا تھا، یہ خوشی برداشت نہیں ہو سکی تھی کہ میری بیٹیوں کو ایک سچا بھائی مل گیا ہے۔''

شکیلہ برتن اٹھا کر باہر نکل گئی تو ارشاد علی صاحب بولے۔ ''پہلے میں نے اس پر غور نہیں کیا تھا کہ تم سے تمہارے بارے میں پوچھوں لیکن اب دل چاہ رہا ہے کہ ان عظیم لوگوں کے بارے میں پوچھوں جن کا خون اس قدر پاکیزہ ہے۔''

''کچھ نہ پوچھیں حکیم صاحب! آپ کی دعائیں میرے لیے سب سے بڑا انعام ہوں گی، بس دعا دیں کہ اللہ میری مشکل آسان کرے۔''

''ان شاء اللہ! اچھا خیر...... ایک خوشخبری ہے، تم کار چلا لیتے ہو نا؟''

''جی......!''

''بس تو سمجھ لو نوکری مل گئی، میں نے بیگم صاحبہ سے بات کر لی ہے، کہنے لگیں آپ کو اطمینان ہے تو سب ٹھیک ہے، کل چلنا ہے۔''

''جی!'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

اس رات بڑی بے چینی رہی تھی۔ کیا ہونا ہے، ابھی کون کون سے امتحان دینے ہوں گے، کبھی وطن واپسی ممکن بھی ہوگی یا نہیں! ہائے میرے خواب! ایک نامور ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن اپنی ذہانت سے، اپنی محنت سے! کسی آسان ذریعے کی خواہش کبھی نہیں کی تھی۔

میری زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی اور اب ڈرائیوری کرنی تھی۔ ارشاد علی نے گاڑی چلانے کے بارے میں پوچھا تھا اور مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے گاڑی چلانی ہوگی۔ لیکن کوئی روشنی نہیں تھی، کوئی اندھا قدم نہیں اٹھانا تھا۔ وقت کے فیصلے کا انتظار کرنا تھا۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ مالک ہے، اگر روحانی قوتیں ایک ناپاک وجود کے خلاف میری مدد کریں گی تو ممکن ہے، اُدھر سے کوئی سبیل نکل آئے ورنہ تقدیر......!

دوسرے دن حکیم ارشاد علی مجھے اپنے ساتھ حویلی لے گئے۔ حویلی کو باہر سے اس کی روایت کے مطابق رکھا گیا تھا لیکن اندر سے وہ جدید ترین تھی، اندر کے ماحول میں بھی جدیدیت تھی۔ مجھے بیگم صاحبہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

''یہ کامران ہیں بیگم صاحبہ!''

''اچھا اچھا! عزیز ہیں آپ کے، کہاں سے آئے ہیں، بیٹھو بیٹے!'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''میں نے کل آپ سے ان کے بارے میں بات کی تھی۔''

''کیا......؟'' بیگم صاحبہ الجھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''وہ ڈرائیور کے لیے۔''

''ایں...... ہاں...... یہ......!'' بیگم صاحبہ جملہ پورا نہ کر سکیں۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''جی! یہی کامران ہیں، میں نے ان کی ضمانت لی ہے۔''

''ارے نہیں یہ خود اپنی ضمانت ہیں، ہم نے بھی دھوپ میں بال نہیں سفید کیے، مگر بیٹھے......! خیر ہم تم سے تمہارے بارے میں پوچھ کر تمہاری عزت نفس کو مجروح نہیں کریں گے، البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ کسی خاص واقعے کا شکار ہو، گھر سے ناراض ہو کر آئے ہو یا......! چلو چھوڑو، ارشاد بھائی گواہی دیں گے کہ اس حویلی میں انسانوں کو انسان ہی سمجھا جاتا ہے، اپنے آپ کو گھر کا فرد ہی سمجھنا، ایک خاص بات تم سے ضرور کہوں گی۔ اس گھر میں ایک کردار سے تمہیں کوفت ہوگی، وہ میری بیٹی نور النساء ہے، ہم اسے نور کہتے ہیں، باپ کی بگاڑی ہوئی ہے، بدتمیز ہے مگر دل کی بری نہیں ہے، پوچھو ارشاد بھائی سے، مجھے خود اس کی حرکتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں، تمہیں اس کی بدتمیزی نظر انداز کرنی ہوگی۔''

''جی آپ اطمینان رکھیں۔''

''ایک بات اور......! رہو گے کہاں، پوری حویلی پڑی ہے، میں نے اس لیے یہ سوال کیا ہے کہ......!''

''جی بیگم صاحبہ! میں انہیں خود سے جدا نہیں کروں گا۔''

''بسر و چشم! مجھے کیا اعتراض، ہمارے اصول کے مطابق تمہیں دو ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی جائے گی تاکہ تم اپنی ضرورتیں پوری کر لو اور دل جمعی سے کام کر سکو، ارشاد بھائی انہیں کار کی چابی دلوا دیں اور تنخواہ ادا کر دیں۔''

''جو حکم بیگم صاحبہ! آؤ کامران۔''

اس رات کھانے پر کافی اہتمام ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دسترخوان پر سب ساتھ تھے، سارے پردے ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس رات آنسو نہ روک سکا۔ اپنے گھر سے دور تھا، سب یاد آ رہے تھے۔ پتا نہیں کون کیا سوچ رہا ہوگا میرے بارے میں، بھر ہی کر چکے ہوں گے مجھے حالات ہی ایسے تھے، کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

دوسرے دن سے ڈیوٹی تھی۔ کار کی چابی مل گئی اور میں نے اللہ کا شکر ادا کر کے اپنا منصب سنبھال لیا۔ اپنی کار یاد آئی اور میں کپڑا نکال کر کار کی صفائی کرنے لگا۔ ایک بار نگاہ اٹھی تو دور سے ارشاد علی کو دیکھا جو عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک گیارہ بجے بیگم صاحبہ باہر نکلیں تو میں نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ بیگم صاحبہ اندر بیٹھ گئیں۔

''فتح پور چلنا ہے۔ ارشاد بھائی نے بتا دیا ہے کہ تم سہارن پور سے آئے ہو اور دلی کے راستے نہیں جانتے، میں بتا دوں گی، کل سے کار لے کر نکل جایا کرو اور خوب دلی گھوما کرو، میں شکور خان کو ساتھ کر دوں گی، وہ تمہیں سارے راستوں سے روشناس کرا دیں گے۔''

''بہتر شکریہ......!''

بیگم صاحبہ کے ساتھ کوئی تین گھنٹے گزارے۔ بہت اچھی خاتون تھیں۔ وہ اس احساس کا شکار تھیں کہ میں کسی بڑے گھر کا نوجوان تھا اور اپنی کسی ضد کا شکار ہو کر گھر سے نکل آیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک نوجوان خادمہ کھانا لے آئی۔ چہرے پر شرارت برس رہی تھی۔

''ڈیلور صاب! کھانا کہاں کھاؤ گے؟''

''بس یہیں ٹھیک ہے، رکھ دیجیے۔'' میں نے لان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''ہائے اللہ! کتنا اچھا بولتے ہو، چلو کھاؤ۔'' اس نے ٹرے لان پر رکھ دی۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو وہ بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

''آپ جایئے، میں برتن یہیں چھوڑ دوں گا۔''

''حسن آرا ہے ہمارا نام!''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے کہا اور وہ بھونڈے انداز میں ہنس دی۔

''سولہ نمبر میں رہتے ہیں۔''

''اچھا......!'' میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اسی وقت حسن آرا کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے میا!'' پھر وہ جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

ابھی میں اُس کی اس کیفیت کے بارے میں کچھ سمجھ نہیں سکا تھا کہ کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

پلٹ کر دیکھا تو ارشاد علی تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا، پھر ان کی آواز ابھری۔ ''حسن آرا......!''

حسن آرا جو ابھی کچھ قدم دور گئی تھی، اس طرح رکی جیسے کمر میں گولی لگ گئی ہو پھر وہ سہمی سہمی سی واپس آ گئی۔ ''اٹھاؤ کھانا، واپس لے جاؤ، آپ میرے ساتھ آیئے۔'' وہ مجھے لے کر گھر آ گئے۔ بیگم صاحبہ اور لڑکیاں موجود تھیں۔ ''امتحان لے رہے ہیں میاں ہمارا، اس وقت کپڑے سے کار صاف کر رہے تھے اور اب گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھانے والے تھے۔''

بیگم صاحبہ نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولیں۔ ''کھانا تو تمہیں گھر آ کر کھانا تھا بیٹے! ہم ایک بجے کھا لیتے ہیں، تمہارے انتظار میں ابھی تک کسی نے نہیں کھایا۔''

''اوہ! مجھے علم نہیں تھا، آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''بیٹے......! اتنی آس دلا دی ہے تو اسے قائم رہنے دو، ہم نے تمہیں بہت کچھ سمجھ لیا ہے، ہماری خوشی نہ چھینو۔''

''مجھے ہدایات دیدیں، کبھی انحراف نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''قصور اس کا بھی تو نہیں تھا، چلو شکیلہ کھانا لگواؤ۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ کھانے کے بعد مجھے بریفنگ دی گئی۔ صبح کا سیر حاصل ناشتہ کر کے گھر سے نکلنا ہوگا، گاڑی شکور صاف کرے گا، دوپہر کا کھانا گھر پر کھایا جائے گا، رات کو سب مل کر کھانا کھائیں گے وغیرہ۔

اس وقت بھی دل بے حد اداس تھا۔ ان لوگوں کے خلوص کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں ان لوگوں کے پیار کا کیا جواب دے سکوں گا، مجھے تو کل کا پتا نہیں تھا کہ مجھ پر کیا بیتے۔

دوسرے دن بیگم صاحبہ کا پیغام ملا۔ یہ پیغام حسن آرا لائی تھی۔ ''بیگم صاب نے کیا ہے کہ تیار ہو جاؤ۔'' وہ بولی اور ہنس پڑی۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تو وہ پھر بولی۔ ''ہری مرچ کو جانا ہے تمہارے ساتھ! ہائے کسی سے کہہ مت دینا، گردن کاٹ کر ہاتھ میں دے دیں گی۔''

''کون......؟''

''نور بی بی اور کون! اللہ کا غضب، حاجی بابا کہویں ہیں کہ فرشتوں نے زوال کے وقت بنایا ہے اس لیے سب کے لیے زوال بنی رہتی ہیں۔'' وہ پھر ہنس پڑی اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے سنجیدہ پا کر وہ پھر بولی۔ ''کوٹلہ جائیں گی تمہارے ساتھ، دوسری قطامائیں بھی ساتھ ہوں گی جیسی روح، ویسے فرشتے...... میں چلتی ہوں۔''

دلچسپ کردار تھی یہ حسن آرا بھی! ڈرتی بھی تھی اور بکواس بھی کرتی تھی۔ پھر شکور آ گیا۔ ''مجھے بھی ساتھ جانا ہے، بڑی گاڑی جائے گی، ابھی ابھی حکم اور چابی ملی ہے، تم بڑی گاڑی چلا لو گے، بیگم صاب نے پوچھا ہے؟''

''ہاں! چلا لوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''لو پھر گیراج سے گاڑی نکال لو، میں فٹافٹ صاف کر لوں گا۔'' شکور نے کہا اور میں اس کے ہاتھ سے چابی لے کر گیراج کی طرف بڑھ گیا۔

دوسری گاڑی بھی بے حد شاندار تھی۔ میں نے اسے نکالا اور شکور اسے صاف کرنے لگا۔ ہم دونوں انتظار کرنے لگے، پھر میں نے اس لڑکی کو دیکھا جو نور النساء تھی۔ بلاشبہ حسین تھی، بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں جن میں گلابیاں رقصاں تھیں۔ کتابی چہرہ، سڈول جسم...... سب سے زیادہ حسین اس کے بال تھے۔ بے حد لمبی چوٹی گندھی ہوئی تھی جو پیروں تک آتی تھی۔ جب یہ بال کھلتے ہوں گے تو گویا بالوں کا طوفان آ جاتا ہوگا۔

وہ بڑی تمکنت سے چلتی ہوئی گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو ملازم سامان لیے آ رہے تھے۔ شکور نے جلدی سے بڑی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ملازموں نے سامان پیچھے رکھ دیا۔ میں نے درمیانی دروازہ کھول دیا اور نور النساء نے پہلی بار نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ پُرکشش آواز لیکن کھردرے لہجے میں بولی۔ ''تم کون ہو؟''

''نئے ڈرائیور ہیں چھوٹی بیگم صاب!'' شکور نے جلدی سے کہا۔

''گونگے ہیں؟'' وہ تڑسے بولی۔

''نن نہیں تو......!'' شکور نے کہا۔

''پھر خود کیوں نہیں بولتے؟''

''آپ تشریف رکھیے۔'' میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔

''وردی کہاں ہے تمہاری؟''

''ابھی تیار نہیں ہوئی ہے۔''

''کل تک ہو جانی چاہیے۔'' وہ اندر بیٹھ گئی۔

میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور شکور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ایک اور تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ امیر زادی بھی ایک سبق تھی۔ دیکھیں اس بدبخت سادھو کی وجہ سے اور کتنے سبق ملیں گے۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔

(جاری ہے)

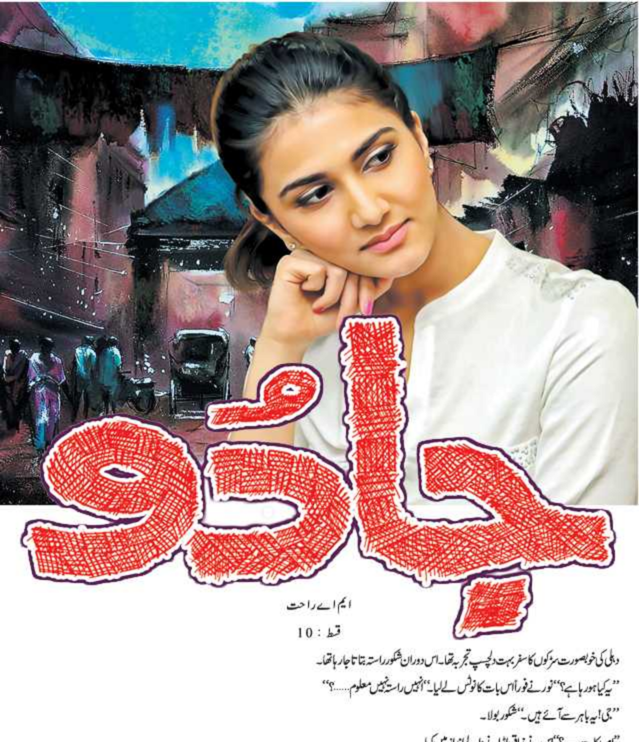

جادو

ایم اے راحت

قسط : 10

دہلی کی خوبصورت سڑکوں کا سفر بہت دلچسپ تجربہ تھا۔ اس دوران شکور راستہ بتاتا جا رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' نور نے فوراً اس بات کا نوٹس لے لیا۔ ''انہیں راستہ نہیں معلوم.....؟''

''جی! یہ باہر سے آئے ہیں۔'' شکور بولا۔

''امریکا سے.....؟'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

شکور بے چارہ کیا بول سکتا تھا۔ جس جگہ وہ آئی تھی، یہ ایک بے حد خوبصورت کوٹھی تھی۔ شکور کے اشارے پر کار کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئی۔ میں نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا۔

وہ اترنے لگی پھر ایک دم چمک کر بولی۔ ''راستے سے ہٹو، اونٹ کی طرح راستہ روک کر کیوں کھڑے ہوگئے، آداب سیکھو۔''

میں سامنے سے ہٹ گیا اور وہ کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئی تو ایک اور خوبصورت لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں بیٹھ گئیں تو میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

نور بولی۔ ''دریبے چلو۔''

''یہ کون صاحب ہیں جو گاڑی چلا رہے ہیں؟'' دوسری لڑکی نے پوچھا۔

''ڈرائیور!'' نور نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....؟'' دوسری لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ڈرائیور کا کوئی اور مطلب بھی ہوتا ہے؟''

''ایسے شاندار ڈرائیوروں کا ہوتا ہے۔'' دوسری لڑکی نے شرارت سے کہا۔

''نازی.....! فضول باتوں سے گریز کیا کرو۔'' نور نے ناگواری سے کہا۔

دوسری لڑکی ہنسنے لگی پھر سرگوشی میں بولی۔ ''تم سے عاجز ہوگا بے چارہ؟'' نورالنساء نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس بار بھی گاڑی ایک اور خوبصورت کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی تھی۔ یہاں کمپاؤنڈ میں چار کاریں کھڑی ہوئی تھیں اور ان کے گرد بہت سی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں البتہ ان کے ساتھ ایک کارٹون بھی موجود تھا۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس، کسی قدر بے ڈھنگے بدن کا مالک عجیب سی شخصیت تھی۔

''یہ کون ہے ان لوگوں کے ساتھ؟'' نازی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کہا۔

''پتا نہیں!'' نور بولی۔

اتنی دیر میں لڑکیوں نے نورالنساء کو گھیر لیا۔ ''یار نور.....! زندگی میں صرف ایک بار، صرف ایک بار تم وقت کی پابندی کرلو، ہماری حسرت پوری ہو جائے۔''

''وہ حسرت ہی کیا جو پوری ہو جائے۔'' دوسری لڑکی نے کہا۔ اتنے میں نازی بول پڑی۔ ''یہ انگریزی اخبار کا کارٹون کون ہے۔''

کئی لڑکیاں ہنس پڑیں۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ''پلیز نازی! یہ میری مجبوری ہیں۔''

''ارے مبارک ہو، اتنی خاموشی سے تم مجبور ہوگئیں، منگنی ہوئی ہے یا نکاح بھی ہوگیا؟''

''یار پلیز! مذاق مت اڑاؤ، امی کے لاڈلے ہیں، دبئی سے آئے ہیں۔'' لڑکی روہانسے لہجے میں بولی۔

''اصولی طور پر غلط ہے، پکنک لڑکیوں کی ہے، یہ کہاں ایڈجسٹ ہوں گے؟'' نور نے کہا۔

''ڈرائیوروں کو کمپنی دیں گے۔'' ایک لڑکی نے کہا۔ غرض یہ کہ ساری لڑکیاں کھی کھی کرتی ہوئی اپنی اپنی گاڑیوں میں جا گھسیں۔ دو لڑکیاں ہماری گاڑی میں بھی آ گئی تھیں۔

گاڑیاں چل پڑیں۔ میں نے اپنی گاڑی پیچھے رکھی تھی تاکہ راستہ پتا چلتا رہے۔ اس طرح یہ سفر فیروز شاہ کے کوٹلے پر ختم ہوگیا۔ بے حد پرفضا مقام تھا۔ سب لڑکیاں گاڑیوں سے اتر کر چہلیں کرنے لگیں۔ دبئی پلٹ جنگر بہت خوش نظر آ رہا تھا اور خود کو اتنی ساری لڑکیوں کے درمیان شہزادہ تصور کر رہا تھا۔ وہ لڑکیوں میں گھسا ہوا تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ لڑکیاں اس کی موجودگی سے بور ہو رہی ہیں۔ وہ جدھر جاتا، لڑکیاں وہاں سے ہٹ جاتیں جس کا اسے کچھ دیر کے بعد احساس ہوگیا۔ دوسری گاڑیوں کے ڈرائیور ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے الگ اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ جنگر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ میری طرف چل پڑا۔ ''خدا خیر کرے۔'' میں نے دل میں سوچا۔ چند لمحوں کے بعد وہ میرے پاس آ گیا۔

''تم اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟'' اس نے آتے ہی سوال کیا۔

''اللہ کی مرضی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا مطلب.....! ویسے میں نے تمہیں وہ بڑی گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا تھا جس میں وہ بیٹھی تھیں، تمہاری کون ہیں وہ؟''

''کون.....؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ جو چھینٹ سوٹ میں چھپکلی لگ رہی ہیں، وہ جن کے بال پیروں تک آ رہے ہیں، معاف کرنا تمہاری کیا لگتی ہیں وہ.....؟''

''مالکن!'' میں نے جواب دیا۔

''ارے ڈرائیور ہو؟''

''ہاں.....!''

''تب تم ہمارے کام آ سکتے ہو، لو یہ رکھو۔'' دبئی پلٹ نے سو روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''کیا نام ہے ان کا؟'' اس نے نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں گرمی آئی لیکن دوسرے لمحے نور کا غرور یاد آ گیا۔ اسے اس غرور کی تھوڑی سی سزا ملنی چاہیے۔

''کیا کام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار! وہ دل کو بھا گئی ہیں، دوستی کرا دو۔'' ایک بار پھر سارے وجود میں گرم لہریں دوڑ گئی تھیں۔ دل چاہا کہ منہ پر ایسا گھونسہ رسید کروں کہ پورا منہ دانتوں سے محروم ہو جائے لیکن دوسرے خیال نے سنبھال لیا۔ نور بے حد مغرور اور بد دماغ لڑکی تھی اور یہ جنگر بہت گھٹیا انسان تھا، دونوں کو سزا ملنا ضروری تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا، پھر بولا۔ ''بولو کام کروگے میرا.....؟''

''کیا چاہتے ہیں آپ!''

''اس تک میرے دل کی بات پہنچا دو۔''

''کتنی بری بات ہے جو کام آپ کو خود کرنا چاہیے، وہ دوسروں سے کرا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' وہ چونک کر بولا۔

''دل کی باتیں ہمیشہ خود کرنی چاہئیں، نور بی بی کیا سوچیں گی کہ آپ کتنے بزدل ہیں۔''

وہ سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔ ''اس کا پتا تو دو تم میرا ساتھ دینا، میرا کام بن گیا تو تمہیں انعام دوں گا۔'' میں نے حویلی کا پتا دہرا دیا تھا۔ ''وہ کیا پسند کرتی ہیں، تمہیں تو معلوم ہوگا؟'' وہ بولا۔

''بس ہنسنے ہنسانے کی شوقین ہیں، ہر وقت لطیفے سناتی رہتی ہیں، ویسے آپ کا نام کیا ہے؟''

''نام تو احسان علی ہے مگر سب پیار سے بنّن میاں کہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر جاکر بسم اللہ کریں، آپ وہاں سے چلے کیوں آئے؟''

''یار اعظمی نے کہا تھا کہ آپ لڑکیوں میں نہ گھسیں۔''

''جائیے ہمت کریں۔'' میں نے کہا اور بنّن میاں لڑکیوں کی طرف بڑھ گئے۔ میرا بڑا دل چاہا کہ قریب سے جاکر بنّن میاں کا کارنامہ دیکھوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا، البتہ چند ہی لمحات کے بعد ''چٹاخ'' کی آواز کے ساتھ نور کا تھپڑ بنّن میاں کے منہ پر پڑا تھا۔

بنّن میاں حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے اور لڑکیوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ نور بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ اس نے چیخ کر شکور کو آواز دی۔ شکور ڈرائیوروں کے پاس بیٹھا ہوا تھا، جلدی سے نور کی طرف بھاگا۔ پھر چند لمحے وہاں رک کر میری طرف دوڑا اور قریب آکر بولا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کرلیں ڈرائیور صاحب! نور بی بی واپس جائیں گی۔''

میں ایسے کسی واقعہ کا منتظر تھا، چنانچہ تیار ہو گیا۔ نور تیزی سے گاڑی کے پاس آ رہی تھی اور لڑکیاں اس کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ وہ اسے روک رہی تھیں لیکن نور نے کسی کی نہیں سنی اور گاڑی میں آ بیٹھی۔

''مس..... سامان لے لوں چھوٹی بی بی صاحب!'' شکور نے پوچھا۔

''بیٹھو!'' نور غرائی اور شکور جلدی سے میرے برابر کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور اسے آگے بڑھا دیا۔ لڑکیاں بے بسی سے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

نور کے بارے میں اندازہ پہلے ہی تھا کہ انتہا پسند ہے لیکن مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے خود کو بھلا دیا تھا۔ کوئی یاد دل میں ابھرتی تو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ واقعہ دلچسپ تھا، چاہتا تو اس میں اور دلچسپیاں پیدا ہو سکتی تھیں لیکن میری تو اپنی زندگی تماشا بن گئی تھی، کسی اور کا تماشا کیا دیکھتا۔ حویلی پہنچ گیا۔ نورالنساء کا موڈ سخت خراب تھا۔ خیر باقی وقت کوئی خاص بات نہیں ہوئی پھر ڈیوٹی ختم کرکے میں حکیم ارشاد علی کی جنت میں آ گیا۔ یہاں آکر درحقیقت سارے غم بھول جاتا تھا۔ اتنے اچھے تھے یہ سب کہ بیان سے باہر۔ ہنسنے ہنسانے والے، جن کے ساتھ گزرنے والا وقت غموں سے آزادی دلا دیتا تھا۔

''پکنک کیسی رہی؟'' ارشاد نے پوچھا۔

''ٹھیک تھی۔''

''نورالنساء نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بس خدشہ ہی رہتا ہے، ناز و نعم میں بگڑی ہوئی لڑکی ہے، ویسے کردار کی اچھی ہے، بیگم صاحبہ اس کے لیے پریشان رہتی ہیں۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

''میں عظیم اللہ خان صاحب کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں، اس کے بعد تمہیں ڈرائیوری کی نوکری سے ہٹالوں گا۔''

''میں نے عرض کیا نا کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

دوسرے دن میں حسب معمول اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ دوپہر کو بارہ بجے شکور نے بیگم صاحبہ کا پیغام دیا کہ انہیں کہیں جانا ہے، تیار ہو جاؤ۔ میری تیاری کیا تھی۔ بیگم صاحبہ آ گئیں اور میں کار لے کر چل پڑا۔

''ٹھیک ہو کامران.....؟''

''جی بیگم صاحبہ! مہربانی۔''

''میں تمہیں راستہ بتاتی ہوں، میری ایک عزیزہ بیمار ہیں، انہیں دیکھنے جانا ہے، پھر کچھ خریداری کرنی ہوگی اور بس!''

''جی!'' میں نے کہا۔ کچھ دیر کے بعد ہم ایک شاندار اسپتال پہنچ گئے۔ پرائیویٹ اسپتال تھا لیکن بہت اعلیٰ پائے کا!

''یہ اسپتال میری نند کے بیٹے کا ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ میں نے اسپتال کی پارکنگ میں کار روک دی، بیگم صاحبہ اتر گئیں۔

''میں ساتھ چلوں؟'' میں نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! میں چلی جاؤں گی۔''

وہ چلی گئیں اور میں کار کے پاس کھڑے ہوکر اسپتال کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایسے ہی اپنے کلینک کے خواب دیکھے تھے، خود کو ایک بڑے اور نامور ڈاکٹر کی حیثیت سے سوچا تھا۔ بڑے اور نامور ڈاکٹر کے طور پر تو میرا نام سامنے آیا تھا لیکن اس پر مجھے کبھی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ ایک خبیث جادوگر کا رہین منت تھا۔

کوئی چالیس منٹ کے بعد میں نے دور سے بیگم صاحبہ کو آتے ہوئے دیکھا۔ ایک شاندار آدمی سوٹ میں ملبوس ان کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں کار سے اتر آیا اور میں نے ادب سے دروازہ کھول دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد بیگم صاحبہ قریب آ گئیں۔

ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مامی صاحبہ! میں حاضری دوں گا، خالہ صاحبہ کی طرف سے آپ اطمینان رکھیے، ایک ہفتے میں وہ گھر چلی.....!'' اس شخص کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ بولتے بولتے رک گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی اس کیفیت کو بیگم صاحبہ نے محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ کار میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''بس.....! مجھے تم پر بھروسہ ہے، نظام بھائی بہت پریشان ہیں۔''

''جی.....!'' اس شخص نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور کار کا پچھلا دروازہ بند کر دیا۔ میں گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا، پھر میں نے کار اسٹارٹ کی، بیگم صاحبہ نے ہاتھ ہلایا اور میں نے کار آگے بڑھا دی۔ خود میری کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر کھو کیوں گیا تھا۔ کیا بات تھی، کہیں اس نے مجھے پہچان تو نہیں لیا تھا۔ راستے بھر اس کی آنکھیں مجھے چبھتی رہی تھیں۔ گھر آکر بھی پریشان رہا۔

رات کے دس بجے تھے۔ ارشاد علی کے گھر میں حسب معمول رونق تھی۔ سب ہنس بول رہے تھے کہ باہر کی گھنٹی بجی اور میں اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ باہر شکور کھڑا تھا۔

''آپ کو بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔''

''اوہ! خیریت، کہیں جانا ہے؟''

''پتا نہیں جی! حکم ملا ہے آپ کو بلا کر لاؤں۔'' شکور نے کہا۔

اتنی دیر میں پیچھے سے ارشاد علی بھی آ گئے۔ وہ بولے۔ ''ارے شکور! خیریت.....؟''

شکور نے انہیں بیگم صاحبہ کے حکم کے بارے میں بتایا تو حکیم صاحب بولے۔ ''کہیں ایمرجنسی میں جانا ہوگا، دیکھو لو کامران! میں چلوں؟''

''ارے نہیں! آپ کیوں جائیں گے، میں دیکھ لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

حویلی کے کمپاؤنڈ میں ایک اجنبی کار کھڑی ہوئی تھی، اس کا مطلب ہے کوئی آیا ہے۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ کون آیا ہے، کیا میرا بلاوا اسی سلسلے میں ہے۔ شکور مجھے زنانہ نشست گاہ لے آیا اور خود دروازے پر رک گیا، پھر بولا۔ ''بیگم صاحبہ اندر ہیں۔''

میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ اندر خوب تیز روشنی تھی۔ بیگم صاحبہ اس شخص کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں جسے میں نے اسپتال میں ان کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ شخص مجھے دیکھ کر جلدی سے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو ڈاکٹر کامران!'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک لمحے توقف کے بعد میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ بولا۔

''میرا نام سہیل احمد ہے، ڈاکٹر ہوں، آپ دن میں جس اسپتال آئے تھے، وہ میرا ہے، براہ کرم تشریف رکھیے۔'' اس نے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ میری نظریں بیگم صاحبہ کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا۔

''آپ ڈرائیور نہیں ہیں بلکہ ایسا سرمایہ ہیں جس پر آپ کا وطن جس قدر ناز کرے کم ہے، براہ کرم بیٹھ جائیے پلیز!''

مجھے اپنے پیروں کی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی چنانچہ میں بیٹھ گیا۔ سہیل نے پھر کہا۔ ''آپ کے ہندوستان آنے سے پہلے سے میں آپ کا فین ہوں، آپ میرے لیے بہت اہم ہستی ہیں، یہ دیکھیے میں پاکستان کے شہر کراچی سے نکلنے والے وہ اخبارات ساتھ لایا ہوں جن میں آپ کے کارنامے اور تصویریں چھپی ہوئی ہیں، اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میں آپ سے کس قدر عقیدت رکھتا ہوں۔'' اس نے اخبارات کے ایک بنڈل کی طرف اشارہ کرکے کہا جو سینٹر ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ کھیل اچانک بگڑ گیا ہے، اب کوئی جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے چنانچہ میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اچانک بیگم صاحبہ بول پڑیں۔ ''یہ سچ ہے کامران! تم ڈاکٹر ہو؟''

''جی بیگم صاحبہ! یہ سچ ہے، کیا ڈاکٹر سہیل نے آپ کو تفصیل بتا دی ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں! تفصیل نہیں بتائی۔'' سہیل بولا۔ ''بس اتنا بتایا ہے کہ آپ ایک حیرت انگیز ڈاکٹر ہیں جو یہاں آکر حسد اور سازشوں کا شکار ہو گئے ہیں حالانکہ آپ نے بہترین حلیہ تبدیل کیا ہے لیکن میری عقیدت ہے کہ آپ کا ایک ایک نقش میرے ذہن پر منجمد ہے، میں نے ایک نگاہ میں آپ کو پہچان لیا۔''

میں نے اس دوران فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے چنانچہ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''خدا کا شکر ہے بیگم صاحبہ کہ آپ کے گھر ان چند دنوں میں میری ذات سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا، اگر ڈاکٹر سہیل مجھے نہ پہچانتے تو شاید کچھ وقت اور یہاں گزار لیتا۔''

''میں کبھی قسم نہیں کھاتا ڈاکٹر کامران! لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ساری زندگی آپ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اگر کبھی کسی کو پتا چل گیا کہ آپ یہاں روپوش رہے ہیں تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔'' ڈاکٹر سہیل نے کہا۔

''ہوا کیا ہے، مجھے نہیں بتاؤ گے تم لوگ.....؟'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''جی اب میں بتاتا ہوں، ڈاکٹر کامران سامری جادوگر کی طرح مشہور ہیں، ان امراض کے بارے میں جنہیں یورپ اور امریکا کے ڈاکٹر بھی ڈائگنوز نہیں کر سکے، کامران صاحب نے انہیں ڈائگنوز کیا، ان کے پیچیدہ ترین آپریشن اور علاج کیے اور دنیا بھر میں مشہور ہو گئے، پھر یہاں ہندوستان میں میڈیکل کانفرنس میں انہیں مدعو کیا گیا لیکن سیمینار کے آغاز سے پہلے ہی ایک مشہور مقامی ڈاکٹر خاتون ایک رات ان کے کمرے میں گئیں اور صبح کو مردہ پائی گئیں، ان کے قتل کا الزام ان پر لگایا گیا اور انہیں گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا، انہیں سزائے موت دی جانے والی تھی کہ یہ کسی طرح جیل سے فرار ہو گئے، جیل کے چند لوگ بھی ان کے ہاتھوں زخمی ہو گئے اور اب پولیس ان کی تلاش میں ہے، بڑی شد و مد کے ساتھ ایک مفرور قاتل کو تلاش کیا جا رہا ہے، یہ ہے کل کہانی!'' سہیل نے کہا۔

بیگم صاحبہ کا بدن نمایاں طور پر کانپ رہا تھا۔ میں نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک وعدہ کرتا ہوں آپ سے بیگم صاحبہ! اگر میں گرفتار ہو گیا اور پولیس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ میں اس دوران کہاں روپوش رہا تو میں یہاں کا نام نہیں لوں گا، وعدہ!''

بیگم صاحبہ بے اختیار رو پڑیں پھر گلوگیر لہجے میں بولیں۔ ''اب کہاں جاؤ گے؟''

''میں نہیں جانتا، آپ اور ڈاکٹر سہیل کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ پر سارے الزامات غلط ہیں، اللہ کا حکم ہوا تو میری بے گناہی ایک دن ثابت ہو جائے گی۔''

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں ڈاکٹر کامران.....؟'' سہیل نے کہا۔

''نہیں! میں اب کسی کو مشکل میں نہیں ڈالوں گا، ہاں اگر ممکن ہو تو ایک کام کر دیں۔''

''بتائیے.....؟''

''کراچی میں میرے بھائی، بہنیں اور والدہ وغیرہ ہیں، انہیں بتا دیجیے کہ میں بے گناہ ہوں، ان سے کہیے کہ وہ اللہ سے میرے لیے دعا کریں کہ اگر میں بے گناہ ہوں تو میری بے گناہی ثابت کرکے مجھے سرخرو کرے اور اگر میں نے یہ گھناؤنا جرم کیا ہے تو مجھے بدترین سزا ملے۔''

ڈاکٹر سہیل نے افسردگی سے سر جھکا دیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اجازت چاہتا ہوں، ارشاد علی صاحب کے پاس واپس نہیں جاؤں گا، بلاوجہ کچھ جھوٹ بولنے پڑیں گے، سچ بولوں گا تو وہ جانے نہیں دیں گے، آپ انہیں بھی حقیقت بتا دیجیے۔ خدا حافظ!''

''کہاں جاؤ گے، میں چھوڑ دوں؟'' ڈاکٹر سہیل نے کہا۔

''شکریہ ڈاکٹر! میں چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

پھر حویلی سے باہر نکل آیا اور حویلی سے نکل کر کسی سمت کا تعین کیے بغیر چل پڑا۔ سمت کی ضرورت بھی نہیں تھی، خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا۔ ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں چلا جا رہا تھا پھر قدم لڑکھڑانے لگے، پیروں میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر قطب کی لاٹ نظر آ رہی تھی، سامنے ہی ایک پارک تھا۔ مدھم پیلی روشنیوں کے سائے میں بے خانماں سوئے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ قدم اس طرف اٹھ گئے اور پھر ایک جگہ خالی دیکھ کر میں لیٹ گیا، آنکھیں بند کرلیں اور سو گیا اور اس وقت جاگا جب سورج خوب چڑھ گیا تھا۔

میرے اطراف بہت سے لوگ تھے، کاہلوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے، کچھ ابھی تک لیٹے ہوئے تھے۔ شدید بھوک لگ رہی تھی۔ ارشاد علی کے ساتھ کھائی ہوئی نہاری یاد آ گئی۔ دل بہت زور سے دھڑکا۔ رات کو جب زیادہ دیر ہو گئی ہوگی تو وہ صورتحال معلوم کرنے آئے ہوں گے، تب صورتحال معلوم ہوئی ہوگی اور صف ماتم بچھ گئی ہوگی۔ مجھے ان سب کی محبت کا اندازہ تھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بہت دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گیا۔ بیٹھے رہنا بیکار تھا۔ کھانا تلاش کروں جو سب سے ضروری ہے۔ وہاں سے چل پڑا۔ راستوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ کہاں جانا تھا، کھانے پینے کی کوئی جگہ مل جائے بس.....! ایک سڑک پر آ گیا اور منہ اٹھائے چلتا رہا۔ سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا۔ بڑی چھوٹی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

اچانک بریکوں کی چرچراہٹ ابھری اور ایک لمبی سی گاڑی کچھ آگے جاکر رکی۔ یہ ڈبل کیبن گاڑی تھی۔ گاڑی ریورس ہوکر میرے پاس رکی اور اس سے ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز ابھری۔ ''گوتم..... گوتم! او مائی گاڈ! گوتم.....!''

میں حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی گوتم نہیں نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے ہی گوتم کہہ کر پکارا جا رہا تھا۔ کوئی غلط فہمی.....! میں نے دل میں سوچا۔ گاڑی سے ایک بھاری بدن کی عورت نیچے اتری اور بے اختیار ''گوتم گوتم'' کہہ کر میری طرف دوڑی۔ پیچھے والے حصے سے بھی تین ملازم قسم کے آدمی نیچے اتر کر میری طرف لپکے۔ عورت قریب آکر مجھ سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

''گوتم..... میرے لعل، میری آنکھوں کے نور! مر گئی تھی میں تو، ہائے تُو کہاں چلا گیا تھا، ارے دیکھ کیا رہے ہو تم لوگ، میرا گوتم مل گیا ہے، لے چلو اسے، لے چلو!''

تین میں سے دو آدمی میرے پاس آکر میرے دونوں طرف کھڑے ہو گئے پھر انہوں نے میرے بازو پکڑ لیے اور مجھے آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''چلیے گوتم مہاراج!'' ''میری بات سنو تم لوگ!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں..... ہاں مہاراج! آپ گاڑی میں تو بیٹھیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ انہوں نے جارحانہ انداز میں میرے بازو پکڑے ہوئے تھے اور مجھے گاڑی کی طرف گھسیٹ رہے تھے جبکہ موٹی پُروقار عورت جو ساڑھی باندھے ہوئے تھی، ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھی تھی۔

میں نے فوراً بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ آگے بڑھ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگوں کی نظروں میں آؤں، یہ خطرناک ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ عارضی طور پر ہی سہی، گوتم کی حیثیت سے کچھ وقت کے لیے ایک ٹھکانا مل جائے گا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی لیکن اس کا سفر ایک گھنٹے کے قریب تھا۔ وہ شاید دہلی کے نواحی علاقے میں سفر کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد ایک وسیع و عریض دریا نظر آیا جس کے پل سے گزرتے ہوئے ایک جگہ دریائے جمنا لکھا دیکھا، پھر ایک جگہ غازی آباد بھی لکھا نظر آیا۔ آخر کار گاڑی ایک عمارت کے ٹوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی اور ایک جگہ رک گئی۔ مجھے نیچے اتارا گیا۔ خالص ہندوانہ طرز کی عمارت تھی۔ دروازے کے دونوں طرف دو بھیانک شکلوں والی مورتیاں آویزاں تھیں۔ وہ لوگ مجھے اس دروازے سے گزار کر اندر لائے پھر ایک ڈیوڑھی نما جگہ سے گزر کر ایک کمرے میں پہنچے جہاں کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

میری بھوک ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بھائی! مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے، مجھے کچھ کھانے کو دو، ورنہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔''

ان میں سے ایک نے دوسرے کو اشارہ کیا اور دوسرا دروازے سے باہر نکل گیا۔ موٹی عورت ہمارے ساتھ اندر نہیں آئی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ کوئی غلط فہمی والی بات نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی ہے۔ موٹی عورت نے وہاں جس دیوانگی کا اظہار کیا تھا، اب اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔

چند ہی منٹ کے بعد وہ آدمی کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر اندر آ گیا۔ میں نے شکم سیری کی اور کچھ سکون ہوا لیکن چند ہی لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ یہ سکون کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ بس دنیا نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور جب ہوش آیا تو خود کو بہت بڑے ہال نما کمرے میں پایا۔ کمرے کی چھت بہت اونچی تھی اور اس کی دیواروں میں روشنیاں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا، ہاں البتہ ایک دروازہ دور سے نظر آ رہا تھا۔ بینائی نے کچھ اور ساتھ دیا تو مجھے وہ سات انسانی ڈھانچے نظر آئے جو ایک دیوار کے ساتھ قطار میں کھڑے تھے۔ سوکھے ہوئے انسانی پنجر میرے لیے اجنبی نہیں تھے کیونکہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں انہیں بارہا دیکھ چکا تھا لیکن ماحول نے مجھے خوف زدہ کر دیا اور اس وقت تو جان ہی نکل گئی جب اچانک ان میں سے ایک ڈھانچہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی مضحکہ اڑانے والی جیسی تھی۔ مزید یہ کہ اس کے ہنسنے کے ساتھ باقی ڈھانچے بھی ہنس پڑے اور ہال میں خوفناک قہقہے ابل پڑے۔

تھوڑی دیر تک وہ ہنستے رہے پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کی یہ اچانک خاموشی ان کی ہنسی سے زیادہ خوفناک تھی۔ ایک دم دماغ پھاڑ دینے والا سناٹا چھا گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر میری نظر ایک دیوار کی جانب اٹھ گئی اور میرے بدن میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔

میں نے دیوار میں چند مجسمے دیکھے جو متحرک تھے۔ ان مجسموں کی شکلیں عجیب و غریب تھیں۔ ایک مجسمے کا سر گائے کی طرح تھا اور دھڑ انسانوں جیسا! ایک کا سر انسان کا اور باقی بدن گائے کا! دوسرے مجسمے بھی ایسے ہی بے تکے جسموں کے مالک تھے۔ اس سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ وہ دیواروں پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

ابھی میں ان کی طرف متوجہ تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور مجسمے ساکت ہو گئے۔ یوں لگا جیسے شرارتیں کرنے والے بچے اچانک ٹیچر کی آمد سے خوف زدہ ہو گئے ہوں۔

میری نظریں اس طرف اٹھی ہی تھیں کہ میرے اردگرد کی دیواروں سے شدید بدبودار دھواں خارج ہونے لگا۔ اس کی بدبو ناقابل برداشت تھی۔ ناک اور کانوں میں شدید جلن ہونے لگی۔ ایک بار پھر مجھے اپنی آنکھیں بند ہوتی محسوس ہوئیں پھر وہی مانوس اندھیرا، اندھیرا اور پھر روشنی.....! روشنی ہوش کا اعلان ہوتی ہے۔ یہ اعلان بھی ایک اجنبی جگہ ہوا تھا۔ بدن کے نیچے نرم گدے والی مسہری تھی، بدن پر نرم کمبل پڑا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسی وقت سامنے نظر آنے والے دروازے سے ایک لڑکی اندر داخل ہوگئی۔ ساڑھی میں تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے پھر بولی۔ ''جے ہو مہاراج کی اشنان کرلیں، وہ سامنے اشنان گھر ہے۔''

میں نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا۔ غسل خانہ تھا۔ صورتحال کافی حد تک واضح تھی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کہاں ہوں۔ اٹھ گیا۔ غسل خانے میں جاکر غسل کیا، وضو کیا۔ غسل خانے میں دوسرے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے لیکن اپنے ہی کپڑے پہنے۔

باہر نکلا تو سامنے کھانے پینے کی کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ پکی ہوئی چیزیں تھیں۔ اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ناپاک جگہ ہے، یہاں کی چیزوں کا کوئی بھروسہ نہیں، چنانچہ میں نے ان پر توجہ نہیں دی اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

کچھ لمحوں کے بعد دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ پجاریوں جیسے لباس پہنے ہوئے تھے۔

''بھوجن نہیں کیا مہاراج.....؟'' ایک نے کہا۔

''نہیں!''

''کرلیں۔''

''نہیں!'' میں نے کہا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ''آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''چلو۔'' میں نے کہا۔

وہ واپس دروازے کی طرف مڑ گئے۔ ایک چوڑی راہداری سے گزرنے کے بعد وہ مجھے لیے ہوئے ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی بڑا ہال نما کمرہ ہے جہاں پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتوں ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے اور دیواروں پر وہی انسان نما جانور یا جانور نما انسان نظر آ رہے تھے۔ البتہ اس وقت یہاں بے حد تیز روشنی ہو رہی تھی۔ کچھ نئی کرسیاں وغیرہ بھی پڑی ہوئی تھیں۔

''بیٹھیے مہاراج!'' میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے کہا اور میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ پیچھے ہٹ کر ایک دیوار سے جا لگے تھے۔ کچھ لمحوں کے بعد دوسرے دروازے پر ہلچل ہوئی اور پھر خوبصورت لباسوں میں ملبوس لڑکیاں اندر آنے لگیں۔ ان کی تعداد سات تھی۔ ایک سے ایک حسین تھی۔ جھلملاتے لباسوں نے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ دروازے سے اندر آکر وہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں اور گردنیں جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔

پھر چار افراد اندر داخل ہوئے جو ایک زرنگار تخت کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ بے حد خوبصورت تخت تھا جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی رنگ برنگی روشنیوں نے ماحول کو اور حسین بنا دیا تھا۔ اس تخت پر کریہہ شخص بھوریا چرن بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا سا سر، بڑی بڑی بدنما آنکھیں، سوکھا بدن اور بے حد دبلے پتلے ہاتھ، پاؤں.....! جیسے ہی وہ اندر آیا لڑکیوں نے دلکش آواز میں نعرہ لگایا۔

''جے پدم شنکھا..... جے شاکیہ منی پدم شنکھا۔'' وہ نعرے لگاتی رہیں اور چاروں آدمیوں نے تخت ہال کے بیچوں بیچ رکھ دیا۔

تب اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیسا ہے رے تُو.....؟''

''ٹھیک ہوں بھوریا چرن!''

''دلی کے مجے لوٹ لیے؟''

''ہاں! تیری راجدھانی میں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

''بھاگ کھوئے میٹھا ہے پاپی! میری راج دھانی تے نے ابھی دیکھی ہی کہاں ہے، اب تو سے آیا ہے تجھے راجہ بنانے کا!''

''تم شنکھا بن گئے بھوریا چرن.....؟'' میں نے کہا۔

''تو اور کیا۔ بس اب تیری مدد سے کھنڈولا کمٹ ہماری کھوپڑیا پر سجنے والا ہے، ویسے بھائی تیرا وہ مولبی بڑا ہکٹ نکلا، اس نے ہمارے شنکھا بننے کے راستے روک رکھے، وہاں رہتے تو کام نہ بنتا، سو ہم ادھر آ گئے۔''

''یہاں تمہارا کام بن گیا؟''

''ہاں! دیکھنا ساتوں کھڑے ہیں جنہوں نے ہماری شنکھا شکتی پوری کی ہے۔'' اس نے ان سات ڈھانچوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

''یہ سب مسلمان ہیں؟'' میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''اے ہی مجبوری تو رہی رے، نہیں تو کب کے کھنڈولے بن چکے ہوتے۔'' میں خاموش ہو گیا۔ مجھے کالے جادو کے شکار ان مظلوموں کا دکھ ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''اب تیرا کام سروع ہووے ہے، پریم کی باتیں کر، ہم سہارن پور چلیں گے اور تو ہمیں مہان پرش پیر پھکو او دوارے لے جائے گا پھر ہم کالو کے چرنوں میں پہنچا دے گا اور ہم کھنڈولے بن جائینگے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے بھوریا چرن! میں تمہارے اس ناپاک عمل میں تمہارا ساتھ دوں گا، ہم ان قابل احترام ولیوں اور درویشوں پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں، ہم ان کے مزار پر تمہارے ناپاک وجود کو پہنچائیں گے؟''

میرے ان الفاظ پر بھوریا چرن کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہوگئیں۔ اس نے بے چینی سے اپنے سوکھے سوکھے ہاتھ، پاؤں ہلائے پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''دھت تیرے کی! تونے بھی اوہی کھیل سروع کر دیا جو تیرے پتا نے کھیلا تھا، سن بروا! تیرا پوار اپر یوار اتھل پتھل ہو گیا تھا، سب سسرے بیر یا بیران ہو گئے تھے، تو ہمیں پھر وہی سب کچھ کرنے کے لیے مجبور کر رہا ہے۔''

''یہ تو اور اچھی بات ہے بھوریا چرن! ایک منحوس جادوگر کو مزار پر نہ پہنچانے کی نیکی کا ثواب نہ صرف مجھے ملے گا، میری وجہ سے یہ ثواب میرے خاندان والوں کو بھی ملے، اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔''

''سارے کے سارے پاگل ہو سسرو! پریوار کا پریوار ایک جیسا ہے، ہم کھنڈولے بن جائیں تو اور تیرا پریوار تیرے دیس کا سب سے امیر پریوار بن جائے گا، تو جسے چاہے گا وہ وزیر بنے گا، جسے چاہے گا سب سے بڑا افسر بنے گا۔''

میرے حلق سے قہقہہ ابل پڑا۔ ''میں اپنے خاندان والوں پر یہ مصیبت کبھی نہیں ڈالوں گا بھوریا چرن!''

''دیکھ رے پاگل! تجھے یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا، ہندوستان بھر کی پولیس تیرے پیچھے لگی ہوئی ہے، ہم تجھے اس کے ہاتھ تو لگنے نہیں دیں گے، وہ تجھے موت کی سجا دیدیں گے، ہمیں کیا فائدہ! پر ہم تجھے مجبور کر چکا ئیں گے، تونے ابھی تک جیون کا کالا روپ نا ہی دیکھا، وہ بھی دیکھ، ہم تو سے جیادہ دور نا ہی رہیں گے، جب تیرا من کرے ہمارے کام کے لیے تیار ہو جانا، چلو رے چلو۔'' اس نے کہا اور چاروں آدمیوں نے دوبارہ تخت کندھوں پر اٹھا لیا اور واپس اسی دروازے کی طرف چل پڑے۔

''آ ؤری پورنیو آ جاؤ۔'' بھوریا چرن نے چلتے ہوئے کہا اور ساتوں خوبصورت لڑکیاں تخت کے پیچھے پیچھے اس دروازے سے اندر چلی گئیں۔

''اٹھو شہزادے! یہ تمہارے باپ کی حویلی نہیں ہے۔'' ان لوگوں میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا جو یہاں تک لائے تھے۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس بار وہ مجھے اس آرام دہ کمرے میں نہیں لے گئے تھے بلکہ ایک اور کمرے میں لے گئے تھے جس کے ننگے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ میں اندر داخل ہوکر دری پر بیٹھ گیا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب آگے کیا ہوگا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک آدمی ہاتھ میں پیتل کی تھالی لیے اندر آیا۔ تھالی کے ایک حصے میں ابلے ہوئے چاول رکھے تھے، ایک پیالی میں پانی جیسی دال رکھی تھی اور مٹی کے آبخورے میں پانی تھا۔ اس نے تھالی میرے سامنے رکھی اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

میں نے تھالی کی طرف دیکھا پھر میرے منہ سے آواز نکلی۔ ''مالک کائنات! تیرا رزق ہے جو میرے لیے نعمت ہے لیکن جن ناپاک ہاتھوں سے مجھ تک پہنچا ہے، وہ قابل بھروسہ نہیں ہیں، کون جانے اس میں کیسی غلاظت شامل کر دی گئی ہو، اس لیے میں روزہ رکھ رہا ہوں اور اسے قبول نہیں کروں گا۔''

وقت کا اندازہ کرکے نماز پڑھی، پھر دری پر دراز ہو گیا۔ نیند آ گئی اور آنکھ کھلی تو دیکھا دھندلا سا اجالا تھا۔ کروٹ بدلی تو ایک زوردار لات کمر پر پڑی اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گھبرا کر اٹھ گیا۔ ایک خونخوار سا آدمی پاس کھڑا خونی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کتے کے پلے! تجھ سا حرام خور پہلے نہیں دیکھا قسم اللہ کی! سالے دار و پی کر پھیپھڑے چھلنی کرلے گا، اب میری ڈیوٹی ہے کہ پہلے تجھے جگاؤں پھر تو کام کرے، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ سارے کے سارے کام پر لگے ہوئے ہیں اور تو ملکندے مار رہا ہے، اٹھتا ہے یا دوں ایک اور لات.....؟'' وہ آگے بڑھا تو میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا پھر میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ ہر طرف سے سائیں سائیں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ سڑک پر جھاڑو لگانے کی آوازیں تھیں۔ بہت سے لوگ سڑک کی صفائی کر رہے تھے۔ جہاں میں سو رہا تھا، وہاں بھی ایک موٹی سی جھاڑو رکھی ہوئی تھی۔

''ہوش آ گیا راج کمار! آیا میں ہوش دلاؤں، ابے اٹھا جھاڑو۔'' میں نے جلدی سے جھاڑو اٹھالی پھر مجھے پتا چل گیا کہ مجھے کیا کرنا ہے چنانچہ میں جھاڑو لگانے لگا۔ دل چاہ رہا تھا کہ قہقہے لگاؤں۔ واہ ڈاکٹر کامران، زندہ باد، سڑک کی صفائی کے اسپیشلسٹ.....! سوچنے کی بات ہی نہیں تھی کہ بھوریا چرن نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ تو مزے کی بات ہے، خودی کی تعمیر ہو رہی تھی۔ یہ نئے انسان تھے جو ارد گرد بکھرے جھاڑو لگا رہے تھے، بالکل میرے جیسے، میرے دوست..... میرے اسپتال کے نئے ڈاکٹر! میں بڑی جانفشانی سے جھاڑو لگانے لگا۔ بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ایک شخص میرے پاس سے گزرا اور بولا۔ ''آج تو بڑی جان آ گئی ہے جیانو.....! رات کو کونسی پی تھی، ٹھیکیدار کہہ رہا ہے زرا دیکھو جیانو کو!''

''تمہارا کام ختم ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔

''اب کیا ہوگا؟''

''کہاں.....؟''

''مطلب اب ہم کہاں جائیں گے؟''

''اوئے چڑھی ہوئی ہے کیا، سمجھ گیا ابھی تک ترنگ میں ہو، اسی ترنگ میں کام ہو رہا ہے ورنہ تم اور اتنا کام! بس کرچند اور نہ کل سے ٹھیکیدار لمبا علاقہ دیدے گا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

میں نے جھاڑو ایک طرف رکھ دی اور اکڑی ہوئی کمر سیدھی کرنے لگا۔ اسی وقت دائیں طرف نظر اٹھ گئی۔ دور سے جامع مسجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے بھی ایک بار جامع مسجد کے سامنے آیا تھا مگر وہ دوسری سمت تھی، اس بار میں اس سے فاصلے پر تھا۔ یہ جگہ کریم ہوٹل کا پچھلا علاقہ تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک گلی نظر آ رہی تھی۔

قدم اس طرف بڑھ گئے۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ یہاں کریم ہوٹل کے بچے کھچے کھانے پھینکے جاتے تھے۔ بڑے بڑے ڈرم رکھے ہوئے تھے جن کے آس پاس کتے گردش کر رہے تھے۔

اچانک ایک کتا زور سے بھونکا اور میری طرف دوڑا۔ کسی نے اسے پتھر مارا تھا۔ کتا تو بھاگ گیا پتھر میرے پاس آکر گرا تھا۔ میری نگاہ سامنے اٹھی تو مجھے میلے کچیلے پھٹے کپڑوں میں ایک شخص ہوٹل کے دروازے کی سیڑھی پر بیٹھا نظر آیا۔

اس نے مجھے دیکھا اور مستانہ آواز میں چیخا۔ ''آ جا آ جا..... من و سلویٰ اترنے والا ہے آ جا!''

میرے قدم اس کی طرف اٹھ گئے۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کوئی فقیر تھا۔ اس نے مجھے سیڑھی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ نہ گزرا تھا کہ پیچھے سے دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہاتھوں میں ٹرے لیے باہر آیا۔

''لو باباجی! برتن جلدی خالی کر دینا، اندر پوچھ گچھ ہو جاتی ہے۔'' اس شخص نے کہا اور ٹرے اس مجذوب نما شخص کو دے کر واپس چلا گیا۔ اس نے ٹرے اس طرح رکھی کہ ہم دونوں کے درمیان رہے، پھر بولا۔ ''شروع کرو۔''

میں سخت بھوکا تھا چنانچہ میرے ہاتھ ٹرے کی طرف بڑھے لیکن اچانک ہی دماغ میں ایک سنسناہٹ سی ابھری اور میرا ہاتھ رک گیا۔ کہیں یہ بھوریا چرن کا کوئی فریب نہ ہو، وہ مجھے اپنے ناپاک مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی طرح آمادہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، کوئی ناپاک شے کھلا کر میرا ایمان داغدار کر دے اور مجھے اللہ سے دور کر دے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے فقیر کی آواز ابھری۔ ''آسان اور سہل ہے، شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے، مشکل آسان، ہر شے کا وجود ظاہر، اپنی اصل شکل میں آ جائے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' اس نے کہا اور کھانا شروع کر دیا۔

دل میں چراغ روشن ہو گیا پھر ایک صاحب ایمان مل گیا تھا، پھر ایک سہارا مل گیا تھا۔ یوں لگا جیسے بہت دن کے بعد کسی اپنے نے خبر لی ہو۔ اس نے بسم اللہ شریف پڑھ کر کھانے کا آغاز کیا تھا اور جو میرے دل میں وسوسہ آیا تھا، اسے جان کر میری تشفی کر دی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ کوئی صاحب علم ہے، چنانچہ میں نے بھی بسم اللہ پڑھ کر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ کھانا کھا رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

آخر کار کھانا ختم ہوا تو بوڑھے نے کہا۔ ''نصیب ور ہو، پیشانی روشن ہے، کتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا ہے ذاتِ رحیم نے، کائنات کس قدر وسیع ہے، کتنے لوگ ہیں یہاں کاروں، بنگلوں، جائدادوں والے۔ کسی بھی مشکل سے ناآشنا، آتے ہیں عیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں، چلے جاتے ہیں، دینے والے سے دور، سب کچھ ہوتا ہے ان کے پاس اور جو سب کچھ ہونے کے باوجود اسے یاد رکھتے ہیں، وہ اسے پیارے ہوتے ہیں، وہ ان سے پیار کرتا ہے، ان سے لاڈ کرتا ہے، ان سے قربت چاہتا ہے کہ اسے یاد کرتے رہیں، اسے امتحان بھی نہ کہو، یہ اس کا لاڈ ہے اور پھر سب کچھ مل جاتا ہے، وہ صرف اتنا لاڈ کرتا ہے جتنا برداشت ہو سکے، اس سے زیادہ نہیں۔''

''باباصاحب!'' میرے منہ سے سسکی نکلی۔

''نا نا نا..... بابا نہیں! میں تو پوسٹ مین ہوں، چٹھی والا، چھٹی والا! خبر دینے والا.....! تجھے خبر دیدی، خط پہنچا دیا، ادائیگی ہو رہی ہے۔ وہ جس سے ناراض ہوتا ہے، اسے چھوٹ دیتا ہے۔ اپنا حساب کرے۔ جسے پیار کرتا ہے، اس سے حساب برابر رکھتا ہے، اپنا ادھار لے لیتا ہے، اس کا ادھار واپس کر دیتا ہے۔ اپنی کار میں بیٹھ رہا تھا تو ایک دن، خاکروب سڑک پر جھاڑو دے رہا تھا تُو نے ناک سکوڑ کر اسے ڈانٹا اور کار کے شیشے بند کر لیے۔ دل دکھا ہوگا اُس کا، آج تو نے خود جھاڑو لگائی ہے۔ ایک دن ایک بوڑھا فقیر روٹی پر دال رکھ کر کھا رہا تھا، اس کے ہاتھ دال میں لتھڑے ہوئے تھے، تو نے اپنی بہن سے کہا تھا کہ کتنا گندا ہے یہ! دیکھ، اپنے چاروں طرف دیکھ کتنی شاندار ڈائننگ ٹیبل ہے، کیسا خوبصورت ڈائننگ ہال ہے، ہم کتوں کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، ہے نا.....؟''

ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ بے اختیار سسکیاں نکلیں، ہچکیاں بندھ گئیں، زار و قطار رونے لگا۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ بوڑھا مجھے دیکھتا رہا، ایک لفظ نہیں بولا۔ میں روتا رہا، پھر کچھ سکون ملا۔

بولنا چاہتا تھا کہ بوڑھے مجذوب کی آواز ابھری۔ ''استغاثہ پیش ہوا، قبول کرلیا گیا، یہ آنسو چوبدار ہوتے ہیں، خبر کرتے ہیں کہ داغ دھل گئے، استغفار ہوتے ہیں یہ آنسو اگر دل سے نکلیں، گناہ دھوتے ہیں اور رنجشیں دور ہو جاتی ہیں، خبر مل گئی اور کیا چاہتا ہے، بول اور کیا چاہتا ہے؟''

میں دیر تک روتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''میں کیا کروں، میری رہنمائی کریں بابا صاحب!''

''آرام.....! پریشانی کیا ہے، کرم ہے اس کا، بدی خود تمہاری حفاظت کر رہی ہے، وہ تمہیں حرام غذا کبھی نہیں کھلائے گا کیونکہ اسے تمہارے ایمان کی ضرورت ہے، وہی اس کے کام کا ہے۔''

''میں اس سے بچنا چاہتا ہوں۔''

''بالکل نہیں! بدی کو مارو، بدی میں گھس کر اسے مارو، جہاد ہمیشہ برائی کے خلاف ہوتا ہے اور جہاد کوئی کھیل نہیں ہوتا، مارو، اسے مارو، اس سے پیچھے نہ ہٹو، آگے بڑھ کر اسے مارو، اس سے خوفزدہ ہوکر بھاگو گے تو اسے شہ ملے گی، بدی زندہ رہے گی، جاری رہے گی، مارو..... اسے مارو..... بدی کو مار دو۔''

''مجھے آپ کی رہنمائی چاہیے بابا صاحب!''

''ارے اسے کہتے ہیں فسادِ گندم! اس دانۂ گندم نے حضرت آدمؑ کو دربدر کیا تھا، پیٹ بھر گیا ہے نا، عقل بھی معدے میں اتر گئی ہے، اتنی دیر سے چٹھی سنا رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آئی، رہنما تیرے وجود میں موجود ہے اور تُو دوسروں سے رہنمائی طلب کر رہا ہے پاگل.....! دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار! بس ذرا گردن جھکا اور دیکھ لے..... خلوص سے گردن جھکانا شرط ہے..... چلتا ہوں، کفر سے گریز کر، اسے ناراض نہ کر دینا۔'' بوڑھا مجذوب اپنی جگہ سے اٹھا اور گلی کے دوسرے سرے کی طرف چل دیا۔

میں خاموشی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں وہیں بیٹھا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اس وقت اٹھا جب ہوٹل کا پچھلا دروازہ کھلا اور ویٹر باہر آیا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا، ٹرے اٹھائی اور اندر چلا گیا۔

میں کاہلوں کی طرح وہیں بیٹھا رہا۔ اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ سڑے ہوئے کھانوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کتے، بلیاں گھوم رہی تھیں۔

بوڑھے مجذوب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ دل کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ اس پر پورا یقین تھا کہ وہ کوئی پہنچا ہوا اللہ کا پیارا تھا۔ آخر کار اپنی جگہ سے اٹھا، راستہ طے کیا اور پھر اسی طرف آ گیا جہاں پر جھاڑو لگائی تھی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا، پتا نہیں سب کہاں گئے تھے۔ مستانہ وار چلتا رہا، کوئی فکر نہیں تھی، کوئی منزل نہیں تھی۔ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آیا تھا۔

ایک سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک پولیس موبائل کھڑی نظر آئی۔ اس سے پہلے پولیس کی وردی کہیں نظر آ جاتی تھی تو جان نکل جاتی تھی لیکن اس وقت دل پر کوئی اثر نہیں ہوا اور میں آگے بڑھتا رہا۔

پولیس والے کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھ گیا لیکن ابھی میں ان سے چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ''اے رکو.....!''

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط : 11

جادو

میرے قدم رک گئے۔ دل میں خوف کا گزر نہیں ہوا جبکہ پہلے پولیس کی جھلک دیکھتے ہی دل کانپ جاتا تھا کیونکہ ایک ناکردہ قتل کے الزام میں ملوث تھا۔
پیچھے سے پھر آواز سنائی دی۔ ''اِدھر آجاؤ سورما بھوپالی یا ڈنڈے کھاؤ گے؟''
میں پلٹ کر واپس چل پڑا اور پولیس والوں کے پاس پہنچ گیا۔
''فقیر ہو؟'' پوچھا گیا۔
''ہاں......!'' میں نے پورے سکون سے جواب دیا۔
''چل بے کشن دے دے۔'' ایک پولیس مین نے کہا اور دوسرے پولیس والے نے پولیس وین سے ایک بڑا شاپنگ بیگ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ''کھانا ہے اس میں، کھالینا اور سن دعا کرنا ہمارے لیے!''
''جی......!'' میں نے کہا اور شاپر لے لیا۔
''میرے لیے دعا کرنا کہ میں حوالدار بن جاؤں۔''
''میں ایس آئی!''
''اور میں انسپکٹر......! چل پھوٹ لے، چل!'' وہ سب ہنسی مذاق کرنے لگے اور میں آگے بڑھ گیا۔ دل میں اب کوئی وسوسہ نہیں تھا۔ ایک اللہ والے نے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کافی دور نکل آیا۔ مجھے اس کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں سے میں گزر رہا تھا، وہ جگہ بالکل سنسان تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ڈھلان تھے، درختوں پر کوے چیخ رہے تھے، چنانچہ سوچا کہ شاپر سے نجات حاصل کرلوں۔ اس میں جو کچھ ہے، ان پرندوں کے کام آجائے گا۔
پہلے سوچا کہ یونہی شاپر سڑک کے ڈھلان پر اچھال دوں، کوے خود اسے کھول لیں گے لیکن فوراً ہاتھ رک گیا۔ رزق کہیں سے بھی آیا ہو، اللہ کی عطا ہوتا ہے، اسے بے حرمتی سے نہیں پھینکا جانا چاہیے چنانچہ کنارے آکر شاپر کھولا۔ اس میں پوریاں، بھاجی اور حلوہ تھا۔
ذہن میں بوڑھے مجذوب کی آواز ابھری۔ ''ایک مظلوم دکاندار سے اس کا دن بھر کا منافع ان بدبختوں نے چھین لیا تھا اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا تھا، خدا ان سے سمجھے۔''
میں نے واضح طور پر یہ آواز سنی اور پہچان لی اور دل کو بڑی مسرت کا احساس ہوا تھا۔ کوئی میرے ساتھ ہے، مجھے اب کیا پروا......! اس وقت تک چلتا رہا جب تک پیروں میں جان رہی پھر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا جہاں بیٹھ کر کچھ وقت گزارا جاسکے۔
تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مندر نظر آیا جس کے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس کے احاطے میں سائے دار درخت جھول رہے تھے۔ اس طرف چل پڑا اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ پیروں میں درد ہو رہا تھا، انہیں اپنے ہاتھوں سے دبانے لگا۔
بیٹھے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا میرے پاس آگیا اور بولا۔ ''پنڈت جی! وہ بابا جی بلا رہے ہیں۔''
اس نے مندر سے کافی دور ایک جھاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ اُدھر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے جن کی صورتیں دور سے نظر نہیں آرہی تھیں۔
لڑکے کے پنڈت جی کہنے پر مجھے ہنسی آگئی پھر میں نے کہا۔ ''مجھے ہی بلایا ہے، کسی اور کے لیے تو نہیں کہا؟''
''نہیں جی! مجھے دس روپے دیئے ہیں انہوں نے، آپ ہی کو بلایا ہے۔'' لڑکے نے کہا اور بھاگ گیا۔
ویسے بھی میرے آس پاس اور کوئی نہیں تھا۔ دیکھوں کون ہے، کیا معاملہ ہے۔ تھکن دور نہیں ہوئی تھی تاہم اٹھ کر چل پڑا۔ اُدھر بیٹھے لوگ اب میری طرف ہی دیکھ رہے تھے، پھر میرا دل زور سے دھڑکا۔ میں نے بنسی راج کو پہچان لیا تھا۔
فاصلہ ختم ہوگیا۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ بنسی راج نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''جے کالی ماتا......آیئے مہاراج! بیٹھیے، بیٹھ جایئے یہ کالی منڈلی ہے اور ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں، بیٹھ جایئے، ابھی سواری آتی ہوگی۔''
میں بیٹھ گیا تو بنسی راج نے پھر کہا۔ ''میں آپ سے جو بات کروں گا، وہ میری نہیں بھوریا مہاراج کی ہوگی اور آپ اسی کو جواب دیں گے۔''
''ہاں بولو!'' میں نے کہا۔
''مہاراج نے کہا تھا آپ سے کہ ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں، آپ نے پہلے رخ کی جھلک دیکھی۔ راج محل، پورنیاں، راج مکٹ۔ دوسرے رخ میں، آپ نے جھاڑو لگائی اور ٹھکیدار کی لات کھائی، وہ ایک نمونہ تھا، آپ نے اگر مہاراج کی بات نہ مانی تو سارا جیون لاتیں کھا کر بتا دیں گے، سو مہاراج چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ سہارن پور چلیں، وہ آپ کے ماتا، پتا کی جنم بھومی، وہیں پیر پھاگن کی درگاہ ہے جہاں بھوریا مہاراج ان کے چرن چھونا چاہتے ہیں، سو فیصلہ کریں، مہاراج نے کہا ہے کہ اگر آپ تیار ہوں تو آپ کو سہارن پور لے آیا جائے اور نہ ہوں تو پھر یہیں چھوڑ دیا جائے پھر مہاراج جانیں اور آپ!''
دل میں غصے کی ایک کالی آندھی اٹھی۔ یہ ذلیل جادوگر مجھے اس کام پر آمادہ کرنا چاہتا ہے، جس کے لیے میرے باپ نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ میں اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ ابھی میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ مجھے مجذوب بابا کی بات یاد آگئی۔ ''بدی کو مارو، بدی میں گھس کر اسے مارو، اس سے پیچھے نہ ہٹو......آگے بڑھ کر اسے مارو، بھاگو گے تو اسے شہ ملے گی، وہ زندہ رہے گی، اسے مارو۔''
فیصلہ ہوگیا۔ میں نے آمادگی ظاہر کردی تو بنسی راج خوش ہوکر بولا۔ ''جے مہا کالی۔'' پھر اس نے ساتھ بیٹھے ایک شخص سے کہا۔ ''سورج! تو ریل میں مہاراج کو سہارن پور لے جائے گا۔''
''جو آگیا شاکیہ منی!'' اس شخص نے ادب سے کہا اور سب اٹھ کھڑے ہوئے۔
تبھی بنسی راج نے پاس کی جھاڑیوں سے ایک بہت خوبصورت اٹیچی کیس نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے کسی حمام میں جاکر حلیہ ٹھیک کرو، اس میں تمہارے کپڑے ہیں اور ضرورت کی چیزیں ہیں، صاف ستھرے ہو جاؤ پھر سفر کرو۔''
میں نے اٹیچی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سورج نامی شخص نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا اور بولا۔ ''داس موجود ہے پھر آپ اسے کیوں پکڑ رہے ہیں؟''
میں ٹھنڈی سانس لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس شخص نے سڑک پر پہنچ کر ایک آٹو رکشہ روکا اور مجھے لے کر چل پڑا۔ تھوڑے سے سفر کے بعد آٹو رکشہ ایک بازار میں رک گیا۔ سامنے ایک ہیئر سیلون نظر آرہا تھا جس پر استاد منظور ہیئر سیلون لکھا نظر آرہا تھا۔
اس میں داخل ہوگیا۔ سورج نے وہاں ایک شخص سے بات کی اور اس شخص نے مجھے سیٹ پر بٹھا دیا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے خود ہی میرے بالوں کی کٹنگ کی اور شیو بنایا۔ طویل عرصے کے بعد میں نے اپنا اصل چہرہ دیکھا تھا۔ کٹنگ سے فارغ ہوا تو سورج نے ایک لباس میری طرف بڑھا کر حمام کی طرف اشارہ کیا۔
جو کچھ ہو رہا تھا، غیر متوقع نہیں تھا۔ لباس میرے بدن پر بالکل فٹ تھا۔ طبیعت کو بڑی فرحت کا احساس ہوا۔ باہر نکلا تو سورج نے جوتے میرے پیروں کے پاس رکھ دیئے۔ وہ بڑی عقیدت سے پیش آرہا تھا۔ سیلون والے کو اس نے ادائیگی کردی تھی کیونکہ جب ہم باہر نکلے تو اس نے پیسے نہیں مانگے تھے۔
الغرض ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے، وہاں دو گھنٹے انتظار کیا پھر ایک ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ گئے۔ میں اپنے ماں، باپ کے شہر جا رہا تھا۔ دل میں ایک عجیب سا احساس تھا۔ آخر کار سفر ختم ہوا اور ایک ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو سہارن پور کا بورڈ نظر آگیا۔ سورج کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ یہاں ابھی تک تانگے چل رہے تھے۔ سورج نے ایک تانگہ کیا اور اسے کچی سرائے جانے کا کہا۔
میری نگاہیں دور تک بھٹک رہی تھیں۔ ایک عجیب سی اینٹھن بدن میں تھی جسے کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ تانگے کا سفر طے ہوا اور سامنے ایک اچھی خاصی عمارت نظر آئی جسے صرف روایتی طور پر کچی سرائے کہا گیا تھا ورنہ وہ کچی تھی نہ سرائے تھی، اچھی خاصی ہوٹل نما جگہ تھی، جہاں کمرہ ملنے میں دقت نہیں ہوئی۔
کمرے میں آکر سورج نے کہا۔ ''ہمارا کام ختم ہوگیا، آپ یہاں رکو، آرام سے رہو، آپ کے سوٹ کیس میں کپڑوں کے علاوہ رقم بھی ہے، آپ یہاں خوب گھومو پھرو، پدم پردھانی جب ضروری سمجھیں گے آپ کے پاس آجائیں گے، ہم چلتے ہیں۔''
سورج چلا گیا اور میں کمرے میں پڑی مسہری پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میرا سہارن پور سے کبھی واسطہ نہیں رہا تھا لیکن وہ ہمارے اجداد کا شہر تھا۔ پھوپی شمسہ، نانا ریاض سے وہاں کی بہت سی داستانیں سنی تھیں۔ خود والد صاحب بھی کبھی کبھی بڑی دلسوزی سے یہاں کے قصے سناتے تھے۔ اس وقت یہ احساس کہ میں انہی داستانوں کے شہر میں ہوں، دل پر عجیب طرح اثر انداز تھا۔
بہت دیر تک اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا رہا۔ مزید بیٹھا رہتا اگر ایک ملازم قسم کا آدمی اندر نہ آجاتا۔ ''کچھ چاہیے بابو صاحب! ہمارا نام جوجی ہے، کوئی ضرورت ہو تو بتا دیں؟''
''چائے پلواؤ گے جوجی بھائی......؟'' میں نے کہا۔
''ایں......!'' وہ چونکا پھر اس کے چہرے سے خوشی پھوٹ پڑی۔ ''ابھی لایا بھائی جی!'' اس نے خوشی کے عالم میں کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اندازہ ہوگیا کہ میں نے جس نرمی سے اسے جوجی بھائی کہا ہے، اس نے اسے سرشار کردیا۔ اس نے بھی مجھے بابو جی کے بجائے بھائی جی کہا۔ کتنے تنگ دل اور نقصان اٹھانے والے ہوتے ہیں وہ لوگ جو انسانوں میں تخصیص و تفریق کرلیتے ہیں۔ انسان تو سب یکساں ہوتے ہیں، آپ کی زبان کی ہلکی سی جنبش، آپ کے الفاظ کسی کو عزت سے پکار لیتے ہیں تو آپ کا کیا بگڑتا ہے لیکن اس کے فوائد کا آپ کو اندازہ نہیں ہوتا۔ نرم روی، کسی کی عزت افزائی بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور جو خوشی اسے ملتی ہے جسے آپ عزت سے پکارتے ہیں، وہ آپ کا آفاقی منافع ہے۔
کچھ دیر کے بعد جوجی صاف ستھرے برتنوں میں چائے لے آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''جوجی بھائی! میں پہلی بار سہارن پور آیا ہوں، مجھے یہاں کے بارے میں بتاؤ۔''
''بڑا اچھا شہر ہے جی ہمارا، پہلے زیادہ بڑا نہیں تھا اب تو خوب پھیل گیا ہے، کئی ہوٹل بھی بن گئے ہیں، ہماری سرائے بھی پہلے کچی تھی اسی لیے آج بھی کچی سرائے کہلاتی ہے حالانکہ جب مجو بھائی نے اسے پکا بنایا تھا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ مجو بھائی اسے مجو ہوٹل کا نام دے دو مگر اپنے مجو بھائی نے کہا کہ کچی سرائے کا نام ان کے دادا جی نے رکھا تھا، کیا میں اپنے دادا جی کا نام بھی بدل دوں؟''
جوجی سے میں نے سہارن پور کے بارے میں بہت کچھ معلوم کیا اور مجھے بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ بھوریا چرن کا کارندہ مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا اور بھوریا چرن مطمئن تھا کہ اب مجھے اس کا کام کرنا ہی ہے۔ میں یہاں تک آگیا تھا لیکن دل میں یہی خیال تھا کہ کروں گا وہی جس کا فیصلہ روزِ اول کرلیا ہے۔ مسلمان ہوں، اپنا ایمان کبھی نہیں بیچوں گا۔ یہ پاک لوگ اللہ کے پیارے ہوتے ہیں۔ اس کے احکامات مان کر، اس کی عبادت کرکے، اس کا قرب حاصل کرتے ہیں، ہم گناہ گار ان کے قدموں کی خاک نہیں ہوتے۔ اتنا تو کرسکتے ہیں کہ ان کے مزار مقدس کی بے حرمتی نہ کریں۔ بدکار اور گندا سادھو مجھے کبھی مجبور نہیں کرسکتا کہ میں اس کی ناپاک خواہش پوری کردوں۔
آج کا پورا دن کچی سرائے میں ہی گزارا۔ جوجی کو میری خدمت پر مامور کیا گیا تھا۔ بڑا معصوم سا آدمی تھا۔ دن میں اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ ''بس جی اماں ہے گھر میں، جوان بہن ہے مگر جن کا سایہ ہے جی اس پر، دورے پڑتے رہتے ہیں، بڑا علاج کرایا، جھاڑ پھونک بھی کرائی ہے، ایک مولوی سے بھی علاج کرایا مگر جن بڑا ابکٹ ہے، مولوی کی خوب پٹائی کی اور وہ علاج چھوڑ کر بھاگ گیا بس جی اللہ مالک ہے، کوئی رشتہ بھی نہیں آتا، کون ایسی لڑکی سے شادی کرے گا حالانکہ ماموں کے بیٹے سے ٹھیکرے کی مانگ تھی مگر ٹھیکرے ہی میں جا پڑی، ماموں نے صاف انکار کردیا، وہ بڑے لالچی ہیں، کہتے ہیں جہیز تگڑا دیا جائے تو وہ اس حال میں بھی شادی کے لیے تیار ہیں۔''
''اوہ......! ماموں کا بیٹا کیا کہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ بڑا نیک ہے، کبھی کبھی گھر آجاتا ہے، روتا رہتا ہے، منہ سے کچھ نہیں کہتا۔''
''روتا کیوں ہے......؟''
''بس جی بچپن سے دونوں ساتھ کھیلے ہیں، سب نے بچپن سے بتایا ہے کہ تاجی اس کی دلہن ہے، انسان کو خیال تو ہوتا ہی ہے۔''
''گویا وہ تمہاری بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''
''اللہ جانے بھائی جی! باپ کے سامنے کچھ نہیں بول سکتا۔''
''تمہارے کتنے بچے ہیں؟''
''ایک بھی نہیں!''
''اچھا! کیوں......؟''
''شادی ہوگی تو ہوں گے نا بچے!'' وہ شرما کر بولا۔
''ارے تمہاری شادی نہیں ہوئی ابھی؟''
''نہیں جی! ابا جب مرنے لگے تو انہیں قول دیا تھا کہ جب تک بہن کی رخصتی نہیں کرلوں گا، اپنی شادی نہیں کروں گا۔''
میں سوچ میں ڈوب گیا۔ بے اختیار دل چاہا کہ جوجی کی بہن کو دیکھوں، پتا چلے کہ کیسا جن ہے اس پر! ایک بار پہلے بھی ایک مکروہ اور گندی روح سے ایک بچی کو آزاد کرایا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے جوجی سے کہا۔ ''جوجی! میں تاجی کو دیکھ سکتا ہوں؟ وہ میری بھی بہن جیسی ہے، اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔''
''ہم اسے یہاں لے آئیں گے بھائی جی!''
''کیوں تم مجھے اپنے گھر نہیں لے چلو گے؟''
''اپنے گھر......؟'' جوجی کے چہرے پر ایک دم خوشی چمکی پھر بجھ گئی پھر وہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔ ''ہمارا گھر ایسا ہی ہے پھر بھی آپ چلو گے تو بڑی خوشی ہوگی۔''
''کتنی دور ہے تمہارا گھر......؟''
''وہ کیا ہے سامنے، وہ چھپر والا گھر، پیچھے کی کھڑکی سے نظر آتا ہے۔''
''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ میں اس بوجھل ماحول سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اپنا کچھ نہیں رہا تھا، حالات کے ہاتھوں بھٹک رہا تھا۔
جوجی مجھے اپنے گھر لے گیا۔ غربت زدہ گھرانوں کی ایک ہی تصویر ہوتی ہے۔ ماں تھی، بہن تھی، ٹوٹی چار پائیاں تھیں۔ ٹوٹی چار پائی پر بیٹھ کر چائے پی۔ معمولی سی شکل وصورت کی نوجوان لڑکی چائے لائی تھی۔
''بیٹھو تاجی......! میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔'' میں نے کہا۔
لڑکی نے پہلی بار نظر بھر کر مجھے دیکھا۔ جب اس نے مجھ پر پہلی نظر ڈالی تھی تو اس میں تجسس تھا، اس کے تاثرات میں مکمل ہوش مندی تھی۔ اس وقت بھی مجھے لگا جیسے تاجی، جوجی سے زیادہ ہوشیار ہے۔
''بیٹھ جا تاجی! بھائی جی، بہت اچھے آدمی ہیں۔'' جوجی بولا اور وہ بیٹھ گئی۔
''کہاں سے آئے ہو بیٹے!'' اماں نے پوچھا۔
''دہلی سے۔''
''اچھا! دلی میں رہتے ہو، کیا کرتے ہو؟''
''نوکری کرتا ہوں۔''
''کتنا کماتے ہو؟''
''بس اماں! گزارا ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔
''شادی ہوگئی......؟''
''نہیں!'' میں نے بے چینی سے کہا۔ جوجی کی ماں کے دل میں جو کچھ تھا، اس کا اندازہ ہوگیا۔ بے اختیار ارشاد علی کا گھرانہ یاد آگیا۔ وہاں تین تین لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کتنا مشکل وقت آگیا ہے والدین پر! وہ بچیاں کتنی پیاری تھیں لیکن ان کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ جوجی کی ماں نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی۔ میرا ذہن اس وقت شکیلہ وغیرہ میں کھو گیا تھا۔ کیا سمجھ لیا تھا بے چاروں نے مجھے، کیا بیتی ہوگی میری گمشدگی پر، کیا بتایا ہوگا بیگم صاحبہ نے انہیں......!
پھر مجھے جوجی کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کیے جارہی ہے، کیے جارہی ہے اماں نہ جانے کیا کیا۔ بھائی جی، تاجی کو بہن سمجھ کر دیکھنے آئے ہیں اور تو بے فضول باتیں کیے جارہی ہے۔''
''کیا کروں پھر......؟'' ماں کی رندھی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس آواز میں بے کسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔
''آتو......میرے ساتھ آ......آ!'' جوجی نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کچھ وقت تاجی کے ساتھ مل جائے تاکہ میں اس کا جائزہ لوں۔
میں نے اس کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ تاجی کے چہرے کے نقوش بدل رہے تھے۔ ہونٹ مڑ گئے تھے، دانت جھانکنے لگے تھے، آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ میں غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور بہت دن کے بعد مجھے اپنی اس صفت پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہ محسوس کرکے مجھے عجیب سا احساس ہوا کہ میری وہ قوت آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے جو کسی بھی مرض کا پتا چلا لیتی تھی۔ لڑکی کا ذہن کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے نمایاں ہوگیا۔ اسے کوئی مرض نہیں تھا، اس کا دماغ شفاف تھا پھر میں نے سرسری اس کے سارے وجود کا تجزیہ کیا۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔
اچانک لڑکی کے حلق سے ایک عجیب سی غرغراتی آواز نکلی۔ ''دوبارہ ادھر کا رخ مت کرنا ورنہ تیرے بدن سے خون کا ایک ایک قطرہ چوس لوں گا، یہ میری محبوبہ ہے، اسے مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''
آواز بالکل مردانہ تھی۔ میں نے ایک بار پھر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر یہی اندازہ ہوا کہ سب فراڈ ہے۔ وہ آواز بدل کر بول رہی ہے لیکن جو کچھ وہ کررہی تھی، وہ بے حد شاندار تھا۔ اس کے بدلے ہوئے نقوش بہترین پریکٹس کا نتیجہ تھے۔ جو کیفیت اس نے اپنائی تھی، وہ اچھے اچھوں کی ہوا خراب کرنے کے لیے کافی تھی لیکن مجھے یقین ہوگیا کہ یہ سب اداکاری ہے۔
میں نے دروازے کی طرف دیکھا شاید جوجی اندر آرہا تھا چنانچہ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''سامنے کچی سرائے میں ٹھہرا ہوا ہوں، وہ جو تمہارے گھر کے سامنے کھڑکی نظر آتی ہے، وہ میرے کمرے کی کھڑکی ہے، جو کچھ تم کررہی ہو، مجھے اس کا اندازہ ہے، چاہو تو مجھے اس کی وجہ......!''
ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ جوجی اندر آگیا۔ اس نے تاجی کا چہرہ دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اٹھ، مجھے پتا ہے کہ ادھر بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہوگا، چل اٹھ!'' اس نے تاجی کا ہاتھ پکڑا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ابھی آیا بھائی جی! بس دو منٹ۔'' یہ کہہ کر وہ تاجی کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا۔
میرا ذہن اس مفلوک الحال گھرانے کی مشکلات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ دنیا میں انسان کے لیے کیا کیا مشکلات موجود ہیں، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کچھ دیر کے بعد جوجی واپس آگیا اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''دیکھ لیا بھائی جی! آپ نے ہمارے گھر کو، یہی تماشا دن رات ہوتا ہے۔''
''تم بہت اچھے انسان ہو جوجی! ماں اور بہن کی خدمت کرکے عبادت کررہے ہو، ایک بات تم سے ضرور کہوں گا کہ خدا کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں! بہت جلدی تمہارے دن پھر جائیں گے اور یہ مشکلیں تمہیں یاد بھی نہیں رہیں گی۔''
''کتنی دیر ہے بھائی جی! عمر گزر گئی، دیکھیں کب پھریں گے ہمارے دن!'' وہ اداسی سے بولا۔ پھر ہم واپس آگئے۔ بڑا تجسس تھا میرے دل میں، مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ تاجی کو کوئی بیماری یا سایہ وایا نہیں ہے۔
وقت گزرتا گیا۔ بظاہر مجھے یہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ دل کو بھی اطمینان تھا کیونکہ میری رہنمائی کی گئی تھی کہ بدی سے گھبرا کر اس سے دور بھاگنے کی کوشش مناسب حل نہیں ہے، بہتر ہے کہ اس کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ سو میں یہاں تک آگیا تھا اور انتظار میں تھا کہ بھوریا چرن یا مہاراج کب مجھے اپنے کام کے لیے کہتے ہیں۔
رات ہوگئی۔ کھانے سے فارغ ہوکر میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے جب مجھے اپنے کمرے کی عقبی کھڑکی پر ''تھپ تھپ'' کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ میں چونک پڑا۔
میں کھڑکی پر پہنچا اور میں نے بے دھڑک کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کے دوسری طرف ایک انسانی وجود کالے رنگ کی چادر میں لپٹا ہوا کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، مجھے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''بھائی جی! میں تاجی ہوں۔''
''ارے تاجی! تم ٹھیک تو ہو؟'' میں نے کہا۔
''مجھے تھوڑا سا وقت دیں گے؟''
''بولو......!''
''اتنا تھوڑا بھی نہیں، آپ اس کھڑکی سے باہر آجایئے، اس میں سلاخیں نہیں ہیں، مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''
''اچھا!'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسے اپنے کمرے میں بھی بلا سکتا تھا لیکن یہ بہت خطرناک بات ہوتی۔ میں نے واپس آکر جوتے پہنے اور پھر کھڑکی سے نیچے اتر گیا۔ کمرے کا دروازہ پہلے ہی اندر سے بند تھا۔
''آیئے بھائی جی!'' وہ بولی اور ایک آوارہ روح کی طرح آگے بڑھنے لگی۔ کچھ فاصلے پر اونچے اونچے جھاڑ نظر آرہے تھے جن کے دوسری طرف پیپل کا درخت تھا۔ وہ اسی طرف بڑھ رہی تھی۔
''یہاں کیڑے کوڑے نہیں ہیں بھائی جی! بیٹھیے۔''
''بات کیا ہے تاجی......؟''
''آپ نے ٹھیک کہا تھا مجھ پر نہ سایہ ہے نہ میں بیمار ہوں، بس زندہ رہنے کی کوشش کررہی ہوں، جب جینا ناممکن ہو جائے گا تو ہم دونوں مر جائیں گے، ہم نے پیر پھاگن کے دربار پر قسم کھائی ہے۔''
''ہم دونوں کون......؟'' میں نے پوچھا۔
''میں اور قاسم!''
''قاسم وہ ہے، جس سے تم بچپن سے منسوب ہو؟''
''ہاں بھائی جی! ہم نے بچپن سے ایک دوسرے کو اپنوں کی طرح دیکھا ہے، نہ وہ، نہ میں کسی اور کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، میری ماں کا قصور نہیں ہے، وہ تو ماموں اقبال کی ایک آواز پر میرا نکاح کرنے کو تیار ہیں مگر ماموں کا خون سفید ہوگیا ہے، وہ جہیز مانگ رہے ہیں۔''
''مگر تم نے یہ ڈرامہ کرکے اپنے گھر والوں کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟''
''کہا نا جینا چاہتی ہوں، اس لیے یہ سب کررہی ہوں، اماں کو میری بڑی پریشانی ہے، میں یہ سب کچھ نہ کرتی تو اب تک مر چکی ہوتی، اماں کسی نہ کسی کو گھیر لیتی اور میری زبردستی شادی کردی جاتی، جن بھوت کا چکر چلا کر میں رشتہ لانے والوں کو بھگا دیتی ہوں، اب تو بڑی مشہور ہوگئی ہوں اور اب لوگ میرا رشتہ نہیں لاتے۔''
''زبردست! یہ ڈرامہ تم نے کہاں سے سیکھا؟''
''آٹھ جماعت پڑھی ہوں، بے وقوف نہیں ہوں۔''
''میرے پاس کیوں آئی ہو؟''
''اماں جوجی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ آپ اتنے شریف ہیں تو آپ کو مجبور کرے کہ آپ مجھ سے بیاہ کرلیں، میری آپ کے پاس آنے کی ہمت یوں پڑ گئی کہ آپ نے مجھے بہن کہا ہے۔''
مجھے ہنسی آگئی۔ ''اگر میں تجھے بہن نہ کہتا تو یہی اداکاری کرتی رہتی؟''
''اس سے بھی زیادہ کرتی۔'' وہ بولی۔
میں خوب ہنسا۔ پھر میں نے کہا۔ ''اگر کسی کو پتا چل گیا کہ تُو اس طرح میرے پاس آئی ہے اور کوئی تجھے تلاش کرنے نکل پڑا تو......؟''
''کچھ نہیں ہوگا، میں اکثر نکل آتی ہوں مگر کوئی میرا پیچھا نہیں کرتا، خود جوجی بھی جن، بھوتوں سے بہت ڈرتا ہے، اب تو آس پاس کے لوگ بھی اگر رات میں مجھے دیکھ لیں تو دوڑ لگا کر گھروں میں گھس جاتے ہیں، اس طرح میں قاسم سے بھی مل لیتی ہوں مگر ایک بات کہوں؟''
''ہاں......بولو!''
''ہم ملتے ضرور ہیں مگر ہم نے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تک نہیں پکڑا تاکہ مولا کے پاس جائیں تو گناہ گار بن کر نہ جائیں۔''
''تب اللہ تمہاری محبت کو ضرور کامیاب کرے گا تاجی!'' میں نے خلوص دل سے کہا۔
''مہربانی بھائی جی! اللہ آپ کو خوش رکھے، بس یہ لوگ تمہیں کچھ بھی کہیں، تم تیار مت ہونا، اب میں چلتی ہوں۔'' میں نے اسے بڑے خلوص سے رخصت کیا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ دعا ہی کرسکتا تھا کہ اللہ اس کی خوشی پوری کردے اور کیا کرسکتا تھا۔
دوسری صبح بہت جلدی جاگ گیا حالانکہ نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن طبیعت پر ایک فرحت سی طاری تھی۔ اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ باہر کا موسم اتنا خوبصورت تھا کہ بیان سے باہر......! ہر طرف نشہ آلود کلائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ بے اختیار دل چاہا کہ باہر نکل کر سیر کروں۔
اپنی اس خواہش کو نہ روک سکا اور میں باہر نکل آیا۔ کوئی خاص سمت اختیار نہیں کی اور چلتا رہا۔ اکا دکا لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ کوئی ایک کلومیٹر چلا تھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ کھڑے نظر آئے۔ تجسس ابھرا اور کچھ دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔
کہا اکھاڑہ تھا۔ بہت سے پہلوان لنگوٹ کسے زور کررہے تھے اور بہت سے کنارے کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک لمبا تڑنگا معمر آدمی آگے بڑھا اور دو ایسے نوجوانوں کے پاس پہنچ گیا جو ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ مارا۔ کیا تھپڑ تھا۔ اس اچھے خاصے وزنی نوجوان نے دو قلابازیاں کھائی تھیں۔
عمر رسیدہ آدمی نے گالیاں بکتے ہوئے کہا۔ ''گر تجھ سے کلاجنگ نہیں لگائی جارہی ہے تو......چانٹی کیوں نہیں لگا رہا، اتنی دیر سے دونوں ارنے بھینسے بنے ہوئے ہو اور تو بے......!'' عمر رسیدہ آدمی دوسرے جوان کی طرف بڑھا تو اس نے خوف سے پیچھے ہٹتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔
''معافی استاد معافی، غلطی ہوگئی۔''
''کان پکڑ کر سو اٹھک۔ بیٹھک لگا، چل شروع ہوجا!''
نوجوان نے جلدی سے کان پکڑے اور اسکول کے بچوں کی طرح اٹھک۔ بیٹھک لگانے لگا۔
''ابے ہاں دیکھو۔ مینڈھوں کی طرح ٹکریں مار رہے ہیں، کوئی داؤ نہیں آزما رہا۔'' اس نے کھڑے ہوکر تماشا دیکھنے والوں سے کہا اور اسی وقت اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔
بات کرتے ہوئے وہ رخ بدل رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو جلدی سے دوبارہ مجھے دیکھا۔ دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ چل کر میرے پاس آگیا۔ قریب سے مجھے دیکھتا رہا پھر سرسراتی آواز میں بولا۔ ''مسعود!''
مخاطب میں ہی تھا اور اس نے میرے والد کا نام لیا تھا اس لیے میرا جواب دینا ضروری تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا، اس نے دوبارہ کہا۔ ''مسعود......! تو مسعود ہے نا......؟''
''نہیں۔ میرا نام کامران ہے۔''
''اچھا......ہاں ٹھیک ہے، وہ اتنا جوان کیسے ہوسکتا ہے، مگر جوان حیرت ہے۔ یہ تو سنا ہے کہ اللہ پاک نے ہر انسان کے سات ہمشکل بنائے ہیں مگر ایسے ہمشکل کہ بندہ دیکھتا رہ جائے مگر تجھے پہلے کبھی نہیں دیکھا، کہیں باہر سے آیا ہے؟''
''ہاں! دہلی سے۔ ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں۔''
''ہاں بول! بڑی پرانی کہانی یاد دلا دی ہے تو نے، بول!''
''میرے والد صاحب کا نام بھی مسعود تھا اور ان کے والد کا نام محفوظ احمد تھا۔''
''او تیری خیر......! تو مسعود کا بیٹا ہے، پاکستان سے آیا ہے؟''
''ہاں......!''
''او میری جان! میں تیرا چاچا ہوں، علی خان میرا نام ہے۔ مسعود، کہاں ہے وہ......؟''
''انتقال ہوچکا ہے ان کا!''
''اللہ مغفرت کرے، بودی ابے او بودی......! چل اکھاڑا اچلا، میرا مہمان آیا ہے، میں چلتا ہوں، آ او بیٹے آ!''
''آپ اپنا کام کریں چاچا جی! میں یہیں کھڑا ہوں، ہم بعد میں باتیں کرلیں گے۔''
''نہیں بیٹے! آ، تو نے پاگل کردیا ہے، او تمہیں کیا معلوم۔ مسعود میرے لیے کیا تھا، ہم بچپن سے ساتھ پلے بڑھے تھے، ساتھ کھیلے تھے بس پھر تقدیر نے الگ کردیا، آ او......آجاؤ۔''
علی خان پہلوان کا گھر بہت اچھا تھا، خاص طرز کا بنا ہوا تھا۔ ایک بڑی سی بیٹھک میں انہوں نے پورا خاندان جمع کرلیا۔ بیٹے، بیٹیاں، بہوئیں خاص طور سے انہوں نے اپنی بیگم کو آگے بلایا اور بولے۔ ''پہچانو کون ہے؟''
سفید بالوں والی خاتون نے مجھے دیکھا، پھر جھٹ سے بولیں۔ ''مسعود بھیا کا بیٹا لگے ہے، انہیں کی شکل کا ہے۔'' خاتون کے جواب پر میں دنگ رہ گیا۔ کیا یادداشت تھی۔
علی پہلوان نے کہا۔ ''حیران مت ہو بیٹا! پہلے محبتیں ایسی ہی تھیں، جمیلہ کو مسعود، بھائی نہیں، بہن کہتا تھا، یہ بھی ہماری بچپن کی ساتھی تھیں، بڑا وقت لگا ہے ہمارے ساتھ کا۔''
''مسعود بھیا بھی ساتھ آئے ہیں، تم لوگ تو پاکستان میں رہتے ہو؟'' چچی نے پوچھا۔
''مسعود اب اس دنیا میں نہیں ہے، چلا گیا دنیا چھوڑ کر!'' علی چچا گلو گیر لہجے میں بولے اور خاتون نے دوپٹہ آنکھوں پر رکھ لیا۔ چند لمحے سوگ کی فضا رہی پھر علی پہلوان نے کہا۔ ''چلو آرام کا بندوبست کرو اس کے لیے! ارے تیرا سامان کہاں ہے کامران......؟''
''وہ چچا جان! میں نے کچی سرائے میں کمرہ لیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔
''چل کوئی بات نہیں، تجھے ہمارے بارے میں پتا کہاں ہوگا، آجائے گا سامان اُدھر سے۔''
''وہ۔ میں اُدھر آرام سے ہوں، کوئی پریشانی نہیں ہے، آپ کے پاس روز آتا رہوں گا۔''
''اور ہم نے یہ مڑھیا آگ لگانے کے لیے بنائی ہے، ایں!'' علی چچا نے کہا۔
مجھے اندازہ ہوگیا کہ پھنس گیا ہوں۔ یہ روایتی محبت ہے جس میں کوئی کھوٹ نہیں ہوتی۔ خاموش ہوگیا۔ بھرا پھرا گھر تھا۔ سب میرے ارد گرد تھے۔ بڑی خاطر مدارات ہوئی۔
دوپہر کو علی چچا نے کہا۔ ''تو تو پہلی بار ہندوستان آیا ہے؟''
''جی چچا......!''
''خوش ہو پاکستان میں......؟''
''جی اللہ کا شکر ہے۔''
''مسعود تو یہاں بڑی پریشانی میں رہا، ہم سب کھلنڈرے تھے، دولت حاصل کرنے کے چکر میں رہتے تھے، اسے کوئی کالے علم والا مل گیا اور اس نے سفلی علم شروع کردیا، بس بھیا پھیر میں آگیا ہمارا یار، پھانسی کی سزا ہوئی، اللہ نے بچا دیا، سارے گھر والے جادو کے جال میں پھنس کر در بدر ہوگئے مگر بارہ برس کے بعد تو گھوڑے کی بھی پھر جائے ہے، اللہ نے بچا کر پاکستان پہنچا دیا، اللہ بڑا بادشاہ ہے، پاکستان جاکر اس نے خط لکھے تھے ہمیں، دکھاتے ہیں تمہیں!''
علی چچا بہت پرانے کاغذ نکال لائے جنہیں انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک خط دکھایا۔ میں اسے پڑھنے لگا۔ رسمی سلام دعا کے بعد لکھا تھا۔
زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر پاک زمین نصیب ہوئی، پورا پاکستان حسن و جمال کا گہوارہ ہے، ہم لوگ کراچی آئے، سندھ کی سرزمین، پاکستان کا دماغ، کسی ویران جنگل کے درمیان سے بہتے دریا کے ساحل پر اتنا سکون، اتنا سکھ نہیں ہوتا جو کراچی کے خاموش ساحل پر ہوتا ہے، میں نے ان ساحلوں پر بیٹھ کر خود کو سوچا ہے، سرزمین سندھ جسے سنسکرت میں ''سندھو'' کہا گیا، یونانی میں ''سنتھوس'' اور لاطینی میں ''سنڈس'' کے نام سے پکارا گیا، نہ جانے کیسی کیسی کہانیوں کی امین ہے۔ جہاں پورے ہندوستان، پنجاب، کشمیر، ہریانے، دلی، اتر پردیش اور بہار سے ہجرت کرنے والے آکر آباد ہوئے، اپنے سینے میں لاکھوں کہانیاں بسائے ہوئے، میری ابتدائی کہانی تمہارے علم میں ہے، سونے کے ڈھیر، چمکتے سکے، نوٹوں کے انبار ایک پرسکون گھر کا بدل کبھی نہیں ہوتے، میرا گھر پاکستان! خدا اسے قائم و دائم رکھے۔
''اور بھی بہت سے خط لکھے اس نے مجھے، ٹھیک کہتا تھا وہ، ہم کنویں کے مینڈک، پرکھوں سے اسی شہر کی خاک پھانکتے رہے، اس نے بڑی دنیا دیکھی، خدا اس کی مغفرت کرے۔''
بعد میں علی چچا نے مجھے میرا گھر دکھایا جو ویران پڑا تھا۔ اس کے دروازے میں بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا، کافی بوسیدہ ہوگیا تھا۔ ''ہمارے یار کی نشانی ہے، بڑی لڑائی لڑی ہے ہم نے اس کے لیے! بڑے بڑے سورماؤں نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ہم نے کہہ دیا کہ ادھر آنکھ نہ اٹھائی جائے، کسٹوڈین والے آئے، ہم نے اس سے بھی نمٹ لیا۔''
میں علی چچا کے اس پیار سے بہت متاثر تھا لیکن انہیں اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔
جمعرات کا دن تھا۔ اکھاڑے میں زور کرانے کے بعد ہم گھر آگئے۔ شام پانچ بجے سے گھر میں کچھ اہتمام نظر آیا۔
''خیریت ہے چچا جی! کوئی مہمان آرہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''ارے نہیں بیٹے! آج جمعرات ہے، چراغی کا دن ہے، نہا کر وضو کرلو، پیر پھاگن کے مزار پر جانا ہے۔''
میرا دل اچھل پڑا۔ چچا بولے۔ ''ہاں جمعرات کے جمعرات چراغی ہوتی ہے، وہاں بڑی خلقت آتی ہے، قوالیاں ہوتی ہیں، تمہیں بھی سلام کرنا ہے وہاں جاکر، چلو گے؟''
''ہاں!'' بمشکل میرے منہ سے نکلا۔ دل عجیب سا ہوگیا تھا۔ بہر حال بڑی عقیدت سے میں نے بھی تیاریاں کیں۔ پیر پھاگن سے تو میرا بڑا گہرا رشتہ تھا۔ آخر کار مغرب سے کچھ پہلے پیر پھاگن کے مزار کی طرف روانگی ہوئی۔ چچا کے بیٹے، کچھ شاگرد ساتھ تھے۔ جوانوں نے بڑی بڑی تھالیاں اٹھا رکھی تھیں جن میں گیہوں کی روٹیوں سے بنا ''ملیدہ'' تھا، گڑ اور دیسی گھی سے تیار کیا ہوا۔ گلاب کے پھولوں کی چادریں اور مٹی کے ''دیوے'' جن میں گھی اور روئی کی بنی بتیاں پڑی ہوئی تھیں۔
فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ دور سے پیر پھاگن کے مزار کے گنبد نظر آئے۔ بہت بلندی پر تھے، پھر وہ سیڑھیاں نظر آئیں جن کی تعداد سو سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ زائرین ان سیڑھیوں سے اتر چڑھ رہے تھے۔ میں بڑی بوجھل کیفیت کا شکار تھا۔ ہم سیڑھیاں طے کرنے لگے۔
مجھ پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری تھی۔ میں تمام رسموں میں شریک رہا۔ چچا نے میرے ہاتھ سے چادر چڑھوائی، گھی کے سات چراغوں میں سے ایک چراغ جلوایا۔ ملیدے پر فاتحہ ہوئی اور اس کا ایک نوالہ مجھے بھی کھلایا گیا۔ یہ بڑی دلچسپ رسمیں تھیں جن میں بہت لطف آرہا تھا اور میں عقیدت مندوں کی محبت دیکھ رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔
''سلام بھائی جی!'' پلٹ کر دیکھا تو جوجی تھا۔
''وعلیکم السلام جوجی! کیسے ہو؟''
''فضل ہے مولا کا!'' جوجی نے کہا پھر پیچھے رخ کرکے کہا۔ ''سلام کر بھائی جی کو!''
جوجی کے کہنے پر میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ کالی اور بڑی سی چادر میں ملبوس تاجی تھی۔ اس نے مہین آواز میں مجھے سلام کیا۔
میں نے جواب دے کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''کیسی ہو تاجی...؟''
اس نے جواب دینے کے بجائے گردن ہلا دی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور ان آنکھوں میں گہری شکایت تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے شدید شرمندگی کا احساس ہوا۔
''گھر آیئے بھائی جی! اتنی عزت دیدی ہے تو اسے قائم رکھیے، آپ کو نسا ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔'' جوجی نے کہا۔
''میں ضرور آؤں گا جوجی! وعدہ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ وہ تاجی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ تاجی نے کئی بار پلٹ کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکایت کا تاثر تھا۔ علی پہلوان اپنے کاموں میں مصروف تھے۔
رات ہوگئی، قوالوں نے قوالی شروع کردی۔ عقیدت مند جھوم رہے تھے، قوالوں کو پیر پھاگن کی بیل دے رہے تھے۔ مجھے بھی اس محفل میں بہت مزہ آرہا تھا۔
نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میں نے چونک کر دیکھا۔ ایک باریش شخص تھا کالے لباس میں ملبوس، بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے متوجہ پایا تو بولا۔ ''منہ کھولو۔''
عجیب سا انداز تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ دوبارہ بولا۔ ''منہ کھولو......!'' میرا منہ خود بخود کھل گیا اور اس نے جلدی سے کوئی چیز میرے منہ میں رکھ دی۔ میں ایک دم پیچھے ہٹا۔ منہ میں جیسے شکر گھل گئی جس سے کیوڑے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس ملنگ کی آواز پھر ابھری۔ ''ایک اور......بتاشے ہیں، پیر کا تبرک ہے، کھالو۔''
میں نے دوبارہ منہ کھول دیا اور اس نے دوسرا بتاشہ میرے منہ میں رکھ دیا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا ایک در سے باہر نکل گیا۔
بتاشے بہت مزیدار تھے۔ دل میں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ پیر صاحب کا مزار تھا، کوئی غلط شخص یہاں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ بتاشے صرف تبرک تھے جو مجھ تک پہنچائے گئے تھے۔ مجھے خوشیاں مل رہی تھیں۔ جس دربار کے خلاف مجھے سازش میں شریک کیا جارہا تھا، وہیں سے بلاوا آگیا تھا اور میں اس پاک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ بڑا حوصلہ مل رہا تھا۔
رات کو چار بجے تک محفل جمی رہی پھر قوالیاں ختم ہوگئیں۔ قوال ساز سمیٹنے لگے اور علی چچا اٹھ گئے۔ ہم گھر آگئے، راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں جاکر سو گئے۔
میں بہت دیر تک جاگتا رہا۔ دربار یاد آرہا تھا جہاں ہر چیز سے عقیدت جھلکتی تھی پھر وہ آنکھیں یاد آگئیں وہ شکایت بھری آنکھیں! اور یہ آنکھیں رات بھر مجھے پریشان کرتی رہی تھیں اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ خواب میں ایک حل ذہن میں آگیا تھا۔
دوسری صبح خوب دیرسے جاگا۔ دھوپ چڑھ چکی تھی۔ نہا کر فارغ ہوا تو چچی جان ناشتہ لے آئیں۔ علی چچا معمول کے مطابق اکھاڑے چلے گئے تھے۔
''ساری رات ایک منٹ بھی نہ سوئیں تب بھی وقت پر اکھاڑے میں ہوتے ہیں۔'' چچی جان نے بتایا۔ ناشتے کے بعد میں بھی اکھاڑے کی طرف چل پڑا۔
چچا جی پوری رفتار سے گالیاں بک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ وقت گزرتا گیا پھر تمام پٹھے چلے گئے تو ہم دونوں اکھاڑے سے چل پڑے اور شمشاد علی کے ہوٹل آپہنچے۔
اکثر یہاں بیٹھ کر چائے پیتے تھے۔ اس بات کا میں بخوبی اندازہ کرچکا تھا کہ اپنے علاقے میں علی پہلوان کا بڑا رعب تھا۔ جدھر سے گزرتے تھے، لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔
چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے میں نے کہا۔ ''علی چچا! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔''
''ایں......بولو!''
''آپ اقبال کو جانتے ہیں؟''
''کون اقبال! سہارن پور کا ہے؟''
''ہاں! اسی محلے میں رہتا ہے، کچی سرائے میں اس کا بھانجا جوجی نوکری کرتا ہے۔''
''اچھا اچھا......! وہ اقبال کن میلیا......؟ ہاں جانتا ہوں۔''
''اس کا بیٹا قاسم ہے۔''
''بالکل ہے، پہلے اکھاڑے پر آتا تھا، اب سنارے کا کام کرتا ہے، تم انہیں کیسے جانتے ہو؟''
''کچی سرائے میں جوجی نوکری کرتا ہے، اس نے یہ سب بتایا تھا، اصل میں اقبال جوجی کا ماموں ہے، جوجی کے باپ کی موت کے بعد ان لوگوں کے حالات خراب ہوگئے، بچپن میں اقبال نے جوجی کی بہن تاجی سے اپنے بیٹے قاسم کا رشتہ طے کردیا تھا، دونوں بچوں نے بچپن سے ماں، باپ کی زبانی یہی سنا تھا کہ ان دونوں کی آپس میں شادی ہوگی لیکن پھر اقبال پھر گیا، اس نے بھاری جہیز کا مطالبہ کردیا اور نہ دینے پر شادی نہ کرنے کا اعلان کردیا۔''
''بڑی بری بات ہے پھر کیا ہوا؟'' چچا نے پوچھا۔
''بری بات تو بری ہوتی ہے چچا جان! جو ہونی نہیں چاہیے۔'' میں نے کہا۔
علی چچا سوچ میں ڈوب گئے، پھر بولے۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''
''جوجی غریب آدمی ہے۔ شاید آپ نے یہ بات نہ سنی ہو چچا کہ اس نے اپنے بیمار باپ کو قول دیا تھا کہ جب تک بہن کو رخصت نہیں کردے گا، خود شادی نہیں کرے گا اور وہ یہ قول نبھا رہا ہے حالانکہ خود اس کے بال سفید ہو رہے ہیں۔''
''بڑے عزت والے ہوتے ہیں ایسے لوگ!'' علی چچا نے کہا۔
''جوجی بے حد غریب ہے، اس دور میں، بہن، بیٹی کو رخصت کرنا کتنا مشکل ہے، آپ کو پتا ہے، وہ بھاری جہیز کہاں سے لائے۔''
''میں نے پوچھا تھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟'' علی چچا نے پوچھا۔
''یہ شادی ہونی چاہیے علی چچا!''
''ہوگی، ضرور ہوگی ان شاء اللہ!'' چچا نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔
پھر انہوں نے اپنے بیٹے کو اقبال کے گھر بھیجا۔ انہوں نے اسے اکھاڑے پر ہی بلایا تھا جہاں ایک کمرہ اور احاطہ موجود تھا۔
''آؤ اقبال بھائی کیسے ہو؟'' علی چچا نے پوچھا۔
''آپ کی بادشاہی میں جی رہے ہیں پہلوان جی!'' وہ بولا۔
''بیٹھو......تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''
''حکم پہلوان جی!''
''معاف کرنا بات، بہت ذاتی ہے لیکن کرنا ضروری ہے، جوجی تمہارا بھانجا ہے؟''
''جی پہلوان جی!''
''اس کی بہن تاجی بھانجی......؟''
''بالکل جی!''
''بچپن میں تم نے اپنی بہن کی بیٹی کو اپنے بیٹے قاسم سے منسوب کیا تھا اور بہن سے وعدہ کیا تھا کہ جوان ہونے پر تم تاجی کی شادی اپنے بیٹے سے کرو گے؟''
''وہ پہلوان جی! ایسی باتیں مذاق مذاق میں ہو ہی جاتی ہیں۔''
''تم نے ایسی بات کہی تھی؟'' علی چچا کا لہجہ خشک ہوگیا۔
''ہاں جی......ہاں جی!'' اقبال گھبرا کر بولا۔
''بیٹیوں کے معاملے میں مذاق نہیں کیا جاتا اقبال بھائی! تمہیں یہ شادی کرنی چاہیے۔''
''وقت بدل گیا ہے پہلوان جی! اب بڑا سوچنا پڑتا ہے، میرے دل میں بیٹے کے لیے بڑے ارمان ہیں، جوجی تو ٹھیک سے برات کو کھانا بھی نہیں دے سکتا۔''
''اگر وہ برات کو کھانا دے دے تو آپ شادی کردیں گے؟''
''وہ......وہ لونڈیا تو......پاگل ہے پہلوان جی! اور اس پر آسیب کا سایہ ہے۔''
''تم شادی کی تیاری کرو، آسیب کو ہم بھگا دیں گے۔'' علی چچا نے کہا۔
''لیکن علی پہلوان......جی!''
''ایک آسیب تمہاری طرف بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا ہے، کہہ رہا تھا کہ پنڈت ہری رام کے گھر میں ڈکیتی کا منصوبہ اسی محلے کے ایک گھر میں بنا تھا اور پنڈت کے گھر کا نقشہ بھی ڈاکوؤں کو یہیں سے معلوم ہوا تھا اور کسی کو اس ڈاکے کا حصہ دس ہزار ملا تھا، پولیس نے اس ڈاکے کی چھان بین ابھی بند نہیں کی ہے۔''
میں نے اقبال کے چہرے پر چھانے والی زردی صاف محسوس کی تھی۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر چچا نے دوبارہ کہا۔ ''اپنے خون کو اپنے ہی سمیٹتے ہیں اقبال بھائی! ایک ہفتے کے اندر اندر شادی کی تیاریاں کروا اور اس فرض کو پورا کردو اور ہاں جہیز بھی ملے گا اور برات کا کھانا بھی!''
اقبال نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے کی کوشش کی تو علی چچا نے گرج کر کہا۔ ''آج بدھ ہے، اگلے جمعے کو ہم برات کا انتظار کریں گے، جاؤ اب ہمیں کچھ کام ہیں۔''
اقبال بادل نخواستہ اٹھ گیا تھا۔
میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کیا وہی ہوگا جو علی چچا نے کہا ہے، اگلے جمعہ کو تاجی کی شادی قاسم سے ہوجائے گی۔ اقبال نظروں سے اوجھل ہوگیا تو علی چچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کتنی بگڑ گئی ہے دنیا، سیدھی انگلیوں سے تو گھی نکلتا ہی نہیں۔''
''کیا وہ مان جائے گا علی چچا......؟''
''ایں!'' علی چچا چونک پڑے پھر بولے۔ ''پھر سہارن پور میں رہنا ضروری ہے کیا، سارے خطرے مول لے رکھے ہیں ان سسروں کے لیے، اتنی بھی عزت نہیں دیں گے یہ ہمیں، چلو اب تم اپنا کام شروع کردو۔''
''حکم دیں چچا......!''
''جوجی سے کہو بہن کی شادی کی تیاری کرلے، ہم جہیز کی تیاری کرتے ہیں اور ہاں دوسرا کام یہ ہے کہ قاسم سے مل کر پوچھو کہ وہ بھی خوش ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ دلچسپ کھیل شروع ہوگیا۔ کچی سرائے جاکر جوجی سے ملا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ علی خان نے اقبال ماموں کو شادی کے لیے تیار کرلیا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گیا، تب میں نے اسے مختصر تفصیل بتائی تو وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔
''آؤ بھائی جی! میرے ساتھ گھر چلو۔'' اس نے کہا۔ میں اس کے ساتھ گھر آیا اور جوجی نے ماں کو بتایا، ماں نے تاجی کو۔ پھر تیاری شروع ہوگئی۔
علی چچا فرشتہ صفت تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ساری تیاری کی۔ سہارن پور اچھا خاصا شہر تھا، ہر چیز وہاں مل گئی۔ میرے پاس بھی کچھ رقم تھی جو میں نے جوجی کو دیدی۔ قاسم سے بھی ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔
کیا تھا، کیا ہوگیا۔ کراچی کے ایک بہترین اسپتال میں بہت بڑی حیثیت سے زندگی گزارنے والا ڈاکٹر کامران اب کیسے کاموں میں مصروف تھا لیکن انسان کی فطرت میں وقت سے سمجھوتہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ میں ماضی بھول کر خود بھی اس شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔
انہی تیاریوں کے دوران تاجی نے مجھے تلاش کرلیا۔ پیار سے میرے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔
''بھیا ہو نا میرے......؟'' وہ بولی۔
''ہاں تاجی! اب ٹھیک ہے؟''
''سچ مانو ہم نے تو کچھ اور سوچا تھا۔''
''کیا......؟''
''برا سوچا تھا، ہم نے سوچا تھا اب تم ہمیں دوبارہ نہیں ملو گے، کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا مگر تم نے تو سب کچھ کردیا۔''
''تو خوش ہے تاجی......؟'' میں نے کہا۔
''ہاں......بہت!'' وہ شرما کر بولی۔
برات آگئی، نکاح ہوگیا۔ باراتیوں کو بہت اچھا کھانا دیا گیا۔ میں بھی مختلف کاموں میں حصہ لے رہا تھا اور اس وقت تاجی کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا میرے پاس آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگاتا ہوا بولا۔ ''جے کالی ماتا کی مہاراج! وہ......بنسی راج مہاراج بلا رہے ہیں۔''
''بنسی راج......بنسی راج!'' میرا ذہن چٹخنے لگا۔ بمشکل میں نے کہا۔ ''چلو......!''

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 12

لڑکے نے واپسی کے لیے رخ بدل لیا۔ معاً دل چاہا کہ تاجی کو رخصت تو کردوں، لوگ مجھے تلاش کریں گے پھر طبیعت پر کچھ ایسا اضمحلال طاری ہوا کہ لڑکے کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ وہ میری رہنمائی کرتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ یہ پیر پھاگن کے مزار شریف کا پچھلا حصہ تھا لیکن مزار سے کافی دور تھا البتہ مزار کے اونچے مینار کی روشنی یہاں سے نظر آرہی تھی۔ اس طرف اونچے اونچے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں کے درمیان ایک جگہ روشنی ہو رہی تھی۔ لڑکے کا رخ اسی روشنی کی طرف تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔

روشنی ایک درخت کے تنے کے ساتھ رکھے ہوئے ہنڈوں سے آرہی تھی۔ یہاں پانچ افراد گیروے لباس میں ملبوس نصف دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے منہ سے مدھم مدھم آوازیں نکل رہی تھیں جن کے بول سمجھ میں نہیں آرہے تھے غالباً کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ لڑکا مجھے وہاں پہنچا کر واپس پلٹ گیا۔ جیسے ہی میں ان کے درمیان پہنچا، وہ سب کھڑے ہوگئے۔

''جے مہاراج کی جے ہو۔'' ان کی آوازیں ابھریں اور انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں خاموش کھڑا رہا پھر درخت کے پیچھے سے بنسی راج باہر نکلا اور اس نے بھی مجھے ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کیا پھر بولا۔ ''آیئے مہاراج!''

مخاطب میں تھا۔ یہ کہہ کر وہ درخت کی طرف واپس مڑ گیا۔ میں آگے بڑھا تو وہ پانچوں بھی میرے پیچھے چل پڑے۔ کوئی سو قدم چلنا پڑا تھا۔ یہاں ڈھلان تھے، جو زیادہ گہرے نہیں تھے۔ ان کے اختتام پر پھر روشنی نظر آرہی تھی اور یہ روشنی خاصی تیز تھی اور ان کے درمیان زرق برق لباسوں میں ملبوس وہی خوبصورت لڑکیاں نظر آرہی تھیں جنہیں یہ لوگ پورنیاں کہتے تھے اور جن کی تعداد سات تھی۔

ان لڑکیوں کے درمیان ایک چوکی پر بھوریا چرن بیٹھا نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔ ''سواگتم..... سواگتم..... ! آؤ آگے آجاؤ، ارے او بنسیا! چوکی دے مہاراج کو.....!''

فوراً ہی ایک چوکی میرے لیے لائی گئی اور میں بیٹھ گیا۔ یہاں باقاعدہ کسی تقریب کا سا احساس ہوتا تھا۔ اب کافی لوگ جمع ہوگئے تھے پھر پورنیاں چاندی کے کلسے لیے آگے بڑھیں جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے کلسوں کا پانی بھوریا چرن پر انڈیلنا شروع کردیا، ساتھ ہی پاس کھڑے لوگ اشلوک پڑھنے لگے۔

ساتوں کلسوں کا پانی بھوریا چرن پر انڈیلنے کے بعد یہ کام ختم ہوگیا اور پورنیاں پیچھے ہٹ گئیں پھر وہ تھالیاں لے کر آئیں اور اس کے بدن پر چندن اور سندور لگانے لگیں۔ اس کام سے فراغت کے بعد چار آدمی آئے جو ایک بڑے سے طشت میں کوئی چیز لائے تھے۔

یہ سونے کا ایک تابوت نما بکس تھا جو بڑے طشت کے بیچوں بیچ رکھا تھا۔ بکس میں ہیرے بھی جڑے ہوئے تھے جن کی جگمگاہٹ آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھی۔ یہ طشت چوکی کے سامنے رکھ دیا گیا۔

تب بنسی راج نے کہا۔ ''کامران جی مہاراج! اب آپ کے کام کا سمے آگیا ہے، ہم پدم پردھانی کو آپ کو سونپ رہے ہیں، آپ انہیں پیر پھاگن دوارے پہنچا دیں اور مہا کالی کو ایک اور کھنڈولا دان کردیں، یہ سنسار پر آپ کا مہان اپکار ہوگا اور اس کے نتیجے میں آپ کو اتنا بڑا انعام ملے گا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے، آپ تیار ہوجائیں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بھوریا چرن چوکی سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور اس کے آس پاس کھڑے لوگ اشلوک پڑھنے لگے تبھی ایک انوکھا منظر سامنے آیا۔

بھوریا چرن کے بدن سے سفید دھواں خارج ہونے لگا جس سے انتہائی شدید بدبو آرہی تھی، اتنی شدید کہ مجھے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ دھوئیں کے اخراج کے ساتھ بھوریا چرن کا قد چھوٹا ہوتا جارہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوئی آٹھ انچ کی جسامت کا رہ گیا، پھر دھواں ختم ہوگیا اور میں نے سکون کی سانس لی۔

بنسی راج نے سونے کے صندوق کا ڈھکنا کھولا اور اس کے آگے دو، دو انچ کی دو چوکیاں رکھی گئیں۔ کھلونا نما بھوریا چرن نے ان سیڑھیوں پر قدم رکھے اور پھر صندوق میں داخل ہوگیا۔ صندوق کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر اس نے باریک آواز میں کہا۔ ''کامران جی مہاراج.....! آپ کو یوں کرنا ہے کہ آپ مجھے اپنے کپڑوں میں چھپا کر پھاگنوا دوارے لے جائیں، وہاں بہت سے لوگ ہوویں ہیں، آپ جلدی نہ کریں، وہاں یاتری حجروں میں سوویں ہیں، آپ یاتری بن کر کسی حجرے میں سو جائیں، کچھ یاتری آدھی رات کو جاگ کر عبادت کریں ہیں، آپ کو بھی عبادت کے لیے اٹھنا ہوگا، آپ دوسروں کی طرح عبادت کریں اور موقع پا کر مجھے اس بکس سے نکال کر پھاگنوا کی قبر پر لٹا دیں بس آپ کا کام ختم ہوجائے گا، پھر آپ کی مرضی ہے اُدھر رکیں یا نیچے آجائیں، چلیں مہاراج جے مہا کالی!'' وہ بکس میں بیٹھا پھر لیٹ گیا۔ بنسی راج نے بکس کا ڈھکنا بند کردیا اور بکس دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر بڑے احترام سے میری طرف بڑھا دیا۔

''چلیں مہاراج!'' بنسی راج نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی پھر میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اب مجھے غرض نہیں تھی کہ وہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ میں نے مڑ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ کوئی میرے پیچھے آرہا ہے یا نہیں!..... یہاں سے پیر پھاگن کے مزار کی روشنیاں نظر آرہی تھیں کیونکہ وہ کافی بلندی پر تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ یہ مزار کا پچھلا حصہ تھا اور اس طرف خاموشی اور سناٹا چھایا رہتا تھا، البتہ سامنے والے حصے میں روشنی اور رونق رہتی تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کی کچھ دکانیں رات بھر کھلی رہتی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مینار کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور سب کچھ صاف نظر آرہا تھا البتہ کسی انسان کا اس طرف کوئی وجود نہیں تھا۔ یہاں رک کر میں نے چاروں طرف دیکھا پھر دونوں ہاتھوں میں پکڑا ہوا ڈبہ زمین پر رکھ دیا اور پاؤں سے جوتا اتار لیا۔ جوتے کو ہاتھ میں پکڑ کر میں نے ڈبے کا ڈھکن کھولا، بھوریا چرن کسی ربڑ کے گڈے کی طرح نظر آرہا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر سکون نظر آرہا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے چند لمحات کے بعد اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔

میں نے دانت پیس کر اسے دیکھا اور میرے منہ سے غراہٹ نکلی۔ ''بھوریا چرن.....! میرے باپ نے تیرے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا ہوگا جو میں کرنے جارہا ہوں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب انہوں نے تیرے کہنے سے بزرگ کی قبر کو تیری قربت سے ناپاک نہیں کیا، تو تُو نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کردیا، میرے اہل خاندان کو تُو نے شدید مشکلات میں ڈالا، میرے محترم بزرگ احمد علی کو تُو نے شیطانی طریقے سے ہلاک کردیا، بدبخت بھوریا چرن! مجھے اس ناپاک قوت کی ضرورت نہ پہلے تھی نہ اب ہے، خدا کا فضل میرے ساتھ ہے، میں اپنی محنت سے ایک مشہور ڈاکٹر بننا چاہتا تھا اور مجھے کسی ماورائی قوت کی ضرورت بالکل نہیں تھی۔ تُو نے جو کچھ میرے لیے کیا، اپنی مرضی سے کیا، جس سے مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور آج میں دیارِ غیر میں دربدر بھٹک رہا ہوں، مجھے فکر نہیں ہے..... زندگی، موت، عزت، ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے، اس نے میری تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا ہے، مجھے خوشی سے منظور ہے لیکن تجھ سے اپنے باپ کے ساتھ کیے گئے سلوک اور اپنے بزرگ احمد علی کی موت کا بدلہ لے کر میں جو خوشی پاؤں گا، وہ میرے لیے بہت قیمتی ہوگی، اب تو اپنی تقدیر کا لکھا بھگت.....!'' میں نے اسے کمر سے پکڑ کر بکس سے نکالا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اسے زمین پر رکھا تو وہ حیرت سے بولا۔ ''ارے کام ہوگیا، سمے بیت گیا؟''

''ہاں! کام ہوگیا۔'' میں نے کہا اور پوری قوت سے جوتا اس کے منہ پر رسید کردیا۔ اس کی ناک سے خون ابل پڑا۔ اس نے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے دوسرا جوتا رسید کیا۔

''ہرے۔ ہرے دیا۔ ہرے مرگیو رے۔ ہائے دیا! رے پاپی، ای کا کرت ہے، ان جائے.....'' وہ سانپ کی طرح بل کھاتا رہا اور میں اس پر کے بغیر جوتے برساتا رہا۔

اس کا پورا چہرہ خون میں نہا رہا تھا۔ بدن کا ہر حصہ مضروب ہوچکا تھا، باریک آواز اور باریک ہوگئی تھی، وہ بری طرح نڈھال ہوگیا تھا اور مجھے عجیب سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے اردگرد خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں ہوں، خنک ہوائیں چل رہی ہوں، خوشبوئیں رقصاں ہوں، ہر شے مسرت سے جھوم رہی ہو۔

وہ اب بھی نڈھال آواز میں چیخ رہا تھا۔ میں نے اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ میں بے قابو ہو رہا تھا۔ جب وہ ساکت ہوگیا تو میں نے اسے اٹھایا۔ اس کا پتلا تنکے جیسا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے اسے سوکھی لکڑی کی طرح توڑ کر اس کے بدن سے علیحدہ کردیا۔ اس کے پورے جسم میں کوئی غیر انسانی علامت نہیں تھی، سوائے اس کے ننھے سے جسم کے.....! دوسرا ہاتھ اور دونوں پاؤں بھی توڑ کر میں نے زمین پر پھینکے تو ایک عجیب عمل ہوا۔

اس کے ہاتھ، پاؤں پہلے تو زمین پر پھڑکتے رہے پھر اچانک وہ زمین پر چھپکلیوں کی طرح مختلف سمتوں میں دوڑنے لگے۔ میں حیرت سے یہ منظر دیکھنے لگا۔ اس کا بدن میرے ہاتھ میں تھا پھر اچانک ہی مجھے چیل کی آواز سنائی دی اور کسی چیل کے پروں کا سایہ زمین پر پڑا لیکن دوسرے لمحے اس چیل نما پرندے نے میرے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور بھوریا چرن کا ہاتھ، پاؤں سے محروم بدن اپنے پنجوں میں لے کر اڑ گئی۔ میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔ چیل کس سمت گئی، مجھے اندازہ نہیں ہوسکا۔ دوسری طرف اس کے ہاتھ، پاؤں بھی بہت دور نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ وہ روحانی مسرت جو میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی، اب بھی اسی طرح تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا فرض پورا کیا ہو۔

اطراف اب بھی سنسان پڑے ہوئے تھے۔ تاجی یاد آئی، رخصت ہوگئی ہوگی، وہاں جانے سے اب کیا فائدہ! دہلی میں ارشاد علی چچا کا گھر خاموشی سے چھوڑ دیا تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا ہو، اس کے بعد سب بھول گئے ہوں گے۔ یہاں سہارن پور میں بھی علی پہلوان، جوجی، تاجی، آخر کار سب بھول جائیں گے۔ یہاں رکنا، علی چچا کے پاس واپس جانا سب بیکار ہے، بلاوجہ الجھنیں پالنا پڑیں گی۔ جانا تو ہے یہیں سے آگے بڑھ جاؤں تو کیا حرج ہے چنانچہ چل پڑا۔ نہ کوئی خوف تھا نہ الجھن.....! بس ایک خاموش سفر، بے معنی منزل کے تعین کے بغیر! راستوں کا بھی کچھ پتا نہیں تھا، کونسا راستہ کہاں جاتا ہے۔

مجھ پر بے خودی سی طاری ہونے لگی، ذہن خیالات سے آزاد ہوگیا بس پاؤں اٹھ رہے تھے، راستے طے ہو رہے تھے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں نہر نظر آرہی تھی۔ نہر کے کنارے اور آس پاس جنگلی درخت اور جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں، ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ میں جھاڑیوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوا تو اونچے نیچے ٹیلے بکھرے نظر آئے۔ ٹیلوں کے دوسری طرف اونچے اونچے درخت تھے۔ میں ایک ٹیلے پر چڑھا اور دوسری طرف دیکھا تو نہر نظر آئی جو تاروں کی روشنی میں ایک حسین منظر پیش کر رہی تھی لیکن جو سب سے اچھی چیز نظر آئی وہ جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے پاس دو پتھریلے ٹیلے اس طرح سر جوڑے کھڑے تھے کہ محراب جیسی جگہ بن گئی تھی۔

یہ جگہ آرام کرنے کے لیے بہترین تھی۔ میرے قدم اس طرف اٹھ گئے اور میں محراب کے پاس جا کر رک گیا۔ جھاڑیاں بے شک بے ترتیب اور گھنی تھیں لیکن محراب کے نیچے کی زمین صاف ستھری تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک درخت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں آگے بڑھ کر محراب کے نیچے پہنچا اور زمین پر لیٹ گیا۔ اس وقت پورا بدن آرام مانگ رہا تھا۔ اس کھردری زمین پر لیٹ کر جو لطف آیا، وہ بیان سے باہر ہے۔ لیٹتے ہی آنکھیں بند ہوگئیں اور گہری نیند آگئی۔

نہ جانے کتنی دیر سویا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ کسی گاڑی کی گھر گھر کی آواز سنائی دی تھی۔ میں چونک کر اٹھ گیا۔ محراب کے باہر زرد دھوپ پھیل گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر میں نے ایک شاندار لینڈ کروزر دیکھی جس کے اگلے حصے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے آس پاس چند لوگ کھڑے نظر آرہے تھے۔ پتا نہیں کیا قصہ تھا۔

میں محراب سے باہر نکل آیا اور ان لوگوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں جو لوگ کھڑے تھے، وہ چونک چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ اس ویران جگہ انہیں کسی کے ہونے کی توقع نہیں تھی۔ میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ پانچ افراد تھے جن میں ایک عورت اور چار مرد تھے۔ عورت ساڑھی میں ملبوس تھی۔ ایک مرد خوب لمبا تڑنگا اور شاندار شخصیت کا مالک تھا، باقی تین ملازم ٹائپ تھے۔

میں ان کے قریب پہنچا تو شاندار شخصیت کے مالک آدمی نے کہا۔ ''یہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''بس جناب! ویرانے ناپ رہا ہوں۔'' مجھ سے کوئی جھوٹ نہ بولا گیا۔

اسی وقت گاڑی کی پچھلی سیٹ سے ایک آواز آئی۔ ''ویرانوں کے باسیوں سے چھان بین نہیں کرتے سکھ راج! وہ جو کوئی بھی ہے، اس کی ضرورت کے مطابق اس کی سہایتا کرو۔''

''ٹھیک ہے مہاراج! آپ اگر ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ چلیں..... آپ جہاں کہیں گے، ہم آپ کو پہنچا دیں گے۔'' سکھ راج نے کہا جس کا نام مجھے پچھلی سیٹ سے آنے والی آواز سے پتا چلا تھا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں جناب.....؟''

''بریلی.....! بریلی کے پاس مانسری نامی جگہ پر ہماری حویلی ہے، زمیندار ہیں ہم، ہمارے باغات ہیں۔''

''آپ مجھے بریلی چھوڑ دیجیے۔''

''خوشی سے! گاڑی گرم ہوگئی، بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں، آپ کا شبھ نام کیا ہے؟''

''کامران!'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا! ہمارے ساتھ چلیے بلکہ اگر وقت ہو تو ہمارے مہمان رہیں، ہمیں خوشی ہوگی۔'' میں خاموش ہوگیا۔ کوئی حرج نہیں تھا، اچھا ہے کسی آبادی تک پہنچوں پھر آگے دیکھوں گا۔ اسی وقت پچھلی سیٹ والا شخص بھی نیچے اتر آیا۔ یہ ایک سادھو نما آدمی تھا۔ گیروے لباس میں ملبوس بڑے بڑے بال، بھاری بدن، آنکھوں میں نرمی اور محبت.....!

اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ہمارا نام چندن ہری ہے بیٹے! تمہارا نام ہم نے سن لیا ہے، آجاؤ گاڑی میں بیٹھو..... آجاؤ۔'' وہ میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھا۔ کافی اچھے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ میرا نام سن کر انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں مسلمان ہوں مگر ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں تھا جبکہ وہ ہندو تھے۔ میں چندن ہری کے ساتھ لینڈ کروزر میں جا بیٹھا۔

''کچھ چل پان لوگے، بھوک لگ رہی ہے؟'' چندن ہری نے پوچھا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ بولے۔ ''تیواری..... ارے او تیواری! پوریاں اور بھاجی دے، جلدی سے لے آبیٹا! ابھی گاڑی رکی ہے۔''

تیواری نوکر کا نام تھا۔ وہ گاڑی کے سامان سے مطلوبہ چیزیں نکالنے لگا۔ اس نے یہ چیزیں ٹرے میں لگا کر مجھے دیدیں۔

''سوڈے کی بوتل بھی نکال دے۔'' چندن ہری نے پھر کہا اور ملازم نے دو بوتلیں میرے سامنے رکھ دیں۔

ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آیا کہ یہ چیزیں پاک ہیں کہ نہیں لیکن اس کا حل بھی موجود تھا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کسی بھی چیز کا اپنے لیے بہتر یا بدتر جانچنے کے لیے بسم اللہ شریف موجود ہے، پڑھو اور روحانی لیبارٹری میں چیک کرلو۔ میں نے یہی عمل کیا اور مطمئن ہوگیا۔ پیٹ بھر گیا۔ اس دوران گاڑی کا نقص بھی دور ہوگیا اور پھر سب لوگ گاڑی میں آبیٹھے اور لینڈ کروزر اسٹارٹ ہوکر چل پڑی۔

مانسری بے حد خوبصورت علاقہ تھا۔ رائے سکھ راج کی حویلی دیکھ کر ان کی شاندار حیثیت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ حویلی بالکل جدید طرز کی تھی۔ اس کا ایک حصہ قدیم طرز کا ضرور تھا لیکن دوسرے حصے میں ہر طرح کی آسائشیں دستیاب تھیں، یہاں تک کہ خوبصورت سوئمنگ پول بھی نظر آرہا تھا۔ ایک حصے میں مہمان خانہ تھا جہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا۔ یہ بھی بہترین جگہ تھی، ہر آسائش موجود تھی لیکن میرے لیے یہ سب عجیب تھا۔

اتنے اچھے لوگ تھے وہ بھی غیر مذہب سے! مجھے کیا کرنا چاہیے۔ راستے میں ملے تھے، اتنا فاصلہ طے کرا دیا تھا، کیا مجھے ان کی میزبانی قبول کرنی چاہیے۔ کچھ وقت تو یہاں گزارنا ہوگا، جلد ہی سکھ راج اور چندن ہری سے اجازت مانگ لوں گا۔

چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک شخص میری قیام گاہ میں آیا اور بولا۔ ''میرا نام اللہ بخش ہے جناب! رائے صاحب نے مجھے بریلی سے بلایا ہے، باورچی ہوں، سامان برتن وغیرہ لے کر آیا ہوں، جب تک آپ مہمان رہیں گے، آپ کا کھانا میں پکاؤں گا، رائے صاحب نے حکم دیا ہے کہ اگر آپ گوشت بھی کھانا چاہیں تو میں پکا دوں۔''

میں دنگ رہ گیا۔ اتنے اچھے لوگ کہاں نظر آتے ہیں۔ میں نے باورچی سے صاف منع کردیا کہ کسی بھی طرح کا گوشت یہاں نہ لایا جائے، تاہم اسے اس کے کام سے نہیں روکا۔

رات کو کافی بے سکونی رہی۔ بھوریا چرن کا خیال آتا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر گئے سویا تھا۔ صبح البتہ جلدی آنکھ کھل گئی۔ باہر بچوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، یہ آوازیں کھڑکی سے آرہی تھیں جو کھلی ہوئی تھی۔ میں صورتحال معلوم کرنے کے لیے کھڑکی پر پہنچ گیا۔ باہر سوئمنگ پول پر رش نظر آرہا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے نظر آرہے تھے۔ لڑکیوں نے مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ خاصے ماڈرن لوگ تھے لیکن میں ان کا احسان مند تھا۔

اللہ بخش نے مجھے ناشتہ دیا۔ ناشتے کے بعد سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ باہر جاؤں یا نہیں! کوئی فیصلہ نہیں کر پایا پھر چندن ہری میری رہائش گاہ میں داخل ہوئے اور میں نے ان کا استقبال کیا۔

''کہو بالک! کوئی مشکل تو نہیں پیش آئی؟''

''کیا کہوں آپ لوگوں کے بارے میں، اب دنیا میں ایسے لوگ نہیں ہوتے، آپ نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہیں!'' میرے ان الفاظ پر چندن ہری مسکرا دیا۔

''کیا پوچھوں تم سے، تمہارے بارے میں، من کی کہانی من جانے، من نے کہا تم اچھے ہو اور کچھ جاننے کو من نہ کیا۔'' میں خاموش ہوگیا۔ کمال کے لوگ تھے سب کے سب نیک فطرت! تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن میں نے چندن ہری سے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیں پنڈت جی! بہت وقت ہوگیا۔''

''من اوبھ گیا ہے، گھوم پھر آیا کرو، مانسری بڑی سندر جگہ ہے، ہمارے باغوں کو دیکھو، بڑے اچھے پھل دیتے ہیں، چلو آج ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں، تمہیں اپنے ایک متر سے ملاتے ہیں، تمہیں خوشی آئے گی، پتا نہیں کب سے اس کا ہمارا ساتھ ہے، پر ہم نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی۔''

''کیوں.....؟''

''بس مرضی ہے اس کی، منہ ڈھکے رہتا ہے، کبھی کسی کے سامنے نہیں آتا، بابا پردہ پوش کے نام سے مشہور ہے۔''

''اچھا! کوئی بزرگ ہیں؟''

''بھگوان جانے، بس اپنے آپ میں رہتا ہے، کوئی مدد مانگنے جائے، کبھی انکار نہیں کرتا، تمہارے ہی دین کا ہے۔''

''مسلمان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں..... پکا نمازی، روزے دار!'' چندن ہری نے بڑی عقیدت سے کہا اور میرے دل میں ایسی شخصیت سے ملنے کا شدید اشتیاق پیدا ہوگیا۔

چندن ہری نے گاڑی اور ڈرائیور کا انتظام کیا اور مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ مانسری واقعی حسن و جمال میں یکتا تھا۔ بڑے بڑے باغ جن کے بارے میں پنڈت چندن ہری مجھے بتاتا جارہا تھا۔ درختوں سے بھرے ہوئے تھے، ان پر پھل لدے ہوئے تھے پھر ایک وسیع دریا آیا جس کے ساتھ ساتھ سڑک چل رہی تھی۔ اس کے قرب و جوار کے مناظر بھی بے مثال تھے۔ سفر کافی لمبا تھا پھر ایک آبادی نظر آئی۔ نہ جانے اس آبادی کا کیا نام تھا لیکن اسی آبادی میں دریا کے کنارے ایک بے حد خوبصورت مکان کے کمپاؤنڈ میں گاڑی داخل ہوگئی۔

ایک عمر رسیدہ ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور مسکرا کر بولا۔ ''آیئے بابا صاحب بیٹھک میں انتظار کر رہے ہیں۔''

ملازم کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''آپ نے بابا پردہ پوش کو اپنے آنے کی خبر کردی تھی؟''

''نہیں.....!'' چندن ہری نے بھی سرگوشی میں کہا۔

''تو پھر.....! ابھی ملازم نے کہا ہے کہ وہ انتظار کر رہے ہیں؟''

''آؤ!'' چندن ہری نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ملازم ایک دروازے کے سامنے رکا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے اشارے پر ہم اندر داخل ہوگئے۔ جس ہال نما کمرے کو بیٹھک کہا گیا تھا، وہ ایک بے حد قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا، لیکن کا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ ایک نشست پر سفید لباس میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے سفید ہی چادر اوڑھی ہوئی تھی جس میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ کافی دراز قامت تھا۔ اس نے بلند آواز میں سلام کیا۔ مجھ سے پہلے چندن ہری نے اس کا جواب دیا تھا۔

''آیئے چندن ہری جی! ماشاءاللہ آپ کی صحت حسبِ معمول ہے۔''

''تم جیسے متروں کی دعائیں ہوں تو صحت تو اچھی ہی ہوگی۔''

''آیئے بیٹھئے آپ بھی بھائی! کیا نام ہے آپ کا؟''

''کامران!'' میں نے جواب دیا۔

''بیٹھئے۔ یہ چندن ہری جی جو ہیں ہمیشہ مجھے اپنا احسان مند کر دیتے ہیں، میرے مہمان کو انہوں نے کتنے پیار سے رکھا ہے۔''

''منہ دھو رکھو مہاشے! میں یہ ڈاکا زنی نہیں ہونے دوں گا، جب تک میرا دل نہیں بھرے گا، میں انہیں اپنا مہمان رکھوں گا۔'' چندن ہری نے کہا۔

''دل پر الزام نہ رکھو، یہ کبھی نہیں بھرتا، کیوں کامران! تم سے بہتر دل کے بارے میں اور کون جانتا ہے، لہو کے اس قطرے پر کتنے الزام عائد ہیں۔'' بابا صاحب نے کہا۔

ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس سفید پردے کے پیچھے کوئی بڑی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ ملازم کا یہ کہنا کہ بابا صاحب بیٹھک میں انتظار کر رہے ہیں جبکہ چندن ہری جی نے انہیں اپنی آمد کی کوئی خبر نہیں کی تھی اور اب انہوں نے ایک پراسرار جملہ کہا تھا کہ کامران تم سے بہتر دل کے بارے میں اور کون جانتا ہے۔

وہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے ایک اور احساس ہوا، بابا پردہ پوش کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی لیکن کوشش کے باوجود یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ آواز میں نے کہاں سنی ہے۔ پھر اچانک بابا صاحب نے کہا۔ ''بھئی افلاک! مہمانوں کی مدارات نہیں کرو گے؟''

دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ پتا نہیں بابا صاحب نے کسے مخاطب کیا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اندرونی کمرے میں گئے اور ایک بڑی ٹرالی دھکیلتے اندر آگئے۔ ٹرالی پر تازہ پکی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

چندن ہری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''گھر میں کوئی مجھے ذرا بھی بدپرہیزی نہیں کرنے دیتا، جب یہ چیزیں کھانے کو دل چاہتا ہے، یہاں چلا آتا ہوں اور گھر جا کر کبھی نہیں بتاتا کہ کیا کھا کر آیا ہوں۔''

''تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچا؟''

''کبھی نہیں!'' چندن ہری نے جواب دیا۔

''تو پھر حملہ کرو۔'' بابا نے کہا اور چندن ہری سامنے رکھی ہوئی چیزوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

خاصی دیر تک بیٹھنے کے بعد چندن ہری نے واپسی کی اجازت مانگی۔ اس دوران میں خاص طور سے ایک بات کے بارے میں سوچتا رہا تھا وہ یہ کہ پہلے چندن ہری یا سکھ راج وغیرہ نے میرے بارے میں کوئی چھان بین نہیں کی تھی اور اب اتنی دیر گزرنے کے باوجود بابا صاحب نے بھی میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ یہ ذرا غیر فطری بات تھی۔

''چلیں کامران جی!''

''انہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ، کچھ کام ہے۔'' بابا صاحب نے کہا۔

''تم واقعی سنجیدہ ہو؟'' چندن ہری نے کسی قدر حیرت سے کہا۔

''ہاں! اگر یہاں ان کا دل نہ لگا تو میں تمہیں خبر کردوں گا۔''

''کیوں کامران.....؟'' چندن ہری نے کہا۔

''بابا صاحب کا اگر حکم ہے تو ٹھیک ہے۔''

''اصل میں تم مہمان ہمارے ہی ہو لیکن چندن ہری تمہیں لائے ہیں، خیر کوئی بات نہیں۔''

چندن ہری رخصت ہوگیا تو بابا صاحب نے کہا۔ ''یہ ضروری تھا، اس گھر کو تمہاری پناہ گاہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا اور اُسے نقصان پہنچایا جاتا۔''

ان الفاظ نے ایک بار پھر میرا دل ہلا دیا تھا لیکن اب میں خاموش نہیں رہ سکا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے حیرت نہیں ہوئی بابا صاحب! مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔''

''قابل احترام ہو، اپنے ایمان کی حفاظت کر رہے ہو اور بہتوں کو مصیبت سے بچانے کے لیے کوشاں ہو، وہاں محفوظ نہیں تھے اس لیے ہم نے تمہیں یہاں رکنے کی درخواست کی ہے، چندن ہری اور سکھ رام وغیرہ بڑے معصوم ہیں، انہیں کوئی نقصان پہنچتا تو بڑے دکھ کی بات تھی، یہاں پریشان نہ ہونا، بعد میں بہت سی باتیں کریں گے۔''

''جی.....! میں غیر اختیاری طور پر یہاں پہنچا ہوں، اسی طرح بالکل اتفاقیہ طور پر آپ کی قدم بوسی حاصل ہوئی ہے، حیران اس لیے نہیں ہوں کہ اس سے قبل بھی مجھے احمد علی صاحب مرحوم اور امام علی صاحب کی سرپرستی حاصل رہی ہے بلکہ اس وقت حالات اتنے خراب نہیں تھے جبکہ اس وقت میں بری طرح گھرا ہوا ہوں، اپنے وطن بھی واپس نہیں جاسکتا، تمام اپنوں کو چھوڑے بیٹھا ہوں، سب سے دور ہوگیا ہوں۔''

''یہ ناپاک روحیں آسانی سے فنا نہیں ہوتیں، بظاہر یہ مر بھی جاتی ہیں لیکن ان کا کالا علم جاگتا رہتا ہے اور انہیں شیطانی مہلت مل جاتی ہے جس میں یہ اپنے عمل جاری رکھتی ہیں، تمہیں کچھ عمل بتائے جائیں گے، درس میں بیٹھنا، بہت کچھ سیکھو گے، بہت کچھ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا، دیکھو دنیا بہت مختصر ہے، وہ گلوب دیکھو..... دیکھو!'' یہ کہہ کر بابا صاحب اپنی جگہ سے اٹھے۔ ایک طرف گلوب رکھا ہوا تھا، اسے اٹھا کر لائے اور بے تکلفی سے میرے پاس بیٹھ گئے۔

''دیکھو..... بس اتنی سی ہے یہ دنیا! کون تم سے دور ہے، تمہارے اہل خاندان کہاں دور ہیں، یہ دیکھو یہ پاکستان ہے اور اس میں یہ تمہارا شہر کراچی ہے، کونسی جگہ دور ہے، دو قدم اٹھا کر جہاں دل چاہے چلے جاؤ لیکن جلد بازی نہیں، دشمن پر نگاہ رکھو، پہلے اسے اس کے ناپاک ارادوں میں پست کرو، اسے شکست کا احساس دلاؤ، اس کے لیے کام کرنا پڑے گا۔''

''مجھے رہنمائی درکار ہوگی۔'' میں نے کہا۔

بابا صاحب خاموش رہے۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''قیام کا بندوبست کردوں.....؟ چندن ہری سکھ رام بلکہ وہ پورا خاندان بہت نیک ہے، ان کی بہتری ہے کہ ان سے فاصلہ رکھو، کھسیانی بلی کھمبا نوچے، کیا سمجھے؟''

''لیکن میں ایک بات سے پریشان ہوں، آپ لوگ کونسی دنیا کے باسی ہیں، کیوں ایک اجنبی کے لیے یہ سب کر رہے ہیں، وہ غیر مذہب کے لوگ انہوں نے میرے لیے بریلی سے باورچی بلایا، میں انہیں بس جنگل میں مل گیا تھا اور آپ.....! میرا انتظار کر رہے تھے؟''

بابا پردہ پوش نے کچھ لمحے توقف کیا پھر بولے۔ ''ابھی بینائی کم ہے، آنکھوں کی بھی اور عقل کی بھی! تیز ہوجائے گی تو سب سمجھ میں آجائے گا، کہا تھا تم سے، احمد علی نے بتایا تھا اس دنیا سے کچھ اوپر دنیاوی حکومت کے علاوہ ایک روحانی حکومت بھی ہوتی ہے جہاں تمام عہدیدار ہوتے ہیں، ان کے مرتبے بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کام کرتے ہیں، یہ شیطنت کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں..... ان کے مشن کے لیے جو بھی کام کرتا ہے، وہ اس کے گرد ہوتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ بے لوث سچائیاں فطرت میں ہوں، تمہیں شہر لانا تھا، میرے پاس آنا تھا، ذریعہ وہ لوگ بنے، انہیں بننا تھا۔ میں کیا، چندن ہری کیا.....!''

میرے پورے بدن میں تھرتھری دوڑ رہی تھی۔ ایک ایک لفظ روح میں اتر رہا تھا۔ ایک عجیب سا اعتماد، ایک بھرپور حوصلہ..... ! میں تنہا کہاں ہوں، ہر بری جگہ سے بچایا گیا ہوں۔ غور کرتا تو اب احساس ہو رہا تھا کہ کونسی جگہ تھی جہاں مجھے بے بس رہنا پڑا، ہر جگہ میری حفاظت کی گئی، کہیں بھی مجھے مایوس نہیں کیا گیا۔

''شیطان کو دھوکا دینا آسان نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی وہ اپنی مکاریوں کے جال میں خود پھنس جاتا ہے، تمہیں ایک قوت دی گئی کہ تم مریضوں کے اندر جھانک کر ان کی بیماریاں تلاش کرلو، یہ قوت شیطانی لالچ نے دی تھی لیکن اصل کام ان لوگوں کو صحت دینا تھا جن کی صحت ان کی تقدیر تھی، تم ذریعہ بنے اور اس قوت کو تمہاری آنکھوں میں منجمد کردیا گیا، اب اسے شیطانی عمل تم سے نہیں چھین سکتا کیونکہ تم ان کی دعاؤں میں چھپ گئے جنہیں تمہارے ذریعے صحت ملی اور وہ قوت تمہاری ملکیت بن گئی۔''

میں نے گردن جھکا لی۔ اچانک بابا صاحب نے کسی کو آواز دی۔ ''افلاک! ایک کمرہ ضرورت کی چیزوں سے آراستہ کردو۔''

یہ نام دوسری بار سنا تھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا تھا البتہ تھوڑی دیر کے بعد وہی شخص آیا جس نے گیٹ پر استقبال کیا تھا۔ اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''آیئے جناب!''

''جاؤ آرام کرو، میں خود تمہیں بلالوں گا۔''

میں اس شخص کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکل آیا۔ ایک راہداری میں چلتے ہوئے میں نے اس شخص سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

''اشرف احمد!'' اس نے جواب دیا اور میں خاموش ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ افلاک نہیں ہے۔ جو کمرہ مجھے رہائش کے لیے دیا گیا تھا، وہ بالکل سادہ لیکن ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھا۔ مجھے یہاں آکر بے حد سکون محسوس ہوا تھا۔ کوئی ولی یا درویش نہیں تھا کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی فکر ہی نہ ہوتی، بڑی مشکلوں سے گزر رہا تھا۔ دیار غیر میں تھا، میرے بھائی بھی یہاں آئے تھے اور میری گلو خلاصی سے مایوس ہو کر واپس گئے تھے۔ گھر والے صبر کے سوا اور کیا کرسکتے تھے۔ ممکن ہے حکومت پاکستان میرے سلسلے میں کچھ کر رہی ہو، ظاہر ہے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا لیکن اب جب بابا پردہ پوش نے مجھے کچھ باتیں بتائی تھیں تو میرے دل کی کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ مجھے اس پناہ کا علم ہوا تھا جس پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا اور اب دل کو بڑی ڈھارس ہوگئی تھی۔

دو دن تک بابا پردہ پوش سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن مجھے ذرہ برابر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ تیسرے دن بابا صاحب خود میرے کمرے میں آگئے۔ چہرہ بدستور پوشیدہ تھا۔

''ٹھیک ہو کامران.....؟''

''جی! اللہ کا شکر ہے۔''

''کچھ لوگ آنے والے ہیں، ان کے ساتھ بریلی جانا ہے، ایک نوجوان کسی مشکل میں ہے، ذرا جا کر دیکھو اسے کیا بیماری ہے، اگر اس کے علاج کے لیے رکنا پڑے تو رک جانا، بھروسے کی جگہ ہے، تیار ہوجاؤ، کچھ کپڑے بھی ساتھ رکھ لینا۔''

''بہت بہتر!'' میں نے بڑے سکون سے کہا۔

''میں چلتا ہوں، واپس آؤ گے تو نشست ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

میں ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگا۔ پھر میں نے اس الماری کا جائزہ لیا جس کے بارے میں اشرف نے بتایا تھا کہ اس میں میرے کپڑے اور جوتے وغیرہ ہیں۔ الماری میں شاندار سوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اب تک میں نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا اور انہی کپڑوں میں گزارا کر رہا تھا۔ جس ماحول میں تھا، اس میں یہ سب کچھ دیکھ کر تھوڑا سا الجھ گیا کہ کیا حلیہ اختیار کروں لیکن چند ہی منٹ کے بعد اشرف شیونگ سیٹ لے کر آگیا۔ اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ کیا حلیہ اختیار کرنا ہے، چنانچہ بہت عرصے کے بعد اسی حلیے میں آگیا جس میں رہا کرتا تھا اور میری بھابیاں میری نظر اتارتی تھیں۔

پھر ایک خوبصورت کار مجھے لینے آگئی۔ اس کی اطلاع بھی اشرف نے دی تھی۔ جب میں باہر نکلا تو اشرف نے ہی مجھے ایک میڈیکل بکس تھما دیا اور بولا۔ ''بابا صاحب نے کہا ہے اس میں آپ کی ضرورت کی ساری چیزیں موجود ہیں۔''

سبحان اللہ.....! میں نے دل میں سوچا۔ دو افراد مجھے دیکھ کر کار سے نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک ڈرائیور تھا، دوسرا ایک خوش پوش کوئی پینتیس سالہ شخص تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا کر بولا۔ ''میرا نام افتخار احمد ہے، نظام علی صاحب کا داماد اور ان کی فرم کا منیجر ہوں، آپ کا اسم شریف.....؟''

''کامران مسعود!'' میں نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔

''بڑی خوشی ہوئی، آیئے۔'' وہ بولا۔

ڈرائیور پہلے سے پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ میں اندر بیٹھ گیا اور میرے بعد افتخار اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔

افتخار نے کہا۔ ''مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ تو بالکل نوعمر ہیں جبکہ ہمارا خیال تھا کہ آپ کوئی ستر سالہ، تجربہ کار سنیاسی باوا ہوں گے۔''

''آپ کا یہ خیال کیوں تھا؟'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ انکل نظام علی نے کہا تھا کہ جہاں میں تمہیں بھیج رہا ہوں، وہ بڑی قابل احترام جگہ ہے اور وہاں سے، جس شخصیت کو تمہیں لانا ہے، اس کو بڑا احترام دینا ہے کیونکہ وہ بہت اعلیٰ پائے کے ڈاکٹر ہیں، ویسے مجھے علم ہے کہ یہ الفاظ خود انکل نظام علی کے بھی نہیں تھے۔''

''پھر.....؟'' میں نے سوال کیا۔

''دادا ابو، سو فیصد دادا ابو..... معاف کیجیے گا نظام علی کے والد سید علی کے، وہ آج تک پیری مریدی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اور انکل نظام علی..... توبہ توبہ توبہ!''

''یہ توبہ توبہ کیوں.....؟'' مجھے افتخار احمد کی باتیں مزہ دے رہی تھیں۔

''بڑے خفیہ راز کھول رہا ہوں ڈاکٹر کامران! مروّت دینا، بڑے کھٹکھنے لوگوں کے درمیان بسر کر رہا ہوں۔''

''ارے نہیں!'' میں ہنس پڑا۔ ''وعدہ! آپ کی ہر بات دل میں رکھوں گا۔''

''اعتبار کیسے لیتا ہوں، اللہ مالک ہے، اصل میں میں خود پیٹ کا بڑا ہلکا ہوں۔'' افتخار احمد نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''جی.....!'' میں نے کہا۔

''توبہ توبہ والی بات ہو رہی تھی تو میں بتا رہا تھا کہ نئی نسل نے بس چنگیز خان کی باتیں ہی سنی ہوں گی لیکن اگر کوئی اس دور میں چنگیز خان کو دیکھنا چاہے تو انکل نظام علی کو دیکھ لے، چنگیز خان سے زیادہ ظالم، سنگدل، بے رحم! آپ دیکھئے داماد ہوں لیکن پچھلے پانچ سال سے تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، بیٹی پر پھوٹی کوڑی خرچ نہیں کرتے جبکہ میری تنخواہ کا آدھا حصہ بیگم کے بیوٹی پارلر میں ہی خرچ ہوجاتا ہے، تو بات توبہ توبہ والی ہو رہی تھی..... وہ جو کہتے ہیں کہ ہر فرعون کے لیے موسیٰ کا وجود ہے تو ان کے لیے دادا ابو موجود ہیں۔''

''بہت سخت مزاج ہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا ہے میں نے توبہ توبہ کیوں کہا تھا؟''

''نہیں مجھے نہیں پتا!''

''ایک دن ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا کہ دادا ابو یعنی سید علی صاحب ہاتھ میں چپل لیے اور نظام علی کا گریبان پکڑے انہیں ان کا بچپن یاد دلا رہے ہیں، وہ تو شکر ہے کہ اس دور میں بھی دادا ابو کے انسٹرومنٹس قدیم ہیں ورنہ بات بڑی خراب ہوجاتی۔''

''انسٹرومنٹس؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! دو پٹی والی اسفنج کی چپل استعمال کرتے ہیں جس کی آواز تسلی بخش ہوتی ہے اور چوٹ ہلکی!'' افتخار احمد نے کہا۔

اور میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ پھر میں نے کہا۔ ''میری نگاہوں میں تو نظام علی صاحب کا مقام بہت بلند ہوگیا ہے، اس قدر سعادت مندی اس دور میں کہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔''

''گالیاں منافع ہیں، دادا ابو کی گالیاں اگر کتابی شکل میں چھپ سکتیں تو گالیوں کے ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوتیں کیونکہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں، اس لیے نئی نئی گالیاں تخلیق کرتے رہتے ہیں اور چونکہ اکلوتے بیٹے کے باپ ہیں، اس لیے وہ سب نظام علی صاحب کا ورثہ ہوتی ہیں۔''

''کمال کے آدمی ہیں آپ افتخار صاحب!'' میں نے کہا۔ ''اتنا تو میں اپنے گھر میں بھی نہیں ہنسا تھا۔''

''جی نہیں! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ میں ایک باکمال ترین گھرانے کا گھر داماد ہوں اور اس کی عکاسی کر رہا ہوں، بڑے عظیم تجربات ہیں زندگی کے، ساس صاحبہ یعنی عظیمہ عالیہ بیگم۔ نظام علی صاحب کے لیے دوسرا غم، یعنی ایک سرکش گھوڑے کی ٹرینر جو اپنی ٹریننگ پر ناز کرسکتی ہیں اور اس جینئس خاندان کی مشترکہ تخلیق یعنی ہماری بیگم دل افروز جنہیں ہم شمع فروزاں کہتے ہیں، پتا نہیں کیوں.....! اچھا باقی آئندہ کیونکہ گھر آگیا ہے جسے ہم تنہائی میں عقوبت خانہ کہتے ہیں۔''

بے حد خوبصورت کوٹھی میں میرا استقبال انہی تین روایتی کرداروں نے کیا تھا یعنی نظام علی، عالیہ بیگم اور دل افروز نے! دادا ابو البتہ موجود نہیں تھے۔ نظام علی نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور نخوت سے بولے۔ ''آپ ہیں ڈاکٹر کامران.....؟''

''جی! مجھے کامران کہتے ہیں۔''

''بابا صاحب کا فون آیا تھا ابا میاں کے پاس کہ آپ آرہے ہیں، آفس سے گھر پہنچ جاؤں۔''

''شکریہ!'' میں نے یہ کہہ کر دونوں خواتین کو بھی سلام کیا جن کے چہرے بگڑے ہوئے تھے۔

دل افروز نے کہا۔ ''یہ ہیں وہ عظیم ہستی جن کے چرچے آسمان تک پہنچے ہوئے تھے، شکل و صورت کے تو اچھے ہیں مگر ڈاکٹر کہیں سے بھی نہیں لگتے بلکہ دل چاہتا ہے کہ منہ کھلوا کر دیکھا جائے کہ دودھ کے دانت ٹوٹے ہوئے ہیں یا نہیں!''

''ہاؤس جاب مکمل کرچکے ہو صاحبزادے.....؟'' اس بار بیگم صاحبہ نے گل افشانی کی۔

''ہاؤس جاب تو زندگی کی آخری سانس تک مکمل نہیں ہوتا محترم خاتون! بشرطیکہ ہاؤس کو ہاؤس کا مقام دیا جائے۔'' میں نے کہا۔

''توبہ توبہ..... توبہ!'' افتخار احمد کی آواز سنائی دی اور میں نے بمشکل ہنسی روکی۔

''تشریف لایئے، مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کا قیام بھی یہیں ہوگا۔'' نظام علی نے کہا۔

''جی! اگر ضرورت پیش آئی۔'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ دور سے ایک بزرگ آتے نظر آئے۔ اچھی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ سید علی تھے۔ میں نے پہلے سے موجود لوگوں کے انداز میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔

''تم آئے ہو پردہ پوش کے پاس سے.....؟'' انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

''جی.....!''

''آؤ تمہارا کمرہ میرے کمرے کے برابر ہے۔'' انہوں نے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔

اسی وقت پیچھے سے افتخار احمد کی آواز سنائی دی۔ ''میں آپ کا بیگ لے کر آتا ہوں ڈاکٹر صاحب!''

میں دادا ابو کے ساتھ خوبصورت راستے طے کر کے اندرونی جگہ میں داخل ہوگیا۔ سید علی کمروں کی ایک قطار کے پاس رکے اور پھر ایک کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اندر داخل ہوگئے۔ بہت شاندار اور آراستہ کمرہ تھا۔

سید علی نے کہا۔ ''اپنی دانست میں، میں نے اسے بالکل ٹھیک کرا دیا ہے، پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف مت کرنا۔''

''بہتر!'' میں نے کہا اور دادا ابو باہر نکل گئے۔ میں نے ایک نگاہ کمرے پر ڈالی۔ سب کچھ موجود تھا اور بڑے دلچسپ لوگ تھے۔ ابھی میں نے اس مریض کو نہیں دیکھا تھا جس کا میں نے علاج کرنا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے تفصیل بھی نہیں معلوم تھی۔ بابا صاحب نے بس یہ کہا تھا کہ ایک نوجوان کسی مشکل کا شکار ہے، اسے دیکھو، اسے کیا بیماری ہے، اس کا علاج کرو۔

خیر اس نوجوان کے بارے میں افتخار احمد سے کچھ معلوم ہوسکتا تھا۔ یہ افتخار احمد بھی بڑا دلچسپ شخص تھا۔ میں اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا لیکن افتخار کو آنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ میں خاموشی سے وقت گزارنے لگا پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور افتخار نے اندر جھانکا۔ ''حاضر ہوسکتا ہوں؟''

''تشریف لایئے۔'' میں نے کہا اور افتخار میرا بیگ لیے اندر داخل ہوگیا۔

''تھوڑی سی دیر ہوگئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، اصل میں بیگم صاحبہ ہدایت نامہ زوجیت عطا فرما رہی تھیں، ان کی نصیحتیں طویل ہوتی ہیں، انہی کی وجہ سے وقت لگا۔''

''خوب.....!''

''یہ ہدایتیں آپ کے متعلق تھیں، فرما رہی تھیں محتاط رویہ اختیار کروں اور اپنا علاج نہ شروع کرا دوں، دادا جان تو بے چارے معصوم آدمی ہیں، ہر کسی پر بھروسہ کرلیتے ہیں، اس چھوٹے سے بچے کا بھلا کیا تجربہ ہوگا جبکہ ڈاکٹر ستیارام، اشتیاق علی کی زندگی صرف چھ ماہ رہنے کا دعویٰ کرچکے ہیں۔''

''اشتیاق.....؟'' میں نے سوالیہ انداز میں افتخار احمد کو دیکھا۔

''جی..... جی! اسی کے علاج کے لیے آپ کو بلایا گیا ہے، اس کی اصل بیماری کی وجہ میں جانتا ہوں۔''

''وہ کیا.....؟''

''غلط گھر میں پیدا ہوگیا ہے بس! ان لوگوں میں کبھی ایڈجسٹ نہیں ہو پایا..... باپ، ماں اور بہن سے بہت مختلف مزاج کا حامل ہے، آپ یقین کریں ڈاکٹر کامران! بالکل انسان انسان جیسا لگتا ہے۔'' افتخار نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''آپ بہت دلچسپ انسان ہیں افتخار صاحب!'' میں نے کہا۔

''اپنی جگہ غلط نہیں ہوں، آپ خود بتا دیں میں نے جن لوگوں کے بارے میں آپ کو بتایا غلط ہے، اپنے بارے میں آپ کو بتاؤں، بریلی کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتا ہوں جو ہمیشہ غریب رہا بس روٹی، کپڑے تک محدود..... ! والد صاحب نے بیٹے کو تعلیم دلائی، نوکری نہیں دلا سکے اور ان تمام خوابوں سے مایوس ہو کر قبر میں جا سوئے، والدہ اور دو چھوٹی بہنیں ہیں جن کی ضرورتیں پوری کرنا میرا فرض تھا، بہت سوچا، بہت غور کیا پھر اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھا جس میں ایک لاڈلی بیٹی کے لیے ایک گدھے نما شوہر کی ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا۔ لڑکی بے حد امیر گھرانے کی بتائی گئی تھی۔ قسمت آزمائی کی اور کامیاب ہوگیا، تمام شرائط پوری کردی ہیں۔ ماں اور بہنوں سے ہفتے میں ایک بار ملنے کی اجازت ہے، شوہر کے علاوہ فرم کے منیجر کی نوکری بھی کرنی ہوتی ہے، تنخواہ کے ایک ایک پیسے کا حساب لیا جاتا ہے کیونکہ اس میں بیوی کے تمام اخراجات اٹھانے کی شرط بھی ہے، بس تھوڑا سا وظیفہ ماں اور بہنوں کے لیے ہے لیکن ہم بھی بے وقوف نہیں ہیں، تھوڑی سی کھانچے بازی کرلیتے ہیں اور ماں، بہنیں آرام سے ہیں۔''

مجھے اس خوش مزاج شخص کی اس کہانی پر افسوس ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کرلیا افتخار.....؟''

''کچھ تھوڑی سی انسان شناسی! یوں لگا جیسے تم ایک ہمدرد اور قابل اعتماد انسان ہو اور پھر اپنی ایک کمزوری کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ پیٹ کا ہلکا ہوں، اب دل اتنا ہلکا ہوگیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔''

میں مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے کہا۔ ''چلیں اب اشتیاق کی بیماری کے بارے میں بھی بتا دیں۔''

''اس بارے میں نہیں جانتا، اس کی عمر چھبیس سال ہے، نہایت خوبصورت جوان ہے، ایک بی بی سے محبت کرتا ہے لیکن جانتا ہے کہ یہ قاتل لوگ نہیں مانیں گے۔''

''اوہ تو کیا یہ بیماری.....؟''

''نہیں! وہ مکار نہیں ہے، اسے دورے پڑتے ہیں اور اس کی حالت خراب ہوجاتی ہے، یہ ممکن ہے کہ محبت میں ناکامی کے احساس نے اعصابی نظام متاثر کیا ہو۔ سرخ سفید تھا لیکن اب کافی کمزور ہوگیا ہے اس کے علاوہ بدن پر کبھی کبھی عجیب سے نشانات نظر آتے ہیں۔''

''ان لوگوں کو اس کی محبت کے بارے میں معلوم ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ بہت بہادر لڑکی ہے، آرام سے یہاں اشتیاق سے ملنے آجاتی ہے۔''

''اوہ! ان لوگوں کا کیا رویہ ہوتا ہے؟''

''شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں، ویسے یہ لوگ کسی سے بھی محبت نہیں کرتے۔''

''دادا جان نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی؟ پوتے کے لیے انہوں نے اپنی طاقت استعمال نہیں کی؟''

''نہیں کرسکتے!''

''کیوں.....؟''

''اس لیے کہ وہ لڑکی ہندو ہے۔''

''اوہ!'' میں حیران رہ گیا۔ کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''یہ تو واقعی مشکل مسئلہ ہے، کیا اشتیاق اس سے شادی کے بارے میں کہتا ہے؟''

''وہ کچھ نہیں کہتا لیکن جب لڑکی اس سے ملنے آتی ہے تو وہ کسی کو اپنے درمیان برداشت نہیں کرتا اور اگر لڑکی کو اس سے ملنے سے روکا جائے تو اس پر دیوانگی طاری ہوجاتی ہے۔''

''لڑکی کا نام کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔ لیکن اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی اور افتخار ایک دم سنبھل گیا۔ دروازے سے دادا جان اندر داخل ہوئے تھے۔ افتخار جانے لگا تو دادا جان نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''رکو افتخار! کوئی کام ہے؟''

''نہیں دادا ابو حکم.....؟''

''ڈاکٹر کامران کو اشتیاق کے کمرے میں لے چلیں، ڈاکٹر! آپ اسے ابھی دیکھنا پسند کریں گے یا.....؟''

''نہیں جناب! میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''چلیں افتخار!''

''جی دادا ابو.....!'' افتخار نے کہا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا تو افتخار نے جلدی سے میرا میڈیکل بیگ اٹھا لیا، پھر ہم باہر نکل آئے۔

اشتیاق کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے اشتیاق کو دیکھا۔ واقعی حسین نوجوان تھا۔ چہرے کے نقوش تھوڑے سے دل افروز سے ملتے تھے۔ رنگ خوب گورا تھا لیکن اس وقت مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کے سرہانے ایک بے حد خوبصورت بلی بیٹھی ہوئی تھی۔ جونہی ہم اشتیاق کی مسہری کی طرف بڑھے، بلی اچھل کر بھاگی، ایک کارنس پر چڑھی اور پھر اس کے اوپر روشندان پر چھلانگ لگا دی، پھر وہ روشندان سے باہر نکل گئی۔

''گھر کا کوئی فرد اس بلی کو نہیں پکڑ سکتا، میں کہتا ہوں اسے پکڑ کر اتنی دور چھوڑ کر آؤ کہ یہ دوبارہ یہاں نہ پہنچ سکے، اگر بلیوں کو مارنے کی ممانعت نہ ہوتی تو میں اسے گولیوں سے چھلنی کردیتا، جب دیکھو اس کے پاس گھسی رہتی ہے۔'' دادا جان غصے سے بولے۔

ہماری آوازیں سن کر اشتیاق جاگ گیا۔ اس نے حیران نظروں سے ہمیں دیکھا، پھر سہارا لے کر اٹھ گیا۔

''خیریت! کیا بات ہے، یہ کون صاحب ہیں؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر ہیں بیٹے! تمہیں دیکھنے آئے ہیں۔'' سید علی بولے۔

''دیکھئے جناب! آپ بھی دیکھ لیجیے، ویسے تو میرے لیے چھ ماہ کی زندگی مقرر کردی گئی ہے، اصولی طور پر تو مجھے چھ ماہ سکون سے جینے دیا جائے، پتا نہیں اب یہ اور ڈاکٹروں کو تکلیف کیوں دی جارہی ہے، دیکھ لیجیے آپ بھی!''

''آپ لوگ ہمیں کچھ دیر کے لیے تنہائی دیں گے؟'' میں نے کہا۔

''ضروری ہے؟'' سید علی نے پوچھا۔

''جی..... ! بہت ضروری۔''

''ٹھیک ہے، آؤ افتخار!'' دادا ابو نے کہا اور دونوں باہر نکل گئے۔

اچانک میری نظر بالکل اتفاقیہ روشندان کی طرف اٹھ گئی۔ خوبصورت بلی روشندان میں بیٹھی، چمکدار آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

(جاری ہے)

جادو

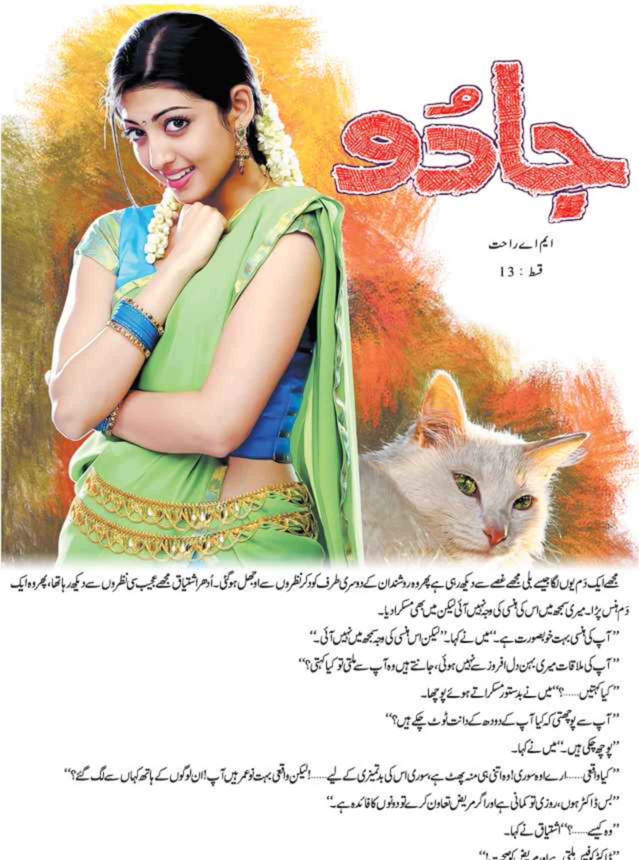

ایم اے راحت

قسط : 13

مجھے ایک دم یوں لگا جیسے بلی مجھے غصے سے دیکھ رہی ہے پھر وہ روشندان کے دوسری طرف کود کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اُدھر اشتیاق مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ ایک دم ہنس پڑا۔ میری سمجھ میں اس کی ہنسی کی وجہ نہیں آئی لیکن میں بھی مسکرا دیا۔

’’آپ کی ہنسی بہت خوبصورت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن اس ہنسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔‘‘

’’آپ کی ملاقات میری بہن دل افروز سے نہیں ہوئی، جانتے ہیں وہ آپ سے ملتی تو کیا کہتی؟‘‘

’’کیا کہتیں......؟‘‘ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

’’آپ سے پوچھتی کہ کیا آپ کے دودھ کے دانت ٹوٹ چکے ہیں؟‘‘

’’پوچھ چکی ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا واقعی...... ارے اوہ سوری! وہ اتنی ہی منہ پھٹ ہے، سوری اس کی بدتمیزی کے لیے...... ! لیکن واقعی بہت نوعمر ہیں آپ! ان لوگوں کے ہاتھ کہاں سے لگ گئے؟‘‘

’’بس ڈاکٹر ہوں، روزی تو کمانی ہے اور اگر مریض تعاون کرے تو دونوں کا فائدہ ہے۔‘‘

’’وہ کیسے......؟‘‘ اشتیاق نے کہا۔

’’ڈاکٹر کو فیس ملتی ہے اور مریض کو صحت!‘‘

’’گڈ! کیا نام ہے؟‘‘

’’کامران مسعود!‘‘

’’خدا آپ کو ہمیشہ کامران کرے، مجھے بہت اچھے لگے ہیں، ویسے آپ کو ایک بات بتاؤں؟‘‘

’’جی......!‘‘

’’ڈاکٹر سیتارام بریلی کے سب سے بڑے ڈاکٹر ہیں اور ہیں بھی بہت قابل! لیکن میرے مسئلے میں وہ دھوکا کھا گئے ہیں، میں دعوے سے کہتا ہوں مجھے کینسر نہیں ہے جبکہ انہوں نے مجھے چھ مہینے کی زندگی کا نوٹس دے دیا ہے۔‘‘

’’وہ ڈاکٹر سیتارام ہیں، اگر آپ کو کینسر بھی ہے تو میں اسے نکال کر پھینک دوں گا اور آپ زندہ رہیں گے کیونکہ میں کامران ہوں۔‘‘

میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت یہ الفاظ کہے تھے لیکن یہ اشتیاق پر بہت اثر انداز ہوئے۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ’’بیٹھیے پلیز! ان جملوں کے بعد آپ مجھے بہت اپنے اپنے سے لگے ہیں، بیٹھیے پلیز!‘‘ میں بیٹھ گیا تو وہ بولا۔ ’’آپ کو جلدی تو نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں! مجھے سید علی صاحب نے بلایا ہے، ان کا حکم ہے کہ مجھے اس وقت تک یہاں رہنا ہے جب تک آپ صحت یاب نہ ہوجائیں۔‘‘

’’ویری گڈ! ویسے آپ یقین کریں میں ٹھیک ہوجاؤں گا، مجھے کوئی کینسر ویسنر نہیں ہے بس کچھ عجیب سی طبیعت ہوگئی ہے، وزن گر رہا ہے اور بدن شدید بوجھل رہتا ہے، کمزوری بے حد ہوگئی ہے، اس کی وجہ کچھ بھی ہوسکتی ہے لیکن کینسر نہیں۔‘‘

’’ان شاء اللہ! آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔‘‘

’’اب دیکھئے نا یہ الفاظ ڈاکٹر سیتارام نہیں کہہ سکتے۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔ ’’یہ الفاظ ایک موثر دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو ہر طرح کے کینسر کو ختم کرسکتے ہیں۔‘‘

’’آپ کا معائنہ کرلوں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں ضرور!‘‘ وہ خوشدلی سے بولا۔ میں نے اسے سیدھا لیٹنے کے لیے کہا۔ بہت دن کے بعد میں نے اپنی اس قوت کا جائزہ لیا جو بھوریا چرن نے دی تھی لیکن بابا پردہ پوش نے بتایا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں منجمد ہوگئی ہے اور اب اس کی تصدیق ہوگئی۔ اشتیاق کا بدن اندر سے نظر آنے لگا۔ میں نے ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا۔ بیشک یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ اسے بیماری کیا ہے لیکن یہ پتا چل گیا کہ کینسر نہیں ہے۔ کافی دیر تک اسے دیکھتا رہا، پھر میں نے اپنا کام ختم کرتے ہوئے کہا۔ ’’اشتیاق! تمہیں واقعی کینسر نہیں ہے۔‘‘

’’ویری گڈ! تم سے ایک بات کہوں، تم مجھے تندرست کردو گے، مجھے یقین ہے۔‘‘

’’ہاں ان شاء اللہ!‘‘ میں نے کہا۔ ایک بار پھر میری نظریں اس روشندان کی طرف اٹھ گئیں۔ خوبصورت بلی دوبارہ وہاں آگئی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پر رحم آگیا شاید وہ اشتیاق سے بہت محبت کرتی تھی جبکہ سید علی اس کے بہت مخالف تھے۔ میں نے بلی کی طرف رخ کرکے اسے پچکارا۔ وہ ایک دم روشندان میں کھڑی ہوگئی جیسے میرے پچکارنے پر اس کی ہمت بڑھی ہو۔ میرے اس عمل سے اشتیاق نے بھی بلی کی طرف دیکھا اور بلی نے روشندان سے نیچے چھلانگ لگادی، دوسری چھلانگ اس نے اشتیاق کے بستر پر لگائی اور اس کے پیروں کے پاس پہنچ گئی اور اس نے اشتیاق کے پاؤں چاٹنے شروع کردیے۔

’’یہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں! اب محبت جانوروں میں ہی رہ گئی ہے۔‘‘ اشتیاق نے کہا۔ اسی وقت اچانک میری نگاہ بلی کے پیروں پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ اس کے پنجے پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے، آگے کا حصہ سپاٹ تھا اور پاؤں پیچھے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اشتیاق سے اس بارے میں کچھ کہتا، اچانک دروازہ کھلا اور سید علی اندر داخل ہوئے۔

’’جی ڈاکٹر کامران! آپ نے میرے بیٹے کا معائنہ کیا؟‘‘

’’جی سید صاحب! یہ ٹھیک ہوجائیں گے۔‘‘ میں نے کہا اور سید علی صاحب کی کیفیت عجیب ہوگئی، یوں لگا جیسے ان کی آواز رندھ گئی ہو اور حلق سے نکل نہ پا رہی ہو۔ دادا جان کے اندر داخل ہوتے ہی بلی نیچے کود کر مسہری کے نیچے گھس گئی تھی۔

’’نہیں ساتھ لے جاؤں اشتیاق......؟‘‘ دادا جان نے بمشکل کہا۔

’’جی دادا ابو! ضرور۔‘‘ اشتیاق نے کہا اور میں بادل نخواستہ اٹھ گیا۔ دادا ابو میرے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔ وہ میرے الفاظ پر جذباتی ہوگئے تھے پھر وہ مجھے لے کر کمرے میں داخل ہوگئے اور بولے۔ ’’بیٹھو بیٹے! میں تم سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جی......!‘‘ میں بیٹھ گیا۔

دادا جان سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔ ’’بڑھاپا بڑے انوکھے تجربات کا حامل ہوتا ہے، یوں تو ہر عمر کی الگ کہانی ہوتی ہے لیکن بڑھاپا ان تمام کہانیوں کا نچوڑ ہوتا ہے، ہر شخص کی فطرت الگ ہوتی ہے، نظام میرا بیٹا ہے لیکن میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ مجھے اپنے بیٹے سے کبھی اتنی محبت نہیں رہی جتنی اپنے پوتے اشتیاق سے ہے حالانکہ نظام میرا اکلوتا بیٹا ہے، اشتیاق بھی مجھ سے انتہائی مانوس ہے، جتنا میں اس سے...... ! چنانچہ تم نے مجھے اس کی صحت یابی کی خوشخبری دے کر مجھ پر احسان کیا ہے جبکہ اس منحوس سیتارام نے بڑی فرعونیت سے دعویٰ کیا ہے کہ اشتیاق صرف چھ مہینے زندہ رہے گا، مجھے ایک بات کا جواب دو گے بیٹے......؟‘‘

’’جی ضرور......!‘‘

’’اشتیاق کے سلسلے میں تم نے صرف مجھے تسلی دی ہے یا......؟‘‘

’’ڈاکٹر سیتارام نے انہیں کینسر بتایا ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’ہاں! وہ بدبخت بہت مشہور ڈاکٹر ہے، نہ صرف بریلی میں بلکہ اور دوسرے شہروں میں اس کی بڑی شہرت ہے۔‘‘

’’تو پھر میں آپ سے عرض کروں کہ انہیں کینسر نہیں ہے۔‘‘ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

’’اللہ کا شکر ہے، اللہ کا شکر ہے مگر اس کی صحت گرتی جارہی ہے، نڈھال بھی رہتا ہے۔‘‘

’’وہ ٹھیک ہوجائیں گے، آپ سے کچھ سوالات کرسکتا ہوں؟‘‘

’’ضرور......!‘‘

’’بابا صاحب سے آپ کے کیسے تعلقات ہیں؟‘‘

’’ان کا عقیدت مند ہوں، کبھی کبھی قدم بوسی کے لیے چلا جاتا ہوں، بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں، بس خوش نصیبی سے ایک دن کہیں ملاقات ہوگئی تھی، مجھ پر بڑی عنایت فرماتے ہیں۔‘‘

’’اشتیاق علی کا ڈاکٹری علاج ہو رہا تھا پھر آپ کو بابا صاحب کا خیال کیوں آیا؟‘‘

’’میں نے ان سے دعا کی استدعا کی تھی، انہوں نے آپ کا تذکرہ کردیا اور کہا کہ وہ ایک بہت بڑے ڈاکٹر کو بھیج رہے ہیں، اشتیاق کا معائنہ کرادیا جائے۔‘‘

’’کوئی اور بات آپ کے ذہن میں ہے؟‘‘

’’کس طرح کی......؟‘‘

’’کیا اشتیاق صاحب کسی ہندو لڑکی سے محبت کرتے ہیں؟‘‘

’’مجھے معلوم تھا کہ افتخار ساری معلومات فراہم کردے گا، ہاں! یہ سچ ہے اور حقیقت یہ میری زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ ہے، ہمارا خاندان بریلی کا قدیم خاندان ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں، بڑے بڑے ہندو خاندانوں سے رسم و راہ ہے، سب لوگ عزت کرتے ہیں، ان حالات میں ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے کہ اس خاندان سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جو صدیوں کی ساکھ خاک میں مل جائے، اس لڑکی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم کون ہے، کہاں رہتی ہے، اشتیاق سے کہاں ملی، بے حد نڈر اور بے خوف ہے۔ جب دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلی آتی ہے حالانکہ نظام کی بیوی اور بیٹی خود بھی آفت کی پرکالا ہیں لیکن اس کے معاملے میں بے بس ہیں، وہ کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی۔‘‘

’’اشتیاق نے کسی سے کوئی بات کی، اس کے بارے میں؟‘‘

’’کبھی نہیں کرتا، وہی سب کچھ کہہ سن لیا کرتی ہے اور کچھ ایسا طرزِ عمل ہے اس کا کہ سب اس سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔‘‘

’’آپ سے کبھی بات ہوئی اس کی......؟‘‘

’’ایک دو بار میں نے خود اس سے بات کی ہے لیکن انداز نرم رکھا، میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے؟ جواب میں بولی کہ پریمیکا ہوں اس کی، اس سے پریم کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی، کوئی راستہ روکے گا تو اسے لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی، ہمیں معلوم ہے وہ ایسا کرسکتی ہے کیونکہ اشتیاق پوری طرح اس کے بس میں ہے۔‘‘

’’ایک ذاتی سوال کروں؟‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں ضرور......!‘‘

’’مجھے یہاں آئے زیادہ وقت نہیں ہوا لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ بیگم نظام علی، خود نظام علی یا دل افروز صاحبہ کسی کی اشتیاق سے کوئی رغبت نہیں ہے، وہ ان کی طرف پھٹکتے بھی نہیں، بیگم صاحبہ اشتیاق کی سگی والدہ ہیں؟‘‘

’’سو فیصد سگی...... ! بڑی عجیب بات ہے نظام علی بچپن سے خود پرست ہے، اس نے شاید کبھی کسی سے محبت نہیں کی، اس کی ماں اس حسرت میں مرگئی کہ بیٹا کبھی اسے ماں سمجھے، اس نے کبھی ماں کو ماں کا مقام نہیں دیا، اسی طرح قدرت نے اسے بیوی بھی اسی کے مزاج کی دی، بیٹی بھی دونوں کا مجموعہ ہے بس اشتیاق ان سے مختلف نکل گیا، میں اسی لیے اسے حد سے زیادہ چاہتا ہوں۔‘‘

’’آپ کے ساتھ نظام علی صاحب کا رویہ کیسا ہے؟‘‘

’’آخر اس کا باپ ہوں میں، بچپن سے اس کی فطرت کا اندازہ کرکے میں نے اسے سنبھال کر رکھا ہے، سب سے پہلی بات یہ کہ میں نے اپنی ساری دولت، ساری جائیداد اپنے قبضے میں رکھی ہے۔ ایک وصیت نامہ تیار کرکے رکھ لیا ہے جو پوری طرح صیغۂ راز میں ہے کہ اس میں کیا ہے، یہ سب کچھ میرا بنایا ہوا ہے، میں اگر چاہوں تو لمحوں میں نظام علی سڑکوں پر آسکتا ہے، یہ بات وہ اچھی طرح جانتا ہے اس لیے میرے سامنے سب سیدھے رہتے ہیں۔‘‘

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ شخص اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ دادا ابو سے فرصت پاکر میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میری اپنی کہانی حالات میں گم ہوگئی تھی اور اس کا گم رہنا ہی بہتر تھا۔ میرے لیے بھی اور وہاں پاکستان میں میرے اہل خانہ کے لیے بھی...... ! اب کوئی جدوجہد بیکار تھی، سب کچھ حالات کے سپرد تھا، تقدیر جو بھی فیصلہ کرے۔ بابا پردہ پوش کا سہارا ملا تھا اور دل گواہی دیتا تھا کہ یہ سہارا مضبوط ثابت ہوگا، چنانچہ خود کو ان سے منسلک کرکے ان کی ہدایات کے مطابق عمل کروں۔ اشتیاق کا جائزہ لے چکا تھا۔ اسے کینسر نہیں تھا لیکن اس کی کسی جسمانی بیماری کا اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔ ہاں ایک بہت بڑا انکشاف اس بلی کے بارے میں ہوا تھا، اس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے کیوں ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ قدرتی جسمانی نقص ہو اور مجھے غلط فہمی ہو لیکن اس کا اشتیاق سے حیرت انگیز لگاؤ بھی قابل غور تھا۔

پہلا دن گزر گیا۔ میرا بہت خیال رکھا جارہا تھا۔ دوسرا دن بھی آدھا گزر گیا۔ دوپہر کے کھانے پر ملازم مجھے بلانے آگیا۔ کھانے کی میز لگی ہوئی تھی، سارا گھر موجود تھا بس افتخار نہیں تھا۔ دادا ابو بھی تھے۔ کھانا بالکل خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد دادا ابو خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

میں اٹھنے لگا تو نظام علی نے کہا۔ ’’ہمیں کچھ وقت دیں گے ڈاکٹر صاحب......؟‘‘

’’جی حکم......!‘‘

’’اشتیاق کے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’فرمائیے......؟‘‘

’’ہماری اولاد ہے وہ، ہم اس کی زندگی چاہتے ہیں لیکن کچھ رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں ہمارے راستے میں، میں آپ کو ان کی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’جی فرمائیے۔‘‘

’’آپ اگر واقعی ڈاکٹر ہیں تو مجھے یہ بتائیے کیا یہ دور تعویذ گنڈوں کا ہے، کیا اب بیماریوں کا علاج جھاڑ پھونک سے ہوتا ہے، ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے جو ہندوستان کا مانا ہوا ڈاکٹر ہے، اسے کینسر بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشتیاق کی زندگی مشکل ہے۔ ہم اپنے بیٹے کے علاج کے لیے ہر کوشش کرنا چاہتے ہیں لیکن سید علی صاحب اس پر راضی نہیں ہیں۔‘‘

’’وہ کیا کہتے ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’آپ کو علم ہے کہ وہ کیا کہتے اور کیا چاہتے ہیں، انہوں نے کسی بزرگ سے رابطہ کیا ہے جو روحانی علاج کرتے ہیں اور ان بزرگ نے آپ کو اشتیاق کے علاج کے لیے بھیجا ہے جبکہ آپ خود کو ڈاکٹر بتاتے ہیں، مجھے بتائیے کیا آپ ایم بی بی ایس ہیں؟‘‘

’’جی میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔‘‘

’’ان بزرگ کے پاس رہتے ہیں؟‘‘

’’جی......!‘‘

’’آپ نے اشتیاق کا معائنہ کیا ہے؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘

’’کیا کہتے ہیں اس کے بارے میں؟‘‘

’’وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔‘‘

’’کیسے......؟‘‘

’’میں ان کا علاج کروں گا۔‘‘

’’کیا آپ کینسر کا علاج کریں گے؟‘‘

’’انہیں کینسر نہیں ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ نظام علی نے شدید غصے سے کہا۔

’’جی ہاں! آپ کا سیتارام بے وقوف ہے، اشتیاق کو کینسر نہیں ہے، وہ تھوڑے دنوں میں ٹھیک ہوجائیں گے، ویسے مجھے بتائیے، آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’ہم اسے ملک سے باہر لے جانا چاہتے ہیں۔‘‘ اس بار محترمہ دل افروز نے کہا۔

’’تو لے جائیے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’دادا ابو نہیں جانے دیں گے۔‘‘

’’توبہ توبہ......!‘‘ دروازے سے افتخار کی آواز آئی اور میں اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ افتخار اندر آرہا ہے لیکن اس کے بعد اس کی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

اس کے بعد سب اٹھ گئے تھے۔ میں بھی کمرے میں آگیا لیکن اب مجھے کچھ الجھن ہونے لگی تھی۔ عجیب و غریب ماحول تھا اس گھر کا! پتا نہیں کس طرح کے لوگ تھے۔ اشتیاق کو کینسر نہیں تھا۔ میں نے بڑے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ وہ ٹھیک ہوجائے گا اور یہ سوچتے ہوئے مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے وہ الفاظ اپنی مرضی سے نہیں کہے تھے بلکہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تھا کہ اشتیاق ٹھیک ہوجائے گا۔

کافی دیر کے بعد افتخار میرے کمرے میں آیا۔ ’’کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟‘‘

’’شکریہ افتخار صاحب! آپ کھانے پر موجود نہیں تھے۔‘‘

’’ہاں! ایک کام سے گیا تھا، آپ کی ایک امانت لایا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر افتخار نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بے حد خوبصورت موبائل سیٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ’’یہ بابا پردہ پوش کا ملازم اشرف لایا تھا، بابا صاحب نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔‘‘

’’ارے، اچھا......!‘‘ میں نے اچنبھے سے ہاتھ بڑھا کر موبائل لے لیا۔ بہت شاندار قیمتی سیٹ تھا۔ میں نے اسے چیک کیا تو انگلش میں ایک میسج موجود تھا۔

’’اسے ساتھ رکھو کامران! میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔‘‘

میں نے گہری سانس لے کر افتخار کا شکریہ ادا کیا، پھر ہنس کر بولا۔ ’’ڈائننگ روم کے دروازے سے آپ کی توبہ توبہ اندر آئی تھی، آپ نہیں آئے۔‘‘

’’زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی عزیزم! تین بھیڑیے مجھے لمحوں میں چٹ کرجاتے، محترمہ دل افروز اپنے بھائی کا علاج لندن میں کرانا چاہتی ہیں، بھائی کو اسپتال میں داخل کراکر وہ پیرس اور دوسرے کچھ ممالک دیکھنے کے منصوبے بنا رہی تھیں لیکن دادا جان نے سارے خواب چکنا چور کردیے۔‘‘

’’اوہو...... ! یہ مسئلہ ہے۔‘‘

’’ظاہر ہے...... فنانسر تو دادا جان ہی ہوتے۔‘‘

افتخار کی بات پر میں کچھ دیر غور کرتا رہا، پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’دنیا کتنی بری ہے افتخار!‘‘

افتخار نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر وہ میرے پاس بیٹھا، پھر چلا گیا۔ اس وقت شام کے پونے پانچ بجے تھے جب میرے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور افتخار کی آواز سنائی دی۔ ’’آجاؤں......؟‘‘

میں نے اسے اندر آنے کے لیے کہا تو وہ اندر آگیا اور جلدی سے بولا۔ ’’وہ آئی ہے۔‘‘

’’کون......؟‘‘

’’وہی لڑکی جو اشتیاق کی دوست ہے۔‘‘

’’اچھا کب......؟‘‘ مجھے ایک دم دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

’’یہ پتا نہیں، ویسے جب اس کا دل چاہتا ہے، آجاتی ہے، کسی کو پتا نہیں چلتا کب آتی ہے اور کب چلی جاتی ہے، اس وقت وہ اشتیاق کے کمرے میں موجود ہے، دیکھنا چاہو تو جلدی کرو...... کب چلی جائے، پتا نہیں چلے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں چلتا ہوں، بیگم صاحبہ کے ساتھ بازار جانا ہے۔‘‘

’’اوکے!‘‘ میں نے کہا۔

بابا صاحب نے موبائل فون بھیجا تھا۔ اس سے مجھے بڑی تقویت ہوئی تھی۔ یوں تو ان سے ملاقات کی کوئی سبیل نہیں تھی سوائے اس کے کہ افتخار سے درخواست کروں کہ مجھے ان کے پاس لے جائے۔ تب میں ان کو تفصیل بتا کر ان سے ہدایات لوں کہ اب کیا کروں؟ موبائل میرے پاس تھا اور یہ مشکل حل ہوگئی تھی لیکن بابا صاحب کی ہدایت بھی میسج کی شکل میں موجود تھی کہ میں خود انہیں فون نہ کروں، وہ کریں گے، میں انتظار کروں۔

میرے دل میں اس لڑکی کو دیکھنے کا تجسس بیدار ہوگیا تھا اس لیے تکلف بالائے طاق رکھ کر میں اشتیاق کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ کمرے پر پہنچ کر میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اشتیاق کی آواز سنائی دی۔

’’آؤ! کون ہے......؟‘‘

میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ تب میں نے اس شعلہ رو کو دیکھا۔ آگ کی طرح دہک رہی تھی۔ بے شک حسن و جمال میں یکتا تھی۔ اتنی خوبصورت کہ دل پر قابو مشکل ہوجائے۔ اشتیاق کے پیروں کے پاس بیٹھی اس کے پیروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سرمہ بھری آنکھیں دروازے کی طرف تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اس کی آنکھوں کا رنگ بدلتے دیکھا۔ وہ جلدی سے سمٹ گئی اور مسہری سے پاؤں نیچے لٹکا لیے۔

’’ارے ڈاکٹر صاحب! سوری میں سمجھا کوئی ملازم ہے، آئیے ڈاکٹر صاحب!‘‘ اشتیاق خود بھی اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اسی وقت لڑکی نیچے اتری اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی چال میں بھی کوئی خاص بات تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ میں نے ایک کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔

’’معذرت اشتیاق! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔‘‘

’’نہیں! کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ نڈھال سے لہجے میں بولا۔ میں بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی اگر اس کی محبوبہ ہے تو اس کے آنے پر اشتیاق کو خوشی ہونی چاہیے لیکن ایسی کوئی بات اس کے چہرے پر موجود نہیں تھی۔ میں اُس سے اس کی صحت کے بارے میں پوچھتا رہا۔

دس منٹ، بیس منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لڑکی واش روم سے باہر نہیں آئی تھی۔ میں نے اس بات کو محسوس کرکے کہا۔ ’’آپ کی مہمان واش روم سے باہر نہیں آئیں؟‘‘

’’ایں......!‘‘ وہ بھی چونکا۔

’’کوئی آواز بھی نہیں آرہی، دیکھوں......؟‘‘ میں نے کہا۔

’’دروازہ بجادیں پلیز!‘‘ وہ بولا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر واش روم کے دروازے پر آگیا۔ میں نے دروازے کو تھپتھپایا تو وہ کھل گیا۔ ایک لمحے میں احساس ہوگیا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ میں نے پورا دروازہ کھول دیا۔ اندر واقعی کوئی موجود نہیں تھا۔ میری آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ میں نے خود اس لڑکی کو واش روم میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ واش روم کافی وسیع تھا لیکن اندر کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا البتہ بلندی پر ایک روشندان کھلا ہوا تھا۔

’’وہ اندر نہیں ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’اچھا...... ! چلی گئی ہوگی۔‘‘ اشتیاق نے لاپروائی سے کہا اور میں اس کے پاس واپس آگیا۔

’’کمرے میں اور کوئی دروازہ تو نہیں ہے اور ہم نے انہیں جاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا، پھر وہ کدھر سے گئیں؟‘‘

’’پتا نہیں۔‘‘ اشتیاق بیزاری سے بولا۔

میں غور سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ’’دادا ابو نے مجھے تمہارے علاج کے لیے بلایا ہے اشتیاق! وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہیں، ایک ڈاکٹر اس وقت تک صحیح علاج نہیں کرسکتا جب تک مریض اس سے پورا تعاون نہ کرے۔‘‘

’’میں نے کب انکار کیا ہے ڈاکٹر کامران!‘‘ وہ بدستور نڈھال لہجے میں بولا۔

’’مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتاؤ، وہ تمہاری دوست ہے، گھر کے سب لوگ کہتے ہیں کہ اس نے تم پر قبضہ جما رکھا ہے، وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی کیونکہ تم اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے، کیا یہ سب سچ ہے؟‘‘

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ’’کیا دادا ابو بھی یہی کہتے ہیں؟‘‘

’’ہاں......!‘‘

’’اوہ!‘‘ اس کے منہ سے نکلا۔ یوں لگا جیسے اسے اس بات پر حیرت ہوئی ہو۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ نہیں بولا تو میں نے کہا۔ ’’خاموش کیوں ہوگئے اشتیاق......؟‘‘

’’اس گھر میں دادا ابو ہی سچے انسان ہیں، باقی سب لالچی اور فریبی ہیں، اپنے کسی بھی مذموم مقصد کے لیے کسی پر بھی الزام لگاسکتے ہیں لیکن اگر دادا ابو بھی یہی کہتے ہیں تو پھر یہ ٹھیک ہی ہوگا۔‘‘

’’کیا مطلب! خود تمہیں ان باتوں کا احساس نہیں ہے؟‘‘

’’نہیں ہے۔‘‘ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

’’تم اس سے عشق کرتے ہو؟‘‘

’’نہیں!‘‘ وہ بولا اور میں چونک پڑا۔

’’وہ غسل خانے میں گئی اور واپس نہیں آئی، وہ غسل خانے میں نہیں ہے، تمہیں اس بات پر حیرت نہیں ہوئی؟‘‘

’’نہیں! وہ سب کچھ کرسکتی ہے، کرتی رہتی ہے، وہ انوکھی ہے، اب مجھے اس کی کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی لیکن وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے، میں اگر اسے حکم دوں تو وہ ایک لمحے میں ان سب کو ختم کردے، میری وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتی۔‘‘

’’وہ ایسا کرنا چاہتی ہے؟‘‘

’’ہاں......!‘‘

’’کیوں......؟‘‘

’’یہ سب اس کی مخالفت جو کرتے ہیں۔‘‘

’’وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟‘‘

’’بس میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے، میرے اور اپنے درمیان اسے کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔‘‘

’’وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟‘‘ میرے اس سوال پر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ لمحے اسی طرح خاموش رہا پھر اس کے پورے بدن کو شدید جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی وہ وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار روشندان کی طرف بھی دیکھا تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

جب اس کی وحشت کم ہوئی تو اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’الٰہ آباد میں...... ! ہم ایک شادی میں گئے تھے، وہاں حویلی اعظم علی میں قیام تھا، بہت عظیم الشان حویلی تھی، دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک حصہ پرانا تھا، ایک نیا! یہ مجھے پرانی حویلی میں ملی تھی، وہاں کسی ہرکارے کی بیٹی تھی، ہم نے تین دن وہاں قیام کیا تھا، یہ ہر وقت میرے ساتھ رہتی جبکہ میں نہیں چاہتا تھا، پھر ہم بریلی واپس آگئے، راستے میں ٹرین کے سفر میں یہ رات کو میرے پاس آگئی۔‘‘

’’سفر کے دوران......؟‘‘

’’ہاں! اس وقت ٹرین کے مسافر سو رہے تھے، یہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی، کہنے لگی کہ اب مجھ سے دور نہیں رہ سکتی۔‘‘

’’تم نے کیا کہا؟‘‘

’’مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔‘‘

’’ٹھیک...... پھر......!‘‘

’’بس میں بریلی آکر پھر اپنے کاموں میں مصروف ہوگیا لیکن ایک دن وہ ایک ماڈرن لڑکی کی حیثیت میں مجھے پوچھتی ہوئی یہاں آگئی اور اس کے بعد اس نے باقاعدہ آنا شروع کردیا، گھر کے لوگ اس کے مخالف ہیں مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔‘‘

’’اس نے اپنا نام بتایا ہے؟‘‘

’’ہاں! نرمل وتی ہے اس کا نام۔‘‘

’’ہندو ہے؟‘‘

’’نام سے تو یہی ظاہر ہے۔‘‘

’’تمہارے دل میں اس کی محبت نہیں ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا، لیکن اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

’’جواب نہیں دیا تم نے اشتیاق!‘‘ میں نے دوبارہ کہا۔

اچانک ایک ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ آواز روشندان کی طرف سے آئی تھی۔ میری نظر اس طرف اٹھ گئی۔ وہی سفید بلی روشندان میں آگئی تھی۔ وہ متجسس سی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگی۔ میں نے ایک لمحے تک اس کا جائزہ لیا، پھر پہلے کے سے انداز میں اسے پچکارا لیکن بلی خاموش روشندان پر بیٹھی رہی، پہلے کی طرح نیچے نہیں آئی۔ میرے پچکارنے کی آواز پر اشتیاق نے چونک کر مجھے دیکھا پھر میری نگاہوں کے تعاقب میں روشندان کی طرف...... ! میں نے اس کے چہرے پر ایک خوشگوار تاثر دیکھا۔

’’کتنی خوبصورت بلی ہے، تمہیں بلیوں سے بہت پیار لگتا ہے؟‘‘

’’بلیوں سے نہیں صرف بیلا سے!‘‘ اس نے کہا۔

’’بیلا اس کا نام ہے؟‘‘

’’ہاں! میں نے رکھا ہے، آپ یقین کریں یہ مجھے بے حد چاہتی ہے، اکثر جب میں صبح کو جاگتا ہوں تو یہ میرے پیروں میں سوئی ہوئی ملتی ہے، یار لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے۔‘‘

’’یار لوگوں کو......؟‘‘

’’خاص طور سے ہماری والدہ محترمہ کو جنہوں نے آج تک کبھی پیار سے ایک کپ چائے بھی نہیں دی، انہیں بیلا سے شدید نفرت ہے، کئی بار اسے پکڑوانے کی کوشش کرچکی ہیں تاکہ کہیں دور پھنکوادیں مگر بیلا بہت چالاک ہے وہ ان کے ہاتھ نہیں آتی، وہ اب بھی مسلسل کوششیں کرتی رہتی ہیں، انہیں بیلا کا میرے پاس رہنا اچھا نہیں لگتا۔‘‘

میں نے ایک بار پھر بلی کی طرف دیکھا۔ وہ آرام سے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

’’صرف ایک بات اور بتادو اشتیاق! جب تم الٰہ آباد سے آرہے تھے اور وہ تمہیں ٹرین میں ملی تھی تو تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ یہاں کیسے آگئی اور اب کہاں جائے گی؟‘‘

’’نہیں! پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا، وہ تھوڑی دیر کے بعد اٹھ کر چلی گئی تھی۔‘‘

’’ٹھیک ہے اشتیاق! تمہاری بیلا میرے جانے کا انتظار کررہی ہے، اس لیے میں چلتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔ اشتیاق نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

رات کو بارہ بجے کے قریب جب میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا، اچانک موبائل فون پر کال موصول ہوئی۔ میں سنبھل کر اٹھ گیا۔ میں نے جلدی سے فون ریسیو کیا تو بابا صاحب کی آواز سنائی دی۔

’’یقیناً سو گئے ہوگے؟‘‘

’’تھوڑا سا!‘‘ میں نے کہا۔

’’جاگ جاؤ۔‘‘

’’جی جاگ گیا۔‘‘

’’اب تک کی تفصیل بتاؤ۔‘‘ بابا صاحب نے کہا اور میں پورے ہوش و حواس میں آکر انہیں اب تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ ایک ایک فرد اور اس کے مسائل سنائے۔ پوری تفصیل سننے کے بعد بابا صاحب نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے تم اپنے موبائل فون کا ایم ایم ایس آن کرو۔‘‘

’’جی اچھا!‘‘

’’پوری بات سنو، تمہیں موبائل میں میری تصویر نظر آئے گی، میرا چہرہ تو نمایاں نہیں ہوگا لیکن میری آنکھیں دیکھ سکتے ہو، پانچ منٹ تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھنا، بس اس کے بعد موبائل بند کردینا اس کے بعد جب تمہیں بلی دوبارہ نظر آئے تو کوشش کرکے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینا، پانچ منٹ تک اسے اپنی آنکھوں سے آنکھیں ملانے پر مجبور کرنا، بس باقی کام بعد میں بتاؤں گا۔‘‘

تھوڑی دیر کے بعد بابا صاحب کی تصویر موبائل پر آگئی۔ میں پانچ منٹ تک ان کی پُرسحر آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر ان کی آواز سنائی دی۔ ’’میں فون بند کررہا ہوں، اب تم آرام سے سو جاؤ۔‘‘

فون بند ہوگیا۔ میں بہت دیر تک ان تمام واقعات پر غور کرتا رہا اور کسی وقت نیند آگئی۔ دوسری صبح طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ اس گھر کے مسائل سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آج کوئی خاص بات نہیں ہوئی، البتہ ایک خیال کے تحت میں افتخار احمد سے ملا۔ ’’افتخار بھائی! مجھے آپ سے ایک کام ہے۔‘‘

’’جی جی ڈاکٹر! حکم کرو۔‘‘

’’کسی ملازم کے ساتھ مل کر ایک کام کریں، اشتیاق کے کمرے میں بلندی پر ایک روشندان ہے، آپ نے دیکھا ہے؟‘‘

’’ہاں ہاں! کیوں نہیں، اشتیاق کی دوسری محبوبہ کا وہی تو آستھان ہے۔‘‘ افتخار نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

’’جی ٹھیک! وہ روشندان دوسری طرف سے بند کرادیں۔‘‘

’’اوہ خیریت......؟‘‘

’’خیریت ہی ہے، آپ یہ کام کرسکتے ہیں؟‘‘

’’ہاں! لیکن اگر کوئی اس بارے میں پوچھے؟‘‘

’’اصل مسئلہ تو یہی ہے، کسی کو پتا چلے گا تو پوچھے گا نا، کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے اس کے علاوہ ایک روشندان ان کے واش روم میں بھی ہے، اسے بھی بند کرنا ہوگا۔‘‘

’’بڑا عجیب طریقہ علاج ہے یعنی روشندان کو بند کرکے کینسر کا علاج کیا جائے گا، توبہ توبہ!‘‘

’’یہ ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہوجائے گا حضور! آپ نے پہلا حکم دیا ہے، تعمیل ہوگی۔‘‘

’’آپ چاہیں تو یہ کام رات کو دس بجے کے بعد کردیں۔‘‘

’’ارے واہ! تب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، آپ سمجھ لیں کام ہوگیا۔‘‘ افتخار نے کہا۔

افتخار کے جانے کے بعد میں اپنے منصوبے پر غور کرتا رہا۔ ایک دلچسپ اور عجیب و غریب صورتحال سے دوچار ہونے جا رہا تھا۔ تھوڑا سا تجسس دل میں تھا۔ رات کا کھانا نو بجے لگتا تھا۔ کھانے کے دوران کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ میرے بارے میں ہر ایک کے دل میں مختلف خیالات تھے اور خود نظام علی بھی میری یہاں موجودگی سے خوش نہیں تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

افتخار نے مجھے آنکھ سے اشارہ کردیا تھا۔ بتادیا تھا کہ اسے اپنا کام یاد ہے۔ ٹھیک دس بجے میں نے اشتیاق کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر روشنی تھی لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ کئی بار دستک دینے پر خود اشتیاق نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور آنکھیں بوجھل تھیں۔

’’ارے ڈاکٹر صاحب! آپ خیریت......؟‘‘

’’سوری اشتیاق! ایک اہم کام تھا، مجبوراً تمہیں اس وقت تکلیف دینا پڑی ہے۔‘‘

’’آئیے!‘‘ اشتیاق کے لہجے میں بیزاری تھی۔ میں اندر آگیا اور میں نے جلدی سے اشتیاق کے بستر پر نگاہ ڈالی۔ میری خوش نصیبی تھی کہ بلی بستر پر موجود تھی اور گول گول آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔ اشتیاق نے پاؤں سے دروازہ بند کردیا اور بستر پر آگیا۔ میں نے اس کے برابر کی کرسی گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔

’’جی ڈاکٹر کامران!‘‘ اشتیاق بولا۔

’’آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا، آپ کی بیماری کے بارے میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے بلی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور خود میری آنکھوں میں بابا صاحب کی آنکھیں ابھر آئیں، البتہ میں نے بلی کے بدن کو جھٹکا لگتے دیکھا تھا۔

اشتیاق نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ’’میں بیمار آدمی ہوں ڈاکٹر صاحب! یہ وقت کسی طرح کے سوالات کا نہیں ہے۔‘‘

’’میں جانتا ہوں لیکن مجبوری تھی۔‘‘ میں نے بلی کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

’’فرمائیے!‘‘ اشتیاق نے کہا، لیکن کچھ فرمانے کی نوبت نہیں آئی۔ اچانک بلی نے ایک بھیانک چیخ ماری اور مسہری سے فرش پر چھلانگ لگادی۔ فرش پر اس نے لوٹ لگائی، پھر اچھل کر ایک ڈیکوریشن پیس پر چڑھی، وہاں سے روشندان پر لیکن وہاں راستہ بند تھا۔ وہ کچھ لمحے وہاں رکی، پھر واپس نیچے کودی اور واش روم کی طرف بھاگی۔ اس نے واش روم کے دروازے پر ٹکر ماری اور دروازہ کھل گیا۔

وہ اندر گھس گئی لیکن افتخار نے ذمہ داری سے اپنا کام کیا تھا۔ واش روم سے بلی کی بھیانک چیخیں ابھریں اور وہ پھر باہر نکل آئی۔ اب وہ پوری قوت سے مسلسل چیخ رہی تھی اور پورے کمرے میں بھاگی بھاگی پھر رہی تھی۔ عین اسی وقت کسی ملازم نے شاید بلی کی چیخیں سن کر دروازہ کھولا اور بلی نے اس پر چھلانگ لگادی۔ ملازم چونکہ دروازے پر تھا، اس لیے بلی کو باہر جانے کا راستہ نہیں ملا، دوسرے لمحے وہ ملازم کے سینے پر چڑھ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا بیچارے ملازم کے ساتھ کہ اس کے حلق سے بھی بھیانک چیخیں نکلنے لگیں۔ اس نے بلی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور خود سے الگ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں اور اشتیاق ششدر کھڑے تھے۔ بمشکل ملازم نے بلی کو اپنے وجود سے دور کیا اور وہ چھلانگ مار کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ ملازم چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے بری طرح دھاڑ رہا تھا۔ اس کی چیخیں سن کر گھر کے سارے لوگ دوڑ پڑے، روشنیاں جلادی گئیں۔

اور ایک افسوسناک صورتحال سامنے آئی۔ بلی نے ملازم کی ایک آنکھ نکال لی تھی۔

افتخار نے فوری طور پر تیاری کی اور ملازم کو اسپتال لے جایا گیا۔ بیگم صاحبہ اور دل افروز نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر بلی کو بددعائیں دے رہی تھیں۔ نظام علی بھی ان کے ہم نوا تھے۔ ہلکے ہلکے چھینٹے اشتیاق کو بھی دیے جارہے تھے کہ اس نے گھر والوں کو نہ جانے کیسی کیسی مشکلات میں گرفتار کر رکھا ہے۔ دادا ابو اس سانحے پر بالکل خاموش تھے۔

تین بجے میں اپنے کمرے میں آگیا۔ شدید دل چاہ رہا تھا کہ بابا صاحب کو اس ساری صورتحال کی اطلاع دوں لیکن مجھے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ خود سے کبھی رابطہ نہ کروں۔ جب بھی ضرورت ہوگی، فون وہی کریں گے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ نہیں ہوسکا جس کا حکم بابا صاحب نے دیا تھا لیکن میں نے ان کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بلی نے بھی اپنا دفاع کیا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس بے چارے ملازم کا تھا۔

حادثہ ایسا تھا کہ اب بھلا نیند کیسے آسکتی تھی۔ بستر پر لیٹا خیالات میں ڈوبا رہا، پھر آنکھوں کی تھکن دور کرنے کے لیے آنکھیں بند کرلیں لیکن چند ہی لمحات میں دوبارہ آنکھیں کھل گئیں۔ ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی اور جو کچھ نظر آیا، وہ وہم نہیں تھا۔ بے حد عجیب سے لباس میں ملبوس ایک عورت مجھ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ گہرا سیاہ تھا، سفید سفید دانت ہونٹوں سے باہر جھانک رہے تھے، آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح روشن اور سرخ تھیں۔ ان آنکھوں میں پتلیاں نہیں تھیں۔

میں گھبرا کر اٹھا تو اس نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ اس کے حلق سے بلی جیسی ہی غراہٹ نکلی تھی۔ میں نے اسے ہاتھوں پر روک کر زور سے دھکا دیا۔ میرے ہاتھ اس کے بدن سے مس ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بدن پتھر کا ہو لیکن میرے دھکے سے وہ کافی دور جا گری تھی۔

میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسری طرف وہ بھی اٹھی لیکن کھڑی نہ ہوئی بلکہ ہاتھوں، پیروں کے بل زمین پر رکی، پھر اگلے ہاتھ دبائے اور پیروں کی مدد سے مجھ پر دوسری چھلانگ لگا دی۔ میں اس کے سامنے سے نہ ہٹا بلکہ جیسے ہی وہ میرے قریب آئی، میں نے ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ بلی کی طرح چیخی اور دوسری طرف الٹ گئی لیکن پلٹی کھا کر پھر اٹھی اور مجھ پر لپکی۔

نہ جانے کیوں اس وقت خوف میرے دل سے بالکل نکل گیا اور میں پوری مہارت سے اس کے مقابلے پر آگیا۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اور بھیانک ہوگیا تھا لیکن وہ رکے بغیر مجھ پر تابڑ توڑ حملے کررہی تھی اور میں اس کے ہر حملے کو ناکام بنا رہا تھا۔ اس بار میں نے اسے لات مار کر دور پھینکا تو اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے سر میں چوٹ لگی اور پیشانی سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس بار وہ فوراً اٹھ نہیں سکی اور اٹھنے کی کوشش میں کئی بار ناکام ہوئی، تب میں نے اس کے پاؤں دیکھے۔ اس کے پنجے پیچھے کی طرف تھے، بالکل اس طرح جیسے میں نے بلی کے پاؤں دیکھے تھے۔ آخر وہ اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا کسی دوسرے واقعے کا منتظر رہا لیکن دیر ہوگئی اور کچھ نہیں ہوا۔ باہر خاموشی تھی۔ کسی کو میرے کمرے میں ہونے والی خونی جدوجہد کا پتا نہیں چلا تھا، پھر میں باہر آیا اور میں نے دور دور تک نظریں دوڑائیں لیکن گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے مکین اب اتنے بھی بے حس نہیں تھے کہ اس خوفناک واقعے کے بعد اطمینان کی نیند سو گئے ہوں گے۔ سب ضرور جاگ رہے ہوں گے لیکن خوف زدہ ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ دوسرا خوفناک واقعہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس بھیانک وجود کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اگر میں ذرا بھی غافل ہوتا تو وہ مجھے چیر پھاڑ کر ڈال دیتی۔

آہستہ آہستہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا، پھر فجر کی اذان ہوئی اور میں وضو کرنے کے بعد نماز پڑھنے کھڑا ہوگیا۔ نماز کے بعد میں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور طبیعت تر و تازہ ہوگئی۔ باہر نکلا تو ملازم جاگ رہے تھے۔ میں نے ایک ملازم سے زخمی ملازم کے بارے میں پوچھا۔

’’ایک آنکھ نکل گئی ہے صاب جی! بے چارہ فیضو کانا ہوگیا مگر صاب جی! بڑے بول سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’اللہ سے توبہ ضروری ہے صاب جی! ہم یہی باتیں کررہے تھے۔ کسی میں کوئی خرابی ہوتی تھی تو فیضو اللہ سے توبہ کرنے کے بجائے اس کا مذاق اڑاتا تھا، ایک دفعہ ایک عورت نوکری کے لیے آئی تھی، بے چاری کی ایک آنکھ خراب تھی تو فیضو نے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ چلو وہ سب کو ایک نظر سے دیکھے گی، اب دیکھ لیں صاب جی! اب کیا ہوگا، اسی لیے کہتے ہیں بندہ بشر، خدا سے ڈرے۔‘‘

’’افتخار صاحب اسپتال سے واپس آگئے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں! وہی تو اس گھر میں سب سے نیک بندے ہیں، وہ اسپتال میں ہی ہیں، نظام صاحب واپس آگئے ہیں۔‘‘

’’ایک پیالی چائے مل جائے گی؟‘‘

’’ابھی لاتا ہوں صاب جی!‘‘ ملازم نے کہا۔ میں کچھ دیر کے بعد کمرے میں واپس آگیا۔ دوسرے کمروں میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی، پھر باہر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں اور وہی ملازم جس سے میں نے چائے کے لیے کہا تھا، ایک خوبصورت ٹرالی لیے اندر آگیا لیکن اس کے پیچھے افتخار بھی تھا۔ رات بھر جاگنے سے اس کا حال خراب ہو رہا تھا، آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

’’توبہ توبہ...... توبہ!‘‘ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور پھر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’چائے میں شریک کرکے ثواب دارین حاصل فرمائیں۔‘‘

’’آپ اسپتال سے واپس آگئے۔‘‘

’’شاید...... چائے پلیز! جمیل بھائی چائے بنادو یار!‘‘ افتخار نے ملازم کو اس کے نام سے مخاطب کیا اور ملازم پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔

’’فیضو کیسا ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے بے چارا! ایک آنکھ بلی اپنے ساتھ لے گئی۔‘‘ ملازم باہر نکل گیا تو افتخار نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ’’میرے دماغ میں بڑی چرخی چل رہی ہے ڈاکٹر کامران! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے بلی کے فرار کے راستے کیوں بند کرائے تھے، یہ حادثہ اسی لیے پیش آیا کہ بلی کو بھاگنے کی جگہ نہیں ملی اس لیے وہ غضبناک ہوگئی۔ بلی کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر وہ گھر جائے تو حملہ کردیتی ہے اور سیدھا نرخرہ دبوچتی ہے۔‘‘

’’دوسری بات......؟‘‘ نہ جانے کیوں مجھے افتخار کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

’’فیضو نے ایک عجیب انکشاف کیا ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘

’’وہ کہتا ہے کہ جس بلی نے اس پر حملہ کیا ہے، وہ بے حد خوفناک اور کالے رنگ کی تھی، وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ وہ بلی بالکل نہیں تھی جس کا نام اشتیاق، بیلا لیتے ہیں۔‘‘

’’او، اچھا...... ! ہوسکتا ہے وہ ٹھیک کہتا ہو۔‘‘

’’اور آپ اس وقت اشتیاق کے کمرے میں موجود تھے جب بلی غضبناک ہوئی؟‘‘

’’تیسری بات......؟‘‘ میں نے کہا۔

’’نہیں! پہلے مجھے بتائیں، آپ نے روشندان کیوں بند کرائے تھے؟‘‘

’’آپ نے خود ہی کہا تھا اس وقت کہ روشندان بند کرکے کیا کینسر کا علاج کیا جائے گا۔‘‘

’’ایں...... ہاں! میں نے کہا تھا۔‘‘

’’بس تو یہی سمجھ لیں اور ایک رائے دوں، آپ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں، آرام کرلیں ورنہ بیمار پڑ جائیں گے۔‘‘ میرے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ افتخار حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ ’’گویا آپ اس بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے؟‘‘

’’ہاں! یہی بات ہے۔‘‘

’’سوری مجھے اجازت!‘‘ وہ اٹھتے ہوئے بولا اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔ وہ باہر نکل گیا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ وہ کسی کو میری ہدایت کے بارے میں بتادے۔ میں نے صرف بلی کو پتا نہ چلنے کے لیے یہ عمل کرایا تھا۔ بس بیچارے ملازم کا افسوس ہوا تھا۔ وہ اگر دروازے پر نہ آتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا۔ دوسری بات اس نے کالی بلی والی بات بھی غلط نہیں کہی تھی۔ خوبصورت کیا بلکہ حسن و جمال کی دیوی نرمل وتی نے ایک کالی چڑیل کی شکل میں مجھ پر حملہ کیا تھا اور وہ اس کی اصلی شکل تھی لیکن اب مجھے کیا کرنا ہوگا، بابا صاحب کے حکم کے مطابق میں انہیں فون بھی نہیں کرسکتا۔

اس وقت دن کے تین بجے تھے، جب گھر کے ایک ملازم نے مجھ سے کہا۔ ’’صاحب جی! اشرف صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔‘‘

’’اشرف......؟‘‘ میں نے کہا۔

(جاری ہے)

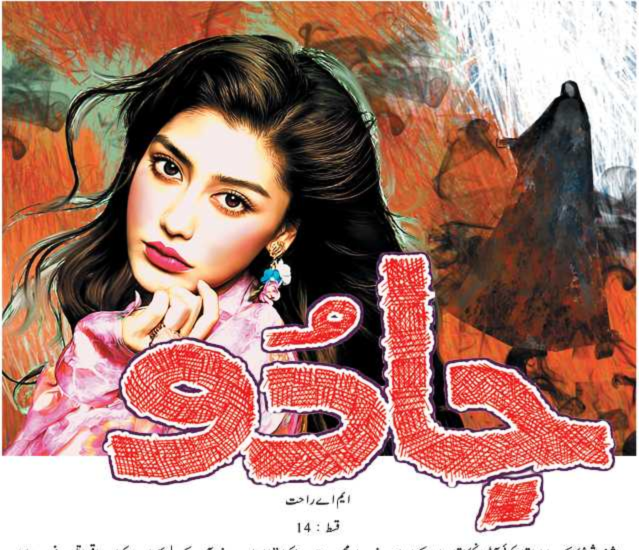

جادو

ایم اے راحت

قسط : 14

اشرف شیشے کا ایک جار لایا تھا جو کوئی آٹھ انچ کا تھا۔ سلام کے بعد اس نے وہ جار مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''باباصاحب نے یہ آپ کے لیے بھیجا ہے اور کہا ہے باقی باتیں وہ فون پر بتادیں گے۔''

''ٹھیک ہے اشرف!''

اشرف کے جانے کے بعد میں نے غور سے جار کو دیکھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، عام قسم کے شفاف شیشے کا بنا ہوا تھا۔ میں باباصاحب کے فون کا انتظار کرتا رہا جو مجھے ساڑھے چار بجے موصول ہوا تھا۔

''مغرب کی نماز کے بعد تمہیں یہ کہانی ختم کردینی ہے کامران!''

''جو حکم باباصاحب......!''

''اس گھر میں صرف دو افراد یعنی سید علی اور افتخار ہیں جن میں انسانیت ہے، افتخار اپنی انا کو کچل کر اپنے چھوٹے سے خاندان کی کفالت کررہا ہے۔''

''جی باباصاحب!''

''ان دونوں کو شریکِ عمل بناسکتے ہو، اشتیاق بے گناہ ہے، اس نے اس چڑیل کے نقلی حسن سے متاثر ہوکر اس کی قربت نہیں اختیار کی بلکہ اس چڑیل نے کالے سحر کے ذریعے اس پر قبضہ کیا ہے، چنانچہ اس کی مدد فرض ہے۔''

اس کے بعد باباصاحب نے مجھے سمجھایا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے باباصاحب سے تو کچھ نہ کہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ یہاں ہونے والے واقعات سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ انہوں نے صاف کہا تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد یہ کہانی ختم کردینی ہے۔ لیکن میرے دل میں ایک خیال ضرور تھا، کیا ان سنگین واقعات کے بعد وہ کھلے عام اشتیاق کے پاس آئے گی جبکہ سب کو معلوم ہے کہ اشتیاق کے کمرے سے نکلنے والی بلی نے ملازم کی آنکھ نکالی ہے اور بلی کالے رنگ کی تھی۔

شام کی چائے پر مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ پیغام نظام علی کی طرف سے ملا تھا۔ کھانے کے کمرے میں نظام علی، افتخار اور دونوں خواتین موجود تھیں۔ سید علی البتہ نہیں تھے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی طاری تھی۔

''آئیے ڈاکٹر صاحب! آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہو پارہی، آئیے تشریف لایئے۔'' نظام علی نے کہا۔ دونوں خواتین کے منہ بنے ہوئے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ناشتہ کیجئے پلیز!'' نظام علی نے کہا اور ناشتہ شروع ہوگیا۔ ناشتے کے بعد نظام علی پھر بولے۔ ''معاف کیجیے ڈاکٹر صاحب! آپ سے ابھی تک کوئی تفصیلی تعارف نہیں ہوسکا۔''

''جی فرمایئے......!''

''آپ کا پرائیویٹ کلینک ہے یا کسی سرکاری اسپتال سے تشریف لائے ہیں؟''

''یہ سوال آپ سید علی صاحب سے کیجیے۔''

''کیوں......؟''

''اس لیے کہ سید علی صاحب نے مجھے اپنے بارے میں کسی کو بتانے سے منع کیا ہے۔''

''میں کسی نہیں ہوں، اس گھر کا مالک ہوں۔'' نظام علی نے ناگواری سے کہا۔

''سید علی صاحب کا فرمانا ہے کہ وہ اس گھر کے مالک ہیں؟''

''آپ کا اپنا کیا فرمانا ہے ڈاکٹر صاحب!'' اس بار بیگم صاحبہ نے منہ کھولا۔

''مجھے بات کرنے دیں۔'' نظام علی نے مداخلت کی۔

''ارے جانے دیں، کیلپڈی کیلپڈی کا شور بہ! آپ سے زیادہ بہادر روئے زمین پر کون ہوگا، بات کریں گے۔ اباجان نے آنکھیں دکھائیں دم نکل گیا، خاموش رہیں، آپ مجھے بات کرنے دیں، تو ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں سے اور کتنی رقم بٹوریں گے، علاج ہوگیا ہو تو کسی اور مریض کو دیکھیں، آپ کی وجہ سے ہماری پرائیویسی متاثر ہورہی ہے، اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ آپ......! آپ خود سمجھدار ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے سخت لہجہ اختیار کیا۔

''بہتر میں دادا ابو سے بات کرلوں۔''

''آپ کے دادا ابو وہ کہاں سے ہوگئے؟ یہ ہتھکنڈے یہاں استعمال نہ کریں تو بہتر ہے۔'' اس بار دل افروز صاحبہ نے اپنا حق وصول کیا۔

''میری ایک تجویز ہے۔'' افتخار بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔ ''میں دادا ابو سے گزارش کرتا ہوں کہ اس مسئلے کو حل کریں، ڈاکٹر صاحب یہاں خود نہیں آئے، بلائے گئے ہیں، میں چلتا ہوں۔''

''شامت آئی ہے تمہاری افتخار! ذرا میری طرف دیکھو۔'' دل افروز بھڑک کر بولی۔

''میں تو مذاق کررہا تھا، توبہ توبہ!'' افتخار نے گردن جھکا کر کہا۔

''خیر آپ لوگوں کا شکریہ! بس تھوڑا سا وقت اور دے دیجیے، میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اصل میں ڈاکٹر صاحب! جو حادثہ پیش آگیا ہے، اس نے ہمیں بہت خوف زدہ کردیا ہے، آپ مہمان ہیں، کہیں آپ کسی حادثے کا شکار نہ ہوجائیں۔'' نظام الدین بولے۔

''آپ نے اس حادثے کے بارے میں کیا سوچا؟''

''کچھ عجیب ہورہا ہے، عقل ساتھ نہیں دے رہی، ناقابلِ فہم سے واقعات ہیں۔'' نظام الدین نے کہا۔ اسی وقت میری جیب میں رکھے فون پر وائبریشن ہوئی۔ ایک لمحے کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ وائبریشن مسلسل ہورہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''فون سن لوں۔'' میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں نے باہر آکر سیل آن کیا تو باباصاحب کی آواز آئی۔

''کامران! انہیں مختصر تفصیل بتا کر شام کے پروگرام میں شامل کرلو، ان کورباطنوں کی بینائی بھی روشن ہونی چاہیے، مناسب الفاظ میں انہیں صورتحال سے آگاہ کردو۔'' آواز بند ہوگئی۔

میرے لیے یہ ایک سنسنی خیز اور دلچسپ مرحلہ تھا۔ مجھے باباصاحب سے شام کے لیے جو ہدایات ملی تھیں، وہ بڑی سنسنی خیز اور دلچسپ تھیں۔ ان دلچسپیوں میں ان لوگوں کی شرکت اور پرلطف ہوگی۔ میں دروازہ کھول کر اندر واپس آگیا۔

''شکر ہے آپ واپس آگئے، ہم تو سمجھے آپ داداجان کے پاس ہم لوگوں کی شکایت کرنے چلے گئے۔''

''میں نے یہاں سے جانے کے لیے آپ سے تھوڑا سا وقت مانگا تھا، ہوسکتا ہے یہ وقت صرف چند گھنٹے ہو۔''

''اگر چند گھنٹے بھی نہ ہوتے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔'' دل افروز نے طنزیہ کہا۔

''میں یہ الفاظ داداجان کو ضرور بتاؤں گا دل افروز!'' افتخار کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔

''اس کا نتیجہ جانتے ہو؟'' دل افروز نے غرا کر کہا۔

''ہاں! نتیجہ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔'' افتخار نے لاپروائی سے کہا۔

''نہیں افتخار صاحب! آپ اپنے درمیان تلخی پیدا نہ کریں، میں آپ لوگوں کو ایک خوفناک حقیقت سے دوچار کرنا چاہتا ہوں، یہ بتایئے آپ کو ارواحِ خبیثہ کے بارے میں کچھ علم ہے؟''

''مجھے ہے۔'' افتخار جلدی سے بولا اور میں اس کی بات نہ سمجھا۔

''کیا جانتے ہیں آپ اس بارے میں؟'' میں نے سوال کیا۔

''مختلف شکلوں میں ملتی ہیں، کبھی ساس، سسر اور بیوی کی شکل میں، کبھی بھوت اور چڑیل کی صورت۔'' اس کا اشارہ دل افروز، اس کے باپ کی طرف تھا۔ شاید اس وقت وہ بہت تپ گیا تھا اور بے دھڑک بول رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا لیکن ایک لمحے میں پتا چل گیا تھا کہ ان کورعقلوں کو اُس کے اِس طنز کا اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔

''یہ سب توہمات ہیں، تھکے ہوئے ذہنوں کی تخلیق!'' ناظم علی نے کہا۔

''مجھے آپ سے اختلاف ہے۔''

''ہوگا مگر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ آپ کے گھر میں ایک چڑیل کا بسیرا ہے۔'' میں نے کہا تو ناظم علی مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''اور تمہارے اس سے گہرے تعلقات ہیں، میں کہتا ہوں تم آخر کیا کھیل کھیل رہے ہو؟'' ناظم علی بولے۔

''یہ چڑیل اس وقت سے اشتیاق کے پیچھے لگی ہے جب وہ الٰہ آباد ایک شادی میں گئے تھے، وہاں کوئی حویلی اعظم علی ہے، اس پرانی حویلی میں وہ چڑیل موجود تھی، وہ اشتیاق پر عاشق ہوگئی اور اس کے پیچھے لگی، یہاں تک چلی آئی، اب بھی وہ اس ہندو لڑکی کے روپ میں اشتیاق کے پاس آتی ہے اور ایک بلی کی حیثیت سے بھی اس کے پاس رہتی ہے۔''

''اومائی گاڈ......اومائی گاڈ! کیسی زبردست کہانی ہے، سر آپ ڈاکٹر ہیں یا رائٹر......! کیا خوبصورت کہانی گھڑی ہے، زندہ کرداروں کے ساتھ!'' دل افروز نے کہا۔

''اور معاون ہیں افتخار احمد! ورنہ شادی اور حویلی اعظم علی کے بارے میں انہیں کیا معلوم!'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

افتخار غصے سے کھڑا ہوگیا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔ ''کچھ منٹ اور انتظار کرلو افتخار! ساتھ ہی اٹھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہاں بیٹھو......ابھی پورا میجک شو دیکھو، ابھی یہ رومال سے کبوتر نکالیں گے، منہ سے لوہے کے گولے اگلیں گے۔''

''مغرب کی نماز کے بعد اشتیاق کے کمرے میں آجایئے، وہاں آپ کو اصلی میجک شو دیکھنے کو ملے گا، بھولیے گا نہیں مغرب کے بعد......آؤ بچے جمورے!'' میں نے افتخار کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آگیا۔ افتخار غصے کی شدت سے لرز رہا تھا۔

''تم نفس کشی کررہے ہو افتخار! اپنے اہلِ خاندان کے لیے، اسے صبر و سکون سے جاری رکھو اور اس بات پر یقین رکھو کہ وقت ضرور بدلتا ہے، تمہیں بہت کچھ ملے گا۔''

''کتنے برے لوگ ہیں، انسان ایسے بھی ہوتے ہیں؟'' وہ بولا۔

''ہاں! ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ میں اسے لیے ہوئے اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ دیر تک خاموش رہا، پھر بولا۔ ''جو بات آپ نے کہی، وہ غلط نہیں ہوگی؟''

''ہاں! تمہیں معلوم ہے مجھے باباپردہ پوش نے یہاں بھیجا ہے، وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کررہے ہیں، تمہیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔''

''بتایئے......!''

''ایک بار ان دونوں روشندانوں کو چیک کرلو اسی طرح بند ہیں یا کھل گئے، اگر کھلے ہوں تو دوبارہ بند کروادو۔''

''میں کرلیتا ہوں لیکن کیا ملازم کو زخمی کرنے کے بعد بلی دوبارہ کمرے میں آئے گی؟''

''ہاں! ضرور آئے گی بلکہ ممکن ہے وہ اب بھی اشتیاق کے پاس ہو۔''

''مغرب کے بعد کیا ہوگا، تجسس تو ہے۔'' افتخار بولا۔

''ان شاءاللہ چڑیل کی کہانی ختم ہوجائے گی۔''

''بڑا سسپنس ہے خیر! میں چلتا ہوں، دادا ابو کو بھی وہاں بلانا ہے؟''

''ہاں! تم انہیں لے آنا۔''

''میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' افتخار نے کہا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد واپس آگیا اور بولا۔ ''روشندان بند ہیں اور بلی کمرے میں موجود ہے، میں نے جھانک کر دیکھا ہے۔''

''ٹھیک......!''

''ایک کام سے جارہا ہوں، واپس آکر داداجان کے پاس جاؤں گا۔'' اس نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں آنکھیں بند کرکے ایک کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ بہت سے خیالات دل میں آرہے تھے، ماضی کے بہت سے کردار......! پھر بھوریا چرن، اس کے بعد اس کا پتا نہیں چلا تھا، کیا وہ ختم ہوگیا۔ یہ ایک خوشگوار تصور تھا لیکن صرف ایک خیال کے طور پر......!

آخر کار مغرب کی نماز ہوگئی۔ نماز پڑھنے کے بعد میں تیار ہوگیا۔ خود کو سنبھال کر اور جار لے کر اشتیاق کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ہلکی سی دستک دی تو اشتیاق کی آواز سنائی دی۔

''آجاؤ!'' میں اندر داخل ہوگیا۔ سب سے پہلے میری نظر اس کے بستر پر پڑی اور میں نے سکون کی سانس لی۔ بلی موجود تھی اور آرام سے اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''آیئے ڈاکٹر کامران! آیئے بیٹھیے، بڑی اکتاہٹ سوار ہے، دل نہیں لگ رہا، اس کا بھی کوئی علاج ہے؟''

''ہاں کیوں نہیں! طبیعت ٹھیک ہوجائے تو بیرونِ ملک نکل جایئے، طبیعت بحال ہوجائے گی۔''

''طبیعت ٹھیک تو ہو۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تھوڑے فاصلے پر میں نے قالین پر وہ حصار بنادیا جس کی ہدایت باباصاحب نے کی تھی۔ اشتیاق نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے طریق کار ہی ایسا اختیار کیا تھا۔ ابھی میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور نظام الدین، ان کی بیگم اور دل افروز اندر داخل ہوگئے۔

''زہے نصیب! بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آج تو!'' اشتیاق نے کہا۔

''آپ کی راجدھانی میں جی رہے ہیں، قدم بوسی کے لیے حاضری تو ضروری ہے۔'' دل افروز بولی، پھر میری طرف رخ کرکے بولی۔ ''کہیے میجک ماسٹر! شو شروع ہونے میں کتنی دیر ہے؟''

''داداجان کا انتظار ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ابھی اتنی ہی بات ہوئی تھی کہ افتخار اور داداجان اندر داخل ہوگئے۔ ''آیئے داداجان! اُدھر نہیں اِدھر تشریف رکھیے۔'' میں نے داداجان کو حصار کی طرف جانے سے روک دیا۔ سب بیٹھ گئے تھے۔

''افتخار! دروازہ بند کردو۔'' میں نے کہا اور افتخار نے دروازہ بند کردیا۔ تب میں نے داداجان کو مخاطب کرکے کہا۔ ''داداجان! آپ نے باباصاحب سے اپنے پوتے اشتیاق کے روحانی علاج کی درخواست کی تھی، باباصاحب نے مجھے اپنی دعاؤں کے سائے میں یہاں بھیج دیا، میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں، میں نے اشتیاق کا میڈیکل پوائنٹ آف ویو سے جائزہ لیا مگر مجھے ان کے اندر کوئی بیماری نظر نہیں آئی، تب باباصاحب نے مجھے روحانی رہنمائی عطا کی، اس کی روشنی میں میں نے ان کا جائزہ لیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ ان پر ایک چڑیل کا سایہ ہے۔''

میری نگاہ بلی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئی تھی اور اس کی آنکھیں سرخ اور بال کھڑے ہونے لگے تھے۔

''یہ چڑیل الٰہ آباد سے ان کے پیچھے لگی ہے، اس کا نام نرل وتی ہے اور یہ وہی لڑکی ہے جو آپ کی کوٹھی میں بے دھڑک آتی جاتی ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی، اس کے علاوہ یہ بلی......!'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ بلی کے حلق سے ایک خوفناک آواز نکلی اور اس نے ایک لمبی چھلانگ میری طرف لگائی۔ اس کے دانت خوفناک انداز میں کھلے ہوئے تھے اور وہ میری گردن کو نشانہ بنانا چاہتی تھی تاکہ میرا ٹینٹوا چبا جائے لیکن میں نے اسے بڑی مہارت سے کمر سے پکڑا اور پوری قوت سے گھما کر دیوار سے دے مارا۔

تمام لوگ ہکا بکا رہ گئے تھے۔ بلی دیوانی ہوگئی تھی، وہ پلٹ کر دوبارہ مجھ پر جھپٹی لیکن میں کھڑا ہوگیا اور میں نے کئی بار اسے اٹھا کر زمین پر مارا۔ اس وقت سب خطرے میں تھے، خود اشتیاق بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ جدوجہد دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بلی کے لیے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ بلی کو یقیناً دونوں روشندانوں کے بند ہونے کا پتا تھا کیونکہ وہ اس طرف نہیں گئی تھی، البتہ اب وہ مجھ پر حملے کرنے کے بجائے بار بار دروازے پر ٹکریں ماررہی تھی۔ اس طرف سے ناکام ہوکر اس نے پھر میری طرف رخ کیا، میں تیار تھا۔ اس بار میں نے بلی کو پکڑ کر پوری مشاقی سے حصار کی طرف پھینکا۔ بلی حصار میں گر کر اٹھی اور اس نے پھر جگہ بدلنے کی کوشش کی لیکن یوں لگا جیسے وہ کسی ٹھوس دیوار سے ٹکرائی ہو۔ اس کے بعد وہ بار بار کوششیں کرنے لگی، ساتھ ہی وہ بھیانک آواز میں چیخیں بھی ماررہی تھی، پھر وہ تھک ہار کر حصار میں گر پڑی اور ایک حیرتناک منظر نگاہوں کے سامنے آنے لگا۔ نرل وتی کا بدن بڑا ہونے لگا تھا اور وہ انسانی شکل اختیار کرنے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ اسی خوبصورت لڑکی کے روپ میں آگئی، اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ ''مجھے بچالے میرے پریمی! مجھے بچالے اس سے......چھوڑ دے مجھے، چھوڑ دے! پریم دیوانی ہوں میں اس کی، ہائے مجھے کوئی بچالے۔''

سب پاگلوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں کی آنکھوں میں شدید خوف کے آثار تھے۔ وہ چیختی رہی، پھر نڈھال ہوکر فرش پر لیٹ گئی۔ اب اس کی شکل پھر بدلنے لگی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ایک خوفناک شکل کی بھوتنی سامنے آگئی جس نے میرے اور پر جان لیوا حملے کیے تھے۔ دل افروز کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا، پھر کہا۔ ''امید ہے آپ کو یہ میجک شو پسند آیا ہوگا، چڑیلیں عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں لیکن اس وقت اس کی تمام قوتیں سلب ہوچکی ہیں، اس لیے آپ اسے دیکھ سکتی ہیں، اس کے پاؤں دیکھیے پیچھے کی طرف مڑے ہوئے ہیں، بلی کے پاؤں بھی مڑے ہوئے تھے، اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چڑیل ہے، تو میں بتا رہا تھا کہ یہ اس کی اصلی شکل ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟'' بیگم صاحبہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

''کیا یہ اسی طرح رہے گی؟'' نظام الدین نے پوچھا۔

''نہیں! میں اسے لے جاؤں گا، آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے کہا اور وہ جار لے کر حصار کی طرف بڑھا۔ زمین پر پڑی چڑیل نے اسے دیکھا اور ایک بار پھر وہ چنگھاڑنے لگی۔ ''چھوڑ دو مجھے، چھوڑ دو......بچالے مجھے میرے پریمی! سنسار کے سارے سکھ تیرے چرنوں میں وار دوں گی، بچالے۔''

خود مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اس پہاڑ جیسی عورت کو میں اتنے سے جار میں کیسے بند کروں گا لیکن باباصاحب مجھے کسی مشکل میں کہاں چھوڑتے تھے۔ اس کا بدن سکڑنے لگا، وہ تیزی سے گھٹ رہی تھی، اس کی آواز بھی باریک ہوتی جارہی تھی پھر وہ کوئی پانچ انچ کی رہ گئی۔ میں نے جار کا ڈھکن کھولا اور اسے اٹھا کر جار میں ڈال لیا۔ جار کا ڈھکن بند کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سب چونک پڑے۔

''دیکھوں......؟'' افتخار نے پوچھا۔

''ہاں! دیکھو کون ہے۔'' میں نے کہا اور افتخار دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔

افتخار منہ لٹکائے اندر آیا اور بولا۔ ''اشرف آیا ہے، باباصاحب نے گاڑی بھیجی ہے، کامران صاحب کو بلایا ہے اور کہا ہے کہ فوراً واپس آجائیں، کام ختم ہوگیا ہے، اشتیاق چندروز میں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''نہیں! یہ کیسے ممکن ہے، سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں باباصاحب سے......!'' سید علی بولے۔

''نہیں دادا ابو! یہ لوگ مجھے فوراً چلے جانے کو کہہ رہے تھے، میں نے ان سے چند گھنٹوں کی مہلت مانگی تھی۔'' میں نے کہا اور جار اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اندر کمرے میں افراتفری پھیل گئی۔ سب میرے پیچھے بھاگے۔ وہ مجھے روک رہے تھے لیکن میرے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ بابا کی طلبی تھی۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی، ڈرائیور دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ افتخار آگے بڑھا اور بولا۔ ''میرے لیے بھی کچھ کیجیے کامران صاحب!''

میں نے مسکرا کر اس سے ہاتھ ملایا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اشرف ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور کار چل پڑی۔ جار میں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ پانچ انچ کی چڑیل اب اس میں بے سدھ پڑی تھی۔ باباصاحب کی رہائشگاہ پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی۔ عمارت خوب روشن تھی۔ باباصاحب نے بڑے ہال میں میرا استقبال کیا۔

''مبارک کامران! اپنا پہلا شکار لے آئے، کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟''

''آپ ساتھ تھے باباصاحب! مشکل کیا ہوتی!''

''تمہاری ایک بات مجھے بہت پسند ہے، کسی کے لیے کچھ کرتے ہو تو کوئی صلہ قبول نہیں کرتے، صلہ ثواب کھودیتا ہے، وہ دعائیں، وہ طمانیت جو کسی کے کام کو کرکے اس کی دعاؤں سے حاصل ہوتی ہے، اپنا الگ مقام رکھتی ہے، اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کماؤ تو رزقِ حلال ہوتا ہے، جان کر ماننا تو کیا ماننا، مزہ جب ہے کہ ایمان سے مانو، مومن وہ ہے جو معبودِ لم یزل کو دیکھے بغیر جانے، اس کا ایمان سے کیا واسطہ جو کہے پہلے سامنے آؤ پھر مانیں گے، صاحبِ ایمان کسی صلے کے لیے کام نہیں کرتا، بس اس کے ایمان کا سہارا ملتا ہے اسے، آرام کرو، جمعرات کو پہلا درس ہے، اس میں شرکت کرنا۔''

باباصاحب اٹھے تو میں بھی اٹھ گیا۔ جار باباصاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ مجھے اپنی آرام گاہ معلوم تھی چنانچہ میں اس طرف بڑھ گیا۔ نہ جانے کیسے دل کو قرار آگیا تھا۔ اب گھر، اپنے یاد بھی آتے تھے تو گزری ہوئی کہانیوں کی طرح......! سب تھے۔ بہنیں، بھائی، بھابیاں، ماں، پھوپی، نانا ریاض نہ جانے کون کون......لیکن اب وہ نہیں تھے اور تھے بھی تو کتابوں کی داستانوں کی طرح! دل کے اوراق کھولو، تحریروں کی طرح دیکھ لو۔ نہ کوئی آواز، نہ لمس......!

دوسرے دن باباصاحب نے اشرف کے ذریعے بلایا۔ اس دن مجھے پتا چلا کہ اس طویل و عریض رہائشگاہ میں کوئی تہہ خانہ بھی ہے۔ یہ تہہ خانہ کوٹھی کے پورے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ پورے تہہ خانے میں بہت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ اخروٹ کی لکڑی کا ایک کاؤنٹر بھی رکھا ہوا تھا جس کے پاس باباصاحب ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر زور سے بولے۔ ''اِدھر آجاؤ کامران!'' میں اُن کے قریب پہنچا تو انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ''بیٹھو!'' میں ہچکچایا تو بولے۔ ''بیٹھ جاؤ، احترام اچھی بات ہے، احترام کرنے والے کے چہرے کے نور میں اضافہ ہوتا ہے اور بزرگوں کا حکم ماننے والے کی عمر میں، بیٹھو!'' میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

معاً میری نگاہ کاؤنٹر پر رکھی ہوئی عجیب سی چیزوں پر پڑی اور میں دنگ رہ گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے شیشے کے جار تھے۔ ویسے ہی جس میں، میں نے نرل وتی کو بند کیا تھا۔ آٹھ جار تھے جن میں طرح طرح کی بھیانک شکلیں نظر آرہی تھیں، باقی بہت سے خالی جار رکھے ہوئے تھے۔

''یہ وہ ہیں جو خود کو بہت سرکش اور طاقتور سمجھتے تھے، انہیں اُن کے برے عمل کی سزا دی گئی ہے، مختلف انداز کی سزائیں ہیں ان کی، بھٹکی ہوئی روحیں ہیں، شیطان کی بگاڑی ہوئی......! بے وقوف یہ نہیں سوچتے کہ مالکِ کائنات ہر لمحے پر قادر ہے، وہ جسے چاہے، جب چاہے کسی کو اس کے اعمال کی سزا یا جزا دیدے، اس کے ایک اشارے پر شیطان ملعون بھی ایک معمولی سے جار میں بند نظر آئے لیکن وہ قادر اپنی مخلوق کو آزماتا رہتا ہے، اس نے اپنی تخلیق کو اس کائنات سے نوازا ہے، اسے سب کچھ عطا فرمایا ہے، وہ کچھ جس کی فہرست بنائی جائے تو عمر ناکافی ہے، وہ یہی دیکھتا ہے کہ کون کتنا شکر گزار ہے۔''

میں نے غور سے دیکھا تو ایک جار میں مجھے نرل وتی بھی نظر آئی، تب میں نے سوچا کہ کاش ایسے ہی ایک جار میں مجھے بھوریا چرن بھی قید نظر آئے۔

''جمعرات کو یہیں درس ہوگا، تہہ خانے کا راستہ تمہیں پتا چل گیا؟''

''واپسی میں اور غور سے دیکھ لوں گا۔''

''عشاء کے بعد آجانا۔'' انہوں نے کہا، پھر بولے۔ ''افلاک......! بھئی بڑے کنجوس ہوگئے ہو، کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔'' وہ کچھ لمحے رک کر پھر بولے۔ ''ہاں......ہاں! لے آؤ، خود ہی لے آؤ، اب رونمائی ہو ہی جائے گی، لے آؤ۔'' اور چند ہی لمحوں کے بعد ایک خوشنما میز سامنے آگئی، پھر اس پر اتنے خوبصورت پھل آسجے جن کی مثال مشکل! اس کے بعد چائے کی کیتلی اور پیالیاں وغیرہ جن کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔ کوئی نادیدہ وجود یہ سب کررہا تھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

''چلو کامران! شروع ہوجاؤ، یہ افلاک ہے، ہمارا دوست! بہت جلد تم سے ملاقات کرے گا۔'' میں نے خاموشی سے ہاتھ بڑھادیئے۔ باباصاحب بھی میرے ساتھ شریک ہوگئے تھے۔

''روحانی عدالت میں تمہاری درخواست پہنچادی گئی ہے، وہاں ساعت میں وقت لگتا ہے، ان شاءاللہ تمہیں رکن بنالیا جائے گا۔'' باباصاحب نے کہا۔

میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی تھی پھر باباصاحب کی اجازت سے واپس آگیا لیکن میرے دل پر بہت اثر تھا، نبض بہت تیز ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھے تھے لیکن اب اُس سے بڑا اعزاز مل رہا تھا۔ افلاک کے بارے میں سوچا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس سے باباصاحب کی شان اور بڑھ رہی تھی۔ ویسے اشتیاق کے سلسلے میں جو کچھ ہوا تھا، اسی سے باباصاحب کی شخصیت پتا چلتی تھی۔ قدرت نے مجھے ان کی شکل میں بہت کچھ عطا کردیا تھا۔

مقررہ دن اور مقررہ وقت پر میں تہہ خانے کی طرف چل پڑا۔ اس بارے میں مجھے مطلع کردیا گیا تھا۔ تہہ خانے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی، قالین پر ایک سفید چادر بچھادی گئی تھی، وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنے طور پر ایک گوشہ منتخب کیا اور بیٹھ گیا۔ آنکھیں تاریکی کی عادی ہوگئیں تو میں نے ہال پر نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف تخت بچھا ہوا تھا جس پر منبر رکھا ہوا تھا۔ میں خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک پورے ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ روشنی کے مرکز کا پتا نہیں چل رہا تھا لیکن ہال منور ہوگیا تھا۔

پھر اچانک ہال کی دیواروں میں دروازے کھلنے لگے۔ میں حیرت سے چونک پڑا۔ اس دن باباصاحب کے پاس آیا تھا، تب اس ہال کی دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں نظر آیا تھا، ابھی ہال میں نظریں دوڑا رہا تھا تب بھی میں نے یہ دروازے نہیں دیکھے تھے، پھر ان دروازوں سے لوگ اندر آنے لگے۔ لمبے لمبے جبّے پہنے ہوئے، عمامے باندھے ہوئے، پُرنور چہرے، مختلف عمریں......! ان کے قد و قامت بھی غیر معمولی تھے۔ یہ لوگ خاموشی سے سفید چادر پر بیٹھنے لگے۔ میں نے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا تھا۔ پورا وسیع و عریض ہال بھر گیا تو ہال کے عقبی دروازے سے ایک خوشرو نوجوان اندر آیا اور احترام سے گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

اس کے پیچھے باباپردہ پوش نمودار ہوئے تو سارے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ احترام سے کھڑے ہوگئے۔ میں بھی فوراً کھڑا ہوگیا۔ باباصاحب منبر پر جابیٹھے اور انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے حاضرین کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ سب بیٹھ گئے۔ باباصاحب نے سلام کے بعد کہا۔ ''ایک نئے مہمان کا تعارف کرارہا ہوں، وہ جو اس گوشے میں بیٹھے ہوئے ہیں، آدم زاد ہیں، نام کامران مسعود ہے، ایک صاحبِ ایمان باپ کے بیٹے ہیں جنہوں نے ساری عمر بدی کے خلاف جنگ کی اور اب کامران ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، آپ سب چہرہ شناسی کرلیں تاکہ انہیں کہیں مشکل میں دیکھیں تو ان کا ساتھ دیں۔''

تمام گردنیں میری طرف مڑ گئیں پھر مشترکہ آوازیں ابھریں۔ ''ان شاءاللہ!''

''شکریہ......کامران! توجہ کیجیے، پہلی بات یہ کہ چھپانا انکساری ہے اور اظہار یا نمائش کرنا غرور کے زمرے میں آتا ہے، عطا معبود کی ہے جو دل کے اس گوشے میں رہتا ہے جہاں صرف اس کے خیال کی روشنی ہوتی ہے اور کسی اور طلب کی گنجائش نہیں ہوتی، جیسے اپنی ذات کا تعارف جو غرور یا خودنمائی کی منزل کی طرف رخ کرتا ہے، عجز بند مٹھی میں جگنو کی طرح ہوتا ہے اور غرور کسی عیش گاہ کی چھت میں لٹکا فانوس! جو بے شک عیش گاہیں روشن کرتا ہے لیکن وہ انسان کے ہاتھوں کی تخلیق ہوتا ہے، برقی رو کا محتاج! بجلی چلی جائے تو روشنی ختم......! جبکہ جگنو کی تخلیق ذاتِ ایزدی کی ہے، ہمیشہ روشن رہنے والی، چنانچہ اپنا علم، اپنا ہنر، اپنا ظرف مٹھی میں بند جگنو کی طرح چھپاؤ۔ خود کو ظاہر کرکے داد پاؤ گے تو بڑائی کھو بیٹھو گے، کبھی بڑا فیصلہ خود نہ کرو، اس میں رہنما سے رہنمائی طلب کرو اور یاد رکھنا خود کو خودنمائی کے امتحان میں ڈالو گے تو موت بھی تم سے نفرت کرے گی۔''

باباصاحب کا ایک ایک لفظ بجلی کی طرح دماغ میں چمک رہا تھا، کانوں میں گرج رہا تھا۔ درس دیر تک جاری رہا، پھر باباصاحب نے آخری الفاظ ادا کیے اور خاموش ہوگئے۔ تمام حاضرین اٹھ اٹھ کر باہر نکلنے لگے۔ آخر میں باباصاحب بھی اسی دروازے سے چلے گئے تو افلاک میرے پاس آگیا۔ یہ وہی خوشرو نوجوان تھا جس نے باباصاحب کے ساتھ ہال میں قدم رکھا تھا۔

''آپ بھی آرام فرمایئے، اب کسی بھی حاجت پر مجھے آواز دے لیا کیجیے، یہ باباصاحب کا حکم ہے۔'' میں ہال کا راستہ طے کرکے اپنی آرام گاہ میں آگیا۔ عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ معبودِ عظیم! میں نے کون سی ایسی نیکی کی تھی جس کے عوض تو مجھے ایسے مرتبے سے نواز رہا ہے۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب ایک عجیب سی سیر چشمی کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ میرے پاس ہو، کوئی تشنگی باقی نہ ہو۔ نماز کا شروع سے عادی تھا۔

ایک صبح جاگا تو ایک عجیب احساس ہوا۔ سامنے کا منظر دیکھا تو کمرے کی دیوار تھی لیکن پھر دیوار تحلیل ہوتی محسوس ہوئی اور باہر باغ کا منظر نظر آنے لگا۔ میں حیران رہ گیا۔ باغ میں پرندوں کے لیے خوراک اور پانی رکھا تھا۔ فاختاؤں کا ایک خوبصورت جوڑا پانی پی رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ جو دیکھ رہا ہوں، صرف تخیل ہے کہ سچ! باہر نکل آیا۔ سامنے کنڈلی میں فاختاؤں کا جوڑا پانی پی رہا تھا۔

اس کے بعد یہ مسلسل ہونے لگا۔

باباصاحب نے حکم دیا تھا کہ گھر میں قیدی بن کر نہ رہوں، باہر گھوما پھرا کروں۔ کبھی کبھی اشرف سے کہتا تو وہی گاڑی آجاتی جو مجھے لینے نظام علی کے گھر گئی تھی۔ ڈرائیور بھی وہی ہوتا لیکن اس سے کبھی بات نہ ہوئی، چنانچہ گھر سے باہر نکل جاتا مگر باہر بھی وہی کیفیت رہتی۔ کبھی لگتا جیسے وحشی درندوں کے غول آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہوں، کبھی سانپ، بچھو اور دوسرے حشرات الارض رینگتے نظر آتے۔

ایک دن باباصاحب سے تذکرہ کیا تو خوشگوار لہجے میں بولے۔ ''مبارک ہو، آغاز ہوگیا ہے۔''

''کیسا آغاز باباصاحب......؟''

''آنکھوں میں روشنی آرہی ہے، ایک عمل بتارہا ہوں، اس کا آغاز کردو۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد باباصاحب پھر بولے۔ ''افلاک تمہیں کچھ چیزیں مہیا کردے گا، وہ ان ساری چیزوں کو ضرورت کے مطابق نصب بھی کرسکتا ہے لیکن بہتر ہے اپنا یہ کام تم خود کرو، ایک آئینہ ہوگا جسے تم دو حصوں میں تقسیم کرکے دیوار پر لگالینا، اس کے بائیں حصے کو سیاہ کپڑے سے ڈھکنا ہوگا، اس کام کی تکمیل کے بعد تم دیوار سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوکر آئینے میں اپنا عکس دیکھو گے، یہ کام تمہیں دن کے وقت کرنا ہوگا جب سورج چمک رہا ہو اور اس کا عکس آئینے پر ہو اور اس کی چمک تمہاری آنکھوں کو خیرہ کررہی ہو لیکن تمہیں ایک آنکھ بند کرکے آئینے کے کالے حصے کو دیکھنا ہوگا یعنی کالے کپڑے والے حصے کو! پھر دوسری آنکھ کو پوری طرح کھول کر چمکدار حصے کو دیکھو، لیکن چکاچوند برداشت کرنی ہوگی، اس کے ساتھ تمہیں کچھ کلمات پڑھنے ہوں گے، یہ عمل سات دن کے لیے ہوگا، سات دن کے بعد تمہاری آنکھوں اور دماغ کا راستہ ایک ہوجائے گا اور تمہارے اندر اتنی قوت پیدا ہوجائے گی کہ تم کسی بھی انسان کے دوسرے روپ کو دیکھ سکو اور اس کے اندر کا حال جان سکو، یہ مشغلہ بہت دلچسپ ہوگا اور تم ایسے دردمندوں کے بارے میں جان سکو گے جن کی مدد کرکے تم ثواب کما سکتے ہو۔''

میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ شیطان بھوریا چرن نے مجھے کالے جادو کی قوت سے کسی بھی مریض کے اندر جھانک کر اس کی بیماری جاننے کی طاقت دی تھی، لیکن درحقیقت مجھے ہمیشہ ایک شرمندگی سی رہی تھی کہ میں ایک ناپاک قوت کے زیرِ اثر یہ سب کچھ کرکے شہرت حاصل کررہا ہوں۔ اب باباصاحب نے یہ روحانی عمل بتایا تھا، جس کی تکمیل کرکے مجھے جو قوت حاصل ہوگی، وہ روحانی قوت ہوگی۔

افلاک نے مجھے مطلوبہ چیزیں مہیا کردیں اور میں نے تسلی بخش طور پر انہیں نصب کرلیا، پھر میں نے پوری توجہ سے اس عمل کا آغاز کردیا۔ ایک آنکھ بند کرکے میں کالے کپڑے کو دیکھتا، پھر دوسری آنکھ سے سورج کی روشنی کو! ساتھ ہی باباصاحب کے بتائے ہوئے الفاظ کو دہراتا۔

سات دن پورے ہوگئے تو میں باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ انہوں نے معمول کے مطابق میرا استقبال کیا اور بولے۔ ''کبھی کبھی شاگرد بھی استاد کی کمزوری بن جاتا ہے، تم جس لگن اور سعادت مندی سے ہر عمل بے لوث اور محنت سے کرتے ہو، وہ تمہاری خوبی ہے، آج میں تم سے تمہارے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

میرے دل میں خوشی کی لہر بیدار ہوگئی۔ باباصاحب بولے۔ ''تم نے اپنے والد صاحب کے بارے میں بتایا تھا کہ اپنے لاابالی دور میں وہ ایک بدکار سادھو کے جال میں پھنس گئے تھے لیکن اپنی قوتِ ایمانی سے وہ ہر مشکل جھیل گئے، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ماں، باپ کی وراثت اولاد کو ہی ملتی ہے خواہ وہ روپے پیسے اور جائداد کی شکل میں ہو، خواہ نام و نمود کی شکل میں! ایک برے اور بدکار شخص کے چھوڑے ہوئے برے عمل بھی کبھی اولاد کو بھگتنے پڑتے ہیں اور اسی طرح نیک عمل بھی اولاد کو ورثہ ہوتے ہیں، مالکِ لم یزل نے تمہیں بہت سے اعزازات عطا فرمائے ہیں، ان میں کچھ تمہارے والد کا ورثہ ہے اور کچھ تمہاری ذاتی کمائی! خیر تم نے اس ملعون کو اس کی ناپاک خواہشوں سے دور کردیا ہے اور وہ بہت پیچھے چلا گیا ہے لیکن یہ بدکار ناپاک روحیں شیطانی قوتوں سے آراستہ ہوتی ہیں اور شیطان کو آزادی ہے روزِ قیامت تک! اسے اپنے اپنے پسندیدہ ہرکاروں کی نگرانی بھی کرنی ہوتی ہے، ہرچند ہر ذی روح کو فنا ہے اور جلد یا بدیر اسے چلے جانا ہوتا ہے لیکن شیطانی عمل سے اس کی زندگی کچھ طویل ہوجاتی ہے، تم میری بات سمجھ رہے ہو۔''

''جی......!''

''لیکن آخر کار موت برحق!''

''بھوریا چرن زندہ ہے؟'' میں نے بے اختیار سوال کیا۔

''اگر وہ زندہ بھی ہے تو بدبختی کے دن گزار رہا ہوگا اور اس نے شیطان کی پناہ حاصل کی ہوگی۔'' باباصاحب نے گول مول سا جواب دیا اور میں خاموش......!'' بات وہیں سے شروع کرتے ہیں، تم نے اپنا ایک عمل مکمل کرلیا ہے، تم کسی بھی شخص کے ذہن میں جھانک کر اس کا باطن معلوم کرسکتے ہو لیکن علم کا استعمال کبھی بے جا نہ کرو، اس طرح تمہارا علم تمہارے سینے میں محفوظ رہے گا، تم اس کی حفاظت کرو گے تو یہ تمہاری حفاظت کرے گا، کبھی کسی کے دماغ میں غیر ضروری جھانکنے کی کوشش مت کرنا، وہ تمہارے لیے سخت نقصان دہ ہوگا، یاد رکھنا جہاں جاننا ایک نعمت ہے، وہاں نہ جاننا اس سے بڑی نعمت ہے، آج کی باتیں ختم، آرام کرو اور سنو......دل کا کیا حال ہے؟''

''میں خوش ہوں باباصاحب!''

''لیکن لہجے میں کرب ہے۔ کیوں......؟''

''باباصاحب! کبھی کبھی گھر بہت یاد آتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''بالکل آتا ہوگا لیکن زندگی کے عمل کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''میں نہیں سمجھا باباصاحب!''

''میں سمجھاتا ہوں، نوعمری ہوتی ہے۔ ماں، باپ اور دوسرے رشتوں کا پیار حاصل ہوتا ہے، جوان ہوتے ہو، بوڑھے ہوتے ہو، مرجاتے ہو، سب رشتے کھو جاتے ہیں......جنہیں اپنے پیچھے سوگوار چھوڑ جاتے ہو، وہ اپنی زندگی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں، کچھ عرصے غمزدہ رہتے ہیں پھر بھول جانے کا قدرتی عمل شروع ہوتا ہے اور وہ اس میں گم ہوجاتے ہیں، یہ کائنات اسی طرح چلتی ہے......جو چیز ہمیشہ زندہ رکھتی ہے، جانتے ہو وہ کیا ہے؟''

''آپ فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''علم!'' باباصاحب بولے۔ ''اور علم ایک کنویں کے گرد چکراتے ہوئے نہیں ملتا، اس کے لیے حرکت بہت ضروری ہے، دنیا میں لاتعداد صاحبِ علم پڑے ہیں، کس کے پاس کیا ہے، کون جانے، دیکھو گے، ملو گے تو پتا چلے گا۔''

''مجھے کہاں جانا ہوگا باباصاحب......؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں، یہ تعین تو قسمت کرتی ہے، بس تمہیں آغاز کرنا ہوگا، اب جاؤ، میں نے تمہیں دوبارہ روک لیا اور سنو یہ رومال لے جاؤ، تم عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھاتے ہو؟''

''جی باباصاحب!''

''کھانے کے ایک گھنٹے کے بعد باہر لان پر نکل جانا، وہاں انار کے درختوں کے جھنڈ کے پاس دوزانو بیٹھ جانا اور یہ رومال سر پر اوڑھ کر آنکھیں بند کرلینا۔''

''بہتر!'' میں نے احترام سے رومال لے لیا۔ اپنی رہائشگاہ آکر میں باباصاحب کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ زبردست معرفت کی باتیں تھیں اور دل میں بڑا اعتماد پیدا کرتی تھیں۔

رات کو آسمان پر گہرے کالے بادل چھاگئے۔ مجھے انتظار تھا۔ نماز پڑھی، کھانا کھایا پھر انار کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ ایک مناسب جگہ منتخب کرکے بیٹھا اور رومال کو سر پر اوڑھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی دیر گزر گئی، پھر بند آنکھوں میں ستارے ناچنے لگے۔ یہ ستارے روشن ہوتے جارہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے روشنیاں جل رہی ہیں۔ یہ روشنیاں واضح ہوتی جارہی تھیں اور پھر اچانک دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یہ میرا گھر تھا، سوفیصد میرا گھر تھا، وہی جمشید روڈ والا......! لیکن اس میں تیز روشنی ہورہی تھی، چاروں طرف رنگین بلب جھلملارہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا کوئی تقریب ہورہی تھی، کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں، لوگ پلیٹیں بھررہے تھے، کھارہے تھے، ہنس بول رہے تھے۔ ایک ایک کو غور سے دیکھا، سب موجود تھے۔ نانا ریاض، پھوپی شمسہ، غالباً شمسہ پھوپی کے کسی بیٹے کی کوئی تقریب تھی۔ سب خوش تھے۔ میرے بھائی بہترین سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ بھابیاں بال بال موتی پروئے ہوئے تھیں اور مہمانوں کی خاطر مدارات کررہی تھیں۔ یہ سب کچھ سچ تھا، کیا یہ سب کچھ سچ ہے، یہ لوگ مجھے بھول گئے، انہوں نے مجھ پر صبر کرلیا۔ ایسا ہوتا ہے، کیا واقعی ایسا ہوتا ہے، ساتھ میں ایک پُروقار آواز میرے کانوں میں گونجی۔

''جوان ہوتے ہو......بوڑھے ہوجاتے ہو......مرجاتے ہو......سب رشتے کھو جاتے ہیں......بھول جانے کا قدرتی عمل شروع ہوتا ہے۔''

لیکن میں تو زندہ ہوں۔ اچانک ذہن کو جھٹکا لگا۔ ماں کہاں ہے، ثریا بیگم کہاں ہیں، پھر ایک کمرے کا منظر ابھرا۔ یہ امی کا کمرہ تھا۔ سفید لباس میں ملبوس، پاکیزہ چہرہ، وہ جائے نماز پر خاموش غمزدہ بیٹھی تھیں، باہر کے ہنگاموں سے بے نیاز......! ان کی آنکھوں میں......میں ڈبڈبا رہا تھا، میری تصویر صاف نظر آرہی تھی ماں کے آنسوؤں میں تیرتی ہوئی۔ حلق میں ایک گولہ سا اٹھا، بہت سی روایتوں کی تصدیق ہوگئی۔ کائنات کا سچ سب سے بڑا صرف ایک سچ، جس کا تعلق رشتے سے ہے جس کے نام کے ساتھ پیار کا نام بجتا ہے، وہ ماں ہے۔ کسی کو نہ سہی میں امی کو یاد ہوں، زندہ رہوں گا امی! لیکن مجھ سے وعدہ کریں آپ کو بھی زندہ رہنا ہوگا تاکہ میرے واپس آنے کا جواز رہے۔ میں نے پیار سے ماں کے تصور کو چوما اور منظر بدل گیا۔ یہ شاید ماضی کے مناظر تھے۔ بھائی انڈیا سے واپس گئے تھے، امتیاز نے پریس کانفرنس بلائی تھی، بھائی سے سوالات ہورہے تھے۔ ڈاکٹر رضوان کہہ رہے تھے وہ پاکستان کا عظیم سرمایہ ہے، اس کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ سائرہ کہہ رہی تھی۔ ان کی فطرت میں پاکیزگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کی گواہ میں ہوں۔ میرے لیے احتجاجی ریلی نکالی جارہی تھی۔ اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ میری گمشدگی اور اس سے متعلق جو کہانی سنائی جارہی ہے، وہ من گھڑت ہے، پھر دیکھا کہ ایک سرکاری عمارت میں ڈاکٹروں کی کانفرنس ہورہی ہے، وہاں میری تصویریں اور میرے نام کے بینر لگے ہوئے ہیں، بس اس کے بعد منظر تاریک ہوگیا۔

میں عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ اب ساری حقیقت کا ادراک ہورہا تھا۔ میں نے باباصاحب سے کہا تھا کہ کبھی کبھی گھر بہت یاد آتا ہے، جس کے جواب میں باباصاحب نے مجھے گھر دکھا دیا تھا، گھر والے دکھادیئے تھے جو مطمئن تھے، خوشیوں میں وقت گزار رہے تھے اور میں......! اپنے باپ کا ہمشکل ایمان کا سفر کررہا تھا، اپنے باپ کے مشن کو آگے بڑھا رہا تھا اور ممکن ہے کبھی میرا ایک بیٹا جو میرا ہمشکل ہوگا، اسی مشن کا علم ہاتھ میں لیے کسی اور بھوریا چرن کے گندے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے سرگرم ہو۔

میں نے سر سے رومال اتارا۔ ابھی اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ پیچھے سرسراہٹ سی ابھری، دیکھا تو افلاک تھا۔

''باباصاحب نے رومال واپس منگوایا ہے۔'' وہ بولا اور میں نے رومال احترام سے تہہ کرکے اسے دے دیا۔

''میرے لیے اور کوئی حکم تو نہیں......؟''

''فرمایا ہے کہ اب آپ اپنے کمرے میں جاکر آرام کریں۔'' افلاک نے کہا اور نگاہوں سے گم ہوگیا۔ میں گہری سانس لے کر واپس چل پڑا۔ گھر دیکھ لیا تھا۔ بلاوجہ تڑپ رہا ہوں، وہ سب آرام سے ہیں۔ مجھے جو نعمتیں مل رہی ہیں باباصاحب کی رہنمائی میں، ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔

چندروز اور گزر گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دن میں نے اپنے گھر کا جو منظر دیکھا تھا، اس سے مجھے بڑی عبرت حاصل ہوئی تھی۔ میں ان لوگوں کے ذہن سے نکلا تو نہیں ہوں گا لیکن اب انہوں نے میری جستجو ترک کردی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر اب میں وطن واپس جانا چاہوں تو شاید مجھے دقت نہ ہو، لیکن باباصاحب نے اس کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ یہ دکھا دیا تھا کہ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں، ان کی زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔ میں نہیں ہوں تو کیا ہوا۔ بابا اگر مناسب سمجھتے تو گھر کا حال دکھانے کے بجائے مجھے گھر جانے کا حکم دے سکتے تھے۔ البتہ ایک دن انہوں نے حکم دیا۔ ''ہاتھرس ایک شہر کا نام ہے، اس کے قریب قصبہ مینڈو جنکشن ہے، وہاں چلے جاؤ، ریل سے جانا، اسٹیشن پر تمہیں غلام قادر نامی ایک نوجوان ملے گا، اس کی ماں بیمار ہے، وہ خود کچھ ایسی خوبیوں کا حامل ہے کہ اسے کچھ وقت ساتھ رکھا جاسکتا ہے، اشرف تیاریاں کرادے گا، میری طرف سے خدا حافظ! اصل کام کچھ اور ہے، جس کی تفصیل وقت کی زبانی سن لوگے۔''

''بہتر......!'' میں نے گردن خم کرکے کہا۔ پتا نہیں یہ میرے اندر کی خوبی تھی یا مرشد کی عطا کہ میرے اندر بڑا حلم پیدا ہوگیا تھا۔ اب کسی بات پر تردد نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی حکم کی کھوج! مزید خوبی یہ تھی کہ اب کوئی خوف دل میں نہیں رہ گیا تھا۔ پولیس کے لوگ نظر آتے تھے تو انہیں اجنبی نگاہوں سے دیکھتا گزر جاتا، کوئی خوف دل میں نہ آتا۔ بار ہا بڑی بڑی مکڑیاں نظر آئیں مگر انہیں دیکھ کر بھوریا چرن کا خیال دل میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ دل میں کوئی بیزاری کا تصور بھی نہیں تھا۔ صبح خوبصورت لگتی تھی اور شام آسودہ!

اشرف نے جو چیزیں مجھے دیں، ان میں بہترین لباس، شیونگ بکس اور ایک امپورٹڈ میڈیکل بکس جس میں بی پی آپریٹس، اسٹیتھسکوپ، دوسرے چھوٹے جدید آلات اور دوائیں تھیں۔ گویا مجھے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بھیجا جارہا تھا۔ خاصی کرنسی بھی تھی، پھر اشرف نے مجھے ٹرین میں بٹھا کر روانہ کیا۔

ٹرین کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ اسٹیشن آتے جاتے رہے۔ ہندوستان کے اور شہر بھی آنکھوں کے سامنے آئے جن میں یہاں کا کلچر نظر آتا تھا، پھر ایک بڑی سی سل پر مینڈو جنکشن لکھا نظر آیا اور ٹرین آہستہ ہوگئی۔ اسے کچھ منٹ کے بعد آگے جانا تھا۔

میں اپنے مختصر سامان کے ساتھ نیچے اترا ہی تھا کہ ایک خوش شکل اور خوش مزاج سے نوجوان نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور بولا۔ ''میرا نام غلام قادر ہے ڈاکٹر صاحب!''

''تم نے مجھے خوب پہچانا غلام قادر! کہو ماں کیسی ہے؟''

''بہت اچھی، بلکہ بہت ہی اچھی! کیونکہ جنت جاچکی ہے۔'' غلام قادر نے کہا اور میں چونک پڑا۔ ''اوہ کب......؟''

''پرسوں رات! مرض لاعلاج ہوچکا تھا، دق ہوگئی تھی، کلی بھر بھر خون اگلتی تھی، خون ختم ہوگیا، مرگئی۔''

''مجھے بہت افسوس ہوا غلام قادر!''

''بس جی اللہ کی مرضی! آیئے۔'' غلام قادر نے کہا۔

ہم چھوٹے سے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ باہر ایک اور چیز دیکھی۔ پاکستان کے کچھ شہروں اور دیہاتوں میں کہیں کہیں تانگے نظر آجاتے ہیں لیکن یہ بدلی ہوئی شکل یہاں یکّہ کہلاتی ہے۔ گول چھتری کے نیچے بیٹھنے کی جگہ، آگے گھوڑا جتا ہوا۔ ایک ایسے ہی یکّے میں بیٹھ کر ہم چل پڑے۔ چھوٹے سے قصبے سے خاصے فاصلے پر غلام قادر کا گاؤں جنک پوری تھا، جس کے بارے میں غلام قادر نے راستے میں بتایا تھا۔

قصبہ ختم ہوگیا تو ایک چوڑی نہر نظر آئی جس کے اطراف سبزہ ہی سبزہ، ہرے بھرے کھیت کھلیان، درخت، مویشی، پھر چھوٹا سا گاؤں جنک پوری اور پھر غلام قادر کا گھر......! دو کچے کمرے، بڑا سا دالان اور خوب بڑا صحن......! جس میں کیکر اور آم کے درخت تھے۔ ایک کنواں، بیلوں کی جوڑی، مرغیوں کے ڈربے تھے۔ ایک بالکل ہی الگ ماحول، سب کچھ بے حد خوبصورت اور انوکھا......! غلام قادر کی ماں مرچکی ہے، پھر میں یہاں کیوں آیا ہوں۔

معاً میرے کانوں میں باباصاحب کے الفاظ گونجے۔

''اصل کام کچھ اور ہے، جس کی تفصیل وقت کی زبانی سن لوگے۔''

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 15

غلام قادر بڑا خوش مزاج نوجوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی گھر تک محدود کرلی تھی۔ ”یہ سب جاندار میرے رشتے دار ہیں ڈاکٹر صاحب! ان کے ساتھ زندگی گزر رہی ہے، زمینوں کی آمدنی آجاتی ہے، ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں۔“

”ماں کے علاوہ اور تمہارے رشتے دار نہیں ہیں؟“

میری بات سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ہنس پڑا۔ ”بتایا نا آپ کو، یہ سب میرے رشتے دار ہی ہیں، اب آپ سے کیا پردہ، مرنے والی بھی میری سگی ماں نہیں تھی۔“

”کیا مطلب......؟“ میں چونک پڑا۔

”میری ہی طرح تھی، نہ اس کا کوئی تھا اس دنیا میں نہ میرا! ہم دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ اپنا لیا، وہ بریلی والے باباجی کی مرید تھی، بس کبھی کبھی میرے ساتھ اُن سے ملنے چلی جاتی تھی اور بس......ایک بات ڈاکٹر صاحب! آپ ماں کے علاج کے لیے آئے تھے نا......؟“

”ہاں......!“

”کیا اب واپس چلے جائیں گے؟“

”کچھ وقت تمہارے ساتھ گزار کر!“

”اللہ خوش رکھے، میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا، بریلی میں آپ کا اسپتال ہے؟“

”نہیں!“

”ڈاکٹر صاحب! جنک پوری غریبوں کی بستی ہے، یہاں کے لوگ شہر جا کر علاج نہیں کرا سکتے، کوئی سرکاری اسپتال بھی نہیں ہے، یہاں ایک دو ڈاکٹر دکانیں کھولے بیٹھے ہیں، وہ بڑے مہنگے ہیں اور ان کے علاج سے لوگوں کو فائدہ بھی نہیں ہوتا، ہم نے کئی بار ایسے خواب دیکھے ہیں کہ ایک ڈاکٹر آیا اور اس نے لوگوں کے مفت علاج کیے اور لوگ ٹھیک ہوگئے، آپ ہمارا خواب پورا کردیں۔“

”ارے واہ غلام قادر...! تم کہو اور میں تمہاری بات نہ مانوں۔“

”اللہ خوش رکھے، مالک آپ کو اس کا بڑا صلہ دے گا، وہ کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔“ غلام قادر خوشی سے پاگل ہوگیا تھا، پھر اس نے ان بیماروں کی فہرست بتانی شروع کردی جو اس کے بقول شہر جا کر اپنا علاج نہیں کرا سکتے تھے۔ وہ خود جا کر ان سے ملتا اور انہیں ان کے علاج کی خوشخبری دیتا، میں جا کر انہیں دیکھتا، انہیں دوائیں دیتا اور اللہ کے فضل سے وہ ٹھیک ہوجاتے۔ چند ہی دنوں میں اس چھوٹے سے گاؤں میں میری دھوم مچ گئی۔ غلام قادر ان کا ہیرو بن گیا۔ یہ لوگ عام قسم کے مریض ہوتے تھے۔ سب سے بڑی بیماری ان کی غربت ہوتی تھی۔ اب زیادہ تر مریض غلام قادر کے گھر ہی آجاتے تھے، اس طرح یہ گھر ایک چھوٹا موٹا اسپتال بن گیا تھا۔

کوئی بیس دن ہوگئے تھے یہاں آئے ہوئے۔ ایک دن میں اور غلام قادر ایک بازار سے گزر رہے تھے کہ میں نے دو فقیر دیکھے۔ ایک فقیر میلا کچیلا ہندوانہ لباس پہنے لکڑی کی ہاتھ گاڑی کو دھکیل رہا تھا جس میں دوسرا اپاہج فقیر لیٹا ہوا تھا۔ لوگ اسے بھیک دے رہے تھے۔ ان کے انداز میں بڑی عقیدت تھی۔

ہم دونوں ان فقیروں کے پاس سے گزرنے لگے تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تاکہ میں انہیں کچھ دیدوں لیکن اسی وقت غلام قادر بول پڑا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! وہ ہمارے ہاتھ سے کچھ نہیں لیں گے۔“

”کیوں......؟“

”وہ صرف ہندوؤں سے بھیک لیتے ہیں۔“

”اچھا!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا اور فقیروں کو کچھ دینے کا ارادہ ترک کرکے آگے بڑھ گیا۔

غلام قادر مجھے ان کے بارے میں مزید بتانے لگا۔ ”جنک پوری میں کوئی تعصب نہیں ہے، یہاں کبھی ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے، سب مل جل کر رہتے ہیں لیکن تھوڑے دنوں سے کھنچاؤ پیدا ہونے لگا ہے جس کا ذمہ دار یہی کالی کندھیر ہے۔“

”کالی کندھیر......؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے غلام قادر کو دیکھا۔

”یہ اسی سادھو کا نام ہے، کہیں اور سے یہاں آیا ہے، پیلی پوکھر پر اپنی کٹیا بنائی ہے، وہیں رہتا ہے، بہت سے ہندو اس کے عقیدت مند ہیں، یہ ان کی بیماریوں کا مفت علاج کرتا ہے، مسلمانوں کے لیے اس کی کٹیا پر جانے پر پابندی ہے، اس کے ساتھ دو اور آدمی ہیں جو صاف کہتے ہیں کہ کوئی مسلمان یہاں نہ آئے، خود آبادی میں آکر بھیک مانگتا ہے۔“

”ٹھیک!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

ہم دونوں جہاں جا رہے تھے، وہاں پہنچ گئے۔ غلام قادر نے بازار سے ضرورت کی کچھ چیزیں خریدیں اور واپس چل پڑے۔ بازار کے اختتام کے بعد ایک وسیع میدان تھا جس کے آخری سرے پر کھیت لہرا رہے تھے۔

میدان کے اس سرے پر جہاں اس وقت ہم پہنچے تھے، چند درخت تھے جن میں سے ایک درخت کے نیچے وہ گاڑی نظر آئی جس میں معذور فقیر لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر اسے دھکیلنے والا دوسرا فقیر نظر آرہا تھا۔

میں نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا اور دوسرے لمحے میرے ذہن میں دھماکا ہوا۔ یہ شکل میری جانی پہچانی تھی۔ یہ بنسی راج تھا، سوفیصد بنسی راج۔ بھوریا چرن کا خاص آدمی، جس سے میرا خاصا واسطہ رہا تھا۔ دماغ میں خیالات کی چرخی سی چل پڑی۔ بالکل غیر اختیاری طور پر میں نے بھاگ کر گاڑی میں لیٹے ہوئے معذور فقیر کو دیکھا۔

وہ بھوریا چرن تھا۔ ہاتھوں اور پیروں سے محروم بھوریا چرن...... بے بس، بے کس......! اس نے بھی مجھے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ سخت دہشت زدہ ہوگیا۔ اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور پھر وہ مسلسل چیخنے لگا۔ اس کی پہلی ہی چیخ پر بنسی راج اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا، پھر وہ آندھی طوفان کی طرح گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا لیکن مجھ سے کچھ کہنے سننے کے بجائے وہ گاڑی لے کر بھاگنے لگا۔ اس کی رفتار بے حد تیز تھی۔ کچے راستے پر گاڑی بری طرح اچھل رہی تھی، پتا نہیں اس میں لیٹے ہوئے بھوریا چرن کا کیا حال ہو رہا ہوگا لیکن بنسی راج کے پیروں میں پنکھے لگے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میدان عبور کرکے کھیتوں تک پہنچا اور پھر کھیتوں میں گھس کر آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔ اسی وقت غلام قادر میرے پاس پہنچ گیا۔ ”یہ کیا ہوا ڈاکٹر صاحب!“

میں نے کھوئی کھوئی نظروں سے غلام قادر کو دیکھا، پھر خود کو سنبھال کر بولا۔ ”پتا نہیں......!“

”کالی کندھیر آپ کو دیکھ کر ہی چیخا تھا اور اس کا ساتھی بھی آپ سے ڈر کر بھاگا تھا۔“

”پتا نہیں!“ میں نے پھر اسی انداز میں کہا۔ کیا بتاتا بیچارے غلام قادر کو، یہ ایک لمبی کہانی تھی۔

”اللہ خوش رکھے، میں حیران رہ گیا ہوں، کوئی بات جو سمجھ میں آرہی ہو۔“ اس دوران میں نے بھی خود پر پوری طرح قابو پالیا۔ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ بھوریا چرن کو اس حال میں دیکھ کر خوشی ہوئی تھی پھر اچانک بابا پردہ پوش کے الفاظ یاد آئے۔ ”اصل کام کچھ اور ہے، جس کی تفصیل وقت کی زبانی سن لوگے۔“

”اصل کام......؟“ میں نے دل میں سوچا اور غلام قادر سے پوچھا۔ ”یہ کالی کندھیر کہاں رہتا ہے؟“

”پیلی پوکھر پر اس نے کٹیا بنا رکھی ہے، وہیں گیا ہے۔“

”چلو گے وہاں......؟“

”کٹیا پر جائیں گے؟“

”دور سے دیکھیں گے۔“

”ٹھیک ہے، چلیں۔“

فاصلہ اچھا خاصا تھا، پھر دور سے کچھ مجمع سا نظر آیا تو غلام قادر بے اختیار بول پڑا۔ ”کچھ ہوا ہے، ضرور کچھ ہوا ہے، پولیس بھی موجود ہے۔“

جہاں ہم لوگ کھڑے تھے، وہاں اور بھی لوگ آآکر کھڑے ہو رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے غلام قادر سے بھی پوچھا تو اس نے کہا۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں بھائی! تمہیں کچھ معلوم ہو تو بتاؤ۔“

”کچھ نہیں معلوم، بس بازار میں خبر اڑی ہے کہ پولیس نے کالی کندھیر کی کٹیا پر چھاپہ مارا ہے، ہم لوگ معلوم کرنے آئے ہیں۔“ لوگوں نے کہا۔

پولیس نے کٹیا کے قریب کھڑے لوگوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ اس طرف سے جو لوگ آئے، ان سے غلام قادر نے پوچھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے تو ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا بھیا کہ وہ سسرا کالے جادو والا ہے، اپنے چھورے کو لے گئے تھے ایک بار اس کی مڑھیا پر، بدبو کے مارے کھوپڑی پھٹی جا رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے مہینوں سے رکھی لاشیں سڑ رہی ہوں، تم ہی بتاؤ بھیا! سادھو، سنتوں کی جھونپڑی میں ماس سڑنے کی بدبو کہاں سے آگئی۔“

”تم اپنے چھورے کو اس کی کٹیا پر کیوں لے گئے تھے تلسی چند......؟“ غلام قادر نے پوچھا۔

”سسرے کو بخار چڑھا تھا، اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔“ تلسی چند نے بتایا۔

”پھر......؟“

”اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر پھونک ماری اور کہا کہ دوبارہ مڑھیا پر نہ آئیں، وہ سب سے یہی کہتا ہے۔“

”کیا......؟“

”کہ دوبارہ یہاں مت آنا۔“

”لوگ جس کام سے آتے ہیں، وہ ایک بار جانے سے پورا ہوجاتا ہے؟“ اس بار میں نے پوچھا۔

”سو تو ہے، سب یہی کہتے ہیں کہ جو ایک بار اس کے پاس آیا، اسے دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں پڑی، ہمارے چھورے کا بخار بھی ایسا اترا کہ آج تک دوبارہ نہیں چڑھا۔“

ہم بہت دیر وہاں رکے۔ پولیس نہ جانے وہاں کیا کارروائی کر رہی تھی، پھر وہاں مزید ٹھہرنا بیکار سمجھ کر ہم واپس چل پڑے۔ غلام قادر اس واقعے پر اپنے طور پر تبصرہ کرتا رہا لیکن میری سوچیں کچھ اور تھیں۔ بھوریا چرن اس معمولی سی جگہ کیوں چھپا ہوا ہے، وہ بغیر ہاتھ پاؤں کے زندہ ہے، اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں کیڑے، مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے تھے، اس کا بدن چیل پنجوں میں جھپٹ کرلے گئی تھی۔ پھر کیا ہوا......؟ جو بھی ہوا ہو لیکن یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور زندہ ہے تو اس سے بھرپور مقابلہ ہے۔ میرا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ بابا صاحب کے الفاظ کا بھرپور مفہوم تھا اور مجھے یہاں بے مقصد ہی نہیں بھیجا گیا تھا لیکن اب میں کیا کروں......؟ میں نے دل میں کہا۔ بابا صاحب! ابھی میری بینائی اتنی تیز نہیں ہوئی ہے کہ میں خود ہی دیکھوں اور فیصلے کرسکوں، مجھے ہر لمحہ آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں نے دوبارہ کٹیا تک جانے کے بارے میں سوچا مگر ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا، مگر دوسرے ہی دن صبح دس بجے غلام قادر ایک جوڑے کے ساتھ آیا۔ وہ کسی کام سے باہر گیا تھا، اب آیا تو دو افراد اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اندر آکر کہا۔ ”جے رام جی کی مہاراج!“

”یہ راجندر ہے ڈاکٹر صاحب! اور یہ اس کی دھرم پتنی سدھا ہے، سدھا کے سر میں درد اٹھتا ہے اور اس کی یادداشت چلی جاتی ہے، دو تین دن تک اسی طرح رہتا ہے پھر ٹھیک ہوجاتی ہے، راجندر بہت پریشان ہے، اس کے پاس اور بھی کام کی خبریں ہیں، یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا ڈاکٹر صاحب ہندوؤں کا بھی علاج کرتے ہیں یا صرف مسلمانوں کا!“ غلام قادر بولا۔

”نہیں راجندر بھیا! میں صرف مریضوں کا علاج کرتا ہوں، ان کا دین، دھرم کچھ بھی ہو، ڈاکٹر یہ نہیں سوچتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بھگوان سکھی رکھے، ہماری بستی میں پہلے دین دھرم کا کوئی جھگڑا نہیں تھا، یہ سب اس پاپی کالی کندھیر کا پھیلایا ہوا ہے۔“

”اچھا تم سدھا بہن کے علاج کے لیے اس کے پاس نہیں گئے؟“

”صورت سے ہی نفرت تھی ہمیں اس کی، ہم کبھی نہیں گئے، بھگوان نے ہمیں اس سے دور رکھا، اب کھل گئی بستی والوں پر اس کی اصل!“ راجندر نے کہا۔

”بڑی خاص خبریں سنائی ہیں راجندر نے ڈاکٹر صاحب!“ غلام قادر نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

”چلو خبریں بعد میں سن لیں گے، پہلے سدھا بہن کی خبر لے لیں، آیئے سدھا بہن!“ میں نے کہا پھر سدھا کو ایک جگہ بٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے مجھے اس کی بیماری کا پتا چل گیا۔ اسے دو انجکشنوں کی ضرورت تھی جو میڈیکل بکس مجھے افلاک نے دیا تھا، وہ بابا صاحب کا عطیہ تھا۔ مجھے جس دوا کی ضرورت ہوتی تھی، وہ اس میں مل جاتی تھی جبکہ پہلے وہ اس میں موجود نہیں ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ افلاک کے ذریعے مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ میں نے سدھا کو دو انجکشن لگائے اور اسے اطمینان دلایا کہ اب اسے یہ درد نہیں ہوگا پھر میں نے راجندر سے پوچھا۔ ”جی راجندر کمار جی! اب بتایئے کیا خبریں ہیں؟“

”پوری بستی میں ہاہاکار مچی ہوئی ہے ڈاکٹر جی! وہ سسرا کالے جادو والا تھا۔“

”سدھا کا بھوجائی کا بھائی سندر لال پولیس کانسٹیبل ہے، راجندر کے ساتھ ہی رہتا ہے، اس نے ساری کہانی سنائی ہے۔“ غلام قادر نے بتایا۔

”گڈ......! کیا کہانی ہے؟“

”وہ ڈاکٹر جی! کالی کندھیر کو جنک پوری آئے ہوئے زیادہ سے نہیں بیتا، اس کے ساتھ دو اور منوئی تھے، انہوں نے وہ مڑھیا بنائی، پھر بستی والوں میں اعلان کیا کہ جتنی ہندو آبادی ہے، ان میں کوئی بھی بیمار ہو، وہ کالی کندھیر مہاراج کے پاس آئے، وہ ایک ہی پھیرے میں اس کا علاج کردیں گے، پر مسلمان جاتی کا کوئی منوئی ان کے پاس نہ آئے۔ لوگ گئے اور انہیں فائدے ہوئے، سو دھوم مچ گئی کالی کندھیر کی، وہ بستی میں بھیک مانگنے آتا اپاہجوں والی گاڑی میں کیونکہ اس کے ہاتھ، پاؤں جڑ سے کٹے ہوئے تھے، لوگ اسے بہت کچھ دینا چاہتے تھے کیونکہ وہ ان کا دیوتا بن گیا تھا، پر وہ تھوڑی سی بھیک لیتا پھر منع کردیتا کہ باقی کل! اس بات سے لوگ اور متاثر ہوتے تھے اور اسے مہان سادھو سمجھتے تھے پھر ڈاکٹر صاحب! بالی رام کا بیٹا گردھر گھر سے غائب ہوگیا، وہ جوان تھا، تین دن کے بعد اس کی لاش گول دھرم شالہ میں ملی۔ جب ایک کسان ادھر سے گزر رہا تھا اور اسے دھرم شالہ سے بدبو اٹھتی محسوس ہوئی تھی بستی میں ہاہاکار مچ گئی، گردھر کا ایک ہاتھ کندھے کی جڑ سے کٹا ہوا تھا اور شریر کا سارا خون نکل جانے سے وہ مرگیا تھا۔ کوئی بیس دن کے بعد پولیس کو دھولگری سے خبر ملی کہ وہاں بھی ایک کھلیان سے لاش ملی ہے، جس کا ایک پیر جڑ سے کٹ کر غائب ہوا ہے۔ تیسری خبر پولیس کو چھ دن پہلے ملی جس میں مینڈو جنکشن کے ایک زمیندار کا بیٹا ہری چند غائب ہوا، پر دوسرے ہی دن ہری چند برے حال گھر پہنچ گیا، اس کا بھی ایک ہاتھ کندھے کے پاس جڑ سے کٹا ہوا تھا۔ اس نے ساری پول کھولی، وہ ایسے کہ ایک بار اس نے یہاں جنک پوری کے بازار میں سادھو کالی کندھیر کو دیکھا تھا اور اسے بھیک دی تھی۔ ہری چند نے بتایا کہ وہ کسی کام سے جنک پوری آیا تھا، اپنے کام سے فارغ ہوکر وہ واپس اپنی جیپ میں مینڈو جا رہا تھا کہ راستے میں اسے دو خوبصورت لڑکیاں نظر آئیں جو اس سے لفٹ مانگ رہی تھیں۔ ہری چند نے انہیں جیپ میں بٹھا لیا مگر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکی نے بے ہوش کرنے والی دوا کا رومال ہری چند کی ناک سے لگا دیا اور دوسری نے ہاتھ بڑھا کر جیپ کے انجن کا سوئچ بند کردیا بس اس کے بعد ہری چند کی آنکھ ایک جگہ کھلی تھی، وہاں اس نے اسی ہاتھ، پاؤں کٹے سادھو کو دیکھا جسے اس نے بھیک دی تھی۔ وہاں دو آدمی اور تھے جن میں سے ایک وہ تھا جو کالی کندھیر کی گاڑی گھسیٹتا ہے۔ انہوں نے ہری چند کو زمین میں گڑھے ہوئے کھونٹوں سے باندھ رکھا تھا، تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے ہری چند کو پھر بے ہوش کردیا۔ دوسری بار جب ہری چند کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو مینڈو جنکشن پر کھڑی ایک مال گاڑی کے ڈبے میں پڑے ہوئے پایا۔ اس کا بایاں بازو کندھے کے پاس سے غائب تھا۔ ہری چند کا خون خوب بہہ چکا تھا، مگر وہ پہلوانی کرتا ہے اور خوب طاقتور ہے، اس لیے اس نے ہمت کی اور ڈبے سے نکل آیا۔ کچھ دور چل کر وہ بے ہوش ہوگیا مگر اسے اسٹیشن پر موجود لوگوں نے دیکھ لیا اور فوراً ہاتھرس کے بڑے اسپتال پہنچایا جہاں ہوش میں آنے کے بعد اس نے باپ سے رابطہ کیا اور پھر پولیس کو تفصیل بتائی۔ پولیس نے کالی کندھیر کی مڑھیا پر چھاپہ مارا تو مڑھیا کے نیچے ایک سرنگ کھدی ہوئی تھی اور وہاں، بہت بڑا کمرہ بنا لیا گیا تھا۔ اس کمرے میں ایک بہت بڑا چولہا جل رہا تھا اور بہت بڑے کڑھاؤ میں دو انسانی ہاتھ اور ایک پاؤں ابالے جا رہے تھے۔ یہ ہاتھ، پاؤں ابل کر چھوٹے ہو رہے تھے، سنا ہے کہ افریقہ کے جنگلی قبیلے اسی طرح انسانی سر چھوٹے کرکے ان کی مالائیں بناتے ہیں اسی طرح یہ ہاتھ، پاؤں چھوٹے کرنے کے لیے اُبالے جا رہے تھے۔ ابھی سادھو کندھیر کو ایک پاؤں کی اور ضرورت تھی جنہیں کسی طرح وہ اپنے ہاتھ، پاؤں کی جگہ لگانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ، پاؤں کٹے ہوئے تھے شاید وہ یہ ہاتھ، پاؤں جادو کے زور سے اپنے ہاتھوں، پیروں کی جگہ جوڑنا چاہتا تھا...... بڑا بکٹ ہووے ہے بھیا یہ کالا جادو......! اب دیکھو کیا ہووے......سندر لال بتا رہا تھا کہ سارے پولیس والے اس سے بری طرح ڈرے ہوئے ہیں۔“

”وہ کہاں ہے؟“

”ہاتھرس کی کوتوالی میں ہے۔“

”اور اس کے ساتھی......؟“

”وہ بھی اس کے ساتھ بند ہیں۔“

”اور وہ دو عورتیں وہاں نہیں ملیں جنہوں نے ہری چند کو وہاں رکھا تھا؟“ غلام قادر نے پوچھا۔

”نہیں اور کوئی نہیں ملا۔“

کوئی نہیں جانتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ پورنیاں ہوں گی۔ راجندر نے کہانی پوری کی اور جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”سدھا بہن ٹھیک ہوجائیں گی، تم اتنا کام ضرور کرنا کہ اگر کالی کندھیر کے بارے میں کوئی اور بات معلوم ہو تو آکر بتا دینا۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر جی! جے رام جی کی۔“ راجندر اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا۔

غلام قادر کچھ دیر اس موضوع پر باتیں کرتا رہا پھر وہ کسی کام سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھوریا چرن کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا۔ میرے ہاتھوں، ہاتھ پاؤں تڑوا کر بھوریا چرن نے ادھر کا رخ کیا۔ اس کی کالی طاقت اسے اس کے ہاتھ پاؤں واپس نہیں دلا سکی تھی، پھر اس نے اپنے ہاتھ، پاؤں کے حصول کے لیے کام شروع کردیا اور کوئی ترکیب نکال لی۔ دو افراد موت کا شکار ہوگئے، تیسرا تقدیر سے بچ گیا اور وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا لیکن پولیس اس کے آگے کیا حیثیت رکھتی تھی البتہ اسے یہ پتا چل گیا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں، وہ میرے خون کا پیاسا ہے چنانچہ جہاں میں اس کے سارے منصوبے خاک میں ملانے میں مصروف ہوں، وہیں وہ اپنی قوت حاصل کرکے مجھ سے معرکے کے لیے تیاری میں لگا ہے۔ لیکن میں اب بے جگر ہوگیا تھا، مجھے کوئی خوف نہیں تھا، البتہ یہ سوچ ضرور ذہن میں تھی کہ اب مجھے کب تک یہاں رہنا ہے؟

اس رات مجھے بھوریا چرن ہی کا خیال آتا رہا۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو ایک بھیانک چیخ ماری تھی، اس کے چہرے پر بے پناہ خوف طاری ہوگیا تھا۔ یہی کیفیت بنسی راج کی تھی۔

دوسری صبح غلام قادر نے جگایا تھا۔ ”اٹھئے ڈاکٹر صاحب! راجندر آیا ہے۔“

راجندر کا آنا کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن غلام قادر نے مجھے جس طرح جگایا تھا، اس میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ میں راجندر سے ملا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کیا اور بولا۔

”آپ نے ہم پر بڑی دیا کی ہے ڈاکٹر جی! سدھا بڑی خوش ہے، کہہ رہی ہے میں ٹھیک ہوگئی، ڈاکٹر صاب اوتار ہیں۔“

”ارے نہیں راجندر! بس میرے اللہ کا کرم ہے۔“

”ایک خبر بھی آپ کو دینی ہے۔“

”ہاں بتاؤ......؟“

”سندر خبر لایا ہے کہ کالی کندھیر کوتوالی سے بھاگ گیا ہے۔“

”بھاگ گیا......؟“

”ہاں جی! سندر نے بڑی جادو بھری کہانی سنائی ہے۔“

”کیا......؟“

”تھانے کے جنگلے کے سامنے دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے، رات کے بارہ بجے انہوں نے دیکھا کہ اندر کی دیواروں سے پیلی پیلی مکڑیاں باہر نکل رہی ہیں، وہ جی حیران رہ گئے، ان کی تعداد ہزاروں ہوگئی، وہ سلاخوں سے باہر نکلنے لگیں، انہیں دیکھ کر دونوں سپاہی بھاگ نکلے، وہ بری طرح ڈر گئے تھے اور چیخ چلا رہے تھے، جتنی دیر میں وہ دوسروں کو کچھ بتاتے، اتنی دیر میں کام ہوگیا۔“

”کام ہوگیا......؟“

”ہاں جی! جب دوسرے سپاہی ان کی رام کہانی سن کر وہاں پہنچے تو وہاں کچھ نہیں تھا، نہ کالی کندھیر نہ اس کے دونوں ساتھی اور نہ مکڑیاں! مزے کی بات یہ ہے کہ جنگلے کے تالے ویسے ہی بند ملے، انہیں کھولا بھی نہیں گیا تھا۔“

”پولیس کا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو سندر نے نہیں بتایا لیکن وہ خوش ہیں کہ ایک بلا ان کے پاس سے چلی گئی، ورنہ ایک جادوگر کو قید کرنے کی وجہ سے اور نہ جانے کیا ہوجاتا۔“

میں بے چارے راجندر سے کیا کہتا۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا، البتہ میں کچھ الجھ گیا تھا۔ میرے لیے اب کوئی ہدایت نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بابا پردہ پوش نے مجھے بہت کچھ عطا کیا تھا، ان ہی کی ہدایت پر میں یہاں آیا تھا۔ دیکھ چکا تھا کہ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا تھا۔

بھوریا چرن اپنی ناپاک قوت حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرچکا تھا۔ میرے والد مرحوم نے اسے شنکھا قوت سے محروم کیا تھا، وہ طویل عرصہ اپنی اس قوت کے حصول کے لیے صرف کرکے بڑی مشکل سے اس میں کامیاب ہوا تھا کہ دوبارہ اسی باپ کے بیٹے کے ہاتھوں دوسری ہزیمت سے دوچار ہوا اور ہاتھ، پاؤں کھو بیٹھا۔

میں کالے جادو کی پہنچ کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ کتنی ہوتی ہے لیکن کچھ اندازے ہوتے جا رہے تھے۔ بھوریا چرن کے ہاتھوں اور پیروں کو میں نے سانپوں، بچھوؤں کی طرح رینگ کر جھاڑیوں میں گھستے دیکھا تھا، اس کے چھوٹے سے بدن کو چیل اٹھا کرلے گئی تھی، اس کا بدن محفوظ رہ گیا تھا لیکن کالا جادو ہاتھ، پاؤں واپس نہیں لا سکا اور اب وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے حصول کے لیے سرگرداں تھا۔ پتا نہیں شنکھا والی حیثیت برقرار تھی یا نہیں، لیکن سندر پولیس والے کی زبانی جو کہانی راجندر کے ذریعے معلوم ہوئی تھی، وہ بتاتی تھی کہ بھوریا چرن کے اردگرد اب بھی بہت کچھ ہے اور میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

غلام قادر کسی کام سے گیا ہوا تھا اور میں اس کے پالے ہوئے پرندوں کے پاس بیٹھا ان کی دلچسپ حرکات سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی وجود میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھ کر ایک دم اسے پہچان لیا، وہ افلاک تھا۔

میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی، البتہ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اب میں نے غور سے افلاک کا چہرہ دیکھا، وہ سخت افسردہ تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بمشکل تمام میرے منہ سے نکلا۔ ”افلاک......؟“

”بابا صاحب رحلت فرما گئے کامران!“ افلاک کی رندھی ہوئی آواز ابھری اور میرے پورے بدن میں جیسے شدید کرنٹ لگا، دماغ جھنجھنا کر رہ گیا، ایک بار پھر میری آواز بند ہوگئی۔

”آپ ریل سے گھر آجائیں تاکہ جنازے میں شرکت کرلیں۔“ افلاک نے کہا، پھر بولا۔ ”چلتا ہوں، آپ کے آنے کے بعد جنازہ اٹھایا جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور ایک قدم آگے بڑھ کر نظروں سے غائب ہوگیا۔

میرے سارے بدن میں تھرتھری مچی ہوئی تھی، شدید سردی لگ رہی تھی اور بدن ٹوٹنے لگا تھا۔ رہ رہ کر افلاک کے لفظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ بابا صاحب رحلت فرما گئے، بابا صاحب رحلت فرما گئے۔

نہ جانے کتنی دیر اسی طرح کھڑا کپکپاتا رہا۔ بابا صاحب بھی گئے۔ انہوں نے مجھے بہت سہارا دیا تھا لیکن وہ چلے گئے، احمد علی بھی اسی طرح اچانک چلے گئے تھے۔ بابا پردہ پوش نے مجھے کئی علم دیئے تھے جو بوقت ضرورت میرے کام آسکتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ انہیں انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کرنے کی ہدایت تھی۔

دل کو اس خیال سے بڑی ڈھارس ہوئی اور حالت بہتر ہونے لگی۔ افلاک مجھے جلد واپس پہنچنے کی ہدایت کرگیا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹیں۔ کچھ دیر کے بعد غلام قادر واپس آگیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”غلام قادر! مجھے فوراً واپس جانا ہے، تمہیں میرے ساتھ مینڈو جنکشن جانا ہے۔“

”اچانک ڈاکٹر صاحب!“

”ہاں! جس طرح مجھے یہاں آنے کی ہدایت کی گئی تھی، اسی طرح فوری واپسی کی ہدایت ہے۔“ غلام قادر کے ساتھ مینڈو جنکشن پہنچا، وہاں سے فوراً ٹرین مل گئی اور میں واپس پہنچ گیا۔ اشرف نے میرا استقبال کیا۔ اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”مغرب کے بعد جنازہ اٹھایا جائے گا۔“

”اچانک کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”بابا صاحب کی ہدایت ہے کہ اس طرح کی کوئی بات نہ کی جائے، انہوں نے اپنا چہرہ ڈھکتے ہوئے کہا تھا کہ اب ان کے چہرے سے کپڑا نہ ہٹایا جائے۔“

”ان کا آخری دیدار بھی نہیں ہوسکے گا؟“ میں نے رندھی آواز میں کہا۔

”میں نے پوری زندگی ان کی خدمت کی ہے، ان کا دیدار کبھی نہیں کرسکا تو اب یہ کیسے ممکن ہے۔“

”غسل میت کس نے دیا؟“

”ان کے مریدوں نے جنہیں ہدایت کی گئی ہوگی، کفن بھی پہنا دیا گیا ہے۔“ اشرف نے جواب دیا، میں خاموش ہوگیا۔ مغرب کی اذان ہوئی۔ بے شمار لمبے لمبے قد و قامت کے سفید لبادے پہنے، عمامے باندھے لوگ جنہوں نے اپنے چہرے عماموں کے ایک حصے سے چھپائے ہوئے تھے، عمارت میں بھر گئے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

افلاک میرے پاس آکر بولا۔ ”نماز جنازہ میں شرکت کیجیے، چالیس قدم کاندھا دیجیے، بس اس سے آگے جانا ممنوع ہے۔“

نماز جنازہ ہوئی پھر جنازہ اٹھایا گیا اور میں نے اور اشرف نے جنازے کو کندھا دیا، پھر ہم پیچھے ہٹ گئے اور وہ مریدین جنازہ لے چلے لیکن ان کا رخ بیرونی دروازے کے بجائے احاطے کی مغربی دیوار کی طرف تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جنازہ لے جانے والوں کی اتنی بڑی تعداد دیوار میں غروب ہوگئی۔ وہ سب جنازے سمیت ٹھوس دیوار سے پار ہوگئے تھے۔

میں اشرف کے ساتھ خاموش کھڑا تھا، پھر اشرف کچھ کہے سنے بغیر واپس مڑ گیا اور میں تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر اندر عمارت میں آگیا۔ اپنے کمرے کی مسہری پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا، بخار جیسی کیفیت تھی۔ بدن میں شدید سنسنی تھی۔ اب کیا کروں، بابا صاحب کے دم سے ایک دنیا آباد تھی، ایک فولادی سہارا حاصل تھا، اب......؟ بہت بڑا سوال سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

دماغ ماؤف ہو رہا تھا، شدید ذہنی تھکن سے نیند آگئی اور ایسی انوکھی نیند کہ پتا تک نہ چلا کہ کب رات ہوئی اور کب صبح ہوگئی۔ جاگا تو صبح ہوچکی تھی۔ حیرانی سے روشنی کو دیکھتا رہا، پھر ایک دم سب کچھ یاد آگیا اور میں اٹھ بیٹھا۔

دل ڈوبنے لگا۔ بابا صاحب اب یہاں نہیں ہیں، پھر اب اس گھر میں کیا ہے، کیا کروں۔ بیٹھا سوچتا رہا پھر اٹھ کر باہر نکل آیا۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا، ایک عجیب سی وحشت طاری تھی۔ اشرف کو آواز دی کہ ایک کپ چائے دیدے لیکن جواب نہیں ملا۔

پھر میں نے پوری عمارت میں اشرف کو تلاش کیا، وہ کہیں نہیں تھا۔ پورے دن اور پوری رات وہ نہیں نظر آیا۔ پتا چل گیا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ دل اور ہول گیا۔ میں اس عمارت میں تنہا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے افلاک کو آواز دی لیکن اس کا مجھ سے کیا واسطہ! اب کیا کروں......؟ یہاں رہنے کا اب کیا جواز ہے، نکلوں یہاں سے! لیکن جاؤں کہاں......؟ بہت عجیب طبیعت ہوگئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ اگر میں پاکستان جانا چاہوں تو کامیاب ہوسکتا ہوں یا نہیں! کوشش کرسکتا تھا لیکن بابا صاحب کا درس یاد تھا۔ جو کام کرسکتے ہو اسے کرنے سے گریز کرو، ہمیشہ اپنی نفس اور خواہشوں کے خلاف کام کرو، فیصلہ تمہارا نہیں وقت کا ہوتا ہے۔ یہ باتیں یاد آئیں اور خود بخود ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ہاں بھئی وقت، کیا کہتے ہو؟“ میرے منہ سے نکلا۔ چند کپڑے ایک چھوٹے سوٹ کیس میں رکھے۔ بابا صاحب نے حلیے کے بارے میں فیصلہ فرما دیا تھا۔ شیونگ بکس اور سوٹ بالکل جدید تھے اور ان کے استعمال کی ہدایت تھی۔

بابا صاحب کے گھر کو خیرباد کہا اور سامنے والی سڑک پر پیدل چل پڑا۔ ذہن کو سلا دیا اور بدن کو رہنمائی سونپ دی۔ فاصلے طے ہوئے اور ہوش آیا تو ریلوے اسٹیشن پر تھا۔

ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ پیچھے سے کسی نے قمیض کا پچھلا حصہ کھینچ کر مخاطب کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو دس گیارہ سال کا ایک پیارا سا بچہ تھا جو کالی کالی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا جس میں کالے رنگ کا ایک خوبصورت بٹوا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بٹوا پکڑنے کے لیے کہا اور میرا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھ گیا۔

”یہ کس نے دیا ہے بیٹے......؟“ میں نے پوچھا تو بچے نے پیچھے اشارہ کردیا۔ میری گردن بے اختیار پیچھے مڑ گئی۔ جس طرف بچے نے اشارہ کیا تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔

”وہاں تو......!“ میں نے بچے کی طرف مڑ کر کہا لیکن وہاں بچہ بھی نہیں تھا، پھر میں نے دور دور تک دیکھا لیکن بچے کا کہیں پتا نہیں تھا۔ تب میں نے گہری سانس لے کر پرس کا جائزہ لیا۔ اس میں تین ہزار روپے تھے، ایک پاکستانی نوٹ بھی تھا جس پر لکھا تھا۔ ”رزق حلال عین عبادت ہے۔“

”سبحان اللہ! کیا رہنمائی ہے۔ بتا دیا گیا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ رزق حلال کما کر پیٹ بھرنا ہے۔ میری کیا مجال کہ روگردانی کروں۔ آگے بڑھ کر ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچا اور ہزار روپے کا نوٹ کھڑکی سے اندر کردیا۔ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اندر بیٹھے شخص نے ایک ٹکٹ اور ہزار کے نوٹ سے بقایا رقم ہاتھ میں تھما دی۔ ابھی ٹکٹ کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا کہ پیچھے آکھڑے ہونے والے ایک شخص نے کندھے سے پکڑ کر دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”جلدی ہٹو یار ریل آگئی ہے۔“

میں ہٹ گیا۔ اسی وقت ایک ٹرین آکر پلیٹ فارم پر رکی تھی۔ میں نے تھوڑا سا ہٹ کر ٹکٹ کو دیکھا۔ آگرے کا ٹکٹ تھا، اس پر بوگی نمبر اور سیٹ نمبر لکھا ہوا تھا، ٹرین بھی یہی تھی جو آکر رکی تھی۔

میں آگے بڑھ گیا اور مطلوبہ بوگی میں چڑھ گیا۔ بہت خوبصورت بوگی تھی، بس چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے عین سامنے ایک پُر وقار ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا تھا، ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ کچھ دیر کے بعد ٹرین چل پڑی اور میں باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔

کافی دیر گزر گئی، اچانک ایک چیخ ابھری اور میں چونک پڑا۔ بوگی کے دوسرے سرے پر کوئی چیخا تھا اور افراتفری مچ گئی تھی۔ لوگ گردنیں اٹھا کر ادھر دیکھنے لگے، کچھ لوگ صورتحال کا جائزہ لینے اس طرف چل پڑے جن میں میرے سامنے والا مسافر بھی تھا۔

کچھ ہی لمحوں میں وہ واپس آیا اور اپنی سیٹ کے نیچے رکھے ہوئے بکس سے کچھ نکالنے لگا۔ یہ فرسٹ ایڈ بکس تھا۔ بکس لے کر وہ اسی طرف چلا گیا۔ اب مجھے بھی دلچسپی پیدا ہوئی، میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ ایک شخص کے بدن کے کسی حصے میں درد اٹھا تھا اور وہ کرب سے تڑپ رہا تھا۔ میرے سامنے والے مسافر نے بکس سے دو انجکشن نکالے اور سرنج تیار کرنے لگا۔

میں نے وہ انجکشن دیکھے اور پھر اس شخص کو دیکھنے لگا جو درد سے تڑپ رہا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میں نے کسی کے جسم میں جھانکا تھا۔ مجھے پتا چل گیا کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ یہ شخص جو انجکشن مکس کر رہا تھا، وہ اس تکلیف کو رفع نہیں کرسکتے تھے، پھر میں نے اس کے بکس میں جھانکا تو اس میں وہ انجکشن موجود تھا جو اس کے درد کے لیے اکسیر تھا۔

”ایک منٹ!“ میں نے کہا اور سب مجھے دیکھنے لگے۔ ”اگر آپ اسے وہ انجکشن دیں تو یکدم فائدہ ہوگا، اسے دوسرا درد ہے۔“ میں نے میڈیکل کی زبان میں اسے تھوڑا سا سمجھایا اور عمر رسیدہ شخص ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے اپنے بنائے ہوئے انجکشن کی سرنج ایک طرف رکھ دی اور میرے بتائے ہوئے انجکشن کو تڑپتے ہوئے شخص کے بازو میں انجکٹ کردیا۔

صرف دو منٹ کے اندر اس شخص کی حالت بہتر ہونے لگی تو میرے ہمسفر نے مسکرا کر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر وی۔ ایم شکلا!“

میں نے خوش اخلاقی سے اس سے ہاتھ ملایا اور اپنا نام بتایا۔ ”کامران مسعود!“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، واقعی آپ کا مشورہ بالکل ٹھیک تھا، میں اصل بات نہیں سمجھ سکا تھا، آپ آگرہ جا رہے ہیں؟“

”جی......!“

”وہیں پریکٹس کرتے ہیں؟“

”نہیں! بس ایسے ہی سیر و سیاحت کے لیے جا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے خاص انداز میں گردن ہلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بڑی حیرت ہوئی، کیا کسی ڈاکٹر کی زندگی میں اس کی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ سیر و سیاحت کے لیے وقت نکال سکے؟“

”ہاں! ہوتی تو نہیں ہے لیکن نکالنی پڑتی ہے۔“

”آیئے بیٹھیں۔“ اس نے کہا اور ہم واپس اپنی سیٹوں پر آگئے۔ ”اپنا کلینک ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں! بس موبائل ڈاکٹر سمجھ لیں۔“ میں نے کہا اور ہنس پڑا۔ وہ بھی میری بات سن کر خوب ہنسا تھا، پھر ایک دم سنجیدہ ہوکر بولا۔ ”لیکن آپ کی تشخیص غضب کی ہے، میرا تیس سالہ تجربہ مار کھا گیا۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر بولا۔ ”میرا اپنا کلینک بھی ہے اور سرکاری اسپتال کا سی۔ ایم۔ او بھی ہوں، نام تو بتا ہی چکا ہوں۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر!“

”آگرے میں کہاں ٹھہریں گے؟“

”کسی ہوٹل میں!“

”ارے وہاں! کوئی عزیز نہیں ہے؟“

”نہیں......!“

”ہے جناب ہے! آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ نہیں ہے، فلمی کہانیوں میں یہی سب کچھ ہوتا ہے، اب میں کوئی خوبصورت ہیروئن نہیں ہوں تو کیا ہوا، آپ کا انکل تو ہوں، انکل شکلا! اور مجال ہے تمہاری کہ تم کسی ہوٹل میں رہو۔“ یہ الفاظ ادا کرکے وہ خوب ہنسا، پھر بولا۔ ”اور ایک ڈاکٹر سب سے بہتر جانتا ہے کہ بیشک دین، دھرم اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر کا ایک ہی دھرم ہوتا ہے یعنی انسانیت، جو سب سے بڑا دھرم ہے، اب تم میرے ساتھ رہنے سے انکار نہیں کرو گے۔“

”کیا کہوں اس بات پر......!“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”میں بتا سکتا ہوں کیا کہو۔“

”بتایئے......؟“ میں نے کہا۔

”تم کہو انکل! میری مجال کہاں کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کروں۔“

آگرے میں جمنا کے کنارے ڈاکٹر شکلا کی بے حد خوبصورت کوٹھی تھی۔ بہت سے لوگ اسے لینے اسٹیشن آئے تھے جن میں کئی نوجوان لڑکیاں بھی تھیں، ہندی فلموں کی خوبصورت ہیروئنوں جیسی! کوٹھی آکر میرا ان سب سے تعارف کرایا گیا اور پھر مجھے ایک کمرے میں منتقل کردیا گیا۔

میں شروع ہی سے ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں کچھ الفاظ گردش کر رہے تھے۔ ”ہمیشہ اپنے نفس اور اپنی خواہشوں کے خلاف عمل کرو۔“

”فیصلہ تمہارا نہیں وقت کا ہوتا ہے۔“ اور وقت نے مجھے ہندو ڈاکٹر شکلا کے پاس پہنچا دیا تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی شکلا کی طرح خوش مزاج تھے۔

”میں راج کنول ہوں، اپنے پاپا کی تیسرے نمبر کی بیٹی......! گھر میں سب سے زیادہ ایڈوانس اور تیز مزاج ہوں، ان سب نے مجھے اپنا نمائندہ بنایا ہے آپ سے باتیں کرنے کے لیے۔“ ایک خوبصورت لڑکی نے کہا۔ دولڑکے اور چار لڑکیوں کا گروہ اچانک میرے کمرے میں گھس آیا تھا۔

”جی کنول جی!“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر کامران! ہم تین بہنیں ہیں، بھائی کوئی نہیں ہیں، یہ دو ہماری کزن ہیں اور یہ دونوں بیوقوف بھی!“ اس نے دونوں لڑکوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

”اور تیسری بہن......؟“ میں نے پوچھا۔

”سادھنا!“ لڑکی کے لہجے میں اداسی آگئی۔ ”وہ بیمار ہوگئی ہے، ہم میں سب سے زیادہ ذہین اور پیاری تھی لیکن اسے نظر کھا گئی۔“

”اوہ! کیا بیماری ہے انہیں؟“

”بس جادو کردیا ہے کسی نے، پاپا بہت بڑے ڈاکٹر ہیں مگر ان کی سمجھ میں بھی سادھنا کی بیماری نہیں آتی، دماغ کے سارے ٹیسٹ ہوچکے ہیں، کچھ پتا نہیں چلتا۔“

میں دل میں ہنس پڑا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”واہ بابا صاحب! پھر ایک امتحان، پھر ایک ذمے داری......! فیصلے واقعی وقت کرتا ہے۔“

”پاپا بہت کم کسی سے متاثر ہوتے ہیں، آپ سے وہ بہت متاثر ہیں، ہم سب کو آپ کے بارے میں بہت سی ہدایتیں کی گئی ہیں۔“

”وہ بہت اچھے انسان ہیں، ایک بات پر مجھے حیرت ہے۔“

”وہ کیا......؟“ راج کنول بولی۔

”آپ لوگ بہت اچھی حیثیت کے مالک ہیں پھر ڈاکٹر شکلا ٹرین کے عام ڈبے میں سفر کیوں کر رہے تھے، مجھے وہ وہیں ملے تھے۔“

”دوسری بات پر مجھے حیرت ہے۔“ راج کنول پھٹ سے بولی اور میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”آپ اس میں سفر کیوں کر رہے تھے؟“

”کیونکہ میں اسی حیثیت کا حامل ہوں۔“

”ہر دھرم میں جھوٹ بولنا پاپ ہے۔“ وہ بولی۔

”میرا خیال ہے اپنے بارے میں میں سچ بول رہا ہوں۔“

”میں نہیں مانوں گی۔“

”کیوں......؟“

”آپ کو دیکھ کر......!“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے کہا۔

”غالب کو پڑھا ہے آپ نے......وہ کہتا ہے ناکہ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب! تو پاپا بھی ہمیشہ ٹرین میں سفر کرتے ہیں، جہاز کا سفر انہیں بالکل پسند نہیں ہے، کہیں ملک سے باہر جاتے ہیں تو بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں، ٹرین میں بھی وہ عام لوگوں کے ساتھ سفر کرنا پسند کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کا اصلی انسانوں سے واسطہ رہتا ہے، اعلیٰ درجے میں سفر کرنے والے نقلی لوگ ہوتے ہیں۔“

”شکلا صاحب خود اصلی انسان ہیں۔“ میں نے راج کنول کے الفاظ سے متاثر ہوکر کہا۔

”آخر پاپا کس کے ہیں؟“ وہ ذرا اکڑ کر بولی۔ بہت دیر تک وہ سب میرے پاس رہے، مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ڈاکٹر شکلا کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

دوسرے دن ڈاکٹر شکلا مجھے اپنے ساتھ سرکاری اسپتال لے گئے، وہاں کئی مریضوں کا معائنہ کرایا اور مجھ سے ان کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ طویل عرصے کے بعد یہ ماحول ملا تھا، دلی مسرت ہوئی۔ ڈاکٹر شکلا نے کئی ایسے مریضوں کے بارے میں مجھ سے مشورے کیے اور میں نے اپنی قوتوں سے کام لے کر ان کے صحیح مرض کی نشاندہی کی۔ ڈاکٹر شکلا نے ان میں سے کئی کے چارٹ میں ان دواؤں کا اضافہ کیا جن کا مشورہ میں نے دیا۔ ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے بہت متاثر ہیں، پھر وہ اپنے آفس میں آبیٹھے۔ کچھ نروس سے تھے اور بار بار مجھے گھورنے لگتے تھے، پھر انہوں نے میرے سامنے اپنے گھر فون کیا۔

”میں دوپہر کو گھر نہیں آؤں گا، کھانا کلینک بھجوا دیں، ڈاکٹر کامران میرے ساتھ ہیں۔“ فون بند کرکے بولے۔ ”دو بجے ہم کلینک چلیں گے، اصل میں دوپہر کو میں گھر چلا جاتا ہوں، شام کو چھ بجے تک گھر پر آرام کرتا ہوں پھر کلینک جاتا ہوں، باقی وقت دوسرے ڈاکٹر وہاں ہوتے ہیں لیکن آج مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہے، میرا دل گھر جانے کو نہیں چاہ رہا، کچھ پوچھوں ڈاکٹر کامران......؟“

”جی......ضرور!“

”آپ کون ہیں؟“

”ارے اس سوال کا میں کیا جواب دوں؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”آپ نے میری ساری زندگی کے تجربے کو شکست دیدی ہے۔ جو کچھ آپ نے کیا ہے، وہ ناقابل فہم ہے، اگر میں ضعیف العقیدہ ہوتا تو آپ کو کوئی درویش، دیوتا یا اوتار سمجھتا۔ آپ نے جتنے امراض کی نشاندہی کی ہے، وہ بالکل ٹھیک تھی، ایک میں بھی تو غلطی نہیں کی جبکہ میں نے ان کے بارے میں غلط اندازے لگائے تھے۔“

”یہ صرف میری خوش نصیبی ہے سر!“ میں نے کہا۔

”نہیں! یہ کچھ اور ہے، ایک درخواست کروں ڈاکٹر کامران!“

”جی حکم دیجیے۔“

”صرف انسانیت کے نام پر۔ ایک ڈاکٹر سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ وقت دیں، اگر کوئی بے حد ضروری کام نہ ہو تو میرے ساتھ قیام کریں، کچھ لوگوں کے بارے میں آپ سے رہنمائی لوں گا جو واقعی آپ کی توجہ کے مستحق ہیں۔“

”آپ نے مجھے بہت عزت دیدی ہے سر!“ میں نے کہا۔ ڈاکٹر شکلا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

دو بجے وہ اسپتال سے اٹھ گیا۔ ہم دونوں کار میں آبیٹھے۔ ڈاکٹر شکلا نے ڈرائیور سے کلینک چلنے کے لیے کہا۔ کلینک دیکھ کر ڈاکٹر شکلا کی حیثیت کا اچھی طرح احساس ہوتا تھا۔ کیا زبردست کلینک تھا، کئی ڈاکٹر اور نرسیں یہاں موجود تھیں، بے شمار کمرے تھے جن میں مریض موجود تھے۔ ڈاکٹر کا آفس بھی بے حد خوبصورت تھا۔ کچھ دیر کے بعد گھر سے کھانا آگیا اور اسے ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا گیا۔

کھانے سے فارغ ہوکر شکلا نے کہا۔ ”دو مریضوں کو خاص طور سے دیکھنا ہے، آرام کرو گے یا انہیں دیکھیں؟“

”نہیں! انہیں دیکھیں گے۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

”آؤ......!“ ڈاکٹر بے تکلفی سے بولا اور ہم ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔ بیڈ پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی، اس کے قریب ایک معمولی سے کپڑوں میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شکلا نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ ”یہ جے راج ہے، بہت عرصہ قبل یہ وحشی درندہ تھا تم نے پھولن دیوی کا نام ضرور سنا ہوگا؟“

”ہاں......!“

”اس کا دست راست تھا، اس کے ساتھ رہ کر بہت کچھ کیا، پوری کہانی ہے اس کی، پھولن دیوی نے اس وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے تھے جب جے راج کی ماں بیمار ہوئی اور کوما میں چلی گئی، اسے ساری دنیا میں صرف ماں سے محبت تھی۔ ماں نے اس سے ایک بار کہا تھا کہ اگر اس نے یہ زندگی نہ چھوڑی تو وہ اس سے روٹھ جائے گی اور......وہ اس سے روٹھ کر خاموش ہوگئی، تب اس نے سارے برے کام چھوڑ دیئے اور ماں کو منانے میں لگ گیا، آج تک یہ ماں کے سرہانے بیٹھا اسے منا رہا ہے۔“ ڈاکٹر کا لہجہ بھاری ہوگیا۔

میرے بدن میں بھی تھرتھری دوڑ گئی تھی۔ پھر میں نے کہا۔ ”پھولن دیوی تو کبھی کی ختم ہوگئی۔“

”ہاں! اور یہ ماں کا پجاری ہے، میں بھی ماں کا پجاری ہوں، اس رشتے سے میں نے اس کے لیے قانون شکنی کی اور قانون کو اس کے بارے میں کبھی نہیں بتایا۔“ ڈاکٹر شکلا نے کہا۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 16

میں شکلا کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ بڑے عجیب کردار کا مالک تھا یہ شخص۔ وہ اپنی بات کو مسلسل جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ماں کو لے کر میرے پاس آیا تھا۔ ساری تفصیل بتا کر بولا کہ وہ گرفتاری دینے جا رہا ہے۔ ماں اگر ہوش میں آ جائے تو میں اسے بتا دوں کہ میں نے اس کی بات مان لی ہے اور پھولن دیوی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اب بھگوان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ میرے پچھلے پاپ معاف کر دے کیونکہ پاپ چھوڑنے کے بعد اسے سنسار بھی چھوڑنا پڑے گا۔ حکومت اسے صرف سزائے موت دے گی۔ ڈاکٹر کامران، میری کہانی عجیب ہے، سنا کر تمہارا سمے برباد نہیں کروں گا، بس یوں سمجھ لو کہ میرا پورا وجود صرف ماں کی دعا ہے اور یہاں بات ایک ماں اور اس کے لعل کی تھی۔ میری سورگباش ماں نے مجھے آنکھیں دکھا کر کہا کہ جب تو اس کی ماں کا علاج کرے گا اور وہ ٹھیک ہو کر جے راج کو آواز دے گی تو تو کیا کرے گا اور میرا دل بے ایمان ہو گیا ڈاکٹر کامران، میں نے اس سے کہا کہ وہ گرفتاری نہ دے اور ماں کے ہوش میں آنے کا انتظار کرے ورنہ وہ ٹھیک ہو کر بھی ٹھیک نہیں ہوگی۔ تب یہ رک گیا۔ پھولن دیوی نے حکومت سے سمجھوتا کیا، پھر وہ سنسار سے چلی گئی۔ اس کے ساتھیوں کا کریا کرم ہو گیا، یہ اپنی ماں کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا ہے۔ رات کی تنہائیوں میں تم اس کی آوازیں سنو تو دل پکڑ کر رہ جاؤ گے۔ یہ اس کے پیروں پر آنکھیں رگڑ رگڑ کر کہتا ہے کہ ماتا جی ہوش میں آ جاؤ، اب میں کوئی برا کام نہیں کروں گا۔''

میں خاموشی سے یہ کہانی سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ان خاتون کے سارے ٹیسٹ تو کیے ہوں گے؟''

''ہر ماہ کرتا ہوں تاکہ پتا چلتا رہے کہ اب دماغ کے خلیوں میں کیا تبدیلی ہوئی ہے!''

''آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ دو مریضوں کو خاص طور سے دیکھنا ہے۔ دوسرے مریض کے لیے کیا حکم ہے۔''

''وہ ایک صاحبِ حیثیت آدمی ہے، اس کا کیس بھی الجھا ہوا ہے۔ اسے بعد میں دیکھیں گے۔ میں جذباتی ہو گیا ہوں اوما دیوی کے بارے میں بتاتے ہوئے۔ اوما دیوی جے راج کی ماں کا نام ہے۔''

''ٹھیک۔ ان کے چند ماہ کے ٹیسٹ مل سکتے ہیں۔''

''آ جاؤ آفس چل کر بیٹھتے ہیں، کافی پئیں گے اور باتیں کریں گے..... آؤ۔'' شکلا نے کہا اور ہم آفس میں آ کر بیٹھ گئے۔ شکلا نے ایک ڈاکٹر کو طلب کر کے اوما دیوی کی فائل طلب کی جو تھوڑی دیر میں مجھے مل گئی۔ میں غور سے اسے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر شکلا پورے حوالوں کے ساتھ ان کے بارے میں مجھے بتا رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں اپنے طور پر نوٹس تیار کیے اور ہم کافی دیر تک اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔

میں اس رات اوما دیوی کی رپورٹوں پر سر کھپاتا رہا، ہر طرح سے ان کا جائزہ لیا اور ان کے بارے میں فیصلے کرتا رہا۔ اس وقت رات کے تین بجے ہوں گے کہ دروازے پر کچھ آہٹیں سنائی دیں، ایسا لگا جیسے کوئی بلی اپنے پنجوں سے دروازہ کھرچ رہی ہو۔

میں ایک دم چوکنا ہو گیا، دروازہ میں نے اندر سے بند نہیں کیا تھا۔ میں نے جلدی سے سامنے رکھے کاغذات سمیٹے اور انہیں ایک طرف رکھ کر اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں تیز روشنی تھی۔ اس روشنی میں، میں نے ایک اپسرا دیکھی۔ اپسرا کا نام ایسے ہی میرے ذہن میں ابھر آیا تھا۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس دودھ جیسے چہرے پر سیاہ بالوں کے جھنڈ طوفان کی طرح بکھرے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بہکتے ہوئے قدموں سے میری مسہری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں۔ حسن بہت بڑی طاقت ہوتا ہے۔ ایک انسان اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے میں بھی اس کی طاقت سے ناواقف نہیں ہوں۔ اس لڑکی کی آنکھیں اتنی سحر خیز تھیں کہ سامنے والے کے حواس کھو جائیں۔ ایک عجیب سی تمکنت تھی اس کے سراپا میں، پھر اس کی آواز ابھری۔ ''جن لوگوں کے پاس عقل کی شکتی نہیں، وہ ان گھروندوں کی طرح ہیں جن میں کوئی آباد نہ ہو۔''

میں اس کے بارے میں اندازہ لگانے لگا۔ معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ سادھنا نہ ہو۔ اس کے بارے میں کچھ باتیں میں نے سنی تھیں۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''آپ سادھنا ہیں؟''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو، وہ خاموش کھڑی تھی لیکن اس کی آنکھیں مجھے نہیں دیکھ رہی تھیں۔ میں نے پھر کہا۔ ''آپ نے بتایا نہیں۔ آپ سادھنا ہیں؟ آج تک آپ سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔''

''جانور اکثر نہ بول پانے سے مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں مگر انسان زیادہ بولنے سے مصائب کا شکار ہوتا ہے، اس لیے میں زیادہ نہیں بولتی۔''

''آپ بیٹھیے پلیز! مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی جگہ سے جنبش کی، میں سمجھا کہ وہ بیٹھنا چاہتی ہے لیکن وہ..... دروازے کی طرف مڑ گئی اور پھر دروازے پر رک کر بولی۔ ''کبھی کسی مشکل میں پڑ کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیے کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں برق کی سی تیزی سے اٹھا اور دوڑ کر دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں نے اسے کمروں کی طرف جاتے دیکھا، پھر وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میں دور سے دیکھتا رہا۔ اصل میں میرے ذہن میں شبہ تھا ممکن ہے میرا خیال غلط ہو، وہ سادھنا نہ ہو۔

اندر واپس آ کر بھی میں بہت دیر تک اس پر غور کرتا رہا۔ اس کا انداز، اس کے الفاظ بڑے متاثر کن تھے۔ وہ مجھے جانے کیوں سادھنا ہی لگی تھی۔

دوسرے دن مجھے ایک اچھا موقع مل گیا۔ ناشتے پر ڈاکٹر شکلا نے کہا۔ ''سوری ڈاکٹر کامران! ہمیں یعنی مجھے اور میری دھرم پتنی کو ایک دھارمک رسم میں شرکت کرنی ہے، اس کے ختم ہونے پر ڈرائیور دیا سرن کو لے کر گھر آئے گا اور تمہیں یہاں سے اسپتال لے آئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر اپنے کمرے کی کھڑکی سے میں نے شکلا اور ان کی بیوی دیا سرن کو کار میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں سوچنے لگا کہ سادھنا کے بارے میں معلومات کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا۔ راج کنول دوسری لڑکیوں کے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی تھی۔

''آپ نے ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ ہماری ہی عمر کے ہیں مگر ہمارے تایا جی بنے ہوئے ہیں۔ پاپا پر آپ نے جادو کی چھڑی گھما دی ہے، صبح شام آپ کے نام کی مالا جپ رہے ہیں، دیوتاؤں کا سمان دے رہے ہیں آپ کو تو، دیوتا مہاراج تھوڑا سا وردان ہمیں بھی دے دیجیے۔''

''آپ تو بڑے سادھنا ڈائیلاگ بول لیتی ہیں، راج کنول جی؟''

''مس کی بات کہی ہے آپ سے..... اڑائیں مذاق۔'' وہ برامان کر بولی۔

''ان لوگوں میں سے کوئی نہیں بولتا۔'' میں نے دوسری لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ کسی کو کہاں بولنے دیتی ہے، زبردستی ہماری لیڈر بن گئی ہے۔'' اس بار دوسری لڑکی بولی۔

''اگر کوئی اچھی بات کر سکتی ہو تو ضرور بولو۔'' راج کنول نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

''نا بابا..... ہمیں جینا ہے۔'' وہ لڑکی بولی۔

''اچھا بتائیے! آگرے میں آپ کو کون سی جگہ سب سے زیادہ پسند ہے؟'' راج کنول نے پوچھا۔

''میں آگرے کبھی نہیں آیا۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا اور وہ سب حیران رہ گئیں۔

''ایں..... ارے واہ، آپ نے تو تاج محل بھی نہیں دیکھا ہو گا مگر کیوں؟''

''میں بتاؤں؟'' دوسری لڑکی بولی۔ پھر کسی کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگی۔ ''ڈاکٹر صاحب نے پوری زندگی دیش سے باہر گزاری ہے، وہیں سے پڑھ کر واپس آئے ہیں۔ چاچا جی جوان کے گن گا گا کر نہیں تھکتے اس کا کارن یہی ہے، کیوں ڈاکٹر جی؟''

میں ہنس کر خاموش ہو گیا۔ اس بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

''تب پھر یہ بتائیے آپ کو آگرہ کیسے دکھایا جائے؟'' راج کنول نے پریشان لہجے میں کہا۔ پھر خود ہی بولی۔ ''بھگوان کے لیے آپ پاپا سے آگرہ دیکھنے کی فرمائش کبھی نہ کریں۔ اول تو ان کے پاس سمے نہیں ہو گا۔ دوسرے وہ آپ کو آگرے کی پوری ہسٹری بتانے بیٹھ جائیں گے۔ ہائے بھگوان آپ کو ہسٹری سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''زیادہ نہیں۔''

''شکر ہے۔ آپ پلیز پاپا سے خود کہیں کہ آپ ہمارے ساتھ آگرہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم آپ کو تمام جگہیں دکھا دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے ایک بات پر حیرت ہے راج کنول جی۔''

''بتائیے کیا؟''

''آپ لوگوں نے سادھنا جی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ بیشک وہ بیمار ہیں لیکن انہیں اس طرح تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''ہم نے نہیں چھوڑا ہے۔ پاپا نے ہدایت کی ہے کہ اسے زیادہ ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

''کیا وہ نیند میں بھی چلتی ہیں؟''

''ہاں اکثر۔ کیوں؟''

''رات کو وہ میرے کمرے میں آئی تھیں۔''

''ارے۔ آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ ویسے وہ بالکل بے ضرر ہے، آج تک اس نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔''

''میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟''

''آیئے۔'' راج کنول بولی اور میں ان کے ساتھ اٹھ گیا۔ یہ لوگ اسی کمرے میں داخل ہوئے تھے جس میں رات کو سادھنا داخل ہوئی تھی۔ کمرہ بہت خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ سادھنا ایک صوفے پر بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھی۔

ہماری آوازیں سن کر بھی اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں اس کے سامنے پہنچ گیا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، بے حد حسین آنکھیں اس وقت پتھرائی ہوئی تھیں۔ اسے کیا ہوا ہے۔ کیا بیماری ہے اسے۔ کیا واقعی اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ اچانک میرے ذہن میں کچھ الفاظ ابھرے۔ جان کر نہ جاننا بہتر ہے۔ اس وقت تک جب تک جاننا بہت ضروری نہ ہو۔ بابا صاحب نے مجھے ایک علم کی مشق کرائی تھی۔ میں نے آج تک اس مشق سے کوئی کام نہیں لیا تھا۔ کیا سادھنا کے بارے میں جاننے کے لیے اس عمل سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ فوری نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری لڑکیاں خاموش کھڑی تھیں۔ میں نے اسے آواز دی۔ ''مس سادھنا۔''

لیکن یوں لگا جیسے اسے میری آواز سنائی ہی نہیں دی ہو، وہ اسی طرح سامنے دیکھتی رہی تھی۔ پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔ لڑکیاں بہت دیر تک میرے ساتھ رہی تھیں۔ پھر میں نے لباس تبدیل کیا اور ڈرائیور کا انتظار کرنے لگا۔ ڈرائیور آ گیا اور میں اس کے ساتھ سرکاری اسپتال پہنچ گیا، جہاں ڈاکٹر شکلا اپنے کام کر رہے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم شکلا کے پرائیویٹ اسپتال چل پڑے۔ یہاں کچھ نئے مریض آئے تھے۔ ڈاکٹر ان میں مصروف ہو گئے۔ میں ان سے اجازت لے کر اوما دیوی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

جے راج بدستور ماں کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا اور ایک کرسی بیڈ کے پاس لا کر رکھ دی۔

''کیسی ہیں تمہاری ماتا جی؟'' میں نے پوچھا۔

''سنسار میں سب سے اچھی۔'' وہ پیار سے بولا۔

''ایک بات بتاؤ جے راج۔ تم پھولن دیوی کے گروہ میں شامل تھے اور اس کے ساتھ مل کر قتل و غارت گری کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تم نے بے دردی سے قتل کیا، کیا ان کی مائیں نہ ہوتی ہوں گی؟''

جے راج نے گردن جھکا لی۔ اس کا جواب اس کے چہرے پر سجا ہوا تھا۔ مزید کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ آج طبیعت کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ بابا صاحب کی عطا کی ہوئی سوغات کا کوئی مصرف تو ہونا چاہیے۔ میں اسے اپنی ذات کے لیے نہیں استعمال کر رہا تھا بلکہ ان کی ہدایت کے مطابق کسی کی حاجت روائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آخری فیصلہ کیا اور جے راج سے بولا۔ ''جے راج، تم باہر جاؤ۔''

''مگر ماں!'' وہ بچوں کی طرح بسور کر بولا۔

''میں ان کا معائنہ کروں گا۔''

''اچھا۔'' اس نے بے بسی سے کہا اور بددلی سے باہر نکل گیا۔ تب میں نے آنکھیں بند کیں اور ان قوتوں کو آواز دی جو میرے ذہن میں سو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ میرے دماغ میں سرخ روشنی پھیلتی چلی گئی، پھر میں نے خیال کی آنکھیں کھولیں اور مجھ پر حقیقتیں منکشف ہونے لگیں۔ میں خود بھی کیف و سرور میں کھو گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں خلا میں تیر رہا ہوں۔ ستارے میرے آس پاس سے گزر رہے ہوں۔ ایک نامعلوم تصور میری رہنمائی کر رہا ہو۔ کچھ انوکھے اشارے مجھے راستہ دکھا رہے ہوں۔ یہ اشارے بخوبی میری سمجھ میں آ رہے تھے اور میں انہیں ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ دیر تک یہ عمل جاری رہا۔ پھر دروازے پر دستک ہوئی اور میں سنبھل گیا۔ آنے والے ڈاکٹر شکلا تھے۔

''سوری ڈاکٹر کامران۔ اگر آپ مصروف ہوں تو.....'' انہوں نے کہا۔

''نہیں ڈاکٹر۔ تشریف لایئے۔''

''وہ پاگل بے چین کھڑا ہے۔ اسے بلا لوں؟''

''آیئے۔ باہر چلیں۔'' میں نے کہا اور شکلا کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جے راج کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود ڈاکٹر شکلا کے ساتھ اس کے آفس میں داخل ہو گیا۔ ''آپ اپنے نئے مریضوں سے فارغ ہو گئے؟''

''ہاں۔ عام سے کیسز ہیں، کوئی خاص بات نہیں۔ تم اوما دیوی کا کوئی خاص معائنہ کر رہے تھے۔''

''جی ڈاکٹر۔ میرے پاس آپ کی بتائی ہوئی پوری تفصیل اور لیبارٹری کی رپورٹیں اور اسے دی گئی دواؤں کی تفصیل موجود ہے۔ اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ آپ نے اسے بہت اچھی اور بے حد قیمتی دوائیں دی ہیں، ان سے بہتر دوائیں اور علاج ممکن نہیں ہو سکتا، لیکن میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں بتاؤ۔''

''اسے تین دن تک انجکشن دیئے جائیں گے۔ کیا ہمارے پاس یہ انجکشن موجود ہیں؟'' میں نے انجکشنوں کے نام بتائے۔

''آسانی سے مل جائیں گے لیکن؟''

''یہ دماغ کے تمام خلیوں کو ڈھیلا کر دیتے ہیں اور ان میں خون کی روانی معتدل ہو جاتی ہے۔''

''ہاں ان کا ایک عمل یہ بھی ہے۔ لیکن انہیں تین دن تک مسلسل دینے کا ایک نقصان بھی ہے۔''

''دماغ کی رگوں میں خون کی روانی بہت سست بھی ہو سکتی ہے، یہی نا؟''

''اس سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔'' شکلا نے کہا۔

''جی ڈاکٹر۔ تیسرے انجکشن کے بعد میں اسے ایک اور انجکشن بھی دوں گا۔'' میں نے ایک اور انجکشن کا نام بتایا۔

ڈاکٹر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''پورا دماغ تباہ ہو سکتا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔ ان دونوں ماں بیٹوں کو آپ کے پاس کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''بہت سال۔''

''اور آپ انہیں کتنے عرصہ یہاں رکھیں گے؟''

''عمر بھر۔''

''فرض کریں اوما دیوی مر جاتی ہیں تو آپ جے راج کے ساتھ کیا کریں گے؟''

''میں اسے ہمیشہ ساتھ رکھوں گا۔ وہ بہت برا انسان رہ چکا ہے لیکن برا انسان جب اچھا بنتا ہے تو اس سے اچھا اور کوئی نہیں ہوتا۔ یہ فیصلہ میں بہت پہلے کر چکا ہوں۔''

''ٹھیک۔ میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اس کی تفصیل بتانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پھر میں بہت دیر تک ڈاکٹر کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتاتا رہا۔ اور شکلا پتھرائے ہوئے انداز میں بیٹھا میری باتیں سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔

پھر وہ گہری گہری سانسیں لے کر بولا۔ ''ممکن تو ہے، حالانکہ یہ ایک جذباتی عمل ہے۔ لیکن تم نے اب تک جس جادوگری کا مظاہرہ کیا ہے اس کے تحت میں یہ ضرور کہوں گا کہ شاید ایسا ہو جائے لیکن یہ صرف جادوگری ہو گی اور..... اور.....'' شکلا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ مجھے ان اشاروں پر اعتماد تھا اور میں یہ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ شکلا دیر تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''کب سے آغاز کر رہے ہیں؟''

''آج سے کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوکے۔ میں آپ کو مطلوبہ انجکشن منگوائے دیتا ہوں۔''

تین دن تک عمل کرنا تھا۔ ان تین دنوں میں، میں نے نہ کچھ سوچا نہ کیا حالانکہ سادھنا میرے ذہن میں تھی اور میں اس پر بھی توجہ دینا چاہتا تھا لیکن ابھی نہیں۔ منصوبہ میں نے بنایا تھا اور بڑے ڈرامائی انداز میں کام کرنا تھا۔ جے راج ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا جبکہ اسی سے اصل کام لینا تھا۔ میں صبر و سکون سے اپنا کام کرتا رہا۔ تین انجکشن پورے ہو گئے۔

چوتھے دن باقی تیاریاں کیں اور پورا اسکرپٹ تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر شکلا نے کچھ لوگوں کو ہدایت کی کہ اس کمرے کے آس پاس کسی کو نہ آنے دیا جائے، اگر کوئی غیر معمولی آواز سنائی دے تب بھی کوئی ادھر نہ دوڑے۔ آخر کام کا وقت آ گیا۔ میں اوما دیوی کے پاس بیٹھا ہوا تھا، میں نے اسے چوتھا خطرناک انجکشن دیا جو ذہن کو شدید ہیجان کا شکار کر دیتا تھا۔ دو منٹ انتظار کے بعد اچانک میں نے جے راج کی طرف رخ کر کے کہا۔ ''جے راج، ماتا جی ختم ہو گئیں۔''

جے راج کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر وہ بری طرح چیخا۔ ''ماں۔ ماں۔'' یہ کہہ کر وہ اوما دیوی کی طرف لپکا اور اس کے جسم سے لپٹ گیا۔ ڈاکٹر شکلا نے ایک دم ہاتھ میں پکڑی ہوئی پچکاری سے جے راج کے چہرے پر ایک خاص سرخ رنگ پھینکا، ساتھ ہی ایک ہلکا سا پٹاخہ چلا دیا جس سے دھما کا ہوا تھا۔

میری آنکھیں اوما دیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس تمام عمل کے دو رخ تھے۔ اگر عمل نگیٹیو ہوتا تو بزرگ عورت کے دماغ کی ساری رگیں پھٹ جائیں گی اور اس کی ناک، منہ اور کانوں سے خون بہنے لگے گا اور اگر دو منٹ تک ایسا نہیں ہوا تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

ایک ایک لمحہ صدیاں بن کر گزر رہا تھا۔ ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اوما دیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس وقت یہ آنکھیں شعور کی روشنی سے محروم تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں زندگی چمکنے لگی۔ پھر اس کی گردن کو ہلکی سی جنبش ہوئی اور میرے منہ سے گہری سانس نکل گئی، جس کے ساتھ ہی آواز ابھری تھی۔ ''اللہ تیرا شکر ہے۔''

تب ہی ایک دلدوز آواز ابھری۔ ''جے۔ جے۔ ہے بھگوان، جے۔ میرے بچے، میرے لعل۔ ہائے میرے بچے، مار دیا پاپیوں نے، میرا جے۔ ہائے مار دیا، میرے بچے کو۔ ہائے چھین لیا مجھ سے میرا لعل۔ ہائے میرے بچے، گولی لگی ہے نا تجھے۔ بچالو، بھگوان کے لیے ہائے میرے بچے کو بچالو۔ کہا تھا میں نے تجھ سے جے۔ برے کام اچھے نہیں ہوتے۔ لے لیا پاپی دھرم سنگھ نے اپنا بدلہ۔ ہائے تجھے تیرے ماما نے ڈاکو بنایا تھا، تیرے پتا کے بدلہ لینے کے لیے۔ ہائے میرے جے۔ ہائے میرے جے!''

اوما دیوی کے سارے اعصاب جاگ گئے تھے۔ وہ جے راج کو بری طرح اپنے بازوؤں میں بھینچ رہی تھی۔ اسے چوم رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر شکلا کی طرف دیکھا اور اسی وقت ڈاکٹر شکلا رو پڑا۔ وہ بڑی مشکل سے اس جذباتی منظر کو برداشت کر رہا تھا۔

''ارے ڈاکٹر صاحب۔ سنبھالیے خود کو، پلیز۔'' میں ڈاکٹر شکلا کے پاس پہنچ گیا۔

''اور تم اب بھی کہو گے کہ تم انسان ہو۔ دیوتا ہو تم کامران، تم انسان ہو ہی نہیں سکتے۔'' شکلا نے کہا۔

''آیئے باہر چلیں، اب سب ٹھیک ہے۔ دونوں ماں بیٹے اب باقی معاملات سے خود نمٹ لیں گے۔ آیئے۔'' میں نے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ بچوں کی طرح میرے ساتھ چل پڑا۔ میں اسے آفس میں لے آیا۔

''پانی منگوا دو میرے لیے۔ میرے اعصاب تباہ ہو گئے ہیں۔'' میں نے اس کے لیے پانی منگوایا۔ وہ بولا۔ ''اب میں تمہاری تکنیک سمجھا ہوں، یقین کرو پہلے میں کچھ بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ تم نے اسے تین دن تک جو انجکشن دیئے، وہ اس کے دماغ کے تناؤ کو ڈھیلا کرنے کے لیے دیئے تھے پھر تم نے اسے یہ چوتھا انجکشن اس کے ذہنی ہیجان کو شدید کرنے کے لیے دیا اور جب اسے اس انجکشن کے تحت شدید ہیجانی ہوش آیا تو تم نے دھماکا کر کے اسے بیٹے کی طرف متوجہ کیا اور جب اس نے بیٹے کو خون میں لت پت دیکھا تو اس ہیجان نے رخ بدل لیا۔ او مائی گاڈ۔ اتنی گہری سوچ۔ انتہائی زبردست پلان اور ایک بھی عمل غلط نہیں ہوا۔ اومائی گاڈ۔ اتنا گہرا تم نے کیسے سوچا۔'' ڈاکٹر شکلا بہت دیر تک وحشت کا شکار رہا تھا۔

اس رات مجھ پر بھی شدید ذہنی دباؤ رہا تھا۔ سخت کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ نماز سکون کا سمندر ہے۔ بہت سی سوچیں دامن گیر تھیں، طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سے احساسات دل میں تھے۔ مجھے تو بڑے سہارے حاصل ہیں اور ہمیشہ رہے۔ بابا احمد علی، امام علی اور پھر دیار غیر میں بابا پردہ پوش جیسی شخصیت۔ بیشک انہوں نے اپنا چہرہ ڈھک لیا ہے لیکن جو کچھ انہوں نے میرے اندر اتار دیا ہے، وہ بہت تھا۔

بہت دیر تک یہ باتیں ذہن میں آتی رہیں۔ میں ایک ہندو ڈاکٹر کے گھر میں تھا لیکن انسان کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اگر واقعی انسان ہو تو بڑا ہوتا ہے۔ اسی قیام کے دوران ایک دن میں شکلا کی کوٹھی کے لان پر گھاس پر نماز پڑھ رہا تھا کہ کسی نے مجھے دیکھ لیا۔ دوسرے ہی دن گھر کے ایک ملازم نے ایک خوبصورت جائے نماز میرے کمرے میں لا کر رکھی تھی میں نے اسے چونک کر دیکھا۔

''ارے۔ یہ کون لایا۔ یہاں کہاں سے آئی؟''

''مالکن نے بازار سے منگوائی ہے مہاراج۔ آپ گھاس پر عبادت کر رہے تھے۔'' میں یہ سن کر بہت متاثر ہوا تھا۔ اس وقت بھی بے شمار خیالات میرے ذہن میں گردش کر رہے تھے کہ مجھے ایک آہٹ سی محسوس ہوئی اور میری نظریں اس سمت گھوم گئیں۔ وہ ڈاکٹر شکلا تھا جو ایک جگہ بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور میرے قریب آ گیا۔

''بھگوان کی سوگند غلطی سے آواز ہو گئی۔ ورنہ میں نے جان بوجھ کر شیطان کا عمل نہیں کیا ہے۔''

''ارے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شکلا صاحب۔ آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

''مسلمانوں کی عبادت کو میں دل سے مہان مانتا ہوں۔ جب چاہا اپنے خدا کے سامنے پہنچ گئے اور سکون حاصل کر لیا۔ مجھے بھی آج ایک پل نیند نہیں آئی تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ باہر نکلا تو تم نظر آئے۔ ساری رات نماز پڑھتے رہتے تو میں یہیں بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔'' وہ بڑے عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں جتنا تمہارے بارے میں سوچتا ہوں حیران ہوتا جاتا ہوں۔ میں نے کتنی ہی بار کلینک میں فون کر کے ان دونوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ بالکل ٹھیک ہیں۔ اوما دیوی نے خوب کھایا پیا ہے اور دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کے پیار میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''

''اب کیا کریں گے ان کے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''کلینک کے پچھلے حصے میں ایک بلڈنگ بنا رکھی ہے میں نے۔ اس میں اسٹاف کے کچھ لوگ رہتے ہیں۔ ایک فلیٹ ان ماں بیٹوں کو دے دوں گا۔ جے راج کو کلینک میں کچھ ذمے داریاں دے دوں گا۔ یہیں رہ کر زندگی گزاریں گے۔''

''اور آپ مجھے دیوتا کہتے ہیں۔ دیوتا تو آپ ہیں شکلا صاحب۔'' میں نے متاثر لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد شکلا بولا۔ ''کچھ کہنا چاہتا ہوں؟''

''ارے ضرور۔ بتائیے۔''

''ہر شخص کے دل کے کچھ حصے زخمی ضرور ہوتے ہیں۔ میرے اندر بھی ایک زخم ہے جس کا میں علاج نہیں کر سکا۔''

''اگر میں کسی کام آ جاؤں تو مجھے دلی خوشی ہو گی۔''

ڈاکٹر شکلا کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''ڈاکٹر تو میں بھی ہوں اور ایک طویل تجربہ رکھتا ہوں۔ میڈیکل لائف میں بہت سے تجربات بھی کیے ہیں لیکن دواؤں کے ساتھ کسی مریض کی صحتیابی میں ایک نفسیاتی دھماکے نے میرے اعصاب جھنجھوڑ دیئے ہیں۔ یہ ایک انوکھا طریقہ علاج ہے جس کے بارے میں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔'' وہ خاموش ہوا۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ بولا۔ ''میری بیٹی سادھنا ہے، تم اس سے ملے ہو گے؟''

''جی۔'' میں نے کہا۔

''بے حد ذہین۔ میری بیٹیوں میں سب سے خوبصورت ہے، لیکن اچانک اسے کچھ ہو گیا۔ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ ایسا بالکل اچانک ہوا۔ میں نے اپنی زندگی کا پورا تجربہ اس پر صرف کر دیا۔ ہر طرح سے اسے چیک کیا لیکن میں نہیں سمجھ پایا کہ ایسا کیوں ہو گیا۔ اب وہ بالکل غیر معتدل ہے۔ اس کا علم اس کے ساتھ ہے لیکن ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ تم نے اوما دیوی کو جس طرح سے ٹریٹ کیا ہے، اس نے نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک چراغ روشن کر دیا ہے۔ ممکن ہے تمہاری ذہانت میرے دل کا یہ گھاؤ بھر دے۔ ممکن ہے تم اس کے علاج کا کوئی طریقہ نکال لو۔ ممکن ہے تم اس کی بیماری سمجھ لو۔ گھر کے لوگ کہتے ہیں کہ اس پر جادو ہو گیا ہے، کسی پریت کا سایہ ہو گیا ہے۔ میں نہیں مانتا لیکن۔ بھگوان جانتا ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری بچی کا علاج کر دو۔ اس کام میں کوئی صلہ نہیں دے سکوں گا۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے خلوص سے کہا۔

تنہائی میں، میں نے سادھنا کے بارے میں سوچا۔ دوبارہ اسے دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی بس سرسری طور پر اس پر نگاہ ڈالی تھی لیکن ڈاکٹر شکلا کی درخواست میرے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اب سادھنا پر سنجیدگی سے غور کرنا تھا اور ایک لائحہ عمل بنانا تھا۔ چنانچہ دوسرے دن میں نے خاص طور سے راج کنول کو بلا لیا۔

''ارے۔ کیا واقعی آپ نے مجھے بلایا ہے؟'' وہ آتے ہی بولی۔

''ہاں۔ اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ خود آپ کے پاس آنے کی ہمت نہیں کر پایا تھا۔''

''کیوں؟''

''آپ میرے لیے احترام کا درجہ رکھتی ہیں۔''

''کیوں۔ شکل سے بوڑھی لگتی ہوں۔ کمال ہے اتنے خوبصورت ہو کر ایسی بدصورت باتیں کرتے ہو۔ چلو مرضی ہے میں تو آپ کو فتح پور سیکری لے جانے کا پروگرام بنا رہی ہوں جہاں اکبر اور جودھا بائی کے پیار کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ جانتے ہیں کیوں؟''

''بتا دیجیے۔'' میں نے کہا۔

''کیونکہ اکبر مسلمان تھا اور جودھا بائی ہندو۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''چلیں چھوڑیں۔ بتایئے مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟''

''سادھنا کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''دھت تیری کی۔ میں سمجھی آپ مجھ سے میرے بارے میں کچھ جاننا چاہیں گے۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''وہ بعد میں جان لوں گا۔''

''وعدہ۔'' اس نے شرارت بھری مسکراہٹ سے کہا۔

''جی۔ وعدہ۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

''چلیے پوچھیے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''سادھنا نے کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟''

''بی اے کیا ہے۔''

''ڈاکٹر شکلا نے آپ بہنوں میں سے کسی کو ڈاکٹر بنانے کی کوشش نہیں کی؟''

''نہیں۔ ہم اس قابل ہی نہ تھے۔''

''سادھنا کس مزاج کی تھیں۔ میرا مطلب ہے اس کیفیت سے پہلے۔''

''نارمل۔ عام لڑکیوں جیسی۔''

''رومینٹک۔''

''سو فیصد۔''

''کوئی انہیں پسند تھا؟''

''ان معنوں میں نہیں۔ یعنی کسی سے اس کا افیئر نہیں تھا۔''

''وثوق سے کہتی ہیں؟''

''ہاں۔ ہم برابر کی بہنیں ہیں اور سگی بہنوں سے اچھا دوست اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ البتہ اسے ہر صاحب فن سے بہت دلچسپی تھی، اکثر لوگ اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے تھے۔ بہت سے نوجوان لڑکوں نے اس کے قریب آنے کی کوشش کی لیکن ان کی غلط فہمی بھی جلد رفع ہو جاتی تھی۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں مس راج کنول کہ کسی طرح کی ناکامی نے تو ان کی یہ کیفیت نہیں کر دی؟''

''نہیں۔''

''کوئی ایسی شخصیت جس سے وہ آخری بار ملی ہوں اور اس کے بعد ان کی یہ کیفیت ہوئی ہو؟''

''میرے علم میں نہیں۔ اس کی ایکٹویٹیز ہم لوگوں سے الگ بھی ہوتی تھیں۔ ایک بات بتائیں۔'' راج کنول بولی۔

''جی۔''

''آپ اس کے بارے میں ایسے تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟''

''میں اس کی بیماری کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کا علاج کر سکوں۔''

''کیا آپ پاپا سے بڑے ڈاکٹر ہیں؟ جنہیں ساری دنیا مانتی ہے۔ آپ کریں گے اس کا علاج۔ آپ کے خیال میں پاپا نے اس کے لیے آخری حد تک کوشش نہیں کی ہو گی؟'' راج کنول نے خاصے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ اسے میری بات ناگوار گزری تھی۔ بیٹی تھی۔ باپ کو سب سے بڑا سمجھنے والی۔ اس پر ایمان رکھنے والی۔ مجھے اس کی بات بالکل بری نہیں لگی تھی۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''یہی میں نے ڈاکٹر شکلا سے کہا تھا۔''

''کیا؟''

''کہ وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔ میں ان کے سامنے کچھ نہیں ہوں، مگر ان کا حکم ہے کہ میں سادھنا کا علاج کروں۔''

''پاپا نے کہا ہے آپ سے؟'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''جی۔''

''ہو سکتا ہے انہیں بھی آپ پر شبہ ہو گیا ہو۔''

''کیسا شبہ؟''

''جو ہم سب کو ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم لوگوں کی اتنی عمر ہو گئی، ہم نے پاپا کو کبھی کسی سے اتنا متاثر نہیں دیکھا۔ یہ آپ کی جادوگری ہے کہ آپ نے انہیں شیشے میں اتار لیا ہے۔ پاپا نے سوچا ہو گا کہ آپ ممکن ہے ایسی ہی جادوگری سادھنا پر بھی دکھا دیں۔''

''اوہ۔ شاید!''

وہ خاموش رہی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ''بے حد شکریہ راج کنول۔''

''اوکے۔ جاؤں؟'' وہ کھڑی ہو گئی اور پھر مزید کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ سادھنا کے بارے میں مجھے اتنی ہی معلومات درکار تھیں۔ گھر کے لوگ اس کے بارے میں یہی سوچتے تھے کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ کسی جادو یا سائے کے زیر اثر ہے۔

دوسرے دن صبح کے ناشتے کے بعد مسز شکلا میرے کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''راج کنول نے آپ سے جو بدتمیزی کی ہے، اس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں۔ بس کیا کہوں۔ ایک درخواست کروں گی بیٹے۔ آپ میرے بچوں کی طرح ہیں۔ اگر ممکن ہو تو شکلا صاحب سے راج کنول کی بدتمیزی کا تذکرہ نہ کریں ورنہ گھر کا ماحول خراب ہو جائے گا۔''

''کبھی نہیں کروں گا۔ اور نہ کرتا۔ میں جانتا ہوں کہ بیٹیاں اپنے باپ پر ناز کرتی ہیں اور کسی اور کو وہ ان سے برتر دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ ویسے آپ کو ان کی گفتگو کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟''

''دوسری بہنوں کو اپنے اور تمہارے درمیان ہونے والی باتیں بتا رہی تھی۔ شکر ہے شکلا صاحب نے نہیں سنا۔ ورنہ بات بہت بگڑ جاتی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ راج کنول جی کی ناراضی فطری تھی، مجھے بالکل برا نہیں لگا۔''

''ایک بات پوچھوں، برا تو نہیں مانو گے؟''

''آپ میری ماں جیسی ہیں۔ ماؤں کی بات کا برا نہیں مانا جاتا۔'' میں نے کہا اور میری آواز بھرا گئی۔

''تمہارا پریوار تو ہو گا؟''

''جی..... ہے۔''

''تم ان سے روٹھ کر نکل آئے ہو؟''

''نہیں۔ بس کچھ ذمے داریاں پوری کرنے نکلا ہوں۔''

''شکلا جی کہتے ہیں تم دیوتا سمان ہو۔ تمہارے پاس کوئی بڑی شکتی ہے۔ یہ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ تم سے کہوں کہ میری سادھنا کو ٹھیک کر دو۔ گھر کی سب سے اچھی بچی تھی وہ۔ سب کی ہمدرد۔ سب کے کام آنے والی۔ شکلا جی اور میں سب سے زیادہ اسے چاہتے تھے۔ ہم اس کی حالت سے بہت دکھی ہیں۔''

''مجھے اس کا پتا ہے۔ آپ بھروسہ رکھیں۔ شکلا جی نے مجھے اس کے علاج کا حکم دیا ہے، میں پوری کوشش کروں گا۔''

''بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ تمہیں کامیاب کرے۔''

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ رات کو تہجد کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے سادھنا کے بارے میں اپنی کامیابی کی دعا مانگی، پھر بابا صاحب کا تصور کر کے کہا کہ بابا صاحب آپ نے جو علم مجھے دیا ہے، وہ بہت بڑا ہے اور میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے آج تک اسے استعمال نہیں کیا اور آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ میں سادھنا کو پڑھ کر اس کا علاج کرنا چاہتا ہوں، کسی نام و نمود کے لیے نہیں، بس ایک انسان کی مدد اور ایک گھرانے کی خوشی کے لیے۔ کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟

کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد میرے دماغ نے ایک تاویل پیش کی۔ کوئی بھی علم اس لیے ملتا ہے کہ اسے انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے۔ اسے اپنی ذات میں قید کر کے دنیا سے واپسی اس علم کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ میرے سوال کا جواب تھا۔ دل مطمئن ہو گیا۔

دوسرے دن میں نے ڈاکٹر شکلا سے کہا۔ ''شکلا صاحب آپ نے سادھنا بہن کے لیے مجھے جو حکم دیا ہے، کیا اس کی توثیق کرتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' وہ بولے۔

''مجھے ان کے علاج کی اجازت ہے؟''

''سو فیصد اجازت ہے۔''

''انہیں اسپتال منتقل کر دیں۔''

''اوہ۔ اچھا۔ بالکل ٹھیک۔ ہاں یہی مناسب ہے۔ بلکہ بہت مناسب ہے۔ تم نے ٹھیک سوچا۔ میں کل ہی اسے کلینک منتقل کر دوں گا۔''

پھر سادھنا کو کلینک کے ایک بے حد خوبصورت کمرے میں فروکش کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ شاردا نامی لڑکی کو رکھا گیا تھا جو اس کی کزن اور نرم خو لڑکی تھی۔ پھر میں نے تنہا کمرے میں سادھنا کا معائنہ کیا۔ پہلے ہی مرحلے پر مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' وہ جیسے ٹھٹھک گئی۔ پھر خاموشی سے بیٹھ گئی، جس سے مجھے عجیب سا احساس ہوا۔

پھر میں نے اسے ایک مخصوص لہجے میں دوسرے احکامات دیئے جنہیں اس نے خاموشی سے سر انجام دیا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ ہپناٹزم کے ٹرانس میں ہے اور اس لہجے میں دیئے گئے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ آخر کار میں نے اپنے عمل کا آغاز کر دیا۔ میں نے بابا صاحب کے عطا کیے ہوئے علم کے مطابق اس کے ذہن کی کتاب کھول لی۔ اور مجھ پر انکشافات ہونے لگے۔

سادھنا فنون سے دلچسپی رکھتی تھی اور کسی بھی ماہر فن سے تعارف کی شائق رہتی تھی۔ ایک اوپیرا ہاؤس میں اس نے ایک نوجوان ہپناٹسٹ کو دیکھا اور اس سے متاثر ہو گئی۔ ہپناٹسٹ، ہپناٹزم ضرور جانتا تھا لیکن اسے اس کا ماہر نہیں تھا۔ اس نے سادھنا پر اپنا عمل کیا لیکن بعد میں اسے ٹھیک نہیں کر سکا۔ سادھنا کے دماغ کا ایک خلیہ شدید متاثر ہو گیا اور زیادہ وقت گزر جانے پر اس کی خون کی سپلائی منقطع ہو گئی۔ ہپناٹزم کرنے والا کسی دوسرے ملک سے تعلق رکھتا تھا، وہ چلا گیا لیکن سادھنا کا ذہن معطل ہو گیا اور وہ ابھی تک اس کا شکار ہے۔ یہ تفصیل دنیا کی کوئی میڈیکل سائنس نہیں جان سکتی تھی۔ یہ روحانیت ہی کا کرشمہ تھا۔

میں نے ڈاکٹر شکلا کو اس بارے میں بتایا۔ ''سادھنا کا ایک آپریشن کرنا ہو گا۔''

''دماغ کا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''مجھے اس کی تفصیل بتاؤ گے؟''

''نہیں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اوہ۔ ٹھیک ہے۔ میں نے اس لیے پوچھا کہ بمبئی میں نیورو سرجن وکٹر دانیال ہوتے ہیں۔ تم نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ دنیا کے پیچیدہ ترین آپریشن انہوں نے کیے ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ اگر ان کی ضرورت ہو تو.....''

''نہیں۔ یہ آپریشن میں کروں گا۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر شکلا نے کسی قدر ہچکچائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میری فرمائش پر ڈاکٹر شکلا نے تیاریاں شروع کر دیں۔ آپریشن کا وقت مقرر ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ ہوں گے ڈاکٹر۔''

''آپریشن میں؟'' وہ گھگھیائے سے لہجے میں بولا۔

''جی۔'' میں نے کہا۔

شکلا کے چہرے پر ہیجان کے آثار پیدا ہو گئے۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے اس امتحان میں نہ ڈالو کامران۔''

''آپ ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کو بڑے بڑے امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے۔''

بڑی مشکل سے شکلا صاحب تیار ہوئے تھے لیکن آپریشن تھیٹر میں بھی ان کا چہرہ دہشت سے سفید ہو رہا تھا۔ دو ڈاکٹر اور دو نرسیں بھی ساتھ تھیں۔ میں نے آپریشن شروع کر دیا۔ شکلا پتھرا گیا تھا۔ وہ پلک جھپکے بغیر مجھے دیکھے جا رہا تھا اور میرے ہاتھ کام کر رہے تھے۔ پورے سوا گھنٹے میں میرا کام مکمل ہو گیا۔ دوسرے ڈاکٹر اور نرسیں عقیدت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آخری عمل کے بعد میں نے مسکرا کر شکلا کو دیکھا اور کہا۔ ''آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا سر!''

''کیا؟''

''آپریشن کامیاب رہا ہے۔''

''ایں۔ ہاں۔ ہاں ایہ ٹھیک ہو جائے گی؟''

''ان شاء اللہ۔'' میں نے جواب دیا۔

چار دن کے اندر سادھنا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ مکمل ہوش کی باتیں کر رہی تھی، لیکن مجھے اب یہاں کوفت ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کا رویہ بالکل بدل گیا تھا، اب وہ مجھے بالکل غیر انسانی شخصیت سمجھ رہے تھے۔ میرے سامنے مؤدب رہتے تھے۔ خود راج کنول جو بہت تیز طرار تھی، مجھ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ ویسے بھی مجھے یہاں سے جانا تھا۔ شکلا نے میرا ٹھیکہ نہیں لے رکھا تھا۔ میں نے ایک دن کہا۔ ''میرے لیے اور کوئی حکم ڈاکٹر صاحب؟''

''اور کیا کیا کرو گے میرے لیے۔ اب مجھے اپنے دیوتا کی پوجا کرنے دو۔''

''میں اب جانا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔ شکلا چونک پڑا۔ ''کہاں؟''

''کہیں بھی۔ جانا تو ہے۔''

''ہاں۔ جانا تو ہے۔ تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں ڈاکٹر کامران۔ وہ جو میں نے آج تک نہیں پوچھا۔''

''اب بھی نہ پوچھیں ڈاکٹر شکلا۔ کچھ باتیں راز رہیں تو اچھا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے تمہیں دیوتا جانا ہے۔ جو تم کہو گے وہ مانوں گا۔ بس میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے کبھی اپنے بارے میں مت بتانا، دوبارہ پوچھوں گا بھی نہیں۔ کوئی پیشکش نہیں کروں گا۔ بس تم میرے بیٹے ہو اور..... اور.....'' ڈاکٹر شکلا کے آنسو نکل آئے۔

میں خاموش ہو گیا۔ خود بھی الجھن میں تھا، آگے کے لیے کوئی بات ذہن میں نہیں تھی۔ اس طرح کسی کے گھر میں جم جانا بھی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ یہاں کافی وقت گزر چکا تھا۔ کچھ دن اور خاموشی سے گزر گئے۔

پھر ایک دن مجھے خیال آیا کہ شکلا نے کہا تھا کہ دو مریضوں کو مجھے خاص طور سے دکھانا ہے۔ ان میں سے ایک تو اوما دیوی تھی جو اللہ کے حکم سے ٹھیک ہو گئی تھی، دوسرے مریض کے بارے میں ڈاکٹر نے دوبارہ بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس بارے میں ڈاکٹر شکلا سے بات کی اور اسے یاد دلایا۔

''ہاں۔ ایشور چندر جی۔ آگرے کے بہت بڑے صنعتکار ہیں۔ بڑے دولت مند لوگ ہیں۔ میں واقعی ان کے مرض کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ کافی دن وہ میرے پاس رہے۔ پھر ایک دن ان کے گھر والے انہیں ڈسچارج کرا کر لے گئے۔''

''اوہ۔ کیا تکلیف تھی انہیں؟''

''میں نہیں سمجھ سکا۔ دورے پڑتے تھے۔ پتا نہیں کیا تھا۔''

''بعد میں آپ نے نہیں پوچھا کہ اب کیسے ہیں؟''

''نہیں۔ مجھے ان کا اس طرح لے جانا اچھا نہیں لگا تھا۔''

''اب انہیں دیکھنا پسند کریں گے؟''

''اگر تم چاہو۔''

''اور کوئی الجھا ہوا کیس نہیں ہے۔ دیکھیں کیا کیفیت ہے ان کی، ممکن ہے کچھ سمجھ میں آ جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر شکلا نے کہا۔ اور ہم نے وقت طے کر لیا۔ ویسے میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات اب الجھن کا باعث بن رہی ہے۔ ڈاکٹر شکلا کسی بھی قیمت پر مجھے یہاں سے نہیں جانے دے گا جبکہ یہ کسی طور ممکن نہیں ہے کہ میں اور وقت یہاں گزاروں۔ کچھ دن اور رہ لوں، اس کے بعد خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ کہاں جاؤں گا یہ سوچنا بیکار تھا۔ وقت جہاں بھی لے جائے دیکھا جائے گا۔ اتفاق سے اس دن ہی راج کنول میرے پاس آ گئی۔ اس کا منہ بنا ہوا تھا۔

''گھر کے سارے لوگ مجھ سے ناراض ہیں۔'' وہ بولی۔

''کیوں؟''

''اس دن جو میں نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔''

''میں نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔''

''میں نے ہی کہہ دیا تھا۔''

''آپ جیسا کہیں۔ میں ان سے بات کروں؟''

''بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ یوں کریں اپنی ناراضگی مجھ سے ختم کر دیں۔ سب کے سامنے ہنس بول کر باتیں کریں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر ہم ایک پکنک منائیں گے۔''

''وہ بعد کی بات ہے۔ سادھنا اب کیسی ہیں؟''

''بالکل ٹھیک۔ پتا جی آپ کو جادوگر کہتے ہیں۔ وہ میں نے بھی مان لیا ہے۔ ایک کام کر سکتے ہیں آپ؟''

''بتائیے کیا؟''

''مجھے بھی جادو سکھا دیں۔'' اس نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اسی رات میں نے ایشور چندر جی کے بارے میں شکلا سے مزید معلومات حاصل کیں۔ بڑا معزز خاندان تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے جن میں ایک آگرے کا پولیس کمشنر تھا۔ دوسرا بزنس کرتا تھا۔ تیسرا تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر شکلا نے ان لوگوں کو پہلے سے بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ آخر کار ہم چل پڑے۔

ایشور چندر کی کوٹھی بھی بے حد شاندار تھی۔ بڑے سے گیٹ سے گزر کر کار اندر داخل ہوئی اور پورچ میں جا رکی۔ ایک ملازم نے ڈائننگ روم کھول دیا۔ ڈاکٹر شکلا کو سب پہچانتے تھے۔

ڈاکٹر شکلا نے ایشور چندر کے بارے میں ملازم سے پوچھا۔ ''اب ایشور جی کیسے ہیں؟''

''پتا نہیں صاحب جی۔ مالک کا علاج لندن میں ہو رہا ہے۔''

''کیا مطلب۔ وہ کہاں ہیں؟''

''ہفتہ ہو گیا۔ ہریش چندر جی انہیں لندن لے گئے ہیں۔''

''اوہو۔ ان کی دھرم پتنی جی ہیں یا ساتھ گئی ہیں؟''

''نہیں۔ وہ ہیں۔ ہریش چندر جی بھی ہیں۔ آپ بیٹھیے، میں سب کو خبر کرتا ہوں۔'' نوکر نے کہا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔

''سوری کامران، مجھے فون کر لینا چاہیے تھا۔ خیر دس منٹ میں ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا اور سرسری نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اچانک میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی اور میرے ذہن میں زبردست چھنا کا ہوا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط : 17

دیوار میں ایک فریم لگا ہوا تھا جس میں ڈاکٹر نیمو کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ وہی ڈاکٹر نیمو جو میڈیکل کانفرنس میں شریک تھی اور رات کو میرے ہوٹل کے کمرے میں گھس آئی تھی اور صبح کو مردہ پائی گئی تھی جس کے قتل کے الزام میں مجھے گرفتار کیا گیا تھا اور بعد میں سزائے موت سنا دی گئی تھی۔ یہ کارنامہ بھوریا چرن کا تھا پھر اس نے کسی پورنی کو نیمو کا ہمشکل بنا کر میرے پاس بھیجا تھا۔ یہاں اس کی تصویر دیکھ کر مجھے گزرے واقعات یاد آ گئے، ابھی میں کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک قدآور جوان باریک ململ کے دھوتی کرتے میں ملبوس اندر داخل ہوا اور مسکراتا ہوا ڈاکٹر شکلا کی طرف بڑھا۔

"پرنام چاچا جی۔ اپنے آنے کی خبر تو کر دی ہوتی۔ ہمارے بھاگ کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمارے لیے....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف توجہ دی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ایک دم ٹھٹھک گیا۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ شکلا ان کیفیات سے بے خبر تھا۔ اس نے کہا۔ "تم لوگ ایشور چندر جی کو کلینک سے لے آئے۔ اس کے بعد بتایا تک نہیں کہ ان کا حال کیا ہے، بس ان کی خبر لینے آ گیا تھا۔"

نوجوان ان کی باتوں سے بے خبر مجھے ٹکر ٹکر گھورے جا رہا تھا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ "یہ کون ہیں چاچا جی۔"

"یہ ڈاکٹر کامران مسعود ہیں۔ بس یوں سمجھو بھگوان سمان ہیں۔ بالی سی عمر ہے مگر بھگوان نے وہ وردان دیا ہے کہ بس، میں نے ایسا جوان....."

"میں ابھی آیا چاچا جی۔" اس نے کہا اور جھپاک سے باہر نکل گیا۔ باہر میں نے کچھ آوازیں سنیں جن کے بول سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ اُدھر شکلا جی کہہ رہے تھے۔

"بڑا نامی گرامی پولیس کمشنر ہے سریش چندر۔ جرائم پیشہ لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔"

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ پھر تو ٹھیک ہے بے چارے سریش چندر کا یہ حال۔ ایک خطرناک قاتل بہ نفس نفیس اس کے گھر حاضر ہو گیا تھا۔

وہ چند ہی منٹ میں واپس آ گیا لیکن اب اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔ آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "دھن واد کامران جی مہاراج۔ آپ نے سپنے میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ گیدڑ خود شہر کی طرف بھاگ پڑتا ہے۔ دیکھ لیں آپ خود بھیڑیوں کی بھٹ میں آ گھسے۔"

اسی وقت دروازے پر شور اٹھا اور بپھرا ہوا نوجوان اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے ایک عمر رسیدہ عورت اور دو لڑکیاں بھی تھیں۔ عمر رسیدہ عورت چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "نریش ہوش میں آ..... پاگل ہو گیا ہے کیا۔"

"آپ پیچھے ہٹ جائیے چاچا جی، پیچھے ہٹ جائیے۔ بھگوان کی سوگند میں اسے بھون کر رکھ دوں گا۔ میں نے موسی جی کی ارتھی پر کھڑے ہو کر سوگند کھائی تھی کہ اگر یہ مجھے مل گیا تو میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" اس نے پستول سیدھا کیا اور پھر دھاڑا۔ "ہٹ جائیے..... چاچا جی ورنہ میں آپ کو بھی گولی مار دوں گا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑے پستول کو سیدھا کر کے کہا۔ تبھی سریش آگے بڑھا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ نوجوان کے منہ پر رسید کر دیا۔ پھر بڑی پھرتی سے پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "تو ایک پولیس افسر کے سامنے قانون اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے، نریش یہ قانون کا مجرم ہے۔"

"اس نے میری موسی کو مارا ہے۔ اس نے۔ میں، میں اسے....." وہ آگے بڑھا تو سریش نے اسے پکڑ لیا اور پھر پوری قوت سے اسے دروازے کی طرف دھکا دیا، وہ دروازے سے ٹکرایا تھا۔

"اسے باہر لے جاؤ ماتا جی ورنہ....." سریش غصے سے بولا اور عمر رسیدہ عورت نوجوان لڑکے کو باہر دھکیلنے لگی۔

اب وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "بچا لو۔ اس سمے اسے بچا لو مگر بھگوان کی سوگند۔ آج نہیں کل میں اسے اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔" عورت اسے دروازے سے باہر لے گئی تھی۔

ایک بات میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہا ہوں کہ میں اس پورے کھیل کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ سب کچھ میرے خلاف ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر شکلا کی حالت بری طرح خراب تھی۔ اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔

سریش نے کہا۔ "بہت خطرناک صورت حال ہو گئی ہے چاچا جی۔ آپ بڑی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ ایک خطرناک مجرم کو پناہ دینے والا بھی مجرم ہوتا ہے۔"

"کون مجرم۔ کس کی بات کر رہے ہو۔" شکلا بولا۔

"یہ ڈاکٹر کامران۔ تعجب ہے آپ موسی نیمو کے قتل کو بھول گئے، اسے پاکستان سے آئے ایک ڈاکٹر نے قتل کیا تھا۔ اس کی تصویریں بھی اخبارات میں چھپی تھیں۔ آپ نے نہیں دیکھیں، اور اس کے بعد جب اسے موت کی سزا سنائی گئی تو یہ جیل کے سپاہیوں کو زخمی کر کے جیل سے فرار ہو گیا۔ جن میں سے کچھ سپاہی بعد میں مر گئے، بہت بڑا خونی ہے یہ۔" سریش نے مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"اس....." ڈاکٹر شکلا نے حیرانی سے کہا۔ "یہ..... خونی؟"

"جی۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا اور....."

شکلا بری طرح الجھا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں نہیں مان سکتا۔ بھگوان کی سوگند کبھی نہیں مان سکتا۔ یہ دیوتا سمان ہے۔ یہ لوگوں کو سکھ دینے کے لیے آکاش سے اترا ہے۔ تم سے بھول ہوئی ہے، دھوکا ہوا ہے تمہیں۔"

"آپ سے جو میں کہہ رہا ہوں ویسا کریں چاچا جی ورنہ مشکل میں پھنس جائیں گے۔ آپ بیان دیں گے کہ اتفاق سے یہ آپ کو آگرے میں نظر آیا، آپ نے اسے پہچان لیا اور پھر آپ چالاکی سے اپنے ساتھ لے آئے اور مجھے انفارم کر دیا۔ یہی کہیں گے چاچا جی ورنہ شاید میں آپ کو نہ بچا سکوں۔"

"اسکول کا لونڈا سمجھتے ہو مجھے۔ تم پولیس کمشنر ہو تو میں بھی ہندوستان کا مانا ہوا ڈاکٹر ہوں۔ کھلبلی مچا دوں گا پورے ہندوستان میں۔ یقیناً کوئی بڑی بھول ہوئی ہے تم لوگوں سے۔ بھگوان کے لیے سریش اس دیوتا کی سہائتا کرو۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ جو گھناؤنا الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ جھوٹ ہے، کچھ اور ہوا ہے۔ تم بہت بڑے افسر ہو، تفتیش کرو۔ دیکھ لینا سب جھوٹ نکلے گا۔"

"آپ کو معلوم ہے چاچا جی۔ نریش موسی جی کی موت پر پاگل ہو گیا تھا۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ جو میں نے کہا ہے وہی کریں ورنہ آپ کو بچانا میرے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

اچانک ڈاکٹر شکلا میری طرف مڑا اور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتاؤ گے ڈاکٹر کامران۔ کیا ڈاکٹر نیمو کو تم نے قتل کیا ہے۔"

"نہیں ڈاکٹر شکلا!" میرے منہ سے جیسے کسی اور کی آواز نکلی۔

"ٹھیک ہے۔ سریش چندر کیا تم اسے گرفتار کرو گے؟"

"ہاں، میں نے نفری طلب کر لی ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی ساتھ ہی گرفتار کر لو۔ یہ میرے پاس، بہت دن سے ہے۔ اس دیوتا نے اسپتال میں بہت سے لوگوں کو نیا جیون دیا ہے۔ میں ڈاکٹر شکلا۔ اس کے لیے لڑوں گا، بڑے سے بڑا وکیل کروں گا، ثابت کروں گا کہ یہ بے گناہ ہے۔"

"برا کریں گے چاچا جی۔ یہ صرف حکومت کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے گھر کی بات بھی ہے۔"

"میں آج سے تم لوگوں سے تعلقات ختم کرتا ہوں۔" شکلا نے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور پھر بہت سے وردی والے اندر گھس آئے اور انہوں نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

"تم چنتا مت کرنا کامران۔ میں تمہارے لیے لڑوں گا۔ میں نے بھی گھاس نہیں کھودی ہے۔"

مجھے باہر لا کر پولیس وین میں بٹھایا گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد سریش چندر پولیس آفیسر کی وردی میں باہر نکلا اور پرائیویٹ کار میں بیٹھ گیا۔ پولیس وین آگے چل پڑی اور سریش کی گاڑی پیچھے۔ اس طرح وہ لوگ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لائے۔ یہاں لا کر میرے پیروں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ وہ سب مجھ سے کافی خوفزدہ لگ رہے تھے۔ پھر مجھے لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سریش میرے پاس آ کر نرم لہجے میں بولا۔ "آپ کے لیے چائے بھجواؤں ڈاکٹر کامران؟"

"بے حد شکریہ آفیسر۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تھوڑی دیر کے بعد آپ سے ملتا ہوں۔" اس نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں لاک اپ کے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا، کبھی کبھی میں غور کرنے لگتا تھا کہ ان تمام حالات کے بعد مجھ میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اس طرح مجھ پر دلچسپ انکشافات ہوئے تھے۔ اس وقت بھی میں نے سکون سے اپنی کیفیت کا تجزیہ کیا۔ میرے اندر کسی اضطراب کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ پھر چند سپاہی مجھے لاک اپ سے نکال کر ایک بڑے کمرے میں لائے جہاں ایک بڑی میز کے پیچھے سریش چندر بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جو مجھے حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"آپ لوگ باہر جائیں۔" سریش نے کھردرے لہجے میں کہا اور وہ سب برق رفتاری سے اٹھ گئے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ تشریف رکھیے ڈاکٹر صاحب!"

"شکریہ!" میں بیٹھ گیا۔

"شکلا جی ہمارے سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے۔ آگرے میں آپ کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا لیکن میں آپ کو دہلی لے جاؤں گا۔ وہاں جو کچھ ہوگا اس کے لیے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"جی!" میں نے کہا۔

"دوسری بات ڈاکٹر نیمو ہماری سگی موسی تھی بلکہ بہنوں جیسی تھی کیونکہ پتا جی نے اس کی پرورش کی تھی اور اسے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا نریش آپ کے بارے میں جان کر بے قابو ہو گیا تھا۔ میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

"آپ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں، کیا وہ سچ ہیں؟"

"میں نے عدالت میں بھی یہی کہا تھا کہ میں نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا۔ ایک پاکستانی باشندہ ہونے کی وجہ سے مجھ سے خصوصی نفرت کا برتاؤ کیا گیا، ورنہ میڈیکل رپورٹ آج بھی یہ بتا سکتی ہے کہ میں ایک پاکباز نوجوان ہوں۔"

"گویا وہ الزام غلط تھا؟"

"ہاں۔ ایسا ہی ہے۔ اگر ممکن ہو سکے تو میری اس بات پر یقین کر لیں کہ ڈاکٹر نیمو آج بھی میرے لیے بہنوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں نے ان کی پاکیزگی کو داغدار نہیں کیا۔ مجھے سو بار سزائے موت دینے کے بعد بھی اگر میں کبھی آپ کو یاد آؤں تو آپ میرے یہ الفاظ ضرور یاد کر لیجیے، ہم مسلمان ماں اور بہن کے تقدس کو کبھی پامال نہیں کرتے، چاہے ہماری گردن اتار لی جائے۔"

میرے ان الفاظ نے سریش چندر کو مضطرب کر دیا۔ وہ مجھے گھورتا رہا، شاید میرے چہرے پر سچائی تلاش کر رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "چاچا جی کے ساتھ کب سے ہو؟"

"تھوڑے دنوں سے۔"

"ان کے پاس کیسے پہنچے تھے؟" اس نے پوچھا تو میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتا دیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا۔ "پاکستانی جاسوس تمہاری مدد کر رہے ہیں۔"

"نہیں؟"

"پھر تم جیل سے کیسے فرار ہوئے۔"

"نہیں بتا سکتا۔"

"گویا تم اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتانا چاہتے۔"

"ایسی ہی بات ہے۔"

"دہلی میں تم پر تشدد ہوگا، وہاں میں کسی کو نہیں روک سکوں گا اور تم جانتے ہو تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟"

"صرف ایک کام!"

"بولو!"

"اپنے گھر والوں کو یہ یقین دلا دیں کہ میں نے نیمو کو قتل نہیں کیا اور اسے خلوص سے، بہن کہا ہے جو میرے لیے بہت مقدس نام ہے۔"

سریش نے گردن جھکا لی، پھر وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "ممکن ہے یہ کوئی سیاسی سازش ہو۔ او مائی گاڈ۔ او کے مسٹر کامران کل میں آپ کو دہلی لے جاؤں گا۔ اگر واقعی آپ نے میری موسی کو قتل نہیں کیا تو..... لیکن میں بے بس ہوں۔ اپنے فرض سے غداری نہیں کر سکتا۔ میں ایک خاص سنتری لاک اپ پر تعینات کروں گا۔ اپنی کوئی بھی ضرورت اسے بتا دیں۔"

مجھے دوبارہ لاک اپ کر دیا گیا۔ ہاں سریش نے میری بیڑیاں اتروا دی تھیں۔ رات کا کھانا بہتر اور صاف ستھرے انداز میں دیا گیا تھا۔ میرے ذہن پر ذرہ بھر بوجھ نہیں تھا۔ بابا صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے آنے والے وقت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وقت کے فیصلے وقت ہی کرتا ہے اور ہم وقت کے فیصلوں میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ عشاء کی نماز پڑھ کر میں لیٹ گیا۔ البتہ کچھ دیر کے بعد سنتری نے لاک اپ کی سلاخیں بجائیں۔

"یہ لے لیجیے صاب!" وہ کچھ لیے کھڑا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس پہنچا تو اس نے ایک جائے نماز سلاخوں سے اندر داخل کر دی۔ "آپ اس پر نماز پڑھ لیا کریں۔"

"اوہ۔ شکریہ۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"تلک رام۔" اس نے جواب دیا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ میں اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر واپس مڑ گیا۔ دوسرے دن دوپہر ایک بجے مجھے کھانا کھا کر تیار ہونے کے لیے کہا گیا اور دو بجے ایک ویگن مجھے لے کر چل پڑی۔

ویگن اسٹیشن تک گئی، یہاں سے مجھے ٹرین میں دہلی لایا گیا۔ دہلی اسٹیشن پر بڑا ہجوم میرے استقبال کے لیے موجود تھا، ان میں بے شمار اخباری نمائندے موجود تھے جو میری طرف لپکے لیکن پولیس نے انہیں میرے پاس نہ آنے دیا۔ غالباً یہ انتظام سریش چندر نے کیا تھا..... البتہ وہ دور سے میری تصویریں بنا رہے تھے۔ کسی جوشیلے جوان نے مجھ پر ایک جوتا بھی پھینکا تھا۔ مجھے ایک وین میں بٹھا کر کسی عمارت میں لے جایا گیا۔ پھر ایک بڑے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ پولیس کی بڑی نفری اس طرح تعینات کی گئی جیسے کسی بڑے گروہ کو قابو میں کیا گیا ہو۔

میں اجنبی کی طرح اپنے آپ کو محسوس کر رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ سب میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ وقت گزرتا رہا پھر رات ہو گئی۔ اس وقت رات کے کوئی نو بجے ہوں گے کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ یہ پولیس کی وردی میں نہیں تھے۔

"آیئے۔" ان میں سے ایک نے کہا اور میں اٹھ گیا۔ انہوں نے چابی نکال کر میری ہتھکڑی کھولی اور مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

کمرے سے باہر کا منظر عجیب تھا۔ پولیس کے جوان اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی فوج کے حملہ آور ہونے کا انتظار ہو۔ مجھے باہر لانے والوں نے دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے ایک باریک سا رومال میرے چہرے پر ڈال دیا جس سے باہر سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

مجھے لانے والے پولیس کے جوانوں کے درمیان سے گزر کر عمارت کے گیٹ سے باہر آئے یہاں ایک پرانی سی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے گاڑی میں بٹھایا گیا اور ان میں سے ایک نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ عجیب سے لوگ تھے۔ ان کا رویہ دوسروں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ میری طرف سے بالکل لاپروا تھے جبکہ دوسری طرف میرے لیے اتنے زبردست انتظامات تھے۔

الغرض گاڑی کا سفر جاری رہا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی ایک کھنڈر نما عمارت میں داخل ہو گئی۔ جہاں کچھ کمروں میں مدھم روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ وہ تینوں گاڑی سے نیچے اتر گئے پھر ان میں سے ایک نے نرم اور پُر ادب لہجے میں کہا۔ "آیئے..... کامران صاحب!"

میں حیران حیران ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ عمارت بے حد پرانی اور پراسرار تھی، نہ جانے دہلی کے کون سے علاقے میں تھی، جگہ جگہ ٹوٹی دیواریں تھیں، اینٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پھر چند سیڑھیاں عبور کر کے ہم ایک غلام گردش میں داخل ہوئے، یہاں بھی روشنی تھی اور راہداری بالکل شفاف نظر آ رہی تھی۔ راہداری کے اختتام پر ایک بڑا چوبی دروازہ تھا۔ ان میں سے ایک نے یہ دروازہ کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

اندر خوب روشنی تھی۔ گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ایک بڑے ہال میں بے شمار عمامہ پوش دو زانو بیٹھے ہوئے تھے۔

میرا دل شدت سے دھڑکا، معاً مجھ پر اس پورے عمل کا انکشاف ہوا۔ مجھے میرے محافظوں نے وہاں سے نکالا تھا اور وہ سب پولیس والے اندھے ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجھے باہر نکلتے دیکھا ہی نہیں تھا۔ پھر لاتعداد سلام کی آوازیں ابھریں۔

میں نے سلام کا جواب احترام سے دیا۔

"ماشاء اللہ۔ آپ اپنا کام بحسن وخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کا تعین اور تقرر کرنے والے آپ پر نازاں ہیں۔"

"شکریہ!"

"روحانی مجلس عمل نے آپ کو تمغۂ حسن کارکردگی عطا کیا تھا، آپ نے خود کو اس کا اہل ثابت کیا ہے۔ آپ کو مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔ ان شاء اللہ باطل قوتیں کبھی آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ نیز یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اسلام ہر مظلوم اور حاجت مند کی حاجت روائی کا حامی ہے، اس کے لیے دین دھرم کی کوئی تخصیص نہیں۔ مذہب انسان کو امداد کے لیے نہیں روکتا۔ طلب بے بسی کی علامت ہے اور خالق کائنات نے جو کچھ جس شکل میں تخلیق کیا ہے، کیا ہے؟ کیسا ہے اس کا محاسب وہی ہے ہم نہیں۔ چنانچہ کوئی مجبور تم سے مدد طلب کرے اور تم اس کی طلب کو پورا کرنے کے اہل ہو تو گریز نہ کرو۔ جواب دو، سمجھ تم نے!"

"جی میں نے سمجھ لیا۔" میں نے صدق دل سے کہا۔

"اپنے نفس کو سرکشی نہ کرنے دو۔ اس کی طلب تمہیں حق سے دور کرتی ہے کیونکہ خواہشیں شیطان کو تقویت دیتی ہیں۔ سمجھ تم نے؟"

"جی!" میرے منہ سے نکلا۔

"کچھ وقت یہاں آرام کرو۔ اس کے بعد تمہیں چندوسی جانا ہے، وہاں کسی کو تمہاری ضرورت ہے۔"

ان الفاظ کے خاتمے کے ساتھ ہی عمامہ پوش اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ سب دراز قامت اور لمبے لمبے جبوں میں ملبوس تھے لیکن ان میں سے کسی کا چہرہ نمایاں نہیں تھا۔ البتہ کسی نے دروازے کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ وہ سب دیواروں میں غروب ہو گئے تھے۔

میں تنہا اس ہال نما جگہ پر کھڑا رہ گیا لیکن کوئی تردد، کوئی الجھن ذہن میں نہیں تھی۔ میں آسانی سے ان خوفناک لمحات سے نکل آیا تھا اور جس مجلس عمل نے میرا استقبال کیا تھا اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ جگہ جہاں میں موجود تھا کہاں ہے، کیسی ہے مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی، جو ہوگا وہ کرنے والے موجود ہیں۔

ابھی اتنا ہی سوچا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی اندر داخل ہوا لیکن اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ اشرف تھا۔ بابا پردہ پوش کا وہ ملازم جوان کے ساتھ ہوتا تھا، اندر آ کر اس نے مجھے سلام کیا۔

"اشرف۔ تم یہاں؟" میں نے اس کے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

"ہاں تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب....."

"کہیں اور نوکری کرتا ہوں۔"

"نوکری.....؟"

"جی۔ بابا صاحب نے ہی حکم دیا تھا کہ حکیم امتیاز احمد کے ہاں نوکری کروں۔ تب سے وہیں ہوں۔"

"پھر.....؟ اس وقت یہاں کیسے آ گئے۔"

"بابا صاحب نے حکم دیا تھا، کہا تھا کہ آپ جب تک یہاں ہیں آپ کی خدمت کروں۔"

"بابا صاحب نے۔" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ اہل ایمان تو بس دنیا سے پردہ کرتے ہیں ان کے فیض میں کہاں کمی ہوتی ہے۔" اشرف نے کہا۔ مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کتنا بڑا اعزاز حاصل ہوا ہے مجھے۔ کوئی حد نہیں تھی اس کی۔

"آیئے۔ آپ کو کچھ وقت یہاں قیام کرنا ہے۔ میں نے بندوبست کر دیا ہے۔"

"بندوبست بھی کر دیا۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے آئے ہو؟"

"ہاں۔ افلاک میرے ساتھ تھا۔ اس کی مدد سے یہ سب کیا ہے۔" اشرف نے بتایا۔

"اوہ۔" میں نے گردن ہلائی۔ افلاک کی مدد سے واقعی سب کچھ کیا جا سکتا تھا۔ اشرف مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ جس کمرے میں وہ مجھے لے کر آیا تھا، وہ اس بوسیدہ عمارت کا کمرہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یکدم صاف ستھرا۔ فرنیچر سے آراستہ ملحقہ غسل خانے کے ساتھ۔

اشرف نے کہا۔ "الماری میں آپ کے کپڑے موجود ہیں۔ ایک جوڑا میں نے غسل خانے میں لٹکا دیا ہے، آپ غسل کر لیں میں کھانا لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں چند منٹ گم صم بیٹھا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ کافی وقت افراتفری میں گزرا تھا۔ غسل نے تازہ دم کر دیا۔ شب خوابی کے نرم لباس نے طبیعت کو فرحت بخشی تھی۔ باہر آیا تو منظر ہی الگ تھا۔

اشرف نے دسترخوان بچھا دیا تھا، اس پر کھانا لگا ہوا تھا جس سے بڑی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں دسترخوان پر آ بیٹھا، میں نے اشرف کو بھی کھانے کے لیے کہا تو اس نے شکریہ ادا کر کے بتایا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے۔

"آپ کے لیے حکم ہے کہ آپ کھانا کھا کر آرام سے سو جائیں کیونکہ تھکے ہوئے ہیں، جاگیں گے تو بیمار پڑ جائیں گے۔" میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تھی۔ سورج چڑھ چکا تھا نماز بھی قضا ہو چکی تھی۔ کہیں سے کوئی آہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ضروریات سے فراغت کر کے باہر آیا تو حسب توقع ناشتہ لگا ہوا تھا۔

چائے کی دلنشیں خوشبو چائے دانی سے اٹھ رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوا تو اشرف آ گیا۔

"تم نوکری پر نہیں گئے اشرف؟"

"جب تک آپ یہاں ہیں، مجھے یہیں رہنا ہے۔"

"حکیم صاحب سے کیا کہہ کر آئے ہو؟"

"چھٹی لے لی ہے۔"

"مجھے کب تک یہاں رہنا ہے؟"

"کل دس بجے آپ روانہ ہوں گے۔"

"چندوسی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

دلی سے ڈھائی گھنٹے کا سفر ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اشرف سے دن میں کئی بار ملاقات ہوئی، نہ جانے کب سے بابا صاحب کی خدمت میں تھا، خود بھی ایک پراسرار شخصیت بن چکا تھا کبھی کبھی بڑی عالمانہ باتیں کرنے لگتا تھا۔

"افلاک کہاں ہے اشرف؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کسی کو نہیں معلوم۔ جب اسے حکم ملتا ہے حاضر ہو جاتا ہے۔"

"بابا صاحب چاہتے تو تمہاری جگہ اسے دے سکتے تھے۔"

"یہ وہی بہتر جانتے ہیں لیکن وہ آتش زادہ ہے اور ہم مٹی کی تخلیق، اللہ نے مٹی کی تخلیق کو اشرف کا درجہ دیا ہے۔"

"مجھے چندوسی جانے کے لیے کہا گیا ہے۔"

"ہاں چندوسی اسٹیشن اتر کر آپ کو تانگے میں بیٹھ کر حسے پور جانا ہوگا۔ یہ ایک قصبہ ہے۔"

"کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ وہاں کسے میری ضرورت ہے؟"

"نہیں۔ میں نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔ مجھے ایک دم احساس ہو گیا کہ میں غلط بات کر رہا ہوں۔ ان تمام سوالات کے جواب میں خود بھی حاصل کر سکتا ہوں لیکن مجھے وقت سے پہلے کچھ معلوم کرنے کی ممانعت تھی۔

"بابا صاحب کوئی ذمے داری کسی کو دے دیں تو یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ ایسے کام وہ اسی کو دیتے ہیں جسے اس کا اہل سمجھتے ہیں، آپ یقیناً بہت اہم انسان ہیں۔"

دن میں کئی بار اشرف سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسرے دن اس نے ناشتے کے ساتھ کئی اخبار سامنے لا کر رکھ دیے۔ ان میں میری تصویروں کے ساتھ بڑی سنسنی خیز سرخیاں جمائی گئی تھیں۔ کسی میں مجھے بہت بڑا دہشت گرد ثابت کیا گیا تھا، کسی میں کہا گیا تھا کہ کوئی بہت بڑا گروہ میرے ساتھ کام کر رہا ہے، جس کی سرگرمیاں بہت پراسرار ہیں۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے جن کے سپرد میری نگرانی کی ذمے داری تھی۔ ان سے یہ پوچھا جا رہا ہے کہ اتنی زبردست سیکورٹی کے باوجود میں کیسے نکل گیا۔

میں نے یہ سب پڑھا لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے ذہن میں کوئی تردد نہ پیدا ہوا جبکہ ہر اخبار میں میری تصویریں تھیں۔ سوا نو بجے اشرف نے کہا۔ "تیار ہو جائیں، موٹر آ رہی ہے۔"

"مجھے کیا ساتھ لے جانا ہے؟"

"میں نے سوٹ کیس تیار کر دیا ہے۔ سفر میں پہننے والے کپڑے غسل خانے میں لٹکا دیے ہیں، جا کر بدل لیں۔"

کچھ دیر میں تیار ہو کر میں باہر آ گیا۔ ٹوٹی حویلی کے بیرونی حصے میں ایک پرانے طرز کی کار کھڑی ہوئی تھی جس میں اشرف نے میرا سامان رکھا اور پھر مجھے خدا حافظ کہا۔

کار چل پڑی، ڈرائیور وہی تھا جو کئی بار سامنے آ چکا تھا۔ بالکل خاموشی سے وہ کار چلاتا رہا۔ طویل سفر کے بعد کار ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔

ڈرائیور نے خود ہی میرا سوٹ کیس سنبھال کر کہا۔ "آیئے!"

میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی تھی۔ میری آسانی کے لیے بہت کچھ کر دیا گیا تھا، چنانچہ اس نے مجھے ریل کے ایک ڈبے میں بٹھا کر کہا۔ "یہ چندوسی کا ٹکٹ ہے۔ تانگے والا آپ کو خود پہچان لے گا۔" پھر وہ کچھ اور کہے بغیر نیچے اتر گیا۔

میں کھڑکی سے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا، اچانک میں نے ایک بات محسوس کی۔ ریلوے اسٹیشن پر پولیس غیر معمولی سرگرمیوں میں ملوث تھی۔ بے شمار پولیس والے وہاں موجود تھے ان میں بڑے رینک کے افسران بھی تھے جو کافی مستعد نظر آ رہے تھے۔ فوری طور پر دل میں خیال آیا کہ یہ لوگ میری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ ہی لمحوں میں چار پولیس والے میرے ڈبے میں بھی گھس آئے۔ وہ ایک ایک مسافر کو غور سے دیکھتے پھر رہے تھے۔ میری سیٹ کھڑکی کے پاس تھی۔ میں پرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔ بہت مشکل کام تھا انسانی فطرت کے خلاف لیکن میں اسے سرانجام دے رہا تھا۔ پولیس والے میرے پاس بھی آئے، مجھے دیکھتے رہے پھر آگے بڑھ گئے۔

ریل کافی دیر کے بعد چلی۔ یقینی طور پر پوری ریل کی تلاشی کے بعد اسے روانگی کی اجازت دی گئی تھی، کچھ دیر کے بعد اس نے رفتار پکڑ لی۔

میں خاموشی سے باہر کے مناظر دیکھتا رہا۔ راستے بھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ دن کی روشنی تھی اس لیے ہر اسٹیشن دیکھتا جا رہا تھا۔ آخر کار چندوسی کا بورڈ نظر آیا تو میں نے جلدی سے سوٹ کیس اٹھایا اور تیزی سے نیچے اتر آیا۔ دو منٹ کے بعد ہی ٹرین آگے بڑھ گئی تھی۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر اس وقت چونکا، جب ایک آواز سنائی دی۔ "سلام شاہ جی۔" پلٹ کر دیکھا تو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک عمر رسیدہ شخص کھڑا تھا۔ "لاؤ..... ٹرنک ہمیں دے دو۔ ہم ممدو تانگے والے ہیں۔" اس نے کہا اور میرے سوٹ کیس پر جھپٹا مارا۔

"ارے نہیں ممدو چچا۔ وزنی ہے میرے پاس رہنے دو۔" میں نے کہا۔

"شکل سے اٹھائی گیرے لگیں ہیں تمہیں کیا، لے کر بھاگ جائیں گے تمہارا بکس، ایں۔" وہ چڑچڑے لہجے میں بولا۔

"ارے نہیں۔ یہ بات نہیں ہے، میں نے تو اس لیے کہا تھا"

"کہ ہم اٹھا نا سکیں گے، ایں۔"

"ہاں بس۔ یہی بات تھی۔" میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

"تیس سال پہلوانی کی ہے۔ کبھی اکھاڑے کی مٹی کمر سے نا لگی مالک کے کرم سے۔ ہمارے بغیر حسے پور میں کبھی کبڈی نا کھیلی گئی، مجال نہ ہوئی کسی مائی کے لعل کی کہ ممدو کو پالا نہ چھونے دے۔ بات کرے ہیں۔"

"ارے نہیں بابا۔ ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ممدو بابا بہت غصہ ور تھا۔ اس نے سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے کر چھوڑا۔ میں تانگے میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور ممدو نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔

"ممدو بابا آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا جبکہ آپ نے مجھے کبھی دیکھا بھی نہیں۔"

"نصیب اللہ نے حلیہ بتا دیا تھا تمہارا، بس کافی تھا، کھوجی کا کام بھی کیا ہے ہم نے پانچ سال۔ بڑے بڑے مجرم پکڑ کر دیے ہیں پولیس کو۔"

"نصیب اللہ۔" میں نے زیر لب کہا۔ میرے علم میں یہ نام نہیں تھا لیکن میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ جو کچھ ہے سامنے آ جائے گا۔ تانگے کا سفر جاری رہا۔ اس دوران بابا ممدو مزے مزے کی باتیں کرتا رہا تھا۔

حسے پور چندوسی اسٹیشن سے کافی دور تھا۔ راستے کے مناظر بھی بہت اچھے تھے، آخر کار تانگہ حسے پور میں داخل ہو گیا۔ اسے خالص گاؤں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہائی اسکول نظر آ رہا تھا۔ بڑی ہی مسجد بھی تھی، تانگہ ایک بازار سے گزر کر مسجد کے سامنے رک گیا۔

"چلو اترو اب۔ کیا تانگے میں ہی زندگی گزارو گے۔" ممدو نے کہا اور میں نیچے اتر گیا۔

"کتنے پیسے دوں بابا ممدو؟"

"بڑا مال بھرا ہوا ہے انٹی میں۔ لکھا شاہ بنے ہوئے ہو۔ پیسے دیں گے یہ ہمیں۔" ممدو نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

اسی وقت ایک نوجوان آدمی میرے پاس آ گیا۔ ممدو نے میرا سوٹ کیس نیچے اتار دیا تو نوجوان نے آگے بڑھ کر اٹھا لیا اور بولا۔ "آؤ شاہ جی!"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مسجد کے برابر والی گلی میں داخل ہو کر دائیں طرف بنے ایک دروازے کے سامنے رکا پھر دروازہ کھول کر بولا۔ "آ جاؤ۔"

میں اندر داخل ہو گیا، کافی بڑی جگہ تھی کئی کمرے تھے۔ نوجوان نے میرا سوٹ کیس ایک ایسے کمرے میں رکھ دیا جہاں مسہری اور صوفے پڑے ہوئے تھے۔

"ضرورت کے لیے باہر جانا پڑے گا۔ بیت الخلا باہر لائن سے بنے ہوئے ہیں۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"شکور خاں۔ وہ سامنے ہمارا گھر ہے۔ وہیں سے تمہارے لیے کھانا آ جایا کرے گا اور کوئی ضرورت ہو تو کنڈی بجا دینا۔"

"وہ سنو۔ نصیب اللہ صاحب کہاں ہیں؟"

"پیش امام صاحب برابر کے گاؤں گئے ہیں۔ ایک دو دن میں آ جائیں گے۔ ہو سکتا ہے آج ہی آ جائیں۔"

"اچھا۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔ اتنا پتا چل گیا تھا کہ وہ اس مسجد کے پیش امام ہیں۔ باقی باتیں صیغۂ راز میں تھیں لیکن صبر و سکون سے کام لینا تھا۔ چنانچہ میں نے سوٹ کیس ایک بہتر جگہ رکھا اور پھر اس حجرے کے دوسرے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ مسجد اس وقت بالکل خالی تھی۔ ویسے خاصی بڑی اور خوبصورت مسجد تھی۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا، کچھ وقت مسجد کے دالان میں بیٹھ کر گزارا۔ پھر ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

"حجرے کا دروازہ کھول دو بھائی جی۔ چائے لائی ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا اچھا۔" میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ وہیں حجرے میں آ گیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ باہر نکل گیا۔ پھر وہ ایک صاف ستھری ٹرے میں چائے کا سامان لے آیا، بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔

ابھی شام ہونے میں وقت باقی تھا۔ میں نے کافی وقت اسی کمرے میں گزارا۔ مسجد میں اذان ہوئی تو باہر آ کر نماز پڑھی۔ نمازی بہت کم تھے۔ لوگوں نے مجھے غور سے دیکھا ضرور تھا لیکن کسی نے میرے بارے میں کچھ پوچھا نہیں۔

رات کا کھانا شکور خود لے کر آیا تھا۔ یہ بھی بہترین کھانا تھا۔ اس نے بتایا۔ "پیش امام صاحب کی بہن بیمار ہیں، وہ انہیں دیکھنے جاتے ہیں، بڑی محبت کرتے ہیں ان سے۔"

"کیا بیماری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑی عمر خود بیماری ہوتی ہے صاحب جی۔ کوئی سو سال کی ہیں نصیب اللہ صاحب کو انہوں نے ہی پالا ہے۔"

عشاء کی نماز کے بعد میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیند آ گئی۔ ناشتہ صبح ہی صبح مل گیا، دن کو بارہ بجے تنہائی سے اکتا کر باہر نکل آیا اور یونہی چہل قدمی کرتا ہوا دور نکل آیا۔

ہائی اسکول کے بچوں کی چھٹی ہوئی تھی، شریر بچے باہر نکل رہے تھے۔ اچانک بچوں کا شور سنائی دیا اور میری نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو بھاگ رہی تھی اور بچے اسے چھوٹے چھوٹے پتھر مار رہے تھے۔ آس پاس اکا دکا دکانیں بھی تھیں، وہاں لوگ بھی نظر آ رہے تھے لیکن سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کوئی ان بچوں کو نہیں روک رہا تھا۔

اچانک بوڑھی عورت کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک نوکیلا پتھر اس کے سر پر لگا تھا اور خون نکل آیا تھا۔ میرے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ کتنے بے حس اور بے غیرت لوگ ہیں، کوئی ان بچوں کو نہیں روک رہا، اب بھی بہت سے بچے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے اس کا نشانہ تاک رہے تھے۔

میں برق رفتاری سے آگے بڑھا اور بوڑھی عورت کی ڈھال بن گیا۔ بچوں نے پتھر پھینکے جو مجھے کافی زور سے لگے تھے۔

اسی وقت بوڑھی عورت نے ہاتھ اٹھائے اور زور سے چیخی۔ "رک جاؤ..... رک جاؤ۔ ابھی کھیلتے ہیں۔ ایک منٹ رک جاؤ۔"

میں نے حیرت سے یہ الفاظ سنے تھے لیکن دوسرے لمحے ایک اور عمل ہوا۔ کئی دکاندار ڈنڈے لے کر دکانوں سے نیچے کودے اور بچوں کی طرف دوڑے، وہ انہیں گالیاں بک رہے تھے۔ بچے پھر امار کر بھاگنے لگے۔ انہیں بھگا کر دکاندار میری طرف لپکے۔

"چوٹ تو نہیں لگی بابو صاب۔ آپ نے بڑی غلطی کی مگر آپ کو بھلا کیا معلوم۔" ایک دکاندار بولا۔

اسی وقت بوڑھی عورت نے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور کرب سے چیخی۔ "ہائے۔ میرے پیتم کہاں گئے۔ ہائے میرے بچے کہاں گئے۔ ہائے، پیتم پیتم پیتم۔" اس نے اُدھر دوڑ لگا دی جدھر بچے بھاگے تھے۔

"آیئے بابو صاب۔ آیئے، کہاں چوٹ لگی آپ کو۔ اور گھسیٹ کرسی رکھ نیچے۔ آیئے بابو صاب۔" ایک دکاندار نے میرا بازو پکڑا اور دکان کی طرف لے چلا۔ دوسرے نے دوڑ کر ایک کرسی دکان کے سامنے رکھ دی۔

"بڑی مہربانی آپ لوگوں کی۔ میرے کہیں چوٹ نہیں لگی، مگر ایک بات بتایئے؟"

"آپ بیٹھیے بابو صاب۔ او حمید و بوتل کھول جلدی، بوتل لا۔"

"ارے آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ مہمان ہیں پوری بستی کے بابو صاب۔ خالی امام جی کے مہمان نہیں ہیں اور پھر آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ آپ نے ساگی کو بچانے کے لیے اپنے بدن پر پتھر کھائے ہیں، یہ بڑی بات ہے۔"

"امام جی کے مہمان بھی بڑے ہی ہو سکتے ہیں۔" کسی اور نے کہا۔ اسی وقت کسی نے کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ سب میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کر رہے تھے۔ میں نے بوتل سے کچھ گھونٹ لیے، پھر کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ بچے اس بوڑھی عورت کو پتھر مار رہے ہیں لیکن آپ نے انہیں نہیں روکا، بلکہ آپ سب اس وقت ان پر دوڑے جب میرے پتھر لگنے لگے؟"

"ہم مجبور ہیں۔ جب ہم بچوں کو روکتے ہیں تو ساگی برا مانتی ہے، زار و قطار روتی ہے کہ ہم نے اس کے بچوں کو ڈانٹا۔ وہ اس سے روٹھ گئے۔ اس بات پر وہ دو، دو دن تک کھانا نہیں کھاتی۔ بچے ہی اسے مناتے ہیں۔"

"اوہ۔ کیا وہ پاگل ہے۔"

"اس کی بھی ایک کہانی ہے بابو صاب۔"

"کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"رما کور ہے اس کا نام۔ سکھنی ہے۔ اس کا پتی بالم سنگھ دل کے دورے سے مر گیا۔ ایک بیٹا تھا پیتم سنگھ، چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی اس نے، تین سال پہلے کی بات ہے شہر گیا تھا مال لینے کے لیے، پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ یہ اس کا انتظار کرتی رہی، پھر اس کے غم میں پگلی ہو گئی۔ سارے بچوں کو پیتم کہتی ہے ان سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ اسے پتھر مارتے ہیں خوش ہوتی ہے زخم کھاتی ہے اور ہنستی ہے۔ چھٹی ہونے سے پہلے اسکول کے پاس آ کر ان کا انتظار کرتی ہے۔ ان کے سامنے پاگل پن کی حرکتیں کر کے انہیں متوجہ کرتی ہے اور پتھر کھاتی ہے۔ یہ ہے اس کی کہانی۔"

میرا دل غم میں ڈوب گیا۔ مالک کائنات، تیری کائنات میں کتنے غم ہیں، کیوں ہیں..... یہ صرف تُو جانتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ "اس کے بیٹے کو تلاش نہیں کیا گیا۔"

"کون سی کسر چھوڑی بابو صاحب۔ مکھیا سنگھ نے دلی تک بات پہنچائی۔ سکھ سبھا نے اس کی تلاش پر انعام بھی رکھا، پر کہیں پتا نہیں چلا۔"

"مکھیا سنگھ کون ہیں؟"

"نمبردار ہیں ہماری بستی کے۔"

"رما کور کہاں رہتی ہے؟"

"پچھائی پلے گھر ہے اس کا۔ گھر کے پاس ہی پیتم سنگھ نے پرچون کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہیں مکھیا سنگھ کی حویلی بھی ہے۔"

"پاگل پن میں اس نے کسی کو کوئی نقصان بھی پہنچایا؟"

"نہیں بابو صاب۔ وہ بے چاری تو نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے، آپ نے دیکھا نہیں وہ بچوں سے پتھر کھا کر بھی خوش ہوتی ہے۔"

"ویسے وہ پاگل پن کی باتیں نہیں کرتی۔ آپ اس سے باتیں کریں، وہ ٹھیک جواب دے گی آپ کو۔" دوسرے دکاندار نے کہا۔

"آپ لوگ بہت اچھے ہیں، اللہ آپ کو خوش رکھے۔ مجھے اجازت دیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کھانا کھا کر جائیں بابو صاب۔ مسلمان کے گھر کا کھانا ہوگا، اس کی چنتا نہ کریں۔"

"ارے نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بستی کے لوگ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ یہاں کوئی کسی کے گھر آئے پوری بستی کا مہمان ہوتا ہے، سب کو ایک دوسرے کی خبر رہتی ہے۔"

"مثالی بات ہے، اچھا چلتا ہوں۔"

بمشکل انہوں نے مجھے اجازت دی تھی۔ واقعی میں یہاں کے ماحول سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ساگی نے بھی میرے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ ماں کائنات میں کہیں بھی ہو، ماں ہوتی ہے۔ ساگی ماں ہے اور ماں کی پکار اللہ ضرور سنتا ہے۔ اے اللہ تُو بہتر جانتا ہے۔ ساگی کو اس کا بیٹا ضرور واپس دے دینا۔ تُو عظیم ہے، تجھ سے دعا ہے کہ وہ زندہ ہو۔ پھر مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ "میری ماں۔ میرے لیے اپنے ہاتھ اٹھائے رکھنا۔ میں صرف تیرے لیے واپس آنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے زندہ رہنا۔ اس وقت تک یہ دنیا مت چھوڑنا جب تک میں تیرے پاس واپس نہ آ جاؤں۔" میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ آنسو بھی اللہ کا کتنا بڑا انعام ہیں۔ آنکھیں صاف ہو جاتی ہیں، دل صاف ہو جاتا ہے، یادیں سکون پا جاتی ہیں۔

میں واپس آ گیا۔ حسے پور واقعی مثالی بستی تھی۔ انسان جہاں بھی ہوتے ہیں وہاں مسائل ضرور ہوتے ہیں، یہاں بھی مسائل ہوں گے لیکن مجموعی طور پر سکون تھا، یہ میں دیکھ چکا تھا۔

دن گزر گیا۔ آج شام کی چائے وہی لڑکا لایا تھا جس نے بعد میں اپنا نام بندو بتایا تھا۔ میں نے بندو سے پوچھا۔ "بندو تم ساگی کو جانتے ہو؟"

بندو ہنس پڑا۔ "اسے کون نہیں جانتا۔ بڑی مزے کی ہے، ہم لوگوں کے ساتھ خوب کھیلتی ہے۔"

"تم بھی اسے پتھر مارتے ہو؟"

"ہاں، بڑا مزہ آتا ہے۔"

"محلہ پچھائی پلہ کہاں ہے۔"

"ٹکئی پلیا کے دوسری طرف۔ نمبردار کی حویلی کے پاس، ساگی بھی وہیں رہتی ہے۔"

"کل تم مجھے اس کے گھر پہنچا دو گے؟"

"ہاں آپ بولو گے تو پہنچا دوں گا۔ کل منگل ہے، اسکول پر نہیں آئے گی۔ منگل کو اسکول کی چھٹی ہوتی ہے نا۔"

"اسکول کی چھٹی منگل کو ہوتی ہے۔"

"ہاں جی!"

"ٹھیک ہے، پھر کل تم مجھے ساگی کے گھر پہنچا دینا۔"

بندو چلا گیا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے حسے پور پہنچنے کی ہدایت بلاوجہ نہیں کی گئی ہوگی۔ کہا گیا تھا کہ چندوسی چلے جاؤ، وہاں کسی کو تمہاری ضرورت ہے۔ کسے؟ کیا پیش امام نصیب اللہ کو۔ رما کور کو جس کا بیٹا گم ہو گیا ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں۔ کیا میں کچھ کر سکتا ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 18

نصیب اللہ کا کوئی پتا نہیں تھا۔شکور ہر طرح میری خبر گیری کر رہا تھا، ہر ضرورت وقت پر پوری ہو رہی تھی۔غرض یہ کہ دوسرے دن میں ساگی کے ہاں جانے کے لیے تیار تھا۔ بندو آ گیا تو میں حجرے سے باہر نکل آیا۔بستی کا ماحول سادگی سے بھرپور تھا حالانکہ میں یہاں اجنبی تھا لیکن ہر گزرنے والا شخص رک کر مجھے سلام کرتا۔ ہندو ہوتا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا، جیسے وہ میرا شناسا ہو۔ میں اس سادہ سے گاؤں کے مناظر دیکھتا آگے بڑھتا رہا، پھر ایک طرف مڑا تو ایک ایسی جگہ نظر آئی جیسے دیہاتوں میں مزار بنا لیے جاتے ہیں۔ دو چار جھنڈے لگائے، اینٹیں چنیں اور چونا کر دیا۔ میں نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے بندو......؟“

”دولہا بابا کا مزار ہے، یہاں جن نماز پڑھنے آتے ہیں۔“ بندو نے بتایا۔

”اچھا! تم نے دیکھا ہے جنوں کو نماز پڑھتے ہوئے؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”توبہ توبہ......! مغرب کے بعد کوئی ادھر سے گزرتا بھی نہیں ہے، ابھی تھوڑے دن پہلے کی بات ہے نمبردار جی کا بھتیجا رام لکھن سمندر پار سے آیا تھا، بڑا بابو بنتا تھا، اسے جب بتایا گیا کہ یہاں جن نماز پڑھنے آتے ہیں تو خوب ہنسا اور بولا کہ وہ ان جنوں سے ضرور ملے گا، بس جی! سب نے روکا پر وہ کسی کی نہ مانا اور مغرب کے بعد ادھر آ گیا، کوئی اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ بس جی! دوسری صبح وہ پاگل ہو گیا، اسے تیز بخار تھا، اس کا علاج ہوا پر وہ مر گیا۔“

”آؤ ذرا دولہا بابا کو سلام کرتے چلیں۔“

”نہیں جی! ہم نا جائیں گے، ابا ٹنگڑیاں توڑ دے گا۔“ بندو نے خوف سے کہا۔

”اچھا! تم یہاں رکو، میں آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اس طرف بڑھ گیا۔

دور سے چھوٹی نظر آنے والی یہ جگہ قریب سے کافی وسیع تھی۔ مزار سے پیچھے کی سمت بہت بڑا احاطہ تھا جو درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ زمین کچی تھی لیکن بے حد صاف شفاف! اندر قدم رکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ کسی پُر وقار ہستی کا مزار ہے۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا اور میں نے خلوص سے سلام کیا۔ ایک لمبی قبر نظر آ رہی تھی جس پر تازہ پھول بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں میں بے شمار طاقچے بنے ہوئے جن میں کلام پاک رکھے ہوئے تھے۔ دل پر رقت طاری ہو گئی جو کسی صاحب دین کی توجہ کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور فاتحہ خوانی کرنے لگا۔ ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی۔ باہر اگر بندو انتظار میں نہ بیٹھا ہوتا تو یہاں کافی دیر رکتا، تاہم دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ یہاں ضرور آؤں گا۔

فاتحہ خوانی کے بعد باہر نکل آیا۔ بندو بے چارہ سہا سکڑا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی اور وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا اور مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔ ”آپ ٹھیک ہو صاب......؟“

”ہاں! بالکل ٹھیک ہوں، چلیں؟“ میں نے کہا اور وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ایک کچے جھونپڑے نما گھر کے سامنے بندو رک گیا۔ گھر کے ساتھ میں ایک دکان نظر آ رہی تھی جس میں دروازہ نہیں تھا۔ دکان کے اندر سامان رکھنے کے ڈبے، مرتبان اور دوسری چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ ویرانی جیسے خود کو سنوارنے والے کی منتظر ہو، یاس سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے خلوصِ دل سے دعا مانگی۔ ”معبودِ دوجہاں! اس دکان کو پھر سے آباد کر دینا، تو رب کائنات ہے، تیرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، ساگی کو اس کا پتیم ضرور دے دینا۔“

اس دوران بندو نے دروازے کی زنجیر بجا دی تھی۔ دوسری اور پھر تیسری بار زنجیر بجانے پر دروازہ کھلا اور سترہ، اٹھارہ سال کی ایک لڑکی نظر آئی۔ رنگ سانولا لیکن نقوش بڑے دلکش تھے۔ دو لمبی لمبی چوٹیاں سینے پر لہرا رہی تھیں، آنکھوں میں بے پناہ کشش اور شوخی تھی۔ بندو کو دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر شرارت بھرے لہجے میں گا کر بولی۔ ”ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا ڈھونڈو رے ساجنا میرے کان کا بالا! ہائے میرے بالے، تو کہاں گیا تھا، تیری مر جائے سجنیا!“

”تو کبھی اپنے گھر میں بھی رہا کر چاچی!“ بندو بولا۔

”پھر چاچی...... چاچی بنے تیری بہنیں، تیری موسی، تیری اماں...... صورت حرام لگے ہے تیری!“ وہ لفظ چاچی سے چڑ کر بولی۔ بندو زور زور سے ہنسنے لگا۔

لڑکی کا موڈ خراب ہو گیا تھا پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اس کے چہرے پر حیرانی پھیل گئی۔ ”ارے تم کون ہو...... میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے؟“ وہ داہنے گال پر انگلی مارتے ہوئے بولی۔ پھر ایک دم کہنے لگی۔ ”ارے ہاں! یاد آ گیا، سپنے میں دیکھا تھا تم سفید گھوڑے پر بیٹھے ہوئے تھے مگر گھوڑا کہاں ہے، اس کے بجائے یہ گدھا تمہارے ساتھ ہے۔“ وہ بندو کو دیکھ کر پھر ہنس پڑی۔

”چاچی! ایسے ہی سپنے دیکھتی رہتی ہے مگر اس کے سپنوں کا راج کمار اس کی کالی صورت دیکھ کر گھوڑے کو موڑ کر واپس بھاگ جاتا ہے۔“

”شکل ہو گی تیری کالی! ناس پیٹے...... صورت ہی سے ہنومان لگتا ہے، کیوں بابو صاب! میں کالی ہوں، سب کہتے ہیں کہ سانولی سلونی ہوں، اصل میں اس کا نام بندو ہے، میں اسے بندو کے بجائے بندھ یا بالا کہتی ہوں تو یہ چڑ تا ہے۔“

”بندو...... تم مجھے ساگی کے گھر لائے تھے؟“ میں نے ان کا جھگڑا ختم نہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

”یہی ساگی کا گھر ہے مگر اب میں کیا کروں، اس کی صورت نظر آ گئی۔“ بندو بولا۔

”ارے شما کر دیں، آپ ساگی کے پاس آئے ہیں مگر آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں، ساگی کے پاس تو کوئی نہیں آتا، چلیں آ جائیں، تو بھی آ جائے گا بالے......؟“

”تو یہاں نہ ہوتی تو آ جاتا، اب نہیں آؤں گا، میں جاؤں صاب جی! آپ نے راستہ دیکھ لیا ہے، آپ مسجد آ جاؤ گے؟“

”ہاں! آ جاؤں گا، تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں کی بک بک کسی طرح ختم نہیں ہو گی۔ بندو چلا گیا اور لڑکی نے مجھے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ کشادہ گھر تھا۔ صحن میں لکڑی کے دو تخت، ایک چارپائی پڑی تھی۔ ساگی ایک تخت کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

”جوئیں نکال رہی تھی میں ساگی کی، ہاتھ دھو لوں، تمہارے لیے شربت بنا کر لاؤں؟“

”نہیں! مہربانی تمہاری...... کیا نام ہے تمہارا......؟“

”امرتا کور...... مگر میری سسری سکھیاں مجھے امرتی کہتی ہیں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”میں تم سے ساگی کے بارے میں کچھ پوچھوں، آؤ بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

”پر تم ہو کون......؟ ارے تم وہ تو نہیں ہو جو امام جی کے پاس آئے ہو؟“

”تمہیں بھی معلوم ہے!“ میں نے کہا۔

”ہمارے گاؤں میں سب کو سب پتا ہوتا ہے، مجھے پردیپ نے بتایا تھا کہ شہر سے کوئی بابو صاب آئے ہیں جو بڑی مسجد کے حجرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، وہی ہو نا تم......؟“

”ہاں! وہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہارے لیے گڑ کا شربت بنا کر لاتی ہوں۔“ امرتا بولی اور اندر بھاگ گئی۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا تھا۔ اسی وقت ساگی اپنی جگہ سے اٹھی اور تخت پر بیٹھ گئی۔ اب وہ براہ راست مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بولی۔ ”تم نے مجھے بچانے کے لیے پتھر کھائے تھے؟“ اس کا لہجہ پوری طرح ہوشمندانہ تھا۔ مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ارے تم نے مجھے پہچان لیا ساگی......؟“

”میں پاگل تھوڑی ہوں بس میری آنکھوں کا نور بجھ گیا ہے، میرا پتیم چلا گیا ہے، میرا دل نہیں لگتا اس کے بنا، تو بچوں کے بیچ چلی جاتی ہوں، وہ مجھے پگلی سمجھ کر خوش ہوتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، اگر میں پگلی نہ بنوں تو وہ میرے پاس بھی نہ آئیں، وہ سب میرے پتیم جیسے ہیں، مجھے ان سے بہت محبت ہے، وہ مجھے مارتے ہیں تو مجھے برا نہیں لگتا۔“

”مجھے اپنے پتیم کے بارے میں کچھ بتاؤ ماں جی!“ میں نے کہا۔

”نا نا نا...... مجھے ماں جی مت کہو، پتیم کہتا ہے مجھے، وہی کہے گا تم ساگی کہو، رما کور کہو۔“

”پتیم جب گیا تھا تو تم سے کچھ کہہ کر گیا تھا؟“

”ہاں! مجھے پیار کر کے گیا تھا، کہہ کر گیا تھا کہ ماں جی تیرے لیے جوئیں نکالنے والی بہت ہی باریک کنگھیاں لاؤں گا اور پیڑے! بس یہ کہہ کر گیا تھا۔“ وہ اداس ہو گئی۔

”تم بے فکر رہو ساگی! وہ ضرور آئے گا۔“ میں نے کہا۔

”مجھے پتا ہے، جانتی ہوں میں! آؤ تمہیں بتاؤں، آؤ۔“ وہ جلدی سے اٹھ گئی۔

میں اس کے ساتھ اندر کمرے میں گیا۔ کمرہ خاصا روشن تھا، سورج کی روشنی کئی جگہ سے آ رہی تھی لیکن سامنے ہی ایک طاقچے پر ایک مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ مجھے اسی چراغ کے پاس لے گئی اور بولی۔ ”یہ دیکھو یہ جل رہا ہے، میری منت کا دیا ہے، دولہا بابا کے استھان سے لائی ہوں، یہ اس لیے جل رہا ہے کہ میرا پتیم جیتا ہے، بھگوان نہ کرے اگر یہ بجھ جاتا تو...... تو......!“ ساگی کی آواز لرز گئی۔

”ہم اس میں تیل نہیں ڈالتے، کمرے میں خوب ہوا آتی ہے مگر یہ جلتا رہتا ہے کیونکہ پتیم بھیا جیتا ہے۔“ پیچھے سے امرتا کی آواز سنائی دی۔ نہ جانے کب وہ پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ ”اور جب پتیم بھیا آ جائے گا تو ہم دولہا بابا کے دوار سات دیے جلائیں گے۔“ وہ پیار سے بولی، پھر اس نے ایک گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ ”لو شربت پی لو۔“

بڑی مشکل پیش آ گئی تھی۔ میں بچپن سے ہی گڑ نہیں کھاتا تھا۔ گڑ کا یہ شربت میرے لیے، بہت بڑا امتحان تھا۔ میں نے امرتا کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بڑی چاہ سے یہ سوغات لائی تھی۔ ”ہمیشہ اپنے نفس اپنی انا کے خلاف جنگ کرو، اس سے مغلوب نہ ہو، یہ ایک معصوم تحفہ ہے جسے قبول نہ کرنے سے ایک دل ناشاد ہو گا۔“ میں نے فوراً اپنا موڈ بدل لیا اور گلاس امرتا کے ہاتھ سے لے لیا۔

باہر آ کر میں نے امرتا سے کہا۔ ”امرتا! تمہارے پتیم بھیا کی کوئی تصویر ہے تمہارے پاس......؟“

”فوٹو...... وہ تو نہیں ہے، کیا کرو گے؟“

”دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیسا ہے۔“

”میرے پاس ہے۔“ ساگی بول پڑی اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ آگے بڑھ آئی اور اس نے اپنا چہرہ میرے مقابل کر دیا اور دوبارہ بولی۔ ”میری آنکھوں میں دیکھو۔“

میری نظریں بے اختیار اس کی آنکھوں پر گئیں۔ وحدہٗ لاشریک کی قسم! وہ معجزہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ساگی کی دونوں آنکھوں میں ایک نوجوان لڑکے کی تصویر روشن تھی، اس کے چہرے کا ایک ایک نقش واضح تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ تصویر میرے ذہن پر نقش ہو گئی ہو۔

اسی وقت امرتا کی ہنسی ابھری۔ ”دیکھ لی فوٹو......؟“

”ہاں!“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ پھر بولا۔ ”ایک بار پھر دعا کرتا ہوں ساگی! تمہارا پتیم تمہیں مل جائے، اب میں چلتا ہوں، ٹھیک ہے امرتا!“

”ہاں!“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں گردن ہلائی، پھر بولی۔ ”پردیسی تو چلے ہی جاتے ہیں، ان سے کیا من لگانا۔“ پھر وہ زور سے ہنسی۔ ”ان کے ملنے کی تو منت بھی نہیں مانگنی چاہیے، دولہا بابا بھی پریشان ہوں گے۔“

”جا انہیں باہر چھوڑ آ۔“ ساگی نے کہا۔

”نہیں جاتی، میں تیری نوکر نہیں ہوں۔“ امرتا نے کہا اور پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔ میں خود ہی باہر نکل آیا۔ اب مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بالی عمریں ایسی ہی دیوانی ہوتی ہیں۔

جسے پور بہت بڑی جگہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے مجھے مسجد کا راستہ مل جانا مشکل نہیں تھا لیکن تھوڑا سا آگے بڑھا تھا کہ بندو مٹی کے ایک ڈھیر پر بیٹھا نظر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”ارے تم! کیا میرا انتظار کر رہے تھے؟“

”ہاں جی! وہ امرتی مجھے بہت بری لگتی ہے چاچی کہیں کی۔“ بندو نے کہا۔

میں ہنس پڑا۔ ”وہ تو تمہیں بندو کے نام کی وجہ سے بندھ یا بالا کہتی ہے مگر تم اسے چاچی کیوں کہتے ہو؟“

”آپ گورنام چاچا کو نہیں جانتے؟“

”نہیں!“ میں نے کہا۔

”کودی منڈی میں کپڑے کی دکان ہے ان کی، بہت بوڑھے ہیں، لاٹھی لے کر چلتے ہیں، اکثر امرتی کو بہت سستے کپڑے دیتے تھے، پھر ایک بار اس کے گھر پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ امرتی سے ان کا بیاہ کر دیا جائے، خوب مٹھائی لے کر گئے تھے، امرتی اس وقت گھر پر نہیں تھی ورنہ گورنام چاچا کی تو مکتی ہو گئی تھی پھر جب امرتی کو پتا چلا تو وہ ٹوکا لے کر گورنام کی تلاش میں چل پڑی، وہ تو گورنام چاچا کی قسمت اچھی تھی کہ وہ دکان پر نہیں تھے ورنہ امرتا ان کو کاٹ کر ہی دم لیتی۔ چاچا کو پتا چل گیا تو وہ دیپو کے کھلیان میں جا چھپے، پانچ دن تک وہ باہر نہ آئے، پھر ایک دن کسی کام سے چھپ کر باہر نکلے تو امرتی نے انہیں دیکھ لیا، پیچھے سے جا کر انہیں دبوچ لیا اور اتنا مارا کہ خون میں نہا گئے۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے بچایا، خوب تھانہ پنچایت ہوئی اور لکھیا سنگھ جی نے چاچا گورنام کے منہ سے پنچایت کے سامنے امرتی کو بیٹی کہلوایا، تب جا کر چاچا کی جان چھٹی، بس جب وہ مجھے بالا کہتی ہے تو میں اسے چاچی کہہ دیتا ہوں۔“

یہ دلچسپ کہانی سن کر میں خوب ہنسا تھا۔ مسجد واپس آ گیا۔ وہی سب کچھ تھا، زندگی ٹھہری ٹھہری تھی، اجنبی لوگ تھے۔ بس حکم کے مطابق آ گیا تھا لیکن ابھی تک نصیب اللہ صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اب کیا کروں؟ اصل میں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہاں جسے پور میں آنے کا مقصد کیا ہے، اگر یہ پتا چل جاتا تو اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ پھر دل میں دولہا بابا کا خیال آیا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ قابل احترام شخصیت کا مزار ہے۔ کیوں نہ رات اسی مزار پاک پر گزاری جائے، شاید آگے کے لیے رہنمائی مل جائے۔ جسے پور کے سادہ لوح لوگ مغرب کے بعد وہاں سے گزرنے سے ڈرتے تھے لیکن میری بات اور تھی۔

شکور رات کا کھانا لے آیا۔ میں نے کھانے سے فراغت پائی، پھر تیار ہو کر چل پڑا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا، خاص طور سے مزار شریف کے آس پاس گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں مزار کے پچھلے حصے میں احاطے میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی خاموشی طاری تھی۔ ایک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے پڑھنے لگا۔ کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔

پھر اچانک کچھ آہٹیں ابھریں اور میں نے آنکھیں کھول دیں لیکن کوئی نظر نہیں آیا، پھر آہٹیں بڑھتی گئیں اور یوں لگا جیسے پورا احاطہ بھر گیا ہو، پھر ایک آواز مجھے اپنے قریب سنائی دی۔ ”ذرا اُدھر سرک جائیے۔“

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور سرک گیا۔ کوئی میرے برابر آ بیٹھا تھا۔ اس کے بعد ہلکی ہلکی آوازیں ابھرنے لگیں، آیات کی تلاوت ہو رہی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت رات کے تین بجے ہوں گے جب ورد ختم ہوا اور آنے والے جانے لگے۔ میرے کانوں میں آواز ابھری۔ ”میاں! آپ بھی اپنی آرام گاہ پر جائیے اور آرام کیجیے۔“ میں اٹھ گیا اور احاطے سے باہر نکل کر مسجد کی جانب چل پڑا۔

اپنی مسہری پر لیٹ کر دلی سکون کا احساس ہوا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی، بس یہ خیال تھا کہ بے مقصد پڑا ہوا ہوں، میرے میزبان کا کوئی پتا نہیں ہے، بے چارا شکور دن رات خدمت کر رہا ہے۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد سوچ رہا تھا کہ باہر نکلوں اور یونہی آوارہ گردی کروں کہ بندو ہانپتا کانپتا آیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ اس نے ایک لڈو بنا کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”صاب جی...... صاب جی! آپ کی فوٹو!“

”میری......؟“ میں نے حیرانی سے کہا اور مڑا تڑا کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کونے پر میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہندی اور اس کے نیچے اردو میں لکھا تھا۔ ”ایک لاکھ روپے انعام!“

اس کے بعد میرے بارے میں تفصیل لکھی تھی جس میں مجھے ایک خطرناک دہشت گرد بتا کر عوام سے استدعا کی گئی تھی کہ میری گرفتاری میں قانون کی مدد کریں اور انعام حاصل کریں۔

”یہ کاغذ تمہیں کہاں سے ملا؟“

”بازار میں پڑا تھا، آپ کی فوٹو نظر آ گئی، تارا جی حلوائی کے پاس اور بھی پڑے ہیں۔“ بندو نے بتایا۔ بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ بندو کے علاوہ دوسروں نے بھی دیکھے ہوں گے، کوئی نہ کوئی نشاندہی کر دے گا، بہت سوں نے مجھے یہاں دیکھا ہے۔ بندو سے کچھ نہیں کہا۔ وہ بولا۔ ”آپ کی فوٹو میں رکھ لوں؟“

”ہاں! رکھ لو۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ بیچارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے، بس اسے اس بات سے دلچسپی تھی کہ کاغذ میں میری تصویر ہے۔ بندو چلا گیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ یہاں سے کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا ہوتا تھا کیونکہ مجھے یہاں بھیجا گیا تھا اور مجھے کہیں بلاوجہ نہیں بھیجا جاتا تھا۔

پورا دن اسی سوچ میں گزر گیا۔ آج رات بھی کافی بے کل گزری تھی۔ دوسرے دن شکور پر بھی غور کیا۔ اس کے اندر کوئی تبدیلی نہیں تھی بلکہ وہ حیران ہو رہا تھا کہ نصیب اللہ واپس کیوں نہیں آئے۔

”مجھے لگتا ہے امام صاحب کی بہن یا تو چل بسیں یا زیادہ بیمار ہیں۔“ اس نے کہا۔

”بستی کے لوگ میرے بارے میں کہتے تو ہوں گے کہ مہمان حاضر، میزبان غائب......!“ میں نے شکور کو ٹٹولتے ہوئے کہا کہ شاید مجھے بستی کے لوگوں کا خیال معلوم ہو سکے۔

”نہیں صاب جی! امام صاب کے مہمان کی سب عزت کرتے ہیں، کوئی کچھ نہیں کہتا۔“ میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ دوپہر کے بعد میں اکتا کر باہر نکل آیا اور یونہی آوارہ گردی کرنے لگا۔

بازار سے گزرتے ہوئے میں نے لوگوں کا جائزہ بھی لیا لیکن کسی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں پائی۔ ٹہلتا ٹہلتا ساگی کے گھر کی طرف نکل آیا لیکن یہ سوچ کر ادھر کا رخ نہیں کیا کہ وہاں امرتا بھی ہو گی اور پھر کیا معلوم کہ اپنے بچوں کے پتھر کھا کر وہ واپس بھی آئی ہو گی یا نہیں! انہی سوچوں میں ڈوبا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک دور سے شکور اور بندو ایک ساتھ نظر آئے۔ بندو میری طرف اشارہ کر رہا تھا، اس کے اشارے پر شکور نے میری طرف دوڑ لگا دی۔ دونوں دوڑتے ہوئے میرے پاس آ گئے، بری طرح ہانپ رہے تھے۔

”پولیس...... پولیس، تین گاڑیاں، مسجد، مسجد گھیر لی ہے۔“ شکور نے بتایا۔ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ پولیس میری تلاش میں یہاں پہنچ گئی تھی۔ ظاہر ہے وہ لوگ بھی کام کر رہے تھے، میرا سراغ لگاتے پھر رہے تھے، کسی طرح معلوم کر لیا ہو گا۔

”لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”پولیس پوچھ گچھ کر رہی ہے۔“

”مار پیٹ تو نہیں کر رہی؟“

”پتا نہیں صاب جی! آپ کہیں اور چھپ جاؤ، مسجد مت آنا، ہمیں بتاؤ کیا کریں؟“

”تم اپنے گھر میں رہو، میں اپنے لیے جگہ تلاش کر لوں گا، جاؤ میری فکر مت کرو۔“ میں نے کہا اور وہ واپس مڑ گئے۔ بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ میں نے غور کیا کہ اب کیا کروں۔ ایک لمحے میں جواب مل گیا۔ دولہا بابا کے مزار سے بہتر پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے۔ وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ میں دولہا بابا کی درگاہ کی طرف چل پڑا۔ یہاں اس وقت بھی سناٹا طاری تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا، سکون ہی سکون تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن میں کوئی انتشار نہیں تھا۔ بس یہ سوچ رہا تھا کہ پولیس جسے پور کے لوگوں کو پریشان نہ کرے۔

اسی طرح بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی، پھر اس وقت جاگا جب کسی نے کندھے کو زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”چائے کا وقت ہو گیا ہے، چائے پی لیجیے۔“ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پاس ہی ایک دسترخوان بچھا ہوا تھا، اس پر رکھی چائے دانی سے چائے کی بہترین خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایک بڑی پلیٹ میں بسکٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے، تاحدِ نظر کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے شکر گزار نظروں سے دولہا بابا کے مزار کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”شکر گزار ہوں بابا صاحب!“

باہر کیا ہو رہا ہے، انڈین پولیس مجھے تلاش کرنے کے لیے کیا کیا جتن کر رہی ہے، اب مجھے اس کی بالکل پروا نہیں تھی۔ یہاں اس مزار پاک پر میری پذیرائی ہوئی تھی، اس سے مجھے بے حد اطمینان ہوا تھا۔ یہ اطمینان قائم رہا۔ رات کو کھانا بھی اسی طرح مل گیا تھا۔ میں نے اسی درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ بڑی بے خوفی سے میں نے سرہانے ایک اینٹ رکھی اور زمین پر دراز ہو گیا۔

خیالات انسان کے بہترین ساتھی ہوتے ہیں، یہ تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ اس وقت بھی یہی میرے ساتھی تھے۔ کچی زمین پر اینٹ کا تکیہ رکھ کر لیٹنے میں کتنا سکون ہے، کوئی اس کا تجزیہ کر کے دیکھے۔ پُرتکلف بستر پر یہ سکون کہاں......؟

منتظر تھا کہ رات کو اجتماع ہو گا لیکن کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ نیند آ گئی لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ کسی آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ میں نے اس آہٹ کا راز جاننے کی کوشش کی تو ایک سایہ نظر آیا جسے ایک اینٹ سے ٹھوکر لگی تھی، اسی کی آواز ہوئی تھی۔ پتا نہیں کون ہے۔ میں نے دم سادھ لیا۔

سایہ سنبھل کر دو چار قدم اور چلا، پھر زمین پر بیٹھ گیا۔ چند لمحات خاموشی رہی۔ میں نے اپنی کوئی آہٹ نہ ہونے دی تھی اور اس کا تجزیہ کرتا رہا۔ میرے دل میں ایک ہی خیال آیا تھا۔ کوئی جن ہے جو مزار پاک پر فاتحہ خوانی کرنے آیا ہے۔

”اے مزار مقدس کے مکین! اچانک ایک دلدوز آواز سنائی دی۔“ میرے لیے اللہ سے دعا فرما دیں کہ میری مشکل حل کر دے۔ اے اللہ کے پیارے! آپ کی دعا مقدم ہے، ہم گناہگاروں سے...... بیشک مرادیں پوری کرنے والی صرف اللہ کی ذات ہے، کوئی بشر کسی کو کچھ نہیں دے سکتا لیکن آپ کی دعا اللہ قبول فرماتا ہے، میں اپنی بہن کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتا، میرا سینہ زخم بن گیا ہے، دعا فرما دیں بزرگ! دعا فرما دیں۔“

زار و قطار رونے کی آواز ابھری اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ بابا پردہ پوش نے بہت بڑی قوت عطا فرمائی تھی انسان شناسی کی لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ ضرورت آخری حد میں پہنچ جائے تب اس قوت کو استعمال کیا جائے ورنہ نہیں۔ چنانچہ میں نے اس شخص کو جاننے کی کوشش نہیں کی، البتہ یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جن نہیں انسان ہے۔

چاند جیسے اسی لمحے کا منتظر تھا، فوراً بدلی کی اوٹ سے نکل آیا۔ اس شخص کو بھی میرے اٹھنے سے کسی کی یہاں موجودگی کا احساس ہو گیا۔ چنانچہ میں نے اسے اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس شخص کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ وہ کوئی پولیس آفیسر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جیسے سکتے میں آ گیا تھا۔

میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر ایک دم وہ ہوش میں آ گیا اور بولا۔ ”پلیز کچھ کرنے کی کوشش مت کرنا ڈاکٹر کامران! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے ہولسٹر سے اپنا سروس ریوالور نکال کر میرے پیروں کی طرف پھینک دیا اور بولا۔ ”میں آپ کے قریب آ جاؤں؟“

”آؤ آفیسر! اپنا ریوالور اٹھا لو، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم مسلمان ہو۔“ وہ آگے بڑھ کر میرے پاس آ گیا۔ ایک بالکل نوجوان اور خوش شکل شخص تھا۔

”خدا کی قسم، کسی دوسرے کے دل میں بیشک کوئی خیال نہ آیا ہو لیکن اس مزار پاک پر آ کر میرے دل میں خیال ضرور آیا تھا کہ ممکن ہے آپ یہاں ہوں۔“

”ہاں! یہ پناہ گاہ ہے، کوئی تمہارے قرب و جوار میں تو نہیں ہے؟“

”کسی کے فرشتوں کو بھی گمان نہیں ہو گا کہ میں ادھر آ سکتا ہوں، دھونی لال بے حد ڈرپوک ہے، جسے پور کے لوگوں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس مزار پر جن رہتے ہیں، یہ سن کر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔“

”دھونی لال کون......؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈی ایس پی ہے، آپ کی تلاش میں آیا ہے مگر آپ سے ڈرتا بھی ہے۔“

”کیوں! ڈرتا کیوں ہے...... بیٹھ جاؤ۔“

وہ بیٹھ گیا، پھر بولا۔ ”آج تک جس طرح کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکا، اس کی وجہ سے بیشتر افراد کا خیال ہے کہ آپ کے قبضے میں کوئی جن ہے جو آپ کی مدد کرتا ہے۔“

”گڈ! تمہارا عہدہ کیا ہے؟“

”انسپکٹر ہوں۔“

”میری تلاش میں آئے ہو؟“

”ہاں جسے پور سے کسی نے مخبری کی ہے کہ آپ یہاں موجود ہیں اور جسے پور کی مسجد کے حجرے میں رہ رہے ہیں، یہ مخبری ایک لاکھ روپے کے انعام کے لالچ میں کی گئی ہے۔“

”ٹھیک! تمہارا کیا نام ہے؟“

”اعظم علی!“

”اعظم علی! تم ابھی دعا مانگ رہے تھے؟“

”آپ نے میری دعا سنی تھی؟“ وہ بولا۔

”ہاں!“

”کائنات میں ایک بہن کے سوا میرا کوئی نہیں ہے جسے میں نے اولاد کی طرح پالا ہے، مجھ سے صرف چھ سال چھوٹی ہے لیکن ماں، باپ کی اچانک موت کے بعد میں نے ہی اس کی پرورش کی، محبت کرتا تھا ایک لڑکی سے مگر اس سے شادی نہیں کی کیونکہ میں پہلے اپنی بہن کی شادی کر کے اسے رخصت کرنا چاہتا تھا، میں نے ایک ایماندار پولیس افسر سے اس کی شادی کر دی، امان اللہ بھی ایک ذمہ دار پولیس افسر تھا اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتا تھا، لوٹیا نے کسی بندے کی سفارش کی تھی جس نے دو بندے قتل کیے تھے، قتل امان اللہ کے سامنے ہوئے تھے، اس نے لوٹیا کی بات نہیں مانی، بس لوٹیا کہاں چھوڑنے والوں میں سے ہے، امان اللہ کو اس نے اٹھوا لیا، کہیں سے اس کا پتا نہیں چلا مگر......!“ وہ رکا پھر ایک سسکی سی لے کر بولا۔ ”آسیہ بہت پیار کرتی ہے اس سے، وہ اس کے غم میں پاگل ہو گئی ہے۔“ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا پھر بولا۔ ”میرے دادا ابو بہت دیندار انسان تھے، وہ ولیوں، درویشوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے، مجھے بس ایک دن خواب میں کہا کہ مزاروں پر جا کر دعا مانگوں، بزرگان دین، بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں، ہر جگہ ہو آیا ہوں، یہاں دولہا بابا کا پتا چلا تو یہاں آ گیا۔“

”لوٹیا کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”رائے پور کا مالک ہے، پورا رائے پور اس کی ملکیت ہے، پورا نام وکرم سنگھ لوٹیا ہے، بہت بڑی جاگیر ہے اس کی، جوگی بنا رہتا ہے، ڈھونگی کہیں کا کسی کی نہیں چلتی اس کے آگے، ایک بات کہوں آپ سے......؟“

”ہاں بولو!“

”اگر آپ کے قبضے میں جن ہے تو خدا کے لیے میری مدد کریں، میرے بہنوئی کو آزاد کرا دیں لوٹیا کے قبضے سے، بہت بڑا احسان ہو گا ہم بہن، بھائی پر......!“

”نہیں بھائی! میرے قبضے میں کوئی جن نہیں ہے، ایک گناہگار بندہ ہوں اور مشکل میں گرفتار ہوں۔“

”کوئی نہیں مانتا، ہندوستان بھر کی پولیس کو آپ نے نچا کر رکھ دیا ہے، ہاتھ آتے ہیں تو دودھ میں سے بال کی طرح صاف نکل جاتے ہیں، آخر کیسے......! ویسے میں ایک بات آپ کو اور بتا دوں، بہت جلد یہ حکم نامہ جاری ہونے والا ہے کہ جونہی آپ نظر آئیں، آپ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے۔“

میں ہنسنے لگا، پھر میں نے کہا۔ ”ہم مسلمان صرف یہ مانتے ہیں کہ موت کا وقت متعین ہے اس لیے موت سے نہیں ڈرتے، خیر اب تم نے مجھے دیکھ لیا ہے، تم مجھے گرفتار کر لو۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی جان دے سکتا ہوں آپ کے لیے، میں اور آپ کو گرفتار کروں گا!“

”اپنا فرض پورا نہیں کرو گے؟“

”چولہے میں گیا فرض، میری بہن شوہر کے غم میں پاگل ہو گئی ہے، کوئی ایسا نہیں ہے جو لوٹیا کے قبضے سے میرے بہنوئی کو آزاد کرا دے، کسی کا یہ فرض نہیں ہے، بس سارا میرا ہی فرض ہے، سنیں ڈاکٹر صاحب! آپ کا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے، کل پولیس کی بڑی نفری آ جائے گی اور جسے پور کے ہر گھر میں آپ کو تلاش کیا جائے گا، ابھی جو پولیس آئی ہے، اس نے جسے پور سے باہر جانے والے راستوں کی ناکہ بندی کر لی ہے۔“

”پھر میں کیسے باہر جاؤں گا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں لے جاؤں گا۔“

”تم......؟“ میں نے کہا۔

”ہاں......!“

”کیسے......؟“

”میں نفری لینے کے لیے نکلا ہوں، چندوسی جا رہا ہوں، میری جیپ باہر کھڑی ہے، بس دعا مانگنے کے لیے رک گیا تھا، یہاں آپ مل گئے اللہ کے فضل سے!“

”اکیلے جاؤ گے؟“

”یہ میری مرضی پر منحصر ہے، پہلے کسی کو لے لیتا مگر اب اکیلا جاؤں گا، آپ میرے ساتھ ہوں گے، دھونی لال کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ کیا کرنا چاہیے۔ اتنے دن ہو گئے نصیب اللہ کا بھی کوئی پتا نہیں چلا، یہاں اس گاؤں میں پولیس لوگوں پر تشدد کرے گی، شکور وغیرہ مصیبت میں پڑ جائیں گے، فی الحال یہاں سے نکل جانا مناسب ہے۔ کل گھر گھر تلاشی ہو گی، کہیں نہ کہیں سے پتا چل جائے گا۔ میں نے اعظم علی سے پوچھا۔ ”بستی کے لوگوں نے میرے بارے میں کیا بتایا؟“

”بہت اچھے لوگ ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان! سب نے ایک ہی بات کہی کہ انہیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، مخبری کرنے والے کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کون ہے۔ یہاں تک کہ نمبردار لکھیا سنگھ نے بھی آپ کے بارے میں پولیس سے تعاون نہیں کیا۔“

آخر کار میں نے اعظم علی کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اعظم علی فوراً جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مسجد سے سامان لینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اعظم علی نے مجھے سیٹوں کے درمیان چھپا دیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اس کا کہنا بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جسے پور سے باہر جانے کے راستے کتنے ہیں لیکن جیپ کے راستے میں کئی جگہ پولیس نظر آئی، جس کے پاس اعظم نے جیپ روک کر ان سے مستعد رہنے کے لیے کہا تھا، پھر کافی دور آنے کے بعد وہ بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! اب آرام سے بیٹھ جائیں، آگے آ جائیں۔“ میں اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ ”چندوسی میں میرا ایک دوست احمد خان ہے، آپ کو اس کے گھر رکھوں گا، بعد میں آپ سے مشورہ کروں گا کہ اب میں کیا کروں۔“

”بھروسے کا بندہ ہے؟“

”نہ ہوتا تو نام بھی نہ لیتا، ایک بات بتائیں آپ جس طرح پولیس کی پوری فورس کے بیچ سے نکل آتے ہیں، کیا اسی طرح پاکستان نہیں جا سکتے، آپ کے جن آپ کو بارڈر نہیں کراس کرا سکتے؟“

”میں نے تم سے کہا ہے کہ میرے قبضے میں کوئی جن نہیں ہے۔“

”پھر بھی کوئی علم تو ضرور ہو گا، خیر آپ کو میری مدد ضرور کرنی ہے ڈاکٹر صاحب! وہاں پاکستان میں آپ کے رشتے دار بھی ہوں گے؟“

”ہاں!“

”بیوی، بچے بھی......؟“

”نہیں! تم جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو، اس کا کیا حال ہے؟“

”اس کی شادی ہو گئی۔“

”ارے اس نے تمہارا انتظار نہیں کیا؟“

”کون کسی کا انتظار کرتا ہے۔“ وہ اداسی سے بولا۔ راستے بھر میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ چندوسی میں داخل ہو کر اعظم علی ایک خوبصورت سے جدید طرز کے گھر کے سامنے رکا۔ دیر تک بیل بجانے پر کسی نوکر نے دروازہ کھولا۔ اعظم علی نے اس سے کچھ باتیں کیں۔ نوکر نے ہمیں گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک اچھی شخصیت کا مالک جوان آدمی شب خوابی کے لباس میں اندر آ گیا۔

”سب سے پہلے خیریت بتاؤ اعظم!“ اس نے بے چینی سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر چونکا۔ ”ارے ڈاکٹر کامران......!“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”بہت شہرت ملی ہے مجھے آپ کے وطن میں!“ میں نے کہا۔

”مجھے پانچ منٹ دیجیے ڈاکٹر کامران!“ اعظم علی نے کہا اور احمد خان کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ انہوں نے واپسی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگائے تھے۔

احمد خان نے میرے قریب آ کر مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ”میری خوش نصیبی ہے ڈاکٹر صاحب کہ آپ کی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس کے لیے میں انسپکٹر اعظم علی کا شکر گزار ہوں، آپ بے فکری سے یہاں قیام فرمائیں، ان شاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی، آپ ہمارے ہیرو ہیں۔“

”شکریہ! میں آپ کو زیادہ وقت تکلیف نہیں دوں گا۔“

تھوڑی دیر کی گفتگو ہوئی، پھر اعظم علی رخصت لے کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ”میں آپ کو صورتحال سے آگاہ کرتا رہوں گا ڈاکٹر کامران!“

احمد خان نے میرے آرام کا بندوبست کیا۔ صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی، سونے کا وقت نہیں تھا۔ میں جاگتا رہا، سوچتا رہا جسے پور میں کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے میزبان سے میری ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی، البتہ دو ذمہ داریاں ضرور میرے شانوں پر آ گئی تھیں۔ ایک ساگی کے پتیم کی تلاش، دوسری انسپکٹر اعظم کے بہنوئی کو کرم سنگھ لوٹیا کے قبضے سے نکالنے کا معاملہ، اس کے علاوہ ایک صاحب علم بزرگ دولہا بابا کے قدموں میں گزرنے والے لمحات روح پرور تھے!

بظاہر اطمینان تھا، بس یہ سوچنا تھا کہ کام کس طرح شروع کیا جائے۔ احمد خان اپنے گھر میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ رہتا تھا، لیکن اس کا گھر اس خوبی کے ساتھ بنا ہوا تھا کہ خواتین کی بے پردگی نہیں ہوتی تھی۔

دوسری صبح احمد خان نے میرے ساتھ ناشتہ کیا اور بولا۔ ”آپ یہاں سکون سے قیام کریں، ہر ضرورت بے تکلفی سے بتا دیں، اعظم نے مجھے تمام حالات بتا دیے ہیں، بس امید ہی انسان کو زندہ رکھتی ہے، اعظم بھی انسان ہی ہے، بہن پر جان دیتا ہے اور پُرامید ہے کہ لوٹیا جیسے شیطان کے چنگل سے امان اللہ کو نکال لائے گا، مجھے تو اس بات کی امید بھی نہیں ہے کہ امان اللہ زندہ ہو گا، لوٹیا بے حد خطرناک انسان ہے، اس کے مخالف جب غائب ہوتے ہیں تو دوبارہ کبھی منظر عام پر نہیں آتے، آج تک کا تو یہی ریکارڈ ہے۔“

”رائے پور یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”چندوسی سے کوئی چالیس کلومیٹر ہے۔“

”میں وہاں جا سکتا ہوں؟“ میں نے سوال کیا۔

احمد خان سوچ میں ڈوب گیا، پھر بولا۔ ”وہ سادھو اور جوگی بنا ہوا ہے، اکثر بیمار لوگ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ ان کا علاج کرتا ہے، ان میں ہندو مسلمان کی تخصیص نہیں ہوتی، ایسا وہ اپنی شہرت کے لیے کرتا ہے لیکن آپ کے معاملے میں تھوڑی سی پریشانی ہے۔“

”کیا......؟“

”پولیس نے آپ کی اتنی پبلسٹی کر دی ہے کہ اب آپ کو ہر شخص پہچانتا ہے، آپ نے دیکھا میں نے آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا، وہ بھی آپ کو پہچان لے گا۔“

”ہوں!“ میں نے گردن ہلائی۔

احمد خان بولا۔ ”اللہ مالک ہے، اعظم فارغ ہو کر آ جائے تو اس بارے میں سوچتے ہیں، کوئی حل ضرور نکلے گا۔“

چار دن گزر گئے، مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ احمد خان کاروباری آدمی تھا اور اس کا کاروبار اطمینان بخش تھا، کافی وقت میرے ساتھ گزارتا تھا۔ پانچویں دن اس نے بتایا کہ اعظم فارغ ہو گیا ہے، رات کے کھانے پر آئے گا۔ اعظم آ گیا۔ اس نے جسے پور کی تفصیل بتائی جس میں افسوسناک خبر یہ تھی کہ پولیس نے شکور کو خوب مارا پیٹا اور اس سے میرے بارے میں تفتیش کی، نصیب اللہ آج تک واپس نہیں آئے، دھونی لال نے آپ کے بارے میں بیان دیا ہے کہ آپ کوئی دہشت گرد وغیرہ نہیں ہیں بلکہ کوئی پہنچے ہوئے نوجوان بزرگ ہیں جو جنوں کی مدد سے اب تک بچے ہوئے ہیں۔“

”پولیس جسے پور سے واپس آ گئی؟“

”ہاں! ظاہر ہے وہ وہاں آپ کو پانے میں ناکام ہو گئی۔“

پھر یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ میں رائے پور کیسے جاؤں تو اعظم نے کہا۔ ”اگر آپ حلیہ بدلنا چاہیں تو میں آپ کے چہرے پر پلاسٹک میک اپ کر دوں گا، میں نے اس کا کورس کیا ہے۔“ میں اس کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

”آپ وہاں بیمار بن کر جائیں گے، کیا آپ ہندو بننا پسند کریں گے؟“

”نہیں......!“

”خیر یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، وہاں ہندو مسلمان سب جاتے ہیں، میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس کا سلوک کیسا ہوتا ہے، سنا ہے کہ بظاہر اچھا ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ الیکشن کے دنوں میں بڑے بڑے حیثیت والے ووٹ لینے کے لیے اس کا سہارا لیتے ہیں اور وہ مسلمانوں سے بھی ان کے لیے سفارش کر دیتا ہے جو اس کی بات مانتے ہیں، یہ اس کی پالیسی ہے۔“

”گڈ! چالاک آدمی ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

تمام پروگرام طے ہو گئے۔ یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا کہ میں وکرم سنگھ کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں گا پھر اعظم نے میرے چہرے پر اپنی مہارت استعمال کی۔ واقعی ماہر فن تھا۔ اس نے بڑے سائنسی طریقے سے میرا چہرہ تبدیل کیا تھا۔ ناک کا اگلا حصہ تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا تھا اور نچلا ہونٹ بھاری کر دیا تھا جس سے میری شکل ہی بدل گئی تھی۔ میں نے اس کے فن کی تعریف کی تھی۔

تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو احمد خان نے مجھے لاری اڈے سے ایک لاری میں بٹھا دیا جو رائے پور جاتی تھی۔ رائے پور کوئی چھوٹی جگہ نہیں تھی بلکہ صاف شفاف شہر تھا جہاں ٹیکسیاں بھی چلتی تھیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے وکرم سنگھ کے ٹھکانے پر جانے کے لیے کہا تو وہ مؤدب ہو گیا۔

”راج دوار آئے ہیں مہاراج! بیٹھیے۔“ اس نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ راستے میں اس نے کہا۔ ”کوئی دکھ بھری بپتا لے کر آئے ہوں گے، بیمار ہیں کیا؟“

”ہاں بھائی! کئی سال ہو گئے ٹھیک ہی نہیں ہو رہا۔“ میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

”سمجھو ٹھیک ہو گئے، بس بھگوان کا اشارہ ہوتا ہے جب وہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اسے راج دوار بھیج دیتا ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور عقیدت سے بولا۔ راستے بھر وہ وکرم سنگھ کے بارے میں کہانیاں سناتا رہا۔

پھر شہری آبادی سے دور ایک پُر فضا جگہ مجھے ایک محل نما عمارت نظر آئی۔ عظیم الشان عمارت سے کچھ فاصلے پر بہت لمبے لمبے بیرک نما مہمان خانے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے درخت جھول رہے تھے، ان کے عقب میں شاداب کھیت پھیلے ہوئے تھے، ایک جگہ ایک دفتر نما جگہ بنی ہوئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے یہاں ٹیکسی روک دی۔

”کتنے پیسے بھائی......؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں مہاراج......! راج دوار آنے والوں سے پیسے نہیں لیے جاتے، ہمارے پھیروں کے پیسے ہمیں مہینے کے مہینے مل جاتے ہیں۔“

”کہاں سے......؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”راج بھنڈار سے، وہیں ہمارا حساب لکھا ہوتا ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے عجیب کہانی سنائی اور میں حیران رہ گیا۔ ٹیکسی واپس مڑ گئی تو میں اس دفتر کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں کئی افراد نظر آ رہے تھے۔ میں اپنا معمولی سامان اٹھا کر دفتر میں داخل ہو گیا۔ کئی میزیں پڑی ہوئی تھیں جن کے پیچھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں آنے والوں کا اندراج ہو رہا تھا۔

”اِدھر آ جائیے۔“ ایک طرف سے آواز آئی اور میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک شخص مجھے بلا رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد اس نے ایک رجسٹر سامنے رکھا اور بولا۔ ”نام......؟“

”کامران مسعود!“

”کہاں سے آئے ہو؟“

”کان پور سے۔“

”کام ذاتی ہے یا کسی اور کے لیے آئے ہیں؟“

”ذاتی!“

”کل شام سات بجے!“ اس نے رجسٹر میں وقت لکھا، پھر کسی کو پکارا۔ ”جیون داس! چودہ نمبر میں پہنچا دو۔“

ایک دبلے پتلے سے آدمی نے قریب آ کر میرے کپڑوں کا تھیلا اٹھا لیا اور میری طرف رخ کر کے بولا۔ ”آیئے!“

مجھے چودہ نمبر بیرک میں پہنچا دیا گیا۔ شاندار انتظامات تھے لیکن کچھ الجھن بھی تھی۔ کھانے پینے کے لیے بھی یہیں سے دیا جاتا ہو گا۔ ایک ایسے شخص کے ہاں سے کھانے کو کیا دیا جائے گا، کون جانے! میں نے ایک فیصلہ کیا۔ وکرم سنگھ لوٹیا سے ملاقات کا وقت دوسرے دن سات بجے دیا گیا تھا، اس وقت تک انتظار کرنا تھا۔

یہاں مہمان خانے میں دوسرے حاجت مند بھی تھے جو اتفاق سے سارے ہندو تھے۔ ایک دو سے ملاقات ہوئی۔ سارے لوٹیا مہاراج کے عقیدت مند تھے اور اس کے بارے میں بہت اچھے خیالات رکھتے تھے۔ کہیں اعظم علی سے بھول تو نہیں ہوئی، ممکن ہے یہ اچھا آدمی ہی ہو۔ میں بابا صاحب کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن مجھے ان کی نصیحت یاد تھی۔ ہاں اگر صورتحال کسی طرح واضح نہ ہو سکی تو پھر مجبوری تھی۔

دن بھر میں نے کچھ نہیں کھایا بلکہ کھانے کے لیے جو کچھ آیا، اسے بڑی چالاکی سے ضائع کر دیا البتہ ایک ہلکا سا خیال میرے دل میں ضرور آیا تھا۔ میں کہیں بھی ہوتا، پراسرار قوتوں کی طرف سے میری خبر گیری ضرور کی جاتی تھی لیکن یہاں قیام کے دوران مجھ پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔

آخری بار دولہا بابا کے مزار پر بھی میرے لیے سارے انتظامات ہوئے تھے۔ دل میں بہت سے خدشات جاگے لیکن رات کو یہ خدشات زائل ہو گئے۔ بڑی خاموشی سے مجھے کھانا پہنچا دیا گیا تھا۔ جس طرح یہ کھانا آیا تھا، وہ انداز میرا جانا پہچانا تھا۔

دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ رات کو بھی بہت دیر تک وکرم کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ اندازہ بخوبی ہو گیا کہ زبردست نیٹ ورک ہے اس کا، کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے، ہر کام بڑے سسٹم سے کرتا ہے، اس سے ملاقات میں بہت محتاط رہنا ہو گا۔

صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بھی دونوں طرف سے آیا لیکن میں نے بڑی احتیاط سے وکرم سنگھ کے پاس سے آیا ہوا کھانا ضائع کر دیا تھا۔ پھر پونے سات بجے میرا بلاوا آ گیا۔ دو آدمی مجھے ساتھ لے کر چل پڑے۔ یہاں موجود دوسرے حاجت مندوں سے یہ علم ہو گیا تھا کہ وکرم لوٹیا ہر شخص سے انفرادی طور پر ملتا ہے اور اس کے مسائل سنتا ہے۔

محل نما عمارت کے ایک حصے میں مجھے ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ زمین پر فرش ہو رہا تھا۔ وہیں ایک مرگ چھالہ پر وکرم سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ سفید دھوتی، کرتے میں ملبوس تھا، بال کندھوں تک تھے۔ زبردست جسامت کا مالک کوئی پہلوان لگتا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں، پھر اس کی گونجدار آواز سنائی دی۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“

میں آگے بڑھ کر مرگ چھالہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ آواز دوبارہ سنائی دی۔

”میں بیمار ہوں مہاراج!“ میں نے کہا۔

اچانک اس نے بند آنکھیں کھول دیں۔ ضرورت سے کہیں زیادہ بڑی آنکھیں تھیں۔ اس قدر تیز، چمکدار کہ ان میں دیکھنا مشکل تھا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا، پھر اس کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ڈاکٹر ہو کر بیمار ہو ڈاکٹر کامران!“ اس کی آواز ابھری۔

(جاری ہے)

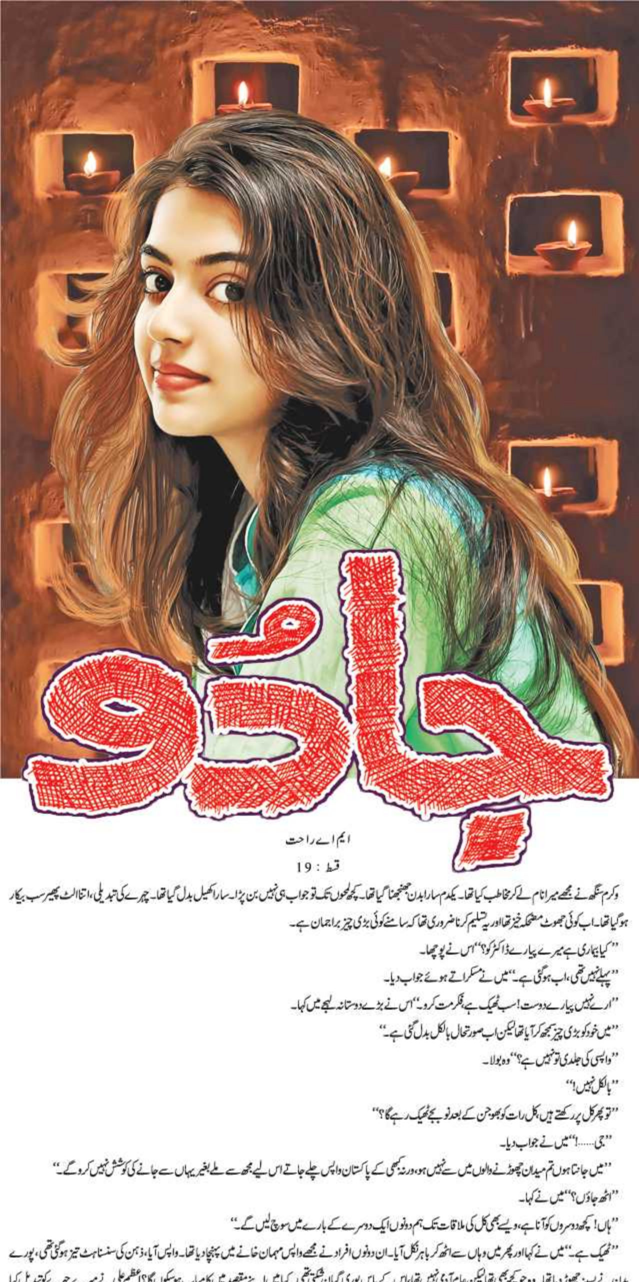

جادو

ایم اے راحت

قسط : 19

وکرم سنگھ نے مجھے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ یکدم سارا بدن جھنجھنا گیا تھا۔ کچھ لمحوں تک تو جواب ہی نہیں بن پڑا۔ سارا کھیل بدل گیا تھا۔ چہرے کی تبدیلی، اتنا الٹ پھیر سب بیکار ہوگیا تھا۔ اب کوئی جھوٹ مضحکہ خیز تھا اور یہ تسلیم کرنا ضروری تھا کہ سامنے کوئی بڑی چیز براجمان ہے۔

''کیا بیماری ہے میرے پیارے ڈاکٹر کو؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے نہیں تھی، اب ہوگئی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے نہیں پیارے دوست! سب ٹھیک ہے، فکر مت کرو۔'' اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''میں خود کو بڑی چیز سمجھ کر آیا تھا لیکن اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔''

''واپسی کی جلدی تو نہیں ہے؟'' وہ بولا۔

''بالکل نہیں!''

''تو پھر کل پر رکھتے ہیں، کل رات کو بھوجن کے بعد نو بجے ٹھیک رہے گا؟''

''جی......!'' میں نے جواب دیا۔

''میں جانتا ہوں تم میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں ہو، ورنہ کبھی کے پاکستان واپس چلے جاتے اس لیے مجھ سے ملے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش نہیں کروگے۔''

''اٹھ جاؤں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں! کچھ دوسروں کو آنا ہے، ویسے بھی کل کی ملاقات تک ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں سوچ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور پھر میں وہاں سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ ان دونوں افراد نے مجھے واپس مہمان خانے میں پہنچا دیا تھا۔ واپس آیا، ذہن کی سنسناہٹ تیز ہوگئی تھی، پورے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھا لیکن عام آدمی نہیں تھا، اس کے پاس پوری گیان شکتی تھی۔ کیا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکوں گا؟ اعظم علی نے میرے چہرے کو تبدیل کیا تھا، میں واقعی اس طرح بدل گیا تھا کہ آئینہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی لیکن یہ تبدیلی وکرم کے سامنے بے اثر ہوگئی تھی۔ اب کیا کروں؟ بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن کوئی فیصلہ نہیں کرسکا۔ پھر ذہن کو آزاد چھوڑ دیا کہ جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

دوسرے دن کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، البتہ میں وکرم سنگھ کے پاس آنے والوں کو دیکھتا رہا تھا۔ ایک سے ایک شاندار کار تھی، کئی گاڑیوں پر فلیگ بھی لگے ہوئے تھے اور وہ پوری سیکورٹی کے ساتھ آئے تھے۔ اس سے وکرم سنگھ کے تعلقات کا اندازہ ہوتا تھا، نیز یہ کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور بہ آسانی مجھے پولیس کی تحویل میں دے کر اپنے نمبر بنا سکتا تھا۔

رات کا کھانا مجھے حسب معمول حاصل ہوگیا۔ اس سے ایک بات میرے ذہن میں آئی کہ وکرم سنگھ کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا کہ میرا کھانا کہاں سے آرہا ہے۔ خیر نو بجے وہ دونوں مجھے لینے آگئے اور کچھ دیر کے بعد میں وکرم کے پاس پہنچ گیا۔

''کہو ڈاکٹر! کیسا دن گزرا؟''

''عام سا!'' میں نے جواب دیا۔

''پریشان تو نہیں رہے؟''

''کس بات سے......؟''

''تمہارا چہرہ بدل کر یہاں آنا تمہارے کام نہیں آیا، میں نے تمہیں ایک نگاہ میں پہچان لیا، خوف زدہ تو نہیں ہو؟''

''خوف زدہ......؟'' میں ہنس پڑا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر پھر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور بولا۔ ''ہاں! میں جانتا ہوں تم ایسے ہی نہیں جے ہوئے، خیر میں تم سے تمہاری شکتی کے بارے میں نہیں پوچھوں گا، ایسے ہی تو اس شنکھا کو نہیں نچار ہے جو کالی پنتھ سے ہے۔'' اس نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔

''کس کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بھوریا چرن کی!'' وہ فوراً بولا۔

''کافی معلومات حاصل ہیں آپ کو وکرم جی میرے بارے میں۔''

''ہاں! لیکن تم سے دوستانہ بات کرنا چاہتا ہوں، کیا بھوریا چرن کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟''

''کیا اس کے یہاں مل جانے کا امکان تھا؟'' میں نے الٹا سوال کردیا۔

''شاید تم نے یہ سوچا ہو۔''

''آپ نے مجھے پہچان کر واقعی حیران کردیا تھا، میں نے سوچا کہ ظاہر ہے یہ مقام آپ کو یوں ہی نہیں حاصل ہوا ہوگا، آپ کے پاس کوئی قوت ضرور ہوگی۔''

''ہاں! میں تمہیں اس بارے میں بتانا چاہتا ہوں اور تمہارے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ تم بھی کسی بڑی شکتی کے سہارے پورے ہندوستان میں دندناتے پھر رہے ہو، شکر کرو کہ مجھ سے تمہاری تلاش کے لیے نہیں کہا گیا ورنہ تم بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔''

''وہ کیوں......؟''

''میں تمہارے مقابلے پر نہیں آنا چاہتا۔''

''اوہ! احسان مانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔''

''بتائیں گے؟''

''ہاں! میں تمہیں وجہ ضرور بتاؤں گا، آرام سے بیٹھو تم دوستوں کے بیچ ہو۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا۔

وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر گلا صاف کر کے بولا۔ ''میں تمہیں ایک کتھا سنا رہا ہوں، یہ کتھا یویودھن اور چندر برج کی ہے، رانی ویروتی، راجہ چندر برج کی دھرم پتنی تھی، وہ بیاہ کے چودہ سال تک بے اولاد رہی...... پتی، پتنی دونوں بڑے بے کل رہتے تھے، پھر وہ ایک بہت بڑے جادوگر یویوراج کے دوار گئے اور ان سے سنتان دان مانگا...... یویودھن نے کہا کہ ٹھیک ہے تمہیں اپنی سنتان میں سے ایک یویودھن کو دینی ہوگی۔ انہوں نے وعدہ کرلیا اور ان کے ہاں بیک وقت دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں، ایک آکاش پر کھلے چندر ماجیسی روشن اور دوسری اماؤس کی رات جیسی کالی! رانی ویروتی جانتی تھی کہ چندر برج بڑا حسن پرست ہے، اس کالی بٹی کو دیکھ کر بہت ناراض ہوگا۔ ویروتی نے رازداروں کو تیار کرلیا کہ وہ کالی لڑکی کو جنگل میں پھینک آئیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ یویودھن سے کیا وعدہ پورا کرے گی تو یویودھن ضرور خوبصورت لڑکی مانگے گا۔ سو اس نے سوچا کہ آئندہ جو سنتان پیدا ہوگی، اسے دے کر وچن پورا کردے گی۔ اس کے رازدار کالی لڑکی کو جنگل میں پھینک آئے لیکن یویودھن سب جانتا تھا۔ اسے ضرورت ہی کالی لڑکی کی تھی سو وہ اسے اٹھالے گیا اور اسے جادو سکھانے لگا۔ اس نے اسے جانوروں کا خون پلا کر پالا اور اپنے سارے منتر اسے سکھا دیئے، یوں کالی دیوی وجود میں آئی۔ دوسری بیٹی کندھاری بڑی ذہین اور سمجھدار تھی، اس نے بڑے بڑے علم سیکھے اور کالی اس سے جلنے لگی۔ اس نے کندھاری پر بڑے بڑے وار کیے مگر کندھاری کو وشنو بھگوان نے اپنے سائے میں لے لیا اور وہ محفوظ رہی، میرا تعلق کندھاری پنتھ سے ہے۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''آپ نے کندھاری پنتھ کے علم سیکھے ہیں؟''

''ہاں! انہیں وشنو مان کرمان کہتے ہیں۔''

''کیا یہ بھی جادو ہے؟''

''جادو کے معنی تو بہت وسیع ہیں، اس کی لاکھوں قسمیں ہیں، آنکھ کا جادو، آواز کا جادو، حسن کا جادو......! انہیں گنا بھی نہیں جاسکتا۔''

''ایک سوال کرنا چاہتا ہوں وکرم جی!''

''ہاں، کرو۔''

''لوگ آپ کو ایک ظالم جادوگر سمجھتے ہیں۔''

''میں کندھاری پریوار سے تعلق ضرور رکھتا ہوں لیکن اس پریوار میں بھی سب با نکے نہیں ہوئے، سب کی کہانیاں الگ الگ ہیں، دکھ سکھ سب کے ساتھ رہے، میری دو پیڑیاں بھی دکھوں کی ماری رہیں اور ان پر بڑے ظلم ہوئے ہیں، میں نے بھی بڑے ظلم برداشت کیے تب کندھاری پنتھ کے ایک جوگی مہاراج نے مجھے اپنی چھاؤں میں لے لیا اور مجھے اپنے سارے علم سکھا دیئے مگر میرے من میں بڑا کرودھ تھا، میں نے سب کچھ حاصل کیا اور بہت سوں کے کام آیا مگر ماضی کے داغ میرے من کو کالا کر چکے تھے، مجھے اپنی مخالفت بالکل برداشت نہیں ہوتی، کوئی مجھ سے ذرا بھی منحرف ہو، میں اس کا دشمن بن جاتا ہوں، بس ورنہ میں لوگوں کے کام بھی آتا ہوں۔''

''تب آپ برے انسان تو نہ ہوئے، ایک اور سوال کروں؟'' میں نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا۔ ''بار بار یوں کیوں کہتے ہو، من چاہے جتنے سوال کرو، ہر منش کے اندر دوسرا منش اوش ہوتا ہے، وہ دوسرا منش حالات کا قیدی ہوتا ہے، وہ اس قید خانے سے باہر جھانکنا چاہتا ہے مگر اس کا جھوٹ اس سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے، وہ اسے کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا کیونکہ اس طرح اس کے پردے کھلتے ہیں جھوٹے مگر خوبصورت پردے! جن کے پیچھے جھوٹ کا اصل چہرہ چھپا ہوتا ہے مگر جب اندر کے منش کو موقع مل جاتا ہے تو اسے سب سے اچھا وہ لگتا ہے جو اسے دیکھ رہا ہو، اس کا غم سننا چاہتا ہو۔''

''آپ نے بھوریا چرن کے بارے میں مجھ سے پوچھا تھا۔''

''ہاں......!''

''آپ کو میرے اور اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

''نہ صرف اس کے اور تمہارے بارے میں بلکہ اس کے اور تمہارے پتا کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہے۔''

''آپ کی عمر کتنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مسکرا دیا۔ ''میں جانتا تھا تم یہ سوال ضرور پوچھوگے، میری عمر اتنی نہیں ہے کہ مجھے اس کے اور تمہارے پتاجی کے بیچ کی پرانی باتیں معلوم ہوں لیکن اپنے دشمن کے بارے میں سب کچھ پتا رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ منش کبھی بھی مار کھا جاتا ہے۔''

''دشمن......!'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں! بتا چکا ہوں تمہیں، وہ کالی پنتھ سے ہے اور میں کندھاری پنتھ سے......! وہ کالی پنتھ کا کھنڈولا بننا چاہتا ہے جبکہ میں کندھاری پنتھ کا اکیلا کرم چاری ہوں، اگر وہ کھنڈولا بن جائے گا تو سب سے پہلے مجھے ختم کرے گا، سو میں نہیں چاہتا کہ وہ کھنڈولا بنے اور تم آج تک اس کے راستے کی رکاوٹ رہے ہو، اس سے پہلے تمہارے پتا نے اس کا کریا کرم کردیا تھا اور اس سے شنکھا شکتی بھی چھن گئی تھی جو اس نے بڑی مشکل سے دوبارہ حاصل کی۔''

میرا دل ایک دم خوش ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وکرم سنگھ میرا دشمن نہیں ہے اور مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''آپ یہ پوچھیں گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

''ہاں! کیونکہ میری شکتی مجھے نہیں بتا سکی، اسی لیے میں نے پوچھا تھا کہ کیا یہاں تم بھوریا کی تلاش میں آئے ہو۔''

''کیا بھوریا یہاں مل سکتا تھا؟''

''کبھی نہیں!''

''اب یہ ضروری نہیں ہے کہ میں آپ سے اپنے یہاں آنے کا مقصد چھپاؤں۔''

''بتاؤ مجھے!''

''ایک شخص آپ کے پاس ہے، میں نہیں جانتا کہ آپ اس سے کیوں ناراض ہوئے لیکن اس کی بیوی جسے میں اپنی بہن کا درجہ دیتا ہوں، اس کی جدائی میں پاگل ہوگئی ہے، میں یہاں اس کی رہائی کے لیے آیا ہوں۔''

''کون ہے، کیا نام ہے؟''

''امان اللہ!''

''امان اللہ...... امان اللہ! اچھا وہ پولیس آفیسر، ہاں میرے پاس ہے، اس نے میری بات ماننے سے انکار کردیا تھا، ایک وزیر نے ایک بندے کو قتل کے کیس سے نکالنے کی ہدایت کی تھی، میں نے اسے سمجھایا، رشوت کی پیشکش بھی کی مگر نہیں مانا اور اس بندے کو موت کی سزا ہوگئی، بس میں نے اسے اٹھوالیا، ایسے بہت سے بندے میرے ذاتی قید خانے میں موجود ہیں، ویسے ان لوگوں سے تمہارا کیا سمبندھ ہے؟ میرا مطلب امان اللہ کے گھر والوں سے......؟''

''جو انسان کا انسان سے ہوتا ہے۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

''اس دور میں کسی انسان کا کسی انسان سے کوئی سمبندھ نہیں رہا، سب غرض کے پتلے ہیں، تم میرے کام آؤ، میں تمہارے کام آؤں گا۔''

''کیا آپ اسے آزاد کرسکتے ہیں میرے کہنے سے؟''

''نہ صرف آزاد کردوں گا بلکہ تمہیں سرحد پار بھی کرادوں گا، یہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔''

''مجھے اس کے بدلے میں کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''کچھ نہیں! اپنا کام تم کر چکے ہو، تم نے بھوریا چرن کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے ہیں، تم نے اسے دوبارہ ہاتھ، پاؤں حاصل کرنے سے محروم کردیا ہے، اب تو تم انعام پانے کے دور میں آچکے ہو۔''

میرا سر چکرا گیا تھا۔ اسے تو میرے بارے میں سب معلوم تھا۔ اس نے شاید میرے چہرے سے میری حیرت کا اندازہ لگا لیا اور بولا۔ ''کندھاری پنتھ کو بڑی شکتی حاصل ہے اور پھر دشمن سے ہوشیار رہنا بھی ضروری ہوتا ہے، میں اس کے ہر عمل سے باخبر رہتا ہوں۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''کلکتے میں۔ کالی دیوی کے نواس کے نیچے تہہ خانے میں جہاں کوئی نہیں جاسکتا، مسلمان اس لیے نہیں کہ وہ جگہ اس کے نزدیک ناپاک ہے، ہندو اس لیے نہیں کہ وہ کالی ماتا کے کرودھ کا شکار ہوجائے گا، تمہیں بھی میں بتاؤں، وہاں جانے کی کوشش مت کرنا، اس کے خلاف جو کرنا چاہو، اس کے لیے اس کے باہر آنے کا انتظار کرنا، ویسے میں تمہیں مشورہ دوں کہ اب اسے من سے جھٹک دو، ہوسکتا ہے ایک بار پھر اس سے شنکھا شکتی چھن گئی ہو کیونکہ وہ شکتی پانے کے بعد دوبارہ بھاگن نہیں جاسکتا بلکہ تمہارے ہاتھوں اسے ہار ہوئی۔''

''اف......!'' میں نے گہری سانس لی۔ ''آپ کو اس حد تک معلومات حاصل ہیں؟''

''ہاں! میں اس کے بارے میں سب جانتا ہوں، یہ میری ضرورت ہے۔''

''آپ امان اللہ کو میرے حوالے کردیں گے؟''

''سمجھو کردیا بلکہ میں تم سے اتنا خوش ہوں کہ اس وقت میرے قید خانے میں چھ منش اور ہیں ان سب کو تمہارے نام پر چھوڑ دوں گا۔'' اس نے کہا تو میرا دل خوشی سے منور ہوگیا۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

''ابھی تمہیں جلدی نہ ہو تو کچھ دن میرے پاس مہمان رہو، میرے اس گھر میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے!''

''آپ اس قدر تعاون کر رہے ہیں تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ امان اللہ کو رہا کر کے میرے حوالے کردیں، میں اسے جلد سے جلد اس کے گھر پہنچا دینا چاہتا ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی! آج رات تو یہاں گزارو اور ہاں پاکستان جانے کے بارے میں کیا سوچا؟''

''ابھی مجھے کچھ اور کام کرنے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بہادر آدمی ہو، حکومت کی جانب سے فورسز کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ جونہی تم نظر آؤ، تمہیں ہلاک کردیا جائے۔''

''ہم زندگی کو اپنے رب کی امانت سمجھتے ہیں، وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے لے، اس سے کیا خوف زدہ ہونا۔'' میرے جواب پر وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

وہ رات میں نے اس کی اس محل نما حویلی میں گزاری۔ ساری رات نفل پڑھتا رہا تھا۔ مجھے ذرہ برابر کوئی خوف نہیں تھا، بس یہ خوشی تھی کہ میرا مشن پورا ہوجائے بشرطیکہ اس شخص کے دل میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ مجھے ایک خوبصورت کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔

صبح کو ایک ملازم نے آکر پوچھا۔ ''ناشتہ آپ کمرے میں کریں گے یا مہاراج کے پاس...... ویسے وہ صبح ناشتہ نہیں کرتے، گرمی یا سردی، بس صرف ٹھنڈائی پیتے ہیں۔''

''میرا ناشتہ میرے کمرے میں پہنچا دو۔'' میں نے کہا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ مجھے وکرم سنگھ کے ساتھ ناشتے کے لیے نہیں جانا پڑا اور نہ کوئی اور ترکیب سوچنی پڑتی۔ ناشتہ آگیا، میں نے اسے احتیاط سے ضائع کردیا اور اپنے ناشتے کا انتظار کرنے لگا جو پورے راز کے ساتھ مجھ تک پہنچا دیا گیا تھا۔

دن کو گیارہ بجے میں نے ایک نوکر کے ہاتھ وکرم سنگھ کو پیغام بھیجا کہ میں جانا چاہتا ہوں۔ دن میں شاید اس کی کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی، چنانچہ اس کی طرف سے بلاوا آگیا اور میں نوکر کے ساتھ چل پڑا۔

وکرم سنگھ کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس نے میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ کچھ دن روکنے کی کوشش ضرور کرتا ڈاکٹر صاحب! لیکن اتفاق سے مجھے پردھان منتری کا بلاوا آگیا ہے، مجھے دہلی جانا ہے اس لیے میں تمہیں وداع کر رہا ہوں، بڑا آنند ملا ہے تم سے مل کر اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ اگر پاکستان جانا چاہو تو میرے پاس اس کے لیے انتظام ہے۔ خیر، جب بھی یہاں آنا چاہو، آجانا میں تمہارا من سے سواگت کروں گا۔''

''آپ کا شکریہ وکرم سنگھ!''

''آؤ میں تمہیں قیدیوں کے پاس لے چلوں۔'' محل نما عمارت کے طویل کوریڈور طے کر کے ہم ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں داخل ہوئے جہاں چار بندے بیٹھے ہوئے چرس پی رہے تھے۔ چرس کی ناگوار بو ہال میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چاروں بری طرح بدحواس ہوگئے اور ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

وکرم سنگھ نے خونی نظروں سے انہیں دیکھا پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''کھولو۔''

وہ جلدی سے ایک جگہ پہنچے اور سب کے سب مل کر ایک دیوار میں لگا گول اسٹیئرنگ جیسا پہیہ گھمانے لگے۔ دیوار میں ایک سنگی دروازہ بے آواز کھل گیا جس سے نیچے تہہ خانے میں جانے والی سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ وکرم سنگھ نیچے اترنے لگا۔ تہہ خانہ بہت وسیع تھا، اس میں بہت سے لاک اپ نما کمرے بنے ہوئے تھے جو آمنے سامنے تھے۔ ان میں لگے ہوئے جنگلوں کے پیچھے قیدی ویران چہروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

قیدیوں کے چرسی محافظوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے، وہ بری طرح سہمے نظر آرہے تھے۔ وکرم سنگھ نے انہیں اشارہ کر کے کہا۔ ''کھولو انہیں!''

''کک...... کسے مہاراج!'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''سب کو......!'' وکرم سنگھ بولا۔ وہ ایک لمحے کو حیران ہوئے، پھر بے حواسی سے لاک اپ کے تالے کھولنے لگے۔ جو قیدی بیٹھے ہوئے تھے، وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

''باہر آجاؤ تم سب!'' وکرم سنگھ نے کہا اور وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔ وکرم نے انہیں دوبارہ باہر آنے کے لیے کہا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آگئے۔ وکرم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''تم اندر جاؤ۔'' وکرم کے ساتھی اس کا مطلب نہیں سمجھے تھے، وہ کھڑے اس کا منہ دیکھتے رہے، تب وکرم نے کڑک کر کہا۔ ''بہرے ہوگئے ہو تم لوگ! اندر جاؤ۔'' اس بار وہ سب ایک لاک اپ میں گھس گئے تب وکرم سنگھ نے خود آگے بڑھ کر اس لاک اپ کو تالا لگا دیا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''چرس پی رہے تھے تم لوگ، میرے مہمان کے سامنے میری بے عزتی کرادی، تین دن کی سزا دی جاتی ہے تم کو، پورے تین دن نہ تمہیں بھوجن ملے گا نہ پانی!''

وکرم کے ساتھی رونے گڑگڑانے لگے۔ وہ معافیاں مانگ رہے تھے لیکن وکرم سنگھ نے قیدیوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہاں سے نکل کر ہال کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے اور قیدیوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے قیدیوں سے کہا۔ ''یہ دیوتا آیا ہے تمہارے لیے، اس نے مجھ سے تمہارے جیون کے لیے سفارش کی ہے، اس کے کہنے سے تمہیں جیون دان کیا جارہا ہے ورنہ تمہیں بتا دیا تھا کہ یہاں سے صرف ہڈیوں کے سوکھے ڈھانچے جاتے ہیں جن کا کریا کرم بھی نہیں ہوتا۔ مگر تم خوش نصیب ہو، بھاگ والے ہو کہ ایک دیوتا نے آکر تمہاری جان بخشی کرادی، سنو! ہندوستان کے کسی کونے میں رہو، تمہیں وکرم سنگھ لوٹیا کا کوئی حکم ملے، اس کی تعمیل کرنا ورنہ جی نہیں سکوگے، ہندوستان کا اصل راجہ میں ہوں وکرم سنگھ لوٹیا، پنتھ کندھاری۔''

ان میں سے کچھ خوشی سے چیخنے لگے، کچھ نے جھک کر میرے پیر چھوئے لیکن میں ان میں سے ایک کو دیکھ رہا تھا، وہ جس کی تصویر معجزاتی طور پر میں نے ساگی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ یہ پیتم تھا، میں نے اسے فوراً پہچان لیا، میرے دل میں ایک دم ہیجان پیدا ہوا، دماغ میں ہلچل مچ گئی۔

وکرم سنگھ قیدیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی چیخ وپکار پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باہر آکر اس نے کہا۔ ''امان اللہ کو تم اپنے ساتھ لے جاؤگے؟''

''ہاں اور اسے بھی......!'' میں نے پیتم کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ایک گاڑی ڈرائیور کے ساتھ دیئے دیتا ہوں، یہ تمہیں تمہارے ٹھکانے پر پہنچا دے گا، میں دہلی جارہا ہوں اور سنو دوست! وکرم سنگھ تم جب بھی آؤگے دل سے تمہارا سواگت کرے گا، پاکستان جانا چاہو گے تو تمہارے لیے بندوبست کردے گا۔''

وکرم سنگھ نے مجھ سے پیتم کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ دوسرے قیدی مجھے دعائیں دیتے چلے گئے اور میں امان اللہ اور پیتم کو لے کر چل پڑا۔ راستے میں، میں نے پیتم سے پوچھا۔ ''وکرم سنگھ نے تمہیں کیوں پکڑا تھا؟''

''منہ ماری ہوگئی تھی ہماری!'' پیتم نے جواب دیا۔

''وکرم سنگھ سے......؟''

''نہیں! اس کے ڈرائیور سے، ہم چندوسی آئے تھے دکان کے لیے مال لینے، اس نے ہمیں اپنی گاڑی سے ٹکر ماری، ہم نے اسے گالیاں دیں، وکرم پیچھے بیٹھا تھا، دوسری گاڑی میں اس کے باڈی گارڈ تھے، انہوں نے ہمیں پکڑ کر گاڑی میں بٹھا لیا اور ہمیں یہاں لا کر بند کردیا بس......!''

''اپنے گاؤں میں تمہیں کوئی یاد آتا ہے؟''

''ہاں!''

''کون......؟''

''ماں ہے ہماری، بس......!''

''جاؤگے ماں کے پاس......؟''

''ہاں! تم ہمیں کہاں لے جارہے ہو؟''

''فکر مت کرو، تمہیں ماں کے پاس لے جاؤں گا، بس تھوڑا سا وقت دو۔''

آخرکار ہم چندوسی پہنچ گئے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ڈرائیور کو احمد خاں یا اعظم کا پتا نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کسی کا کوئی بھروسہ نہیں، کبھی لوٹیا میری تلاش میں یہاں نہ آجائے، اس لیے میں نے احمد خاں کے گھر سے دور گاڑی رکوائی اور نیچے اتر کر ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو میں نے امان اللہ سے کہا۔ ''امان اللہ! تم مجھے احمد خاں کے گھر لے جاؤگے، مجھے راستہ نہیں آتا، احمد خاں کو جانتے ہو؟''

''ہاں! جانتا ہوں لیکن آپ......؟ میرا مطلب ہے میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''تم گھر ہی جاؤگے لیکن ہمیں احمد خاں کے گھر پہنچا دو۔''

''ٹھیک ہے آئیے!'' اس نے کہا اور چل پڑا۔ پیتم سنگھ معصوم سا نوجوان تھا۔ وہ کسی بات میں تعرض نہیں کر رہا تھا، چنانچہ ہم احمد خاں کے گھر پہنچ گئے۔

احمد خاں گھر پر موجود تھا۔ مجھے اور امان اللہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ امان اللہ کے بجائے مجھ سے بغلگیر ہوگیا اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بولا۔ ''مولا کی قسم! میں نے اعظم سے کہہ دیا تھا ڈاکٹر صاحب کہ بس امان اللہ آیا ہی آیا، بہت بڑے آدمی نے وعدہ کیا ہے، کوئی معمولی بات تھوڑی تھی، میں اعظم کو فون کرتا ہوں۔''

''میں گھر چلا جاؤں؟'' امان اللہ بے صبر ہو رہا تھا۔

میں نے اسے جانے کی اجازت دیدی، پھر میں نے احمد خاں سے کہا۔ ''یہ ایک سکھ نوجوان ہے، پیتم سنگھ نام ہے، حسے پور میں رہتا ہے، یہ بھی لوٹیا کا قیدی تھا، میں اسے حسے پور لے کر جاؤں گا۔''

''آپ اجازت دو تو میں خود چلا جاؤں گا صاب جی!'' پیتم سنگھ بولا۔

''میں خود تمہیں ساگی کے حوالے کروں گا، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔

احمد خاں نے ہمارے لیے کھانے پینے کے انبار لگا دیئے۔ کئی گھنٹے گزر گئے، پھر اعظم اور اس کے پورے اہل خاندان آگئے۔ اعظم کی بہن آسیہ نے بھاگ کر میرے پاؤں پکڑے تو میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''نہیں آسیہ بہن! بھائی اگر بہن کے لیے کچھ کریں تو ان کے پاؤں نہیں پکڑتے، یہ بہنوں کا حق ہے۔''

''آہ! خدا نے میری رہنمائی کی، میں دولہا بابا کے مزار پر جا کر اپنی بہن کی خوشیاں مانگتا نہ آج میرے گھر میں یہ خوشیاں آتیں، میں مزار پاک پر فاتحہ خوانی کے لیے جاؤں گا۔''

''ہم کچھ دیر کے بعد حسے پور چلیں گے پیتم!'' میں نے کہا۔

''آپ بھی......؟'' اعظم نے حیرت سے کہا۔

''ہاں! کیوں......؟''

''نہ جاتے تو اچھا تھا، چلیں ٹھیک ہے، آپ کا چہرہ بدلا ہوا ہے مگر آپ زیادہ وہاں نہ رکیں، میرے پاس آجائیں پھر کچھ کریں گے لیکن احتیاط رکھیں، خاص طور سے گاؤں والے دوبارہ پولیس کو خبر کرسکتے ہیں، دھونی لال بہت ذلیل ہوا ہے آپ کو گرفتار کرانے میں ناکام ہو کر۔''

اعظم اس لیے مطمئن تھا کہ اس نے میرا چہرہ بدل دیا تھا۔ وہ خود مجھے لاری اڈے چھوڑنے آیا۔ کسی اور طریقے سے حسے پور جانے سے میں نے انکار کردیا تھا۔ ہم نے شہر ہی سے پھول وغیرہ لے لیے تھے۔ میں وہاں شکرانے کے نفل پڑھنا چاہتا تھا۔ جب ہم حسے پور پہنچے تو مغرب کا وقت نکل چکا تھا۔

مجھے مزار کا راستہ معلوم تھا۔ مزار پر پہنچا تو گہری تاریکی پھیل چکی تھی۔ پیتم ڈر رہا تھا لیکن میری وجہ سے اسے ڈھارس تھی۔ وہ مزار سے کچھ فاصلے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور وقت گزرنے کا اندازہ بھی نہیں ہوسکا۔ رات گہری ہوگئی۔ میں سب کچھ بھول کر نفل پڑھتا رہا، پھر مجھے پیتم کا خیال آیا اور میں چونک پڑا۔ اس کی کوئی آہٹ بھی نہیں ہورہی تھی جبکہ وہ پہلے یہاں کے ماحول سے بہت خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے مقامی تھا اور بندو مجھے بتا چکا تھا کہ یہاں دن میں بھی لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ یہاں جن نماز پڑھنے آتے ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر پیتم کی تلاش میں چل پڑا، وہ مجھے نظر آگیا۔ ایک درخت کے نیچے زمین پر پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے تنفس کا جائزہ لیا، پھر ایک جگہ آبیٹھا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک طرف بیٹھ کر کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

میری آواز کے جواب میں خاموشی رہی۔ مجھے شرمندگی ہوئی تھی۔ میرے لیے کچھ کھانے کو نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی۔

رات کے بارہ بج گئے کہ اس احاطے میں قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں اور میں سمجھ گیا کہ درس کا آغاز ہونے لگا ہے۔ میں خود بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر درس کی جگہ پہنچنے والا تھا کہ ایک طرف سے روشنی چمکی اور بار بار چمکنے لگی، پھر ایک آواز ابھری۔ ''روشنی کی جگہ آجاؤ۔''

یہ ہدایت مجھے دی گئی تھی چنانچہ میں حیران حیران چلتا ہوا روشنی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں ایک پتھر کی سل پڑی ہوئی تھی۔ روشنی کے جھماکے کر کے مجھے اسی کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو آواز ابھری۔ ''بیٹھ جاؤ کامران!'' اور میں بیٹھ گیا۔ تب ایک دوسری آواز ابھری۔ ''ڈاکٹر کامران! دولہا بابا کے دربار میں تمہارا انتظار کیا جارہا تھا، تمہاری حاضری کے لیے یہی جگہ منتخب کی گئی تھی، بیشک ڈاکٹر کامران! تم آدم زاد ہو اور آدم زاد خطا کا پتلا ہے لیکن اگر وہ اپنے عمل میں مخلص ہے اور دیانتداری سے اپنے فرائض پورے کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کی ان خامیوں سے آگاہ کردیا جائے جو اس کے اندر باقی رہ گئی ہیں۔ تم نے آج تک اس شیطان زادے کے خلاف عمل کر کے اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے، اپنے باپ مسعود احمد کی نسبت تمہیں ذرا بھی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مسعود نے صرف نو جوانی کی عمر کے تقاضوں سے متاثر ہو کر دولت کی خواہش کی تھی لیکن جب وقت کے ترازو میں دولت کے بدلے اس کے ایمان کو رکھا گیا تو اس نے دولت کو لات ماردی اور نتیجے میں ساری زندگی عذاب میں گزار دی لیکن اپنے ایمان کو داغدار نہیں ہونے دیا، باپ کی نیکیوں کا صلہ اولاد کو بھی ملتا ہے، اس بات کو سخت ناپسند کیا گیا کہ تم نے وکرم سنگھ سے ملنے کے لیے اپنے چہرے کو مصنوعی طریقے سے تبدیل کرنے کی اجازت دی، کیا اس سے پہلے تمہیں اسی چہرے کے ساتھ تحفظ نہیں دیا گیا، کئی معاملات میں تم نے ایمانی تنزل کا ارتکاب کیا ہے، چنانچہ تمہارے لیے کچھ فیصلے کیے گئے ہیں، تمہیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ایک حصہ یہ کہ تم نے اپنی مشقت سے بابا پردہ پوش کے بتائے ہوئے کچھ عملیات کی مشق کی ہے، انہیں استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی، اب تم ان کے استعمال کے لیے آزاد ہو لیکن ان کے استعمال کے نیک وبد کا فیصلہ تمہیں خود کرنا ہوگا، غلطی کرنے کا نقصان خود بھگتوگے، تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔ دوسرا حصہ یہ کہ تمہیں ملنے والی ہر دعا کی قبولیت کے لیے مجلس دعا کرے گی، تم نے سب کچھ سن لیا، کچھ کہنا، کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟''

''ہاں......!'' میرے منہ سے آواز نکلی۔

''پوچھو......؟''

''اگر میں اپنی ناسمجھی میں کیے گئے گناہوں کا ازالہ کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو کیا کبھی کوئی مقام مل سکتا ہے؟''

میرے ان الفاظ پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ممکن ہے وہاں سوچا جارہا ہو گا کہ میں رو رو کر معافیاں مانگوں گا لیکن میرا موقف کچھ اور تھا۔ آج تک میں نے جو کیا تھا، نیک ارادوں اور اچھا عمل سمجھ کر کیا تھا، اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے رہنمائی ملنی چاہیے تھی، روکا جانا چاہیے تھا، میں نے سرکشی تو نہیں کی تھی، یہ سرزنش سخت تھی۔ میرے اندر بغاوت نہیں، دکھ تھا۔

یہ خاموشی پھر نہ ٹوٹی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے احساس ہوگیا کہ اب میں یہاں تنہا ہوں، وہ سب جاچکے ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا، ٹہلتا ہوا اس جگہ آگیا جہاں پیتم جوانی کی گہری نیند سو رہا تھا۔ میں اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا، پھر مجھے کچھ خیال آیا۔ اعظم علی مجھے میک اپ اتارنے کا عمل سکھا چکا تھا۔ میں نے اپنے چہرے سے پلاسٹک کے وہ ٹکڑے اتار کر پھینک دیئے، اپنا چہرہ بری طرح رگڑ ڈالا۔ اب میں اپنی اصلی شکل میں تھا پھر میں زمین پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے فوراً ہی نیند آگئی۔ صبح کو اس وقت جاگا جب سیدھا سادا پیتم مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔

''بھور ہوگئی ڈاکٹر جی!'' اس کی آواز ابھری۔

میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''ارے پیتم...... تم جاگ گئے؟''

''ہاں جی! سورج بھی نہیں نکلا تھا جب ہم جاگ گئے تھے۔''

''کیا کر رہے تھے اس وقت سے......؟''

''آپ کے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے، ماں بڑی یاد آرہی ہے صاب جی! اس کی خوشبو بسی ہے ہمارے گاؤں کی ہوا میں جی!''

''ارے تو تم چلے کیوں نہ گئے ماں کے پاس؟''

''نہ جی! آپ کے بغیر کیسے جاتے، آپ ہمارے لیے آئے ہو اور پھر آپ نے ہی تو ہمیں اس راکھشش سے چھڑایا ہے، آپ ہی کی وجہ سے تو اس نے ہمیں چھوڑا ہے ورنہ اس کی قید سے منش پنجر بن کر ہی نکلتا ہے۔''

''چلو...... پھر چلیں!''

''چلیں۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''میری ماں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی، بہت اچھی ہے میری ماں، بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے، میں کھو گیا تھا پتا نہیں اس کا کیا حال ہوگا، چلیں جی......؟''

ہم مزار سے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر پیتم نے کہا۔ ''رات کو تو ہماری جان ہی نکل رہی تھی، یہاں جن نماز پڑھنے آتے ہیں، کوئی انہیں دیکھ لیتا ہے تو پاگل ہو کر مر جاتا ہے، ہمیں یوں لگا جیسے جن آرہے ہیں، ہم نے کہا جن پا، جی واہ گرو دی سوں، ہم تمہیں نہیں دیکھیں گے، تم ہمیں پاگل مت کرنا، یہ کہہ کر ہم نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں بس ڈاکٹر جی! آنکھیں بھینچے بھینچے ہمیں نیند آگئی، پھر صبح ہی آنکھ کھلی۔''

بڑا معصوم انسان تھا۔ سادگی اور ناآگہی بھی اللہ کا کتنا بڑا انعام ہوتی ہے۔ ہم آگے بڑھتے گئے اور صبح روشن ہوتی گئی، پھر ایک شخص نے ہم دونوں کو دیکھا اور اس طرح ہماری طرف دوڑا کہ کئی جگہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ ہمارے پاس آکر وہ منہ سے کچھ نہ بولا، پھر جس طرح آیا تھا، اسی طرح واپس دوڑا۔

''آگیا رے آگیا، پیتم آگیا۔ ساگی! تیرا پیتم آگیا، لے آیا رے لے آیا، ڈاکٹرا سے لے آیا۔''

پھر ایسی بھگدڑ مچی کہ مجھے ہنسی آنے لگی۔ ہمارے ساگی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے آدھا گاؤں ہمارے پیچھے تھا۔ ساگی کو بھی پتا چل گیا تھا۔ وہ خاموش دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی امرتا کھڑی تھی۔ دونوں پتھرائی ہوئی سی تھیں۔

پیتم ماں کو دیکھ کر بے قابو ہوگیا۔ وہ دوڑا اور ساگی سے لپٹ گیا۔ ساگی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ بے ہوش ہو کر گرنے لگی تو پیتم نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ مجمع اب میری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ لوگ میری جے جے کار کر رہے تھے۔ اسی وقت کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گھوم کر دیکھا، کوئی عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ لمبی سفید داڑھی، نورانی چہرہ! مجھے دیکھ کر بڑی نرمی سے بولے۔ ''میرا نام نصیب اللہ ہے۔''

''اوہ......!'' میرے منہ سے نکلا۔ میں نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔

وہ جواب دے کر بولے۔ ''ہر عمل من جانب اللہ ہوتا ہے، میری بہن شدید بیمار ہوگئیں، میں انہیں چھوڑ کر نہیں آسکا اور آخرکار وہ جاں بحق ہوگئیں لیکن یہاں یہی ہوا جو ہونا تھا، آیئے چلیں، آیئے تعرض نہ کیجیے۔''

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ لوگ ہمارے پیچھے چلے تو نصیب اللہ نے کہا۔ ''کچھ توقف فرمایئے، مہمان میرے ساتھ ہیں، آپ سے بعد میں بھی ملاقات ہوسکے گی۔''

لوگ رک گئے۔ کچھ دیر کے بعد ہم مسجد پہنچ گئے۔ مجھے حجرے میں لے جایا گیا۔ میں نے مجمع میں شکور اور بندو کو نہیں دیکھا تھا لیکن اب وہ سامنے آگئے اور مجھے سلام کیا۔

''شکور میاں! ناشتے کی ضرورت ہے۔'' نصیب اللہ بولے۔

''ابھی لایا۔'' شکور نے مستعدی سے کہا اور گھر کی جانب دوڑ گیا۔

''تو آپ ساگی کے پیتم کو لے آئے؟'' وہ مسکرا کر بولے۔

''احسان ہے رب کریم کا!'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے تفصیل پوچھنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اللہ کی مدد سے آپ نے بڑا کام کیا ہے، اس کے علاوہ جو کچھ آپ سے منسوب ہے، اس کے بارے میں بھی اللہ بہتر جانتا ہے، بستی کے ایک شخص نے ایک لاکھ کے انعام کے لالچ میں پولیس کو آپ کی نشاندہی کی تھی، پولیس یہاں سے ناکام ہو کر گئی لیکن کھیا سنگھ کو پتا چل گیا کہ حسے پور کے ایک مہمان کے ساتھ بدسلوکی کی گئی ہے تو کھیا سنگھ نے اسے پکڑوا کر تین دن گاؤں کے چوک میں درخت سے بندھوا کر سو جوتے روزانہ لگوائے اور پھر اسے اس کے خاندان سمیت حسے پور سے نکلوا دیا اور اس پر تاحیات یہاں آنے کی پابندی لگا دی۔''

''اوہ، افسوس......!''

''کھیا سنگھ بے حد انسان دوست شخص ہے، اس نے شاید دھونی لال ڈی ایس پی کے ساتھ سخت سلوک کیا تھا اور اسے چند گھنٹوں کے اندر حسے پور چھوڑنے کی ہدایت کردی تھی، جس کے بعد وہ چلا گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے حسے پور کے ایک ایک گھر اور آس پاس کے کھیت کھلیانوں کی زبردست تلاشی لی تھی۔''

نصیب اللہ باتیں کرتے رہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان سے پوچھوں کہ مجھے یہاں بلانے کی درخواست کس لیے کی گئی تھی لیکن پھر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

شکور ناشتہ لے آیا تھا۔ ناشتے کے بعد پیش امام صاحب نے مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی اور خود اندر مسجد میں چلے گئے۔ میں بستر پر لیٹ کر رات کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں کیوں دل میں ایک دکھن سی تھی۔ میں ایک کمزور اور حالات کا مارا ہوا انسان ہوں۔ مجھے جو کچھ عطا کیا گیا، وہ میری طلب نہیں تھی، بس ایک عطا تھی جو بہت عظیم تھی لیکن میں ایک معمولی آدمی ہوں، وہ سب بہت بڑے ہیں۔ مجھ سے ابھی بہت غلطیاں ہوں گی، اگر وہ ناقابل معافی ہیں تو مجھے موت کی سزا دیدی جائے۔ میں تو اپنے محور سے بہت دور ہوچکا ہوں، میرے لیے زندگی موت بے معنی ہے۔ مجھے پاکستان جانے کی پیشکش کی گئی ہے، زندہ رہا تو جاؤں گا، ابھی کسے جلدی ہے۔

نہ جانے کب نیند آگئی۔ آنکھ کسی طرح کے شور سے کھلی تھی۔ میں اس شور پر غور کرنے لگا۔ ٹین کا کنستر بجایا جارہا تھا، پھر کسی کی چیختی آواز سنائی دی۔

''حسے پور کے لوگو......! جو کچھ کہا جارہا ہے، غور سے سنو! حسے پور میں آنے والا مہمان ڈاکٹر کامران پورے حسے پور کا مہمان ہے، کاشی رام نے انعام کے لالچ میں پولیس کو اس کے بارے میں خبر دی، تم نے کاشی رام کا حشر دیکھ لیا، ہماری پرکھوں کی مان مریادا ہے کہ مہمان بھگوان سمان ہوتا ہے، اس کے بارے میں برا سوچنے والا اپرادھی ہے، سو غور سے سن لو، اب اگر کسی نے اس کی خبر پولیس کو کی تو پورا حسے پور اس کا دشمن ہوگا، جھگڑا اس کا اور حکومت کا ہے، جب وہ اپنی خوشی سے یہاں سے چلا جائے گا تب حکومت جانے اور وہ۔ حسے پور میں اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو ازتھ ہوجائے گا۔ یہ حکم کھیا سنگھ نمبردار کا ہے۔''

پوری کہانی سنا کر منادی کرنے والا آگے بڑھ گیا، پھر کہیں دور سے اس کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اسی وقت مسجد کے اندرونی دروازے سے آہٹ ابھری اور میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ آنے والے نصیب اللہ تھے۔ مسکرا کر بولے۔ ''کھیا سنگھ نے تمہارے لیے ڈونڈی پٹوائی ہے۔''

''میں نے سن لیا۔''

''میرے خیال میں غسل کرلو، شکور کھانا لے آئے گا، پھر ظہر کی نماز کا وقت ہوجائے گا۔''

''بہتر ہے، لیکن کھانے کی چنداں حاجت نہیں ہے۔''

''میں نے ہلکی کھچڑی کے لیے کہہ دیا ہے، تھوڑی بہت کھالینا۔'' نصیب اللہ نے کہا۔

غسل کر کے کھانا کھایا، پھر نماز پڑھنے چلا گیا۔ حسے پور کے مسلمان باشندے نماز کے بعد بڑے تپاک سے مجھ سے ملے۔

عصر کی نماز پڑھی گئی۔ اس وقت شام کے چھ بجے تھے جب حجرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھ سے پہلے پیش امام دروازے پر آئے اور انہوں نے دروازہ کھول کر دیکھا، پھر ان کی آواز ابھری۔ ''ارے نمبردار صاحب! آپ......؟''

''ہاں بزرگو! اپنے مہمان سے ملنے آئے ہیں۔''

''اندر تشریف لائیں گے؟'' نصیب اللہ نے پوچھا۔

''کون سی نئی بات ہوگی، ہمیشہ عید بقرعید تم سے ملنے آتے ہیں۔''

''آیئے!'' نصیب اللہ نے کہا اور نمبردار اندر آگئے۔ بہترین شخصیت کے مالک تھے۔ لمبا اونچا قد، ورزشی بدن، بارعب چہرہ جس پر بڑی بڑی مونچھیں، گونجدار آواز......! دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے پھر بولے۔ ''بھگوان کا شکر ہے کچھ لوگوں کی برائی کے باوجود آپ کو نقصان نہیں پہنچا ورنہ دولہا کی نگری میں ہمارا منہ کالا ہوجاتا، دولہا بابا کہتے کھیا سنگھ! تم ہمارے ایک مہمان کی حفاظت نہ کرسکے، ہم تمہاری پوری بستی کو سنبھالے ہوئے ہیں۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ...... کھیا جی!''

''اوتار ہو بھگوان کے، ساگی کے بیٹے کو ڈھونڈ لائے بڑی شانتی ہوئی ہے، تمہارے چرن چھونے کو جی چاہتا ہے۔''

''میں ایک گناہگار بندہ ہوں۔''

''یہی کہوگے، یہی کہوگے، ایک بنتی لے کر آیا ہوں، کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ اب کچھ دن میری مڑھیا کو رونق دیں، میرے ساتھ رہیں مگر آپ کو دین دھرم کے کاموں میں دقت ہوگی اس لیے نہیں کہتا، ہاں بنتی یہ ہے کہ کل رات کا بھوجن میرے گھر کریں، باہر حکیم احمد موجود ہے، چندوسی کا سب سے مشہور باورچی ہے، مسلمانوں کے کھانے یہی پکاتا ہے، ہم نے اسے بلا لیا ہے، کھانے اسی کے برتنوں میں پکیں گے، اسی کے برتنوں میں کھلائے جائیں گے، کوئی ہندو انہیں ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

بڑی متاثر کن پیشکش تھی۔ میں نے نصیب اللہ کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔ ''نمبردار صاحب دولہا بابا کے زبردست عقیدت مند ہیں، نومبر کے مہینے میں ان کا عرس کراتے ہیں، سات دن تک لنگر رہتا ہے، قوالیاں ہوتی ہیں، مسلمان باورچی بلوائے جاتے ہیں، لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔''

میں نے دعوت قبول کرلی تھی۔

نمبردار کے جانے کے بعد بہت دیر تک ان کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا۔ ''نمبردار صاحب اتنے صاحب حیثیت ہیں تو دولہا بابا کی درگاہ کیوں نہیں بنوادی؟''

''سب کچھ کر ڈالا تھا، نقشہ تک بنوالیا تھا مگر دولہا بابا کی طرف سے انکار ہوگیا، وہاں سے حکم ملا کہ مزار کو جوں کا توں رہنے دیا جائے، حکم عدولی نہ کی جاسکی۔''

رات گزر گئی۔ دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب نصیب اللہ سے اجازت لے کر ساگی کے گھر چل پڑا۔ بندو کو ساتھ لے لیا تھا۔ ساگی کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا، بستی کے لوگ آجارہے تھے۔ ساگی نے بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، بالکل ٹھیک نظر آرہی تھی۔ امرتا حسب معمول موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر عجیب طرح سے شرمانے لگی۔ اس کا چہرہ گلابی ہورہا تھا۔ پیتم میرے گلے سے آلگا۔

''آپ نے مجھے میری ماں سے ملا دیا مہاراج! واہ گرو آپ کو اپنی چھایا دے۔''

بہت سی باتوں کے بعد اچانک امرتا نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''ادھر آؤ میرے ساتھ آؤ۔''

میں اس کی بے باکی پر دنگ رہ گیا، تاہم اٹھ کر چل پڑا۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں طاق میں منت کا چراغ دیکھا تھا لیکن اب وہاں دو چراغ جل رہے تھے۔

''یہ دیکھو۔'' اس نے چراغوں کی طرف اشارہ کیا، پھر بولی۔ ''ان میں سے ایک ساگی کا ہے، وہ دولہا بابا کے مزار پر سات چراغ جلائے گی، دوسرا میں لائی ہوں تمہارے لیے......! جب میرا اتم سے دواہ ہوجائے گا تو ہم دونوں دولہا بابا کے مزار پر سات چراغ روشن کریں گے، میں نے منت مانی ہے۔''

(جاری ہے)

جادُو

ایم اے راحت

قسط : 20

میں ہکّا بکّا رہ گیا۔ کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھا، سوچا نداق کر رہی ہے، ایک بیباک مذاق......! لیکن اسے مذاق کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد کی پرچھائیاں رقصاں تھیں۔

معبودِ دو جہاں! یہ سب کچھ مجھے نہیں آتا، کوئی مجھ سے میری زندگی مانگ لے، دے دوں گا لیکن کسی کو، کسی معصوم دل کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرے کانوں میں امرتا کے الفاظ سنسنا رہے تھے۔

''دوسرا چراغ میں لائی ہوں، تمہارے لیے! جب میرا واہ تم سے ہو جائے گا تو ہم دونوں دولہا بابا کے مزار پر سات چراغ روشن کریں گے، میں نے منت مانی ہے۔''

میں نے اس کے معصوم چہرے کو دوبارہ دیکھا۔ وہ چراغوں کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے کھڑی تھی، تب میرا ایک ہاتھ آگے بڑھا۔ میں نے چراغ کو چھوتے ہوئے دل میں کہا۔ ''دولہا بابا! میری منت ہے کہ اس کے معصوم دل سے میری محبت کا یہ احساس دور کر دیں، اس کا انداز بدل دیں، یہ مجھے ایک بھائی کے انداز میں سوچے، میری یہ آرزو پوری کر دیں۔''

اسی وقت سانگی اور پتیم اندر آ گئے۔ ''اب باہر آ جا امرتی! کیوں ڈاکٹر جی کو پریشان کر رہی ہے؟''

''آ گیا تو جل ککڑے......! ڈاکٹر جی میرے ہیں، میں نے انہیں بھیجا تھا تیری تلاش میں، کیا سمجھا!''

''سمجھ گیا، مگر کچھ جل پانی تو کرا ڈاکٹر جی کو۔''

''ایں...... ہاں...... ہائے دیا! میں تو بھول ہی گئی۔'' وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر باہر بھاگ گئی۔

کافی وقت وہاں گزار کر واپس آ گیا۔ نصیب اللہ سیدھے سادے انسان تھے، اندر سے گہرے نہیں تھے۔ خود ہی بول پڑے۔ ''اللہ نے آپ کو بہت بڑا مرتبہ عطا کیا ہے، ایک دن دولہا بابا کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گیا، ٹھیک ٹھیک دوپہر تھی، سورج قہر برسا رہا تھا، بس دل چاہا کہ مزار پاک پر جاؤں، سو چلا گیا، بڑی ٹھنڈی جگہ تھی۔ درختوں کے نیچے بیٹھ کر فاتحہ خوانی کی پھر ٹھنڈک میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ کوئی آہٹ سنائی دی، اٹھ کر دیکھا تو سانگی نظر آئی۔ دھوپ میں بیٹھی سر پر خاک ڈال رہی تھی اور آہستہ آہستہ پتیم پتیم پکار رہی تھی۔ میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس وقت باہر کی مٹی آگ بنی ہوئی تھی اور وہ یہ آگ اپنے سر پر ڈال رہی تھی۔ میں اٹھا تو وہ مجھے دیکھ کر بھاگ گئی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ دوبارہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں تو ایک سرگوشی کانوں میں ابھری۔ ''نصیب اللہ! ایک مہمان کے خیر مقدم کے لیے انتظام کر لو، وہ سانگی کے درد کا درماں بنے گا۔'' میں سمجھ نہیں سکا۔ دوسرے دن میری بہن کی بیماری کی خبر ملی، میں وہاں چلا گیا لیکن شکور سے کہہ گیا کہ اگر کوئی مہمان آئے تو اس کا خیال رکھے۔''

ساری بات میرے علم میں آ گئی۔ مجھے پتیم کے لیے ہی حسے پور بھیجا گیا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ میرا فرض پورا ہو گیا اور ساتھ میں آسیہ کو بھی اس کا شوہر مل گیا۔

کھیا سنگھ کا ذکر نکلا تو نصیب اللہ نے بتایا۔ ''رجواڑے ختم ہو گئے، ریاستیں حکومت میں ضم ہو گئیں لیکن راجاؤں کی شان ختم نہیں ہو سکی، کھیا سنگھ کے دادا راجہ ملکھان سنگھ بڑی شان و شوکت کے مالک تھے، پھر ان کے پتاجی راجہ سکھ دیو سنگھ بھی انگریزوں کے گہرے دوست تھے، ان کے بہت سے رشتے دار آج بھی وزارتوں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، آج بھی کھیا سنگھ کی بڑی شان ہے، دلی میں ان کی بات چلتی ہے، بس اللہ کی مرضی ہے، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے، ایک بیٹی تھی تو وہ بھی لندن میں ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔''

''ارے، کیسا حادثہ......؟''

''روڈ ایکسیڈنٹ تھا، لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی، وہیں لندن میں کریا کرم کر دیا گیا۔''

''اوہ، افسوس......!''

''بہت اچھے انسان ہیں، ذرا بھی تعصب نہیں ہے، ہر ایک کا احساس کرتے ہیں، دولہا بابا کا عرس کراتے ہیں، ننگے پاؤں جا کر چادر چڑھاتے ہیں، مجال ہے کوئی کسی کو نقصان پہنچا دے حسے پور میں!''

''بڑی بات ہے۔''

دن گزر گیا۔ بہت سے خیالات دامن گیر تھے۔ اب کیا کروں، کہاں جاؤں......؟ وہاں سے بھی ناپسندیدگی کی سند مل گئی تھی۔ گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی خوف دل میں نہیں تھا۔ ایک شکایت سی تھی میں نے کبھی ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جو عطا کی گئی تھی اس کے لیے ملی ہر ہدایت پر عمل کیا تھا، کسی غلطی پر سرزنش کافی تھی، بس......!

رات کو طبیعت پر اس قدر وحشت سوار ہوئی کہ اپنی آرام گاہ سے باہر نکل آیا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دل نے ایک دم کہا کہ دولہا بابا کے مزار پر جایا جائے، سکون کی وہی جگہ تھی۔ اب وہاں کے راستے اجنبی نہیں رہے تھے، چنانچہ میں مزار پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر بیٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کچھ ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی رو رہا تھا۔ مردانہ آواز تھی۔ ایک دم چھپنے کی جگہ تلاش کی اور مزار کے اندر سے آنے والی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ الفاظ کانوں میں پڑے۔

''اور کہاں جاؤں پربھو......! بتاؤ اور کہاں جاؤں سنتان کی گردن بھی تو نہیں دبائی جا سکتی۔ ایک ہی پھول کھلایا تھا میرے باغ میں، وہ بھی سوکھ گیا، کس کے در پر جاؤں، کیا کروں؟''

بڑی درد بھری آواز تھی۔ دل لرز گیا پھر کچھ آہٹیں ابھریں اور کوئی مزار کے اندر سے باہر آ گیا۔ ایک لمحے میں پہچان لیا۔ کھیا سنگھ تھا۔ حیرت سے کھو گیا۔ نصیب اللہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ ایک ہی بیٹی تھی کھیا سنگھ کی جو حادثے میں مر گئی۔ اس کا غم بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ الفاظ ''سنتان کی گردن بھی تو نہیں دبائی جا سکتی۔'' ان کا کیا مطلب تھا۔

دیو ہیکل کھیا سنگھ سست قدموں سے چلتا مزار کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ میں نے کئی گھنٹے وہاں گزارے، پھر واپس آرام گاہ پر آ گیا۔ میرے خیال میں نصیب اللہ کو میرے آنے اور جانے کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد میں نے نصیب اللہ سے کہا۔ ''کیا مجھے کھیا سنگھ کے ہاں جانا چاہیے؟''

''ہاں! ضرور، آپ نے وعدہ کر لیا ہے۔''

''آپ بھی چلیں گے؟''

''اگر تم مناسب سمجھو!''

''انہوں نے آپ کو دعوت دی ہے؟''

''ہاں......!''

''تب پھر کیا تعرض ہے۔''

''نہیں! کچھ نہیں۔''

ناشتہ، کھانا، بہت سی الجھنیں لیکن اندر کی آواز، سب کچھ منجانب اللہ ہے، وقت ہی تقدیر ہے۔ نصیب اللہ ایک سیدھے سچے مسلمان تھے، سادگی سے زندگی گزارتے تھے، مسجد کے پیش امام تھے، قطعی غیر متنازع شخصیت، سب کی عزت کرتے تھے۔ جو کچھ وہ مجھے کھیا سنگھ کے بارے میں بتا چکے تھے، اس سے زیادہ شاید وہ خود بھی نہ جانتے ہوں گے۔ کھیا سنگھ کو میں نے رات جس عالم میں دیکھا تھا، وہ کچھ اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ اس کے الفاظ بڑے درد انگیز لیکن معنی خیز تھے۔ کیا حسے پور میں میری مزید ضرورت ہے، کیا مجھے دوبارہ یہاں بھیجا گیا ہے؟ بابا پردہ پوش نے جو آگہی دی تھی، اس سے کام لے کر میں کھیا سنگھ کے اندر جھانک سکتا تھا لیکن میرے مرشد نے مجھے جو ہدایت دی تھی، اس سے منحرف نہیں ہو سکتا تھا بلکہ قربان جاؤں شان بزرگی کے کہ ہر عقدہ خود بخود منکشف ہو جاتا تھا۔ آج تک ایسا ہی ہوا تھا اور گزری رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کہاں کھیا سنگھ ایک سکھ اور راجہ خاندان سے اور کہاں دولہا بابا سے عقیدت......!

نہ جانے کس خیال کے تحت میں نے نصیب اللہ سے پوچھا۔ ''کھیا سنگھ کے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی؟''

''نہیں......!''

''ان کی دھرم پتنی زندہ ہیں۔''

''ہاں! وہ بھی بڑے خاندان کی ہیں، بلند شہر کے راؤ گوند لال ان کے تیل بنانے کے کارخانے ہیں، پورے ہندوستان میں انہی کا تیل فروخت ہوتا ہے، اب پتی ہیں، ویسے کھیا سنگھ کی عمر زیادہ نہیں ہے، ان کے پتا کی موت بھی کوئی دس سال پہلے ہوئی ہے۔''

''بیٹی کا حادثہ کب ہوا؟''

''کوئی ڈھائی سال پہلے!''

''لندن پڑھنے گئی تھی؟''

''نہیں! گھومنے پھرنے گئے تھے۔''

''اچھا!'' میں نے کہا پھر خاموش ہو گیا۔ شام کو کوئی ساڑھے سات بجے خوبصورت بگھی آ گئی۔ کوچوان کے علاوہ ایک اور نوکر بھی تھا جو ہمیں لینے آیا تھا۔ نصیب اللہ اور میں تیار تھے۔ بگھی میں سوار ہو کر چل پڑے۔ راستے میں جدھر سے گزرے، لوگ جھک جھک کر سلام کرتے رہے۔ کھیا سنگھ کی حویلی سے تھوڑے فاصلے پر سانگی کا گھر تھا۔ بگھی وہاں سے گزری تو میرے دل کو جھٹکا سا لگا۔ دروازے پر امرتا کھڑی تھی۔ بگھی کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح اس کی طرف دوڑی اور زور زور سے چیخ کر کہنے لگی۔ ''ماما، رک جا، ماما رک جا، بس ایک منٹ!''

کوچوان نے بگھی آہستہ کر دی لیکن سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''رکو، بگھی روکو!''

اتنی دیر میں امرتا بگھی کے قریب پہنچ گئی۔ ''بس ایک منٹ ماما جی! بس ایک منٹ!'' پھر اس نے نصیب اللہ کے پیروں کو ہاتھ لگائے اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''کتنا انتظار کیا تمہارا، کیوں نہیں آئے ہمارے پاس، پتیم بھیا نے بتا دیا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں، ہمارے پاس نہیں آؤ گے۔ میں نے کہا میرے بابو جی کتنے ہی بڑے ہوں، وہ میرے ہیں، کسی کام میں لگے ہوں گے، فرصت ہو گی تو آئیں گے، آپ آتے نا بابو جی......؟''

''ہاں امرتا! ضرور آتا۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ خوش ہو گئی۔ ''دیکھا ماما جی! تم ایسے ہی ڈر رہے تھے، یہ میرے ماما ہیں بابو جی! نمبردار کی بگھی چلاتے ہیں، انہوں نے مجھے بتایا کہ بابو جی آج نمبردار جی کے گھر مہمان جا رہے ہیں، میں نے ماما سے کہا کہ بس ذرا بگھی روک لینا، میں اپنے بابو جی کو دیکھ لوں گی، تم نے برا تو نہیں مانا؟''

''نہیں!'' میں نے بمشکل کہا۔

''سانگی کے گھر آؤ گے نا......؟''

''ہاں! آؤں گا۔''

''اب جاؤں؟'' کوچوان نے ناگواری سے کہا۔

''ہاں جاؤ، ست سری اکال بابو جی! اور بابا جی!'' وہ شرارت سے ہنس کر بولی اور کوچوان نے بگھی آگے بڑھا دی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

نصیب اللہ اس دوران بالکل خاموش رہے تھے، بعد میں بھی انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم کھیا سنگھ کی حویلی پہنچ گئے۔ اس نے حویلی کے عظیم الشان پھاٹک پر ہمارا استقبال کیا تھا۔ اس کی بیوی اور چند دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ شان و شوکت اور حویلی کی قدیم وجدید بناوٹ سے ہی پتا چل رہا تھا کہ کسی راجہ کا محل ہے۔ کھیا سنگھ بڑی اپنائیت سے ملا تھا، پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔ عالی شان نشست گاہ تھی۔ کھیا سنگھ نے خاطر مدارات کی انتہا کر دی تھی۔

''دین، دھرم کا احترام منش کا پہلا فرض ہے، میں جانتا ہوں ڈاکٹر جی کہ اگر آپ مجھے اپنے گھر بلاتے تو آپ بھی میرا اتنا ہی خیال رکھتے۔'' ڈنر ٹیبل پر کھیا سنگھ نے کہا۔ طویل و عریض میز پر دو پورشن کر دیے گئے تھے۔ ایک نمایاں فاصلے پر دو بجلی ڈشز لگائی گئی تھیں، دوسرے پورشن میں ہر طرح کے گوشت کی ڈشیں تھیں جن میں تیتر، بٹیر، ہرن، مچھلی اور بکرے کے گوشت کے سالن رکھے تھے۔ دوسرے پورشن میں نو افراد تھے جن میں چار خواتین اور پانچ مرد تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد کافی وغیرہ کا دور چلا۔ نصیب اللہ نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نے جو اہتمام کیا کھیا جی! وہ ایک راجہ کے شایان شان تھا لیکن خدا کی قسم اگر ہمارے لیے دال، روٹی ہی بن جاتی، سو کافی تھی۔''

کھیا سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہت وقت گزارنے کے بعد ہم نے واپسی کی اجازت مانگی تو کھیا سنگھ نے کہا۔ ''آپ کے بارے میں ایس پی دھونی لال سے بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے ڈاکٹر صاحب! معاملہ جو بھی ہے، آپ کے اور حکومت کے بیچ ہے، ہم معمولی سے لوگ ہیں، حکومت نے ہم سے ریاستیں چھین لی ہیں لیکن اپنے رسم و رواج، اپنی روایتیں ہم اسے نہیں دے سکتے، حسے پور میں مہمان کی حیثیت سے کوئی بھی آ جائے، ہماری آبرو ہوتا ہے اور آبرو کے لیے جان کی قربانی ہماری تاریخ ہے، آپ کافی دن ہمارے مہمان رہیں گے اور یہاں سے نہیں جائیں گے، حسے پور کا ہر گھر آپ کا میزبان ہے۔ جب تک آپ یہاں ہیں، پولیس کے کسی بھی فرد کو حسے پور کی سرحد میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی، میرے مسلح جوان ادھر آنے والے راستوں پر چوکس ہیں۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ کھیا سنگھ نے مزید کہا۔ ''اس کے علاوہ مجھے آپ سے کچھ ذاتی کام بھی ہے۔''

''حکم دیں نمبردار صاحب!'' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں! میں مسجد پر حاضری دوں گا۔'' کھیا سنگھ بولا۔ پھر ہم بگھی میں آ بیٹھے۔ اس دعوت اور اس ماحول کا میرے ذہن پر بہت اثر تھا لیکن اس وقت تو میں بالکل ہی ڈوب گیا جب بگھی سانگی کے گھر کے قریب پہنچی اور امرتا اس کے راستے پر آ کھڑی ہوئی۔

''چوری چوری نکل رہے تھے ماما جی! مگر میں بھی بڑی سیانی ہوں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''تو یہاں کیوں مر رہی ہے؟'' کوچوان نے غصے سے کہا۔

وہ بدستور شوخی سے ہنس پڑی اور بولی۔ ''لے میں گئی کب ہوں یہاں سے!''

''کیا......؟'' کوچوان حیرت سے بولا۔

''تو اور کیا، مجھے پتا تھا کہ گزرو گے تو ادھر سے ہی، ایک بار اور دیکھ لوں گی اپنے بابو جی کو۔'' وہ بولی اور کوچوان نے غصے سے بگھی آگے بڑھا دی۔ امرتا زد میں آتے آتے بچی تھی۔ اس کا غصہ بھی بجا تھا۔ امرتا اس کی بھانجی تھی۔ امرتا زور سے چیخی تھی۔

''ستیاناس جائے تیرا ماما کے بچے! کیڑے پڑیں، مجھے مارنے چلا تھا گھوڑے مر جائیں تیرے، تجھے تو میں کیا کہوں......؟'' اس کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی۔

نصیب اللہ اب بھی خاموش رہے تھے۔ مسجد کے قریب بگھی سے اترتے ہوئے میں نے کوچوان سے کہا۔ ''سنو کیا نام ہے تمہارا......؟''

''یادو سنگھ مہاراج!''

''خبردار امرتا کو کچھ مت کہنا، مجھے پتا چل گیا تو نمبردار سے کہہ کر تمہیں سزا دلواؤں گا، وہ ایک معصوم بچی ہے اور میرے لیے میری چھوٹی بہن جیسی! جو کچھ بولتی ہے، اپنی معصومیت کی وجہ سے بولتی ہے۔''

''سبحان اللہ!'' نصیب اللہ کی مدھم سی آواز ابھری۔

''سنا تم نے......؟'' میں نے دوبارہ کوچوان سے کہا۔

''جی بابو صاب!'' کوچوان نے کہا۔ بگھی واپس چلی گئی تو ہم لوگ اندر آ گئے۔

نصیب اللہ میرے پاس بیٹھ گئے تھے۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''بڑی خطرناک عمر ہوتی ہے یہ، بلکہ میں اسے بدنصیبی کی عمر کہتا ہوں، عقل چھوٹی ہوتی ہے، آرزوئیں بے قابو! تمہیں کہاں سے مل گئی تھی؟''

میں نے نصیب اللہ کو امرتا کے بارے میں ایک ایک لفظ بتا دیا۔ انہوں نے گردن جھکا لی۔ پھر بولے۔ ''معبود عظیم خیر کرے، بڑی شوخ، پیاری سی بچی ہے، مشکل میں پڑ جائے گی۔''

''میں اس کا ذہن بدلنے کی کوشش کروں گا۔''

''اللہ تعالیٰ اجر دے گا، کیسا لگا کھیا سنگھ کے ہاں جا کر...؟''

''بے حد نفیس انسان ہے۔''

''صحیح معنوں میں بڑا، صاحب ظرف......! اس نے جو کچھ کہا ہے، سچ کہا ہے، مجال نہیں پولیس کی کہ ادھر پھٹک جائے۔''

''یہ حیرانی کی بات ہے، یہاں حکومت اس طرح بے بس ہے، وکرم لوٹیا نے بھی خود کو اتنا ہی پاورفل بتایا تھا، اس طرح کے لوگ اس قدر طاقتور ہیں۔''

''وکرم لوٹیا...... نام سنا ہوا ہے۔'' نصیب اللہ بولے۔

میں نے انہیں پوری کہانی سنانے میں حرج نہ سمجھا۔ سب کچھ بتا دیا سوائے بھوریا چرن کے......! کافی رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے تھے، پھر نصیب اللہ مسجد میں چلے گئے۔ وہ وہیں سوتے تھے۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دماغ بند تھا، آگے کے بارے میں کوئی راستہ سامنے نہیں تھا۔ کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا، رہ رہ کر ایک ہی جملہ ذہن میں گونج رہا تھا، ہر سانس قرض ہے، ہر حاصل صدقہ ہے، وقت کے فیصلے ہی تقدیر ہوتے ہیں۔ کھیا سنگھ چاہتا تھا کہ میں یہاں رکوں۔ رک جاتا ہوں دیکھوں وقت کی ہوا کیا کہتی ہے۔

دن معمول کے مطابق تھا، البتہ شام کو پانچ بجے کوچوان یادو سنگھ مسجد آیا اور بولا۔ ''یہ موبائل فون بھیجا ہے نمبردار صاحب نے آپ کے لیے!''

''ارے......؟'' میرے منہ سے بس اتنا نکلا۔

''وہ اس پر آپ سے بات کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ایک گھنٹے کے بعد موبائل پر کال آئی، پھر کھیا سنگھ کی آواز آئی۔ ''ڈاکٹر صاحب!''

''جی کھیا سنگھ جی! میں بول رہا ہوں۔''

''معافی چاہتا ہوں، خود آنا تھا لیکن کچھ اہم لوگ آ گئے ہیں، ان کے ساتھ کہیں جانا ہے۔''

''بہتر ہے۔''

''کل مجھے وقت دے سکیں گے؟''

''جی ضرور......!''

''آپ کو حویلی آنا ہوگا، حویلی آنا ضروری ہے، میں خود آپ کو لینے آ جاؤں؟''

''یادو سنگھ کو بھیج دیں یا میں خود آ جاؤں گا۔''

''نہیں! بگھی بھیج دوں گا۔'' فون بند ہو گیا۔

میرے ذہن میں امرتا آ گئی۔ انتظار کر رہی ہوگی، کیا کروں......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کروں۔ اس سے بڑی مشکل میرے لیے اور کوئی نہیں تھی، اس کے لیے دل میں ہمدردی تھی لیکن کوئی حل ذہن میں نہیں تھا، البتہ بڑے خشوع و خضوع سے دعا کی تھی کہ الٰہی! اس کے دل سے یہ فتور نکال دے۔

دوسرے دن فون پر کھیا سنگھ نے ایک بجے آنے کی درخواست کی۔ ''آپ بھوجن یہیں کریں گے۔''

مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نصیب اللہ آج میرے ساتھ نہیں تھے۔ سانگی کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے چور نظروں سے اس کے دروازے کی طرف دیکھا۔ امرتا وہاں موجود نہیں تھی۔

یادو سنگھ بول اٹھا۔ ''میں نے اسے آج نہیں بتایا۔'' میں خاموش رہا تھا۔

دن کی روشنی میں حویلی مزید شاندار نظر آ رہی تھی۔ کھیا سنگھ نے باہر ہی استقبال کیا اور بڑے احترام سے پیش آیا۔ اس نے خاص طور سے حکیم احمد باورچی کو استقبال میں شریک رکھا تھا تاکہ میں مطمئن رہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا تھا، البتہ کھیا سنگھ نے نصیب اللہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔

کھانے کی میز پر وہی انداز رکھا گیا تھا۔ آدھا پورشن میرے لیے تھا اور حکیم اللہ خود میرے لیے سروس کر رہا تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ دوسری طرف کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد کھیا سنگھ نے کہا۔ ''حویلی کا دوسرا حصہ میرے ان مہمانوں کے لیے مخصوص ہے جن سے میرے ذاتی کام ہوتے ہیں اور جب وہ میرے ساتھ ہوتے ہیں تو کسی کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں ہوتی، تو اب میں اپنے مہمان کے ساتھ اسی طرف جا رہا ہوں۔''

یہ دوسرا حصہ بھی اپنی بناوٹ اور سجاوٹ کے ساتھ بے مثال تھا لیکن کسی ملازم کے نہ ہونے کی وجہ سے ویران ویران سا لگ رہا تھا۔ ایک خوبصورت نشست گاہ کے قیمتی صوفے پر بیٹھ کر کھیا سنگھ نے کہا۔ ''میں نے حکیم احمد سے کافی کے لیے کہہ دیا ہے، اس کے آنے کے بعد ہم اصل گفتگو کا آغاز کریں گے، آپ نے میرے نہ آنے کو محسوس تو نہیں کیا؟ میں نے کہا تھا کہ میں خود آپ کے پاس حاضری دوں گا۔''

''بالکل نہیں!''

''کچھ مہمان آ گئے تھے حسے پور سے۔''

''جی......!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

حکیم اللہ کافی لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد کافی پیتے ہوئے کھیا سنگھ نے کہا۔ ''میں نے آپ سے ایک ذاتی کام کے لیے کہا تھا۔''

''جی......!''

''حسے پور کے سرکا تاج دولہا بابا ہیں، یہاں کا بچہ بچہ ان پر جان چھڑکتا ہے اور مزار کی حرمت پر جان وارنے کو تیار رہتا ہے، اگر کسی سے سچ بلوانا ہو تو اسے مزار پر لے آؤ، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا نہ صرف میں بلکہ میرے پرکھ بھی ان کے عقیدت مند تھے۔ جب بھی کوئی دل کی لگی ہوتی ہے، ہم ان کے چرنوں میں چلے جاتے ہیں، شانتی مل جاتی ہے لیکن......'' کھیا سنگھ کے منہ سے سسکی سی نکل گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پھر گویا ہوا۔ ''پرسوں رات بھی میں ان کے چرنوں میں گیا تھا، اپنے لیے کچھ مانگنے گیا تھا اور پہلی بار میں نے اپنے مرشد کی آواز سنی۔''

''آواز سنی......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! ایک سرگوشی کی شکل میں کسی نے کہا، کھیا سنگھ ایک چہرہ ابھی تیرے سامنے آئے گا، اپنے مسئلے کے لیے اس سے رجوع کر، دوبارہ یہ سرگوشی سنائی دی اور ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کو دیکھا، آپ ہی کے بارے میں مجھ سے کہا گیا تھا۔''

میرے بدن میں عجیب سی اینٹھن پیدا ہو گئی۔ کھیا سنگھ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ بولا۔ ''آپ تھے نا مزار شریف پر......؟''

''ہاں......!'' میں نے کہا، پھر بولا۔ ''مجھے بتائیے کھیا جی کیا مشکل ہے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

''جی ضرور......!''

''تھوڑا سا چلنا ہوگا میرے ساتھ۔''

''ضرور...... میں حاضر ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ حویلی سے کہیں باہر جائے گا لیکن وہ حویلی کے اسی حصے میں پچھلی سمت چل پڑا۔

پھر ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک بڑے چوبی دروازے کا تالا کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے دوسری طرف بھی ایک کشادہ ہال تھا لیکن اس کے آدھے حصے میں ایک سلاخوں دار جنگلا لگا ہوا تھا جس کے دروازے میں تالا پڑا تھا لیکن سلاخوں کے دوسری طرف کا منظر بے مثال تھا۔ شاندار دبیز ایرانی قالین بچھا ہوا تھا، پیتل کے منقش پایوں والا قدیم طرز کا چھپر کھٹ جس پر بیش قیمت گدے پڑے ہوئے تھے۔ بڑے اسٹائلش صوفے جن میں سے ایک پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ حسین ترین نقوش کی مالک، نرم و نازک سی، منتشر بال اسے اور حسین بنا کر پیش کر رہے تھے۔ ہماری آہٹ پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ نشیلی سی دلکش آنکھوں میں یاسیت سی ابھری۔

کھیا سنگھ سلاخوں کے پاس جا کھڑا ہوا، پھر اس نے آواز دی۔ ''منورما......!''

جواب میں لڑکی نے شکایتی انداز میں کھیا سنگھ کو دیکھا اور کہا۔ ''جی پتا جی......!''

میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ نصیب اللہ نے بتایا تھا کہ کھیا سنگھ کی ایک ہی بیٹی تھی جو لندن میں ایک ٹریفک کے حادثے میں مر گئی، پھر یہ کون ہے۔

''آگے آؤ۔'' کھیا سنگھ بولا اور لڑکی چند لمحوں کے توقف کے بعد اپنی جگہ سے اٹھی اور سلاخوں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کی حزنیہ مسکراہٹ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ وہ آگے آ کر بولی۔ ''جی پتا جی!''

''یہ ڈاکٹر کامران ہیں، میں انہیں تم سے ملانے لایا ہوں۔'' کھیا سنگھ نے کہا۔

وہ مجھے دیکھنے لگی، پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے بولی۔

''اے چارہ گر، بتاؤ تو، کوئی سیاہ بخت
گر ہو اسیر پیچ، گیسو تو کیا کرے

اگر کوئی جواب ہے ڈاکٹر، تو میرا علاج شروع کر دیں، میں آپ سے پورا تعاون کروں گی ورنہ......!'' اس نے گہری سانس لی۔ ''کیوں وقت ضائع کریں گے۔''

میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پوری طرح ہوش مند لگ رہی تھی، البتہ چہرے پر پیلاہٹ تھی۔ کچھ لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''مل لیے آپ مجھ سے، بتاؤں آپ کو اپنی بیماری کے بارے میں، کسی سے پریم کرتی ہوں، مجھے پیا گھر بھیج دیں، ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''آئیے......!'' کھیا سنگھ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور ہیجانی انداز میں میرا بازو پکڑ کر مجھے سلاخوں کے پاس سے دور لے آیا، پھر وہ ہال میں نہیں رکا، میرے ساتھ واپس اسی نشست گاہ میں آ گیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آخر کار میں اسے شوٹ کر دوں گا، بیٹھئے پلیز!'' میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔ ''میری بیٹی ہے وہ!''

''جی......!''

''آپ نے اس کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''

''جی! نصیب اللہ نے بتایا تھا کہ آپ کی ایک ہی بیٹی تھی جو لندن میں ایک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گئی۔''

''ہاں! یہی کہنا پڑا لوگوں سے، ایسا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یہ کمبخت اولاد انسان سے سب کچھ چھین لیتی ہے، اس کا غرور، اس کا وقار، اس کا اعتماد......! آپ یقین کریں ڈاکٹر! میں اسے ختم کر چکا ہوتا، اگر مجھے یہ یقین نہ ہو جاتا کہ وہ بدکار نہیں ہے بلکہ کسی اثر کا شکار ہے، سنیں ڈاکٹر کامران! میں صرف بابا کے حکم پر آپ کو اپنا راز دار بنا رہا ہوں ورنہ اپنی بربادی کی کہانی زندگی کی قیمت پر بھی نہ سناتا۔''

''میں اس امانت کی حفاظت کروں گا۔'' میں نے متانت سے کہا۔

''وہ ایک صاحب کردار لڑکی تھی، خوش ذوق، خوش مزاج، غیرت مند......! بڑی منتوں مرادوں سے دنیا میں آئی تھی، بڑی چاہ سے پروان چڑھایا تھا مگر تقدیر نے لوٹ لیا، اکثر راتوں کو حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر نکل جاتی تھی، بہت دن کے بعد پتا چلا، کسی کو بتاتے ہوئے ڈرتے تھے، اس کی ماتا کو بتایا، اس نے مجھے......! میں نے اس کا پیچھا کیا اور اسے باغ میں ایک نوجوان کے ساتھ دیکھا۔ نوجوان کا چہرہ ایک نقاب میں چھپا ہوا تھا، بڑی مشکل سے صبر کیا، انہیں نہیں ٹوکا، اپنی پتنی کو بتایا، اسے ہدایت دی کہ اسے سمجھائے کہ اگر اس کے پتا کو بھی پتا چل گیا تو کیا ہوگا، آئندہ وہ کبھی باہر نہ نکلے گی مگر دوسری رات بھی وہ نکل گئی۔ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا، اس کی ماں سے بھی کہا کہ اس سے معلوم کرے کہ یہ کون ہے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا، بس اتنا کہا کہ وہ اسے نہیں جانتی، وہ بس اس سے ملنے آتا ہے۔ کہاں سے آتا ہے، وہ نہیں جانتی، دونوں پریم کرتے ہیں۔

وہ روز باغ میں جاتی۔ میرا جو حال تھا، میرا دل جانتا ہے، آخر کار میں نے اس کے سامنے آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میرا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ میں پستول لے کر ان کے سر پر پہنچ گیا اور میں نے اسے للکارا۔ وہ خوف زدہ نہیں ہوا لیکن اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور باغ میں درختوں کے جھنڈ میں چھپ گیا۔ جونہی وہ منورما سے دور ہوا، میں نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میرا نشانہ بہت اچھا ہے لیکن وہ میرا نشانہ نہیں بن سکا، میں منورما کو واپس لے آیا۔ وہ سحرزدہ سی خاموش واپس آ گئی۔ میں نے اسے بند کر کے پہرہ لگا دیا۔ تین ملازموں کو بہترین معاوضہ دے کر تیار کیا کہ وہ پوری مستعدی سے نگرانی کریں اور راز داری برتیں۔

دوسرے دن میں نے دوپہر کو اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن اس دن مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا، وہ نشے میں تھی، بالکل بدحواس...... ڈاکٹر صاحب! پاگل ہو گیا تھا میں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بعد میں پتا چلا کہ وہ زیادہ تر نشے میں رہتی ہے۔

پھر ایک اور کوڑا لگا جب پہرہ دینے والے تینوں ملازموں نے بتایا کہ وہ پہرے پر مستعد تھے کہ انہیں کمرے کے اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ وہ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر اندر گھس گئے تو انہوں نے اس نوجوان کو دیکھا جو نقاب لگائے ہوئے تھا۔ وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اسے دبوچ لیا، وہ اسے دبوچ کر باہر لے آئے لیکن اچانک ہی وہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر ایک کمرے میں جا گھسا۔ جب وہ کمرے میں گئے تو وہاں کچھ نہیں تھا جبکہ کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

میں نے ان کی بات پر یقین نہیں کیا اور انہیں دھمکیاں دیں کہ انہوں نے اپنی کوتاہی چھپانے کے لیے یہ جھوٹ گھڑا ہے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں لیکن میں نے ان کی ایک نہ مانی اور ہدایت کی کہ وہ زیادہ مستعدی سے پہرہ دیں، وہ شخص اندر نہ آنے پائے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ کون سا سپر مین تھا کہ تین تین بندوں کے قابو میں نہیں آ سکا۔

پھر یہ تین دن بعد کی بات ہے کہ صفائی کرنے والی نوکرانی دہشت سے کانپتی میری پتنی کے پاس آئی اور اس نے بتایا کہ تینوں نوکر ایک کمرے میں مرے پڑے ہیں۔ مجھ تک خبر پہنچی اور میں نے جا کر دیکھا۔ یہ وہی تینوں پہریدار تھے۔ تلاش کرنے پر ان کے جسموں پر چھوٹے چھوٹے زخم نظر آئے جیسے کسی کیڑے نے کاٹا ہو، ان کے بدن نیلے پڑے ہوئے تھے اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

میرے ہوش اڑ گئے۔ تین بندوں کی موت اور یہ وہ تھے جنہیں میں نے پہریداری سونپی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی لاشیں جنگل میں لے جا کر ٹھکانے لگائیں۔ اس کے بعد تین راتیں خود پہرہ دیا لیکن ان تین دنوں میں منورما آرام سے سوتی رہی، کوئی اس کے پاس نہیں آیا۔

گھر میں اب وہ کسی کے سامنے نہیں آتی تھی، کھانا بھی اپنے کمرے میں ہی کھاتی تھی لیکن میری پتنی بدستور روتے روتے کہتی تھی کہ منورما کی حالت بگڑتی جا رہی ہے، اس کا چہرہ زرد ہو رہا ہے اور وہ ہر وقت نشے میں رہتی ہے۔

ہم نے لاکھ کوشش کی کہ اس کے پاس سے نشہ آور دوا یہ تلاش کر لیں لیکن کہیں سے کچھ برآمد نہ کر سکے۔ میری پتنی کو ایک اور شبہ ہوا کیونکہ اس پراسرار نوجوان کی کہانی اس کے علم میں تھی، اس نے اپنی ایک راز دار دائی کو بلا کر منورما کا معائنہ کرایا اور دائی نے ہمیں ایک روح فرسا خبر سنا دی۔

وہ ہی باتیں تھیں کہ ہم خودکشی کر لیتے یا منورما کو ہلاک کر کے کہیں دفن کر دیتے۔ کمبخت نے ساری زندگی کی کمائی عزت گنوا دی تھی۔ بدنصیب تھے ہم کہ اکلوتی بیٹی کو ہلاک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ دائی کو ایک بڑی رقم دے کر الٰہ آباد اس کی بیٹی کے پاس بھیج دیا، یہ کہہ کر کہ وہ زبان بند رکھے ورنہ پورے پریوار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور فیصلہ کیا کہ اسے ملک سے باہر لے جایا جائے۔ ہم اسے انگلینڈ لے گئے، وہاں ہم نے اس کے سارے ٹیسٹ کرائے۔ وہاں انکشاف ہوا کہ دائی کا خیال غلط تھا، ہاں اس کے خون میں کسی خطرناک مادے کی آمیزش ہے۔ اس مادے کے کئی ٹیسٹ ہوئے لیکن اس کی صحیح شناخت نہیں ہو سکی۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کوئی نشہ نہیں کرتی، اس پر یہ مدہوشی خون کی آمیزش کی وجہ سے طاری رہتی ہے۔ ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات کے سوالات کے جواب اس نے بڑے شرمناک دیے۔ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر وہ مر گئی تو میری پتنی بھی اسی لمحے مر جائے گی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حسے پور میں کسی کو اس کی باتیں سننے کو ملیں۔ میری پتنی نے بنتی کی کہ اسے جیتا رہنے دیں، ہو سکتا ہے وہ کبھی ٹھیک ہو جائے۔ ہم انگلینڈ سے واپس آ گئے لیکن میں نے وہیں مشہور کر دیا کہ منورما کا بہانت ہو گیا، وہ ٹریفک کے حادثے میں مر گئی۔ میں نے اسے یہاں لا کر بند کر دیا۔ وہ کہتی ہے اس کا واہ کر دیا جائے، ایسی باتیں کرتی ہے وہ!''

''نشے کے بارے میں ڈاکٹر انکار کرتے ہیں؟''

''ہاں بالکل......!''

''اس کی رپورٹیں موجود ہیں؟''

''پوری فائل ہے۔''

''آپ نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کا پریمی کون ہے؟''

''ترکیشی نام بتاتی ہے۔''

''اس کا اتہ پتہ بتاتی ہے۔''

''کہتی ہے نہیں جانتی!''

''آپ نے......!'' میں نے کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ کچھ لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''ایک اور خاص بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''جی! پوچھیں۔''

''لندن سے آنے کے بعد اور انہیں اس قید خانے میں ڈالنے کے بعد آپ کو کبھی شبہ ہوا کہ وہ یہاں آیا......؟'' میرے اس سوال پر کھیا سنگھ نے گردن جھکا لی، پھر آہستہ سے بولا۔ ''ہاں......!''

''یہ پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں......!''

''مگر کیسے......؟ اس قید خانے میں وہی آ سکتا ہے جسے یہاں کا راستہ معلوم ہو۔''

''میں نے آپ سے کہا ہے کہ شاید میرا جنون، میری غیرت مجھے مجبور کر دیتی کہ میں اسے گولی مار دوں، زہر دیدوں لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ کوئی اور ہی بات ہے۔''

''اور ہی بات......!''

''ہاں! آپ نے خود کہا ہے کہ اس قید خانے میں وہی آ سکتا ہے جسے یہاں تک آنے کا راستہ معلوم ہو، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے یہاں منورما کے پاس دیکھا ہے۔''

''اوہ! آپ نے اسے پکڑنے یا مارنے کی کوشش نہیں کی؟''

''جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس پر فائر کیے تھے لیکن وہ جھاڑیوں میں گم ہو گیا تھا۔ اسی طرح دوبارہ میں نے یہاں اسے گھیر اور اس پر سائلنسر لگے پستول سے فائر کیے لیکن وہ زخمی تک نہیں ہوا اور غائب ہو گیا، جب سے میری نظروں میں منورما کا جرم ختم ہو گیا۔ میں نے دولہا بابا کا دامن پکڑ لیا، مجھے میری بیٹی چاہیے دولہا بابا اور...... اور انہوں نے آپ کی نشاندہی کی۔'' کھیا سنگھ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہی ہوتا تھا، اسی طرح مجھے امتحان میں ڈالا جاتا تھا۔ واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے، کچھ پتا نہیں تھا اور اب تو کچھ اور ہی حالات ہو گئے تھے۔ دولہا بابا کی ولایت کا قائل تھا لیکن کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''حکم نہیں، درخواست ہے کہ اگر میری تقدیر بننے کی دعا کر سکتے ہیں تو ضرور کریں، ورنہ ایک وعدہ کریں میرے اس راز کو راز رکھ کر مجھے جینے دیں گے۔'' کھیا سنگھ کی آواز رندھ گئی۔

''دولہا بابا کے نام پر آپ اطمینان رکھیں، آپ کا ہر راز، راز رہے گا۔''

''شکریہ ڈاکٹر!''

''اب میرا قیام ضروری ہے، مجھے یہیں آپ کی حویلی میں رہنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

کھیا سنگھ کے چہرے پر خوشی نظر آئی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''پوری حویلی میں جو جگہ چاہے پسند کریں۔''

''دیکھ لیتا ہوں اور قید خانے میں آنے کا راستہ بھی دیکھنا ہے، پہلے غور نہیں کیا تھا، اس کے علاوہ نوکروں کو ہدایت کر دیں کہ حویلی میں میرے کہیں آنے جانے پر پابندی نہ ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' کھیا سنگھ بولا۔

میں نے بڑی مہارت سے ایک کمرہ منتخب کیا اور کھیا سنگھ سے وعدہ کیا کہ کل سے میں اس میں منتقل ہو جاؤں گا۔ کھیا سنگھ نے میری ساری ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کہا تھا، پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ نصیب اللہ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کھیا سنگھ کو مجھ سے کچھ کام ہے جسے میں نے کرنے کا وعدہ کر لیا ہے، اس کے لیے مجھے ان کی حویلی میں رہنا ہوگا۔

''جو بہتر ہو ڈاکٹر کامران! ایک تھوڑی سی الجھن درپیش ہے۔''

''جی فرمائیے......!''

''وہ دیوانی لڑکی بار بار چکر لگا رہی ہے امرتا، کہہ رہی ہے بابو جی سے ملا دو۔''

''میں اس کی طرف سے الجھن میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے ماما سے بات کرنی ہوگی۔''

''وہ سخت آدمی ہے، اس کے ساتھ برا سلوک کرے گا۔'' میں نے کہا اور بگھی والی بات بتائی کہ کس طرح اس نے امرتا پر بگھی چڑھا دی تھی۔

''غیور سکھ ہے، خیر میں کچھ سوچتا ہوں۔''

دوسرے دن صبح ضروریات سے فارغ ہوا تھا کہ حجرے کے باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''کون ہے، آ جاؤ۔'' اندر آنے والے کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ امرتا تھی۔

''ایسے کیسے جیون گزرے گا بابو جی! تم گھر سے غائب رہو گے اور میں تم سے لڑوں گی، بولو کل کہاں غائب رہے، مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟''

''وہ کچھ کام تھا امرتا!'' مجھے اور کچھ نہ سوجھی۔

''کل کو ہمارا واہ ہو جائے گا تب بھی تم ایسے ہی......!''

اسی وقت دروازے سے شکور کی آواز آئی۔ ''میں اندر آ سکتا ہوں؟''

میرے اجازت دینے پر وہ اندر آ گیا۔ امرتا نے جلدی سے اوڑھنی سر پر کھسکا لی تھی اور بھونڈے انداز میں شرمانے لگی تھی۔

''ارے تو یہاں ہے، تیرا ماما تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے، ابھی ادھر ہی آنے والا ہے۔''

''مر جائے، جینا مشکل کر رکھا ہے اس نے، تو میں نے کہہ رکھی تھی کہ دو بجے دوپہر کو سانگی کے گھر آ جانا، ہم سب دولہا بابا کے پاس جائیں گے، سانگی منت کے دیے جلائے گی، ساری تیاری میں نے کی ہے، ہائے دیا......! چلوں وہ کالیا ادھر آ گیا تو پیٹے گا۔'' وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

شکور ہنسنے لگا، پھر بولا۔ ''یہی ترکیب تھی اسے بھگانے کی، پیش امام صاب نے کہا تھا کسی طرح اس سے ڈاکٹر صاب کی جان چھڑاؤ۔''

''ارے تو تم نے جھوٹ بولا تھا؟'' میں نے کہا۔

''تو اور کیا کرتا، مجبوری تھی، وہ اپنے ماما کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔'' شکور نے کہا۔

دن گزرنے لگا۔ ذہن میں کھیا سنگھ کی کہانی سوار تھی، اس کے ساتھ ہی ایک بوجھ بھی......! مجھے سزا ملی تھی مجلس عمل کی رکنیت کینسل کر دی گئی تھی۔ دل میں ایک شکایت تھی، میرا کونسا تجربہ تھا، وارننگ دیدی جاتی۔ اب تک وہی کیا تھا جس کی ہدایت کی گئی تھی۔ تمام مراحل سے گزرا تھا، تو تیں عطا کی گئی تھیں۔ بتایا گیا تھا کہ آگہی کے بعد چشم پوشی بہتر قوت ہے۔ سو حالات کیسے بھی ہوئے، تعمیل حکم کی اور اب ایک اور امتحان میں ڈالا گیا ہے مجھے...... کھیا سنگھ غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا ہے، اپنی آبرو اپنی اولاد کے لیے رو رہا ہے۔ بہت بڑا ایثار کیا ہے اس نے اپنی شفقت کو موت کا نام دے دیا ہے۔ کتنی مشکل پیش آئے گی اسے، اگر منورما ٹھیک بھی ہو جائے گی تو وہ دنیا کو کیا بتائے گا کہ بیٹی کیسے دنیا میں واپس آ گئی۔

ایک شدید بے چینی کا احساس دل میں جاگا۔ طبیعت اس طرح بے کل ہوئی کہ حجرے سے باہر نکل آیا اور بالکل بے ارادہ دولہا بابا کے مزار کی طرف چل پڑا۔ دماغ میں کوئی سوچ نہیں تھی۔ مجھے کوئی خوف نہیں تھا، اس لیے نہیں کہ کھیا سنگھ نے حسے پور میں پولیس کا داخلہ ممنوع کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ وقت ہی تقدیر ہے اور وقت ہی فیصلے کرتا ہے۔

دولہا بابا کا مزار سنسان پڑا تھا، پرندوں تک کی آوازیں نہیں تھیں۔ حسے پور کے لوگ خوف کی وجہ سے وہاں نہیں آتے تھے لیکن جو سکون وہاں تھا، وہ کہیں اور کہاں! مزار کے پاس بیٹھ کر درود پاک کا ورد کرنے لگا اور اس طرح گم ہو گیا کہ کچھ خبر نہیں رہی۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا پھر کچھ آوازیں ابھریں تو ہوش آیا۔ کوئی ایک دم میرے پاس آ گیا۔

''ہائے میں مر جاؤں، کتنے اچھے ہو تم!'' ایک حیران آواز ابھری۔

''کون ہے امرتی......؟'' یہ پتیم کی آواز تھی۔

''وہ ہیں وہ......!''

''ارے ڈاکٹر صاب!'' پتیم نے بھی مجھے دیکھ لیا۔

''میں نے بلایا ہے انہیں، ہم دونوں کو بھی دولہا بابا کے چرنوں میں حاضری دینی تھی۔''

''تو باؤلی ہے، ڈاکٹر صاب بہت بڑے آدمی ہیں، انہیں ہم ایسے تو نہیں بلا سکتے۔''

''میں بلا سکتی ہوں کیونکہ میں...... میں بھی بڑے آدمی کی...... وہ...... وہ...... وہ! ہائے دیا! مجھے لاج آتی ہے۔'' یہ کہہ کر امرتا نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

''آؤ بیٹے! تم دولہا بابا کے اوتار ہو، انہوں نے تمہیں ہی تو بھیجا تھا میرے پتیم کو لانے کے لیے!'' سانگی نے آگے بڑھ کر پیار سے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور میں اٹھ گیا۔

سانگی اب بالکل ٹھیک تھی۔ خوب بنی ٹھنی، صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ میں ان کی رسموں میں شریک ہو گیا۔ سانگی نے سات چراغ روشن کر کے مزار کے چاروں طرف رکھے۔ امرتا کی خوشیاں آسمان تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''سنو! تم بھی بابا جی سے مجھے مانگ لو۔''

''ایسا بھول کر بھی نہ کرنا ڈاکٹر جی! یہ امرتی سے بھی زیادہ ٹیڑھی ہے۔'' پتیم نے کہا۔ اس نے امرتا کی سرگوشی سن لی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔

سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ واپسی کے لیے تیار ہو گئے تو امرتا نے کہا۔ ''اب تمہیں ہمارے ساتھ گھر چلنا ہے، میں گوبھی کے پروسے بنا رہی ہوں، وہ کھا کر کہیں جانا۔''

مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے پتیم سے کہا۔ ''پتیم! اسے لے جاؤ، میں اس وقت نہیں جا سکتا۔''

پتیم ایک دم شرمندہ ہو گیا۔ وہ امرتا کو کچھ دور لے گیا، پھر اس نے نہ جانے اس سے کیا کہا کہ وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی لیکن جاتے جاتے اس نے اشاروں سے مجھے دھمکیاں دی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد وہاں سناٹا پھیل گیا، پھر میں وہاں سے واپس آ گیا۔ حجرے میں آیا تھا کہ موبائل پر کھیا سنگھ کا پیغام موصول ہوا۔

''بگھی بھیج دوں ڈاکٹر صاحب......؟''

''بھیج دیجیے۔'' میں نے جواب دیا اور سیل فون بند ہو گیا۔ نصیب اللہ کو میں نے بتا دیا کہ مجھے طلب کیا گیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد یادو کوچوان بگھی لے کر آ گیا۔

میری رہائشگاہ الگ تھی لیکن اسے بہترین طریقے سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ یہاں سے قید خانے والا کمرہ دور نہیں تھا، چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہاں کسی اور کو اس طرف آنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ کھیا سنگھ نے بڑی عاجزی سے کہا تھا کہ اب اس کی عزت میرے ہاتھ ہے۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی کی قیمت پر آپ کی عزت کی حفاظت کروں گا۔''

کھیا سنگھ نے قید خانے میں بنے ہوئے جنگلے کے تالے کی چابی مجھے دے کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے آپ کو اندر جانے کی ضرورت پڑ جائے۔''

''منورما کو کھانا وغیرہ کون پہنچاتا ہے؟''

''میں اور میری پتنی!''

''تو یہ چابی آپ کو نہیں چاہیے ہوگی؟''

''میرے پاس دوسری ہے۔''

میں اپنی رہائشگاہ میں فروکش ہو گیا۔ بہت خوبصورت کمرہ تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ ایک کھڑکی حویلی کے عقبی باغ کی طرف کھلتی تھی اور وہ کمرہ جسے منورما کا قید خانہ بتایا گیا تھا، اسی عقبی باغ کے حصے کی طرف کھلتا تھا۔ اس میں بھی ایک بڑی کھڑکی تھی جسے مضبوطی سے بند کر دیا گیا تھا۔

حویلی میں میری پہلی رات کا آغاز ہوا۔ میرے ذہن پر ایک بوجھ سا طاری تھا۔ رات کے ابتدائی حصے میں نیند آ گئی لیکن تین بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ تہجد کی نماز پڑھنے کو دل چاہا اور میں اٹھ گیا۔ وضو کر کے باہر نکلا۔ بس یونہی اتفاق سے کھڑکی پر نگاہ پڑ گئی تھی، لیکن باہر چاندنی کی مدھم چاندنی میں مجھے جو کچھ نظر آیا، اس نے مجھے ساکت کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط : 21

کھڑکی کے دوسری طرف حویلی کے عقبی باغ کا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کافی فاصلے پر حویلی کا احاطہ تھا جو درختوں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اونچے اونچے درختوں اور پھول پودوں نے احاطے کی دیوار کو ڈھک رکھا تھا۔ پھولوں کے اس جھاڑ کے پاس منورما نظر آئی جو پھولوں سے کوئی چار گز پیچھے تھی لیکن آن کی آن میں وہ پھولوں کے پاس پہنچی اور ان میں گم ہوگئی۔

میں حیرانی سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ دو مضبوط تالوں میں بند منورما باہر کیسے نکل گئی۔ اچانک میں اس کیفیت سے نکل آیا۔ اب میں چڑیا گھر میں قید کسی چیتے کی طرح مضطرب تھا اور باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن یہاں سے باہر جانا ناممکن تھا کیونکہ اس کے لیے دو طویل راہداریاں عبور کرنا پڑتیں اور ان کے راستے بند بھی ہو سکتے تھے۔

اب کیا کروں؟ اس بارے میں پہلے نہیں سوچا تھا۔ اب تک کی کہانی سے مجھے اتنا ہی پتا چلا تھا کہ کوئی نقاب پوش کسی پراسرار ذریعے سے منورما کے پاس آ جاتا ہے اور کھیا سنگھ کے تجزیے کے مطابق وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے لیکن منورما دو تالوں کے درمیان سے نکل کر باغ میں کیسے پہنچ گئی۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آیا اور میں نے جلدی سے وہ چابیاں تلاش کیں جو کھیا سنگھ نے مجھے دی تھیں۔ چابیاں سنبھال کر میں باہر دوڑا اور پھر پہلے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔

مضبوط تالے کو کھول کر اندر داخل ہوا اور پھر جنگلے والے کمرے میں پہنچ گیا۔ لاک اپ نما موٹی موٹی سلاخوں والے کٹہرے کا تالا بدستور لگا ہوا تھا لیکن ایک اور چیز مجھے صاف نظر آ گئی۔ کٹہرے والے کمرے میں کٹہرے کے اندر ایک کشادہ روشندان تھا۔ اتنا کہ ایک متناسب انسانی بدن اس سے باہر نکل سکے۔ میری توجہ اس طرف کبھی نہ جاتی کیونکہ روشندان بڑی فنکاری سے بنا ہوا تھا لیکن اس وقت اس روشندان سے ایک رسی لٹکی ہوئی تھی جس میں پاؤں جمانے کے لیے گرہیں لگی ہوئی تھیں۔

صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ میرا اندازہ تھا کہ رسی روشندان کے باہر بھی اسی طرح لٹکی ہوئی ہوگی۔ میں مکمل تحقیقات پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے چپلیں اتار کر نیفے میں اڑسیں اور رسی کو تول کر اوپر چڑھنے لگا۔ مجھے اپنی اس خوبی کا پہلی بار احساس ہوا تھا کہ میں ایسے کام بھی کر سکتا ہوں۔

روشندان کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے بدن کو اندر داخل کرنے کی کوشش کی اور تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس میں کامیاب ہوگیا۔ میرا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ رسی دوسری طرف بھی لٹک رہی تھی۔ نیچے اتر کر میں نے چپلیں پہنیں اور پھولوں کے اس جھاڑ کی طرف چل پڑا جہاں منورما گم ہوئی تھی۔ جھاڑ میں داخل ہو کر میں نے دیوار کو دیکھا جس پر مضبوط بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بیلوں کے ذریعے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کودنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے اس سے بھی گریز نہیں کیا۔

باہر ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا جس کے آخری سرے تک کسی ذی روح کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں رک جانا ضروری تھا۔ میں کئی منٹ تک وہیں کھڑا رہا تھا۔ آنکھیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ کچھ نہ پا کر آخر میں وہاں سے پلٹا اور دیوار عبور کر کے واپس اندر آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں دونوں تالے اسی طرح لگا کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر صورت حال کا تجزیہ کرنے لگا۔

منورما ذہنی طور پر معطل ہے بھی یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کے عشق میں گرفتار ہو کر وہ ذہنی طور پر بھٹک گئی ہو لیکن کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جن پر غور کرنا ضروری تھا مثلاً منورما کی میڈیکل رپورٹیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ اس کے خون میں کوئی زہریلی آمیزش تھی اور یہ زہر اس کے دماغ میں پھیلی رگوں میں گردش کر کے ذہنی فتور بھی پیدا کر سکتا تھا، لیکن پھر وہ نقاب پوش وجود؟

معاً میرے ذہن سے ایک خیال گزر گیا۔ مجھے وہ قوت بخش دی گئی تھی جس کے ذریعہ میں کسی انسانی وجود کو چشم تصور میں لا کر اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اتر سکتا تھا۔ میں نے اس نقاب پوش وجود کو نہیں دیکھا تھا لیکن منورما کے نقش میری آنکھوں میں پوشیدہ تھے۔ اسے خیال کی گرفت میں لا کر میں اس کے ذہن کی گہرائیاں کھنگال سکتا تھا۔

کیوں نہ مسئلہ حل کر لوں۔ مجھے منورما کا سارا کچا چٹھا پتا چل جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے فیصلہ کر لیا کہ اپنا کام شروع کر دوں لیکن پھر کچھ آوازیں کانوں میں ابھرنے لگیں۔ انکار کیا گیا تھا، محفوظ رکھوان لمحوں کے لیے جب وقت نا گزیر ہو جائے۔ ملے کو اپنا مت جانو، ورنہ تن آسان ہو جاؤ گے، پھر تم کچھ نہ رہو گے۔ مزہ اسی میں ہے کہ خزانوں کو محفوظ رکھو۔

لیکن دل سے ایک منفی آواز ابھری...... نہیں...... دوسری آواز نے کہا۔ یہی لمحے ہوتے ہیں بننے اور بگڑنے کے، انہیں میں ایمان کی حفاظت کرنا ہوتی ہے، اپنے باپ کی طرح۔

باپ کے خیال نے آنکھیں بند کر دیں۔ یوں لگا جیسے مسعود احمد انکار میں گردن ہلا رہے ہوں۔ پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا۔ گرمی لگنے لگی۔ گھٹن ہونے لگی۔ کھڑکی کھولی، کرسی اس کے پاس رکھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ تازہ ہوا نے ذہنی گھٹن بھی کم کر دی۔ آنکھوں پر ایک بوجھ سا پڑا اور نیم غنودگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔

پتا نہیں کب تک یہ غشی جیسی کیفیت طاری رہی، پھر بدن آرام طلب کرنے لگا۔ کھڑکی پر جا کر منورما کے کمرے کی طرف دیکھا۔ رسی بدستور لٹک رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی واپس نہیں آئی۔ کھڑکی بند کر کے بیڈ پر آ گیا۔ پھر گہری نیند طاری ہوگئی تھی۔

صبح کو اس وقت جاگا تھا جب حکیم احمد باورچی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ''معافی چاہتا ہوں بڑے صاحب۔ میں سمجھا آپ جاگ گئے ہوں گے۔'' اس نے ناشتے کے برتن میز پر رکھ کر مجرمانہ انداز میں کہا۔

''ارے ارے حکیم بھائی، معافی کیوں مانگ رہے ہیں، میں خود دیر سے اٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔

ناشتے سے فارغ ہوا تو حکیم احمد برتن لے گیا لیکن چند ہی منٹ کے بعد کھیا سنگھ اور اس کی بیوی آ گئے، وہ ناشتے کا سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ کھیا سنگھ نے کہا۔ ''یہ چابی بھول آئی ہے۔ آپ ذرا اپنی چابی دے دیں، واپس کرتے جائیں گے۔ آپ چاہیں تو آپ بھی آ جائیں۔''

''چلیں، میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر ہم تینوں کٹہرے کے سامنے پہنچ گئے۔ منورما صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال بھیگے ہوئے تھے اور چہرے پر شگفتگی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ارے۔ آج ناشتے میں ڈاکٹر......؟''

''بدتمیزی مت کرو منورما۔'' کھیا سنگھ نے کہا۔

''سوری ڈاکٹر جی۔ کیا آپ نے یہاں نوکری کر لی ہے؟''

میں مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور وہ جگہ تلاش کر لی جہاں رسی چھپائی گئی تھی، مسہری کے نیچے قالین کا کچھ حصہ ابھرا ہوا تھا۔ اس دوران کھیا سنگھ کی پتنی نے ناشتہ اس کے سامنے لگا دیا اور اپنے ہاتھ سے اسے ناشتہ کرانے لگی۔ وہ بڑے لاڈ سے ناشتہ کرتی رہی۔ بار بار وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے کہا۔

''میرا علاج شروع نہیں کیا آپ نے ڈاکٹر صاحب؟''

''کر دیا ہے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اس، نہ کوئی دوا نہ انجکشن، یہ کیسا علاج ہے؟''

''ایک خاص علاج ہے۔ بہت جلد نتیجہ نکلے گا۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''کسی وقت اکیلے آئیں میرے پاس۔ میں آپ کو اپنا علاج خود بتاؤں گی۔'' وہ بڑے بے باک انداز میں بولی۔

''چلو...... مجھے دیر ہو رہی ہے!'' کھیا سنگھ نے اپنی بیوی کو دھکا دے کر کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بیوی بھی سہم کر برتن اٹھانے لگی۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھے، میں بھی ساتھ تھا۔

جونہی وہ باہر نکلے، میں پلٹ آیا اور میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہارے علاج کے پہلے مرحلے کے طور پر مجھے یہ رسی غائب کرنی پڑے گی جو تمہاری مسہری کے نیچے قالین کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس وقت منورما کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔

کھیا سنگھ منورما کے الفاظ اور انداز سے سخت شرمندگی کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں، مجھ سے ضبط نہ ہو سکا میں نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر ہوں کھیا جی۔ ہمارے پاس گلے سڑے جسم آتے ہیں جن سے شدید تعفن اٹھ رہا ہوتا ہے۔ ہم ان سے کبھی گھن نہیں کھاتے بلکہ تن من صرف کر دیتے ہیں انہیں صحت مند کرنے میں۔ اب میرے سامنے دو بیمار ہیں ایک منورما اور دوسرے آپ۔''

میرے الفاظ پر کھیا سنگھ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا! ''میں......؟''

''جی۔ آپ اس درد کا شکار ہیں کہ منورما میرے سامنے ایسے الفاظ ادا کر رہی ہیں جو ایک جوان لڑکی کے منہ سے قابل اعتراض تصور کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی ملاقات پر انہوں نے کہا تھا کہ ان کی بیماری ان کا محبوب ہے۔ ان کی شادی کر دی جائے۔ آپ اس وقت نروس ہو گئے تھے۔''

''ہاں......!'' کھیا سنگھ کے منہ سے کراہ سی نکلی۔

''اس وقت بھی ان کے الفاظ نے آپ کو دل برداشتہ کیا ہے!''

''انکار نہیں کروں گا۔'' کھیا سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

''کھیا سنگھ جی۔ آپ کی بیماری کے لیے میں چند الفاظ انجکشن کے طور پر ادا کر رہا ہوں۔ سارے دھرم سب سے پہلے انسان بننے کا سبق دیتے ہیں اللہ، بھگوان، گوڈ، سارے نام ایک خالق کے ہیں جنہیں اپنی اپنی زبان میں پکارا جاتا ہے۔ ہم مسلمان اپنے ایمان کی سند اسی کو سمجھتے ہیں کہ اس کے نام کے ساتھ جو منہ سے ادا کریں اسے اپنی سانسوں سے زیادہ قیمتی سمجھیں۔ ہمارے ہاں ایک نوزائیدہ بچے کے کان میں اس کا نام لے کر اسے بتایا جاتا ہے کہ حق کیا ہے۔ ہمارے ہاں کلمہ حق پڑھ کر اپنے دین میں مکمل ہوا جاتا ہے۔ ہم اپنے معبود کے نام کے ساتھ جسے ہم نکاح کا نام دیتے ہیں، دو اجنبی زندگیوں کو ساری حیات کے لیے یکجا کر دیتے ہیں۔ میں اسی کا نام لے کر کہتا ہوں کہ منورما کا مقام میرے دل میں سگی بہنوں جیسا ہے، میں اس کے بھائی کی طرح ہوں اور جانتا ہوں کہ جو کچھ وہ بول رہی ہے، اپنی بیماری کے عالم میں بول رہی ہے۔ اس کے لیے نہ میں شرمسار ہوں نہ آپ کو ہونا چاہیے۔''

دونوں میاں بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔ دفعتاً کھیا سنگھ نے جھک کر میرے پاؤں چھوئے اور میں دنگ رہ گیا۔ بڑی شان و شوکت کا آدمی تھا وہ......!

بگھی کو کوچوان سمیت میرے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ کھیا سنگھا اپنے کسی کام سے چلا گیا تھا۔ میرا یہاں رکنا ضروری نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے نصیب اللہ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ باہر نکلا تو بگھی تیار کھڑی تھی، کوچوان پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔ ''چلیں سرکار......؟''

''او تمہیں فرصت ہے؟''

''ہم تو آپ ہی کے لیے کھڑے ہیں مالک۔ نمبردار جی نے یہی کہا ہے کہ آپ ہی کی ڈیوٹی دیں۔''

''ٹھیک ہے چلو۔'' میں نے کہا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ اچانک امرتا سامنے سے آتی نظر آئی۔ اس نے بگھی نہیں دیکھی تھی، اچانک ہی اس کی نظر بگھی پر پڑی۔ اس کے حلق سے زبردست چیخ نکلی اور وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر چیختی ہوئی بھاگی۔ اس بری طرح بھاگی کہ دو تین بار منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔

''پاگل ہو گئی ہے، کیا کروں اس کا؟'' کوچوان نے بڑبڑا کر کہا۔

''تم سے ڈر کر بھاگی ہے۔ عجیب لڑکی ہے، گرتی تو ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔'' میں نے کہا۔

''کہاں کی باتیں کر رہے ہیں سرکار۔ یہ ہم سے کیا، کسی سے بھی نہ ڈرے۔''

''پھر ایک دم اسے کیا ہو گیا؟''

''کوئی بات سوجھی ہوگی۔''

''سانگی کے گھر گئی ہے۔''

''ہاں جی۔ اس کا اصل ٹھکانہ ہی وہ ہے۔''

''ذرا چلو سانگی کے گھر۔''

''اچھا جی!'' کوچوان نے کہا اور چند لمحوں کے بعد بگھی سانگی کے گھر کے پاس روک دی۔ دروازہ کھلا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کوئی ابھی اندر گیا ہے۔ امرتا کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ میں اتر کر دروازے میں پہنچا اور آواز دی۔ ''پیتم......!''

لیکن جواب میں امرتا کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر دوبارہ پیتم کو آواز دی تو امرتا اور زور سے چیخی اور پھر اندر بھگدڑ سی مچ گئی۔ میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اسے کیا ہو رہا ہے۔ اسی وقت پڑوس کے دو تین بچے ہنستے ہوئے بگھی کے پاس پہنچے، وہ کہہ رہے تھے۔ ''ٹھنگو یا ٹوٹ گئی سسری کی لنگڑاتی ہوئی بھاگی ہے۔''

''کون......؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''وہی سسری امرتی۔ دیوار پر چڑھ کر کودی ہے، زور سے گری مگر اٹھ کر پچھائی پلے کی طرف بھاگ گئی۔'' ایک بچے نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''اوہ!'' میرے ہونٹ افسوس سے سکڑ گئے۔ ''سانگی اور پیتم کہاں ہیں؟''

''وہ تو چندوسی گئے ہیں!''

میں نے مایوسی سے گردن ہلائی۔ کوچوان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں بگھی میں بیٹھ گیا تو اس نے بگھی آگے بڑھا دی۔ میں نے کہا۔ ''تمہاری سگی بھانجی ہے؟''

''بالکل سگی جی!''

''ماں باپ زندہ ہیں؟''

''نہیں جی۔ دو سال کی تھی جب دونوں مر گئے۔''

''دونوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں جی، دونوں۔''

''کیسے؟''

''باڑھ آئی تھی گنگوتری میا میں۔ دونوں کو لے گئی۔ گنگوتری میا ہر سال بھینٹ لیوے ہے۔'' کوچوان نے بتایا۔

''گنگوتری کون ہے؟''

''ندی ہے۔ آپ نے نہیں دیکھی۔ دولہا بابا کے استھان سے تھوڑی دور ہی تو ہے۔ پر ایک بات بتائیں پورا بستی ڈبو دے ہے، مجال ہے دولہا بابا کے مزار شریف کی گھاس بھی بھگو دے۔ ترائی کے سارے لوگ اپنے گھر چھوڑ کر دولہا بابا دوار آ جاویں ہیں۔''

بگھی مسجد کے پاس پہنچ گئی۔ ''تم یہاں رکو گے یا واپس جاؤ گے۔''

''جو حکم کریں سرکار......!''

''شام چھ بجے آ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کوچوان نے کہا اور بگھی واپس موڑ دی۔ شکور اور بندو اپنے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

''پیش امام صاحب کہاں ہیں؟''

''کسی کام سے گئے ہیں، حجرہ کھولیں؟'' شکور نے پوچھا۔

''ہاں کھول دو۔'' میں نے کہا اور شکور نے مسجد کے اندر جا کر حجرہ کھول دیا، پھر بندو سے بولا۔ ''جا...... تو چائے بنوا کر لے آ۔'' بندو چلا گیا تو شکور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہ باؤلی تو نہیں ملی؟''

''کون؟''

''امرتا کی بات کر رہا ہوں۔ سانگی تو اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو گئی مگر اس دوسری باؤلی کو کون ٹھیک کرے۔''

''اسے پتا نہیں کیا ہو گیا۔'' میں نے شکور کو امرتا کی چیخوں کے بارے میں بتایا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''آپ کی جان چھوٹ گئی اللہ کے کرم سے۔ سب سے کہتی پھر رہی تھی کہ بابو جی اس سے بیاہ کریں گے، اس نے دولہا بابا سے منت مانی ہے اور چراغ لائی ہے منت کا۔ یہاں مشہور ہے کہ کوئی منت مانے اور اسے پوری نہ ہونا ہو تو منت کا چراغ بجھ جاتا ہے اور یہ بہت بڑی نحوست ہوتی ہے۔ پیش امام صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اس کی باتوں سے پریشان ہو رہے ہیں۔ میں نے ترکیب کر ڈالی۔''

''ترکیب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں ڈاکٹر صاحب۔ چوری سے سانگی کے گھر کی طاق میں رکھا چراغ پھونک مار کر بجھا دیا اور مشہور کر دیا کہ امرتا کی منت رد ہو گئی ہے، اب اگر وہ بابو جی کی صورت بھی دیکھے گی تو بابو جی اللہ نہ کرے، مر جائیں گے۔ بس اب وہ آپ کے سامنے کبھی نہیں آئے گی، خوب روتی پھرے ہے کہ ہائے اب بابو جی سے اس کا بیاہ نہیں ہوگا۔''

شکور اپنے کارنامے پر ہنس رہا تھا لیکن میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ میں کیا کر سکتا تھا اس معصوم لڑکی کے لیے، آہ کاش کسی طرح اس کے درد کا مداوا ہو جائے۔ کوئی حل نہیں نکل سکتا تھا۔ نصیب اللہ سے بھی اس موضوع پر بات ہوئی انہیں پوری بات کا علم تھا۔ وہ خود بھی افسردہ تھے۔ کھیا سنگھ کے بارے میں مختصر بات ہوئی تھی۔ نصیب اللہ شریف اور معزز انسان تھے، انہوں نے کھیا سنگھ کے کسی کام کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔

بگھی آ گئی اور میں واپس حویلی پہنچ گیا۔ کھیا سنگھ بھی آ گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے، پھر رات ہو گئی۔ حکیم احمد نے کھانا لگا دیا۔ کھانے کے بعد میں باہر نکل آیا اور حکیم احمد کے ساتھ ہی حویلی کے پچھلے باغ کی سیر کی۔ خاص طور سے پھولوں کی عظیم الشان کیاریوں کو میں نے بہت غور سے دیکھا۔ پھر واپس آ کر اپنے کمرے کی کھڑکی سے پوری پوزیشن کا جائزہ لیتا رہا۔ ابھی کوئی مؤثر خیال ذہن میں نہیں آیا تھا۔

رات کے کوئی بارہ بجے ہوں گے، میں چوروں کی طرح باہر نکل آیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بڑی احتیاط سے بڑے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ دوسری طرف مدھم بلب جل رہا تھا اور سلاخوں والے کمرے کی مسہری پر منورما گہری نیند سو رہی تھی۔

بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ایک خیال آیا۔ اس کے بارے میں اس کے ذہن میں جھانک کر معلوم کرنے کی ممانعت تھی لیکن اسے اندر سے تو دیکھا جا سکتا تھا۔ میڈیکلی اس میں کیا سقم تھا۔ ممکن ہے اس کا پتا چل جائے۔ کل دن میں اس کا معائنہ کروں گا۔

رات کو کئی بار جاگا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا سب کچھ پُرسکون تھا۔ دوسرے دن بھی معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ گیارہ بجے کے قریب میں نے کھیا سنگھ سے کہا۔ ''میں آج منورما کا چیک اپ کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''نہیں۔ آپ آرام کریں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کھیا سنگھ نے کہا، اور میں منورما کے پاس پہنچ گیا۔ آج اس کے چہرے پر پہلے دن جیسی تازگی نہیں تھی۔ وہ نڈھال تھی۔ مجھے اس نے سرسری نظروں سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔

''آپ کیسی ہیں منورما جی؟''

''پتا نہیں؟'' وہ بیزاری سے بولی۔

''میں آپ کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیجیے۔'' وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

''آپ لیٹ جایئے۔'' میں نے کہا اور وہ بے چوں وچرا لیٹ گئی۔

مجھے اُس کے اس طرح مان جانے پر حیرت ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے انسانی وجود میں جھانک کر اس کی بیماریوں سے آگاہ ہونے کی قوت بھوریا چرن نے دی تھی اور میں نے اس سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا تھا، لیکن چند لوگوں کو اس سے زندگی مل گئی تھی۔ پھر اس کے بعد بابا پردہ پوش نے مجھے بے شمار علم دے دیئے تھے اور اس قوت کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس وقت بھی میں اسی کا سہارا لے رہا تھا۔ میں نے اس پر نگاہیں جما دیں اور اس کا بدن دھواں دھواں ہونے لگا، پھر اس کے اعضاء روشن ہونے لگے۔ دل، جگر اور دوسرے اعضاء ایک تندرست وجود کی نشاندہی کر رہے تھے لیکن پورے بدن میں پھیلی رگوں میں روشن ذرات گردش کر رہے تھے۔ یہ اجنبی جراثیم تھے اور پہلے کبھی کسی کے خون میں ایسے ذرات کی آمیزش نہیں ملی تھی۔

میں انہیں دیکھتا رہا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے یہ میرے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ دل میں شدید خواہش بیدار ہوئی کہ کسی عمدہ سی لیبارٹری میں ان کا تجزیہ کروں اور کوئی انوکھا انکشاف کروں، لیکن ظاہر ہے مجھے ایسی لیبارٹری نہیں مل سکتی تھی۔ ڈاکٹر شکلا بھی یاد آیا جس کے کلینک میں بے حد شاندار لیب تھی، لیکن نہ جانے میری وجہ سے اس بے چارے پر کیا گزری۔

اچانک ہی ذہن کو دھچکا سا لگا۔ افلاک یاد آیا تھا۔ بابا صاحب کے حکم سے جہاں بھیجا جاتا تھا وہاں کے لیے تمام ضرورتیں فراہم کر دی جاتی تھیں۔ کیا اس خون کے تجزیے کے لیے مجھے ضرورت کی چیزیں فراہم کر دی جائیں گی۔

اسی وقت منورما کی آواز ابھری۔ ''کیا میں سو جاؤں ڈاکٹر صاحب!''

''نہیں پلیز۔ آپ اٹھ جایئے۔''

''دو منٹ باتیں کر سکتی ہوں آپ سے؟''

''ہاں ضرور......!''

''بیٹھ جایئے اور کسی کو نہ آنے دیجیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں بیٹھ گیا۔

''آپ کی شادی ہو گئی ہے؟'' وہ بولی۔

''نہیں!''

''پریم تو کیا ہوگا کسی سے؟''

آگے کہیے!'' میں نے کہا۔

''پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ محبت کی ماری ہوں۔ میں کیا کروں۔ وہ میرا دیوتا ہے۔ پوجا کرتی ہوں اس کی۔ جانتی ہوں کہ یہ ماتا پتا کے ساتھ...... زیادتی ہے مگر بہت مجبور ہوں۔ اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اس کے حوالے کر دو...... بس!''

''وہ کون ہے؟''

''ترکیشی۔ میرا محبوب؟''

''کہاں رہتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں!''

''کہاں لے جائے گا وہ تمہیں؟''

''جہاں بھی لے جائے۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔''

''تم لوگ باہر ملتے ہو۔''

''ہاں!''

''واپس یہاں کیوں آ جاتی ہو؟''

''پتا نہیں۔ بس آ جاتی ہوں۔''

''کیا ترکیشی مجھ سے مل سکتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ اس سے پوچھ لوں گی۔ مگر تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''پوچھوں گا اس سے کہ وہ کون ہے؟''

''مجھ پر سے پہرہ ختم کرا دو۔ ہم تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔''

''رسی کہاں ہے؟''

''اُس نے چھپا دی ہے۔''

''وہ آیا تھا؟''

''ہاں...... آتا ہے!''

اس سے زیادہ میں اس سے اور کیا بات کرتا۔ وہاں رکنا بھی بیکار تھا۔ ہاں ان چمکدار جرثوموں کا معاملہ تحقیقی حیثیت رکھتا تھا۔ کسی خیال کے تحت میں نے اس سے کہا۔ ''میں ویسے بھی تم پر کوئی پابندی لگانے کا حق نہیں رکھتا لیکن اب تم جیسے بھی ملوگی میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے واپس نکل آیا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں سوچ میں ڈوب گیا۔ منورما ترکیشی نامی نوجوان کو پاگلوں کی طرح چاہتی تھی اور اس کے لیے جان دینے پر آمادہ تھی۔ ترکیشی کسی صورت ملے تاکہ پتا چلے کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔''

اب تھوڑی سی الجھن ہونے لگی تھی۔ کھیا سنگھ نے مجھے بڑے مان سے روکا تھا، اسے دولہا بابا کی طرف سے میری نشاندہی کی گئی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے منورما کے لیے کیا کرنا ہے۔ البتہ اس کے خون میں تیرتے چمکدار جرثومے میرے لیے، بہت اہم تھے۔

رات کو تمام ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے بابا پردہ پوش کے تصور پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔ میں نے بے شک ان کا چہرہ پردے میں دیکھا تھا لیکن ان کی آنکھیں، ان کا سراپا میرے تصور میں تھا۔ اس وقت میں انہیں نگاہوں میں لانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن میری آنکھوں میں دھوئیں کی لکیریں گردش کر رہی تھیں۔ کوئی تصویر ہی نہیں بن پا رہی تھی۔ بیس منٹ تک کوشش کرتا رہا لیکن بابا صاحب کا تصور نقش نہ ہو سکا۔

تب اچانک میں چونک پڑا۔ یہ اظہار ناراضی بھی ہو سکتا ہے کہ نقش نہ بننے دیا جا رہا ہو۔ میرے دماغ میں آگ بھڑک اٹھی۔ ''کیوں۔'' میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ ''کیوں بابا صاحب کیوں...... کیا قصور ہے میرا، کونسا ولی ہوں میں۔ کونسا درویش ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ جو حکم ملا وہ کیا...... اور...... ویسے بھی میں نے ولی بننے کی کوششیں نہیں کیں۔ کوئی طلب بھی نہیں کی۔ اس شیطان زادے نے اپنے مطلب کی تکمیل کے لیے میرا انتخاب کیا لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں مانگا۔ جن لوگوں کو اس سے فائدہ ہوا، ان سے کوئی تعلق نہیں رکھا کہ کہیں لالچ کے زمرے میں نہ آ جائے۔ میں یہ بے اعتنائی دیکھ رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں لیکن خود احتسابی بتاتی ہے کہ بے گناہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مجھ سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں تو نادانستگی میں ہوئی ہیں۔

خود کلامی کر رہا تھا، لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے میرے گرد ہزاروں کا مجمع ہو، لاتعداد آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہوں۔ آنکھوں سے دو آنسو نکلے لیکن کھولتے ہوئے۔ سچ مچ جلتے پانی جیسے، جو میرے رخساروں پر جلن پیدا کر کے نیچے گر گئے۔

میں نے دیوانوں کی طرح آستین سے چہرہ رگڑ لیا اور میرے منہ سے جنونی آواز نکلی۔ ''دوبارہ میری آنکھوں سے مت نکلنا، ورنہ میں آنکھیں پھوڑ لوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے بری طرح آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ آنسو حیرت انگیز طور پر بند ہو گئے جیسے آنکھیں سہم گئی ہوں۔

اس کے بعد میں، بہت دیر تک پتھرایا بیٹھا رہا۔ اس سے قبل جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی افلاک میرے مانگنے سے پہلے مہیا کر دیتا تھا۔ مجھے کہیں بھیجا جاتا تھا تو وہاں کی ضرورتیں پوری کر دی جاتی تھیں۔ اب بھی مجھے ان آلات اور ادویات کی ضرورت تھی جن سے میں منورما کے خون کا تجزیہ کروں لیکن میں نے افلاک کو آواز نہیں دی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

پتا نہیں نیند آئی تھی یا نہیں، غنودگی کی سی کیفیت میں تھا کہ بستر پر کوئی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ پہلے تو نظر انداز کیا لیکن پھر بدن پر ایک بوجھ سا لگا۔ کوئی شے سرسرا رہی تھی۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک خوفناک کوبرا نظر آیا۔ گہرا کالا ناگ جس کا چوڑا پھن میرے چہرے کے عین سامنے تھا۔

انسانی فطرت سے گریز کیسے ممکن ہے۔ سانپ کو دیکھ کر جو فطری جھٹکا لگ سکتا تھا، وہ لگا اور میں نے پوری قوت سے بدن پر اوڑھی چادر جھٹک دی۔ سانپ مسہری سے دور جا گرا اور میں اٹھ کر سٹ گیا۔

رات کو لائٹ بھی نہیں بجھائی تھی، اس لیے کمرے میں تیز روشنی تھی اور میں اس سانپ کو بخوبی دیکھ سکتا تھا جو نیچے گرتے ہی سنبھلا تھا اور پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بے حد خوفناک سانپ تھا اس کے پھن پر دو سفید لکیریں تھیں اور لمبائی کوئی سات فٹ کے قریب تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ اسے شاید مجھے سزا دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اکثر آتش زادے سانپ کے روپ میں آ جاتے ہیں۔ ایک بار پھر دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سزا...... ہاں میرے اندر جو بغاوت بیدار ہوئی ہے اس کی سزا ملنا ضروری ہے۔ ''مجھے سزا دی جائے۔ میرے لیے سزا ضروری ہے۔'' مجھ پر پھر جنون طاری ہو گیا۔ ''سزا دو مجھے۔ مجھے سزا دو۔'' میں مسہری سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اپنی پنڈلی کھول کر سامنے کر دی اور سانپ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے میری پنڈلی پر پھن مارا اور گوشت اڑا لے گیا۔ کرب و اذیت کا سمندر موجزن ہو گیا لیکن میں نے دوسری پنڈلی کھول کر سامنے کر دی۔

''یہاں بھی......!'' میرے حلق سے آواز نکلی اور سانپ نے دوسری پنڈلی سے بھی گوشت اڑا لیا۔ وہ خود بھی شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ ''یہاں بھی'' میں نے بازو سامنے کیا۔ سانپ میرے بدن کو جگہ جگہ سے کاٹتا رہا اور میں اس کی ضیافت کرتا رہا۔ میرا سارا بدن زہر بنا ہوا تھا۔ مجھے ڈاکٹر ہونے کے باوجود پہلی بار پتا چل رہا تھا کہ درد کیا ہوتا ہے۔ سانپ نے خود ہار مان لی اور پھر وہ واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں زمین پر پڑا رہا۔ اپنا تجزیہ کرتا رہا کہ سانپ کے کاٹنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ سانپ کے ڈسے ہوئے جو مریض میرے پاس آتے تھے، ان پر کیا بیت رہی ہوتی ہوگی لیکن مجھے ابھی تک موت کیوں نہیں آئی؟ میں زندہ ہوں، کیا وہ سانپ زہریلا نہیں تھا۔ مگر میری تکلیف، وہ صرف زہر سے ہی ہو سکتی ہے۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے بدن کو دیکھا۔ وہ پانی کیوں نہیں بن رہا۔ اوہ، یہ شاید ہلکی سزا تھی۔ شاید...... سانپ زہریلا نہیں تھا۔ کافی دیر تک زمین پر لیٹا اپنے درد کا تجزیہ کرتا رہا، پھر اٹھا۔ غسل خانے پر نظر پڑی تو سانپ کے بارے میں سوچا۔ اُدھر ہی گیا تھا۔ کیا ابھی تک وہیں ہے۔

غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، اسے کھول کر اندر جھانکا۔ سانپ وہاں نہیں تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے چھت کی طرف متوجہ کیا اور حیران رہ گیا۔ چھت کے قریب ایک بڑا روشندان تھا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ پہلے یہ روشندان نہیں دیکھا تھا۔ اس پر غور ہی نہیں کیا تھا لیکن اس روشندان کو دیکھ کر ایک عجیب سی الجھن بیدار ہو گئی۔ سانپ کے بارے میں، میں نے سوچا کہ وہ کوئی جن تھا۔ اکثر جن سانپ کا روپ دھارتے ہیں۔ میں نے بابا صاحب سے شکایتیں کی تھیں۔ ان کی سزا کے طور پر سانپ نے مجھے کاٹا اور چونکہ یہ صرف سزا تھی، سزائے موت نہیں تھی اس لیے میں زندہ رہا لیکن...... سانپ کو اس طرح واش روم میں داخل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ باہر جانے کے لیے روشندان کو استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ آتش زادہ تھا تو وہیں کھڑے کھڑے غائب ہو سکتا تھا اور پھر آتش زادے اتنے نفاست پسند ہوتے ہیں کہ کبھی کسی غلیظ جگہ نہیں داخل ہوتے۔

''تو پھر......؟''

واپس آ کر بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، زخم اب بھی تکلیف دے رہے تھے۔ میں لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں، اندر سے عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

بڑی مشکل سے نیند آئی تھی۔ دیر تک سوتا رہا صبح کو جاگا تو طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ زخموں پر غور کیا تو دنگ رہ گیا۔ ہاتھوں یا پیروں پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ حیرت سے ان تمام جگہوں کو دیکھا جہاں سانپ نے کاٹا تھا۔ کچھ نہیں تھا۔ رات کی اذیت کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا، ورنہ گزرے ہوئے واقعات پر خواب کا گمان ہوتا۔

لباس لے کر غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ ایک بار پھر روشندان پر نگاہ پڑی۔ ایسا تھا کہ جب بند تھا تو دیوار کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا، اسی لیے پہلے کبھی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ مگر اب وہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا کھلے ہونا بھی اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ سانپ والی بات خواب ہرگز نہیں تھی۔

حکیم احمد نے ناشتہ لگا دیا۔ ناشتے سے فراغت حاصل کر کے منورما کے بارے میں سوچا اور دل چاہا کہ اسے دیکھوں۔ وقت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ منورما ناشتہ کر چکی ہوگی۔ دونوں تالوں سے گزر کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ بے حد خوبصورت لباس میں ملبوس نکھری نکھری سی بیٹھی تھی۔ آنکھوں میں وہ غنودگی بھی نہیں تھی جو عموماً رہتی تھی۔ مجھے دیکھ کر شوخی سے بولی۔ ''آؤ ڈاکٹر...... کیسے ہو؟''

''شکریہ منورما!''

''بیٹھو...... باتیں کریں گے۔''

''تمہارا ترکیشی نہیں آیا؟''

''وہ جاتا کہاں ہے جو آئے گا۔'' وہ مخمور لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''وہ تو رہتا ہی میرے اندر ہے۔ جب دل چاہتا ہے میرے اندر سے نکل کر باہر آ جاتا ہے۔ قریب آؤ...... مجھے سونگھ کر دیکھو۔ اس کی خوشبو سے بسی ہوئی ہوں، آؤ...... سونگھو۔''

''نہیں...... تم ٹھیک کہتی ہوگی۔'' میں نے جلدی سے کہا اور وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔ ''کوئی علاج نہیں کر رہے میرا۔ مفت کا مال سمیٹ رہے ہو۔ چلو تمہارا بھی بھلا ہو رہا ہے میری وجہ سے۔ ویسے بھی میرے پتا جی کے پاس بڑی دولت ہے۔''

یہ الفاظ مجھے بہت برے لگے تھے۔ ''مجھے لگتا ہے تمہارا علاج کرنا ہی پڑے گا، لیکن یہ علاج بہت سخت ہوگا تمہارے لیے۔''

''اپنا علاج میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی علاج ہے ہی نہیں۔''

میں وہاں زیادہ نہیں رکا۔ رات سے شدید جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ ایک خطرناک خیال دل میں آیا۔ میں نے سوچا کہ کھیا سنگھ سے کچھ چیزوں کی فرمائش کروں اور ان کی مدد سے پہلے منورما کے خون کا تجزیہ کروں اور پھر اس کا پورا خون ہی بدل ڈالوں۔ ایسا علاج ہوگا کہ مزہ آ جائے گا اسے۔ بہت کم غصہ آتا تھا مجھے، لیکن نہ جانے کیوں رات سے بالکل کیفیت بدل گئی تھی۔

صاف ستھرا ہو کر کھیا سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ بیڈ روم میں تھا اور بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس کا سر دبا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''بخار آ گیا ہے ڈاکٹر کامران۔ سر میں درد ہے۔ تم نے تو ابھی تک شادی نہیں کی لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ پتنی کے نرم ہاتھ جب سر دباتے ہیں تو منش خود کو سورگ میں محسوس کرتا ہے۔ آؤ بیٹھو!''

''کوئی دوا لی آپ نے۔''

''ہاں معمولی سے بخار کی دوا ہے۔ حسے پور میں ایک سرکاری ڈسپنسری تو ہے لیکن اچھے میڈیکل اسٹور نہیں ہیں۔ میں اپنی ساری دوائیں دلی سے منگوا لیتا ہوں اور ان کا اسٹاک رکھتا ہوں۔ یہ دیکھیں، ابھی ناشتے کے بعد خوراک لی ہے!'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے دوا کی شیشی اٹھا کر دیکھی، پھر کہا۔ ''دوا بالکل ٹھیک ہے لیکن اس کی ایکسپائر ڈیٹ دیکھتے رہا کریں۔''

''اس کا میں پورا خیال رکھتا ہوں۔''

''ایک بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔''

''ضرور...... بولو۔''

''میں حکومت ہندوستان کا ایک مفرور مجرم ضرور ہوں لیکن زندگی بچانے کے لیے نہیں چھپتا پھر رہا۔ حسے پور سے نکل گیا تھا، لیکن صرف پیتم کو سانگی کے حوالے کر کے ایک ماں کی دعا لینے آیا تھا کیونکہ پاکستان میں میری ماں میرا انتظار کرتی ہوگی۔ آپ نے مخلصانہ میرے لیے، بہت کچھ کیا لیکن میں اب بھی کہتا ہوں کہ میں اپنی گرفتاری سے ذرہ بھر بھی نہیں ڈرتا۔''

''ڈاکٹر کامران۔ کسی نے کچھ کہا ہے...... لیکن کس نے؟''

''نہیں...... دل میں خیال آتا ہے کہ میں یہاں کافی وقت صرف کر رہا ہوں۔'' میں نے منورما کے الفاظ نہیں بتائے۔

''تم میرے نہیں دولہا بابا کے مہمان ہو۔ انہوں نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے، کیوں ایسا سوچ رہے ہو؟''

''مجھے کچھ چیزیں درکار ہیں جو میں منورما کے علاج کے لیے منگوانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے ان کی فہرست بنا کر دے دو، دلی سے منگوا دوں گا۔''

''آپ کامران جی کو کیوں نہیں بتاتے۔'' کھیا سنگھ کی بیوی نے کہا اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ ''کوئی خاص بات ہے؟''

''بس دل غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ الٹے سیدھے سپنے آتے رہتے ہیں۔ ایک سپنا دیکھا ہے اور من بے کل ہو گیا ہے۔ میں نے دیکھا میں ایک چتا کو آگ لگا رہا ہوں اور میری پتنی میرے پاس کھڑی رو رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کھیا سنگھ کی آواز بھرا گئی۔

مجھ سے کوئی بات نہیں بن پڑی۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر کھیا سنگھ خود کو سنبھال کر بولا۔ ''ان چیزوں کی فہرست مجھے دے دو۔ میں کل آدمی دلی روانہ کر دوں گا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ان کے پاس سے اٹھ آیا۔

میں نے کھیا سنگھ کو ضروری چیزوں کی فہرست بنا کر دے دی اور اس نے وعدہ کیا کہ آج ہی دلی میں موجود اپنے ایک خاص آدمی کو یہ فہرست پہنچا دے گا۔

''وہ پڑھا لکھا آدمی ہے، تمام چیزیں مناسب جگہوں سے خرید کر لے آئے گا۔''

اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا۔ منورما نے جو الفاظ کہے تھے، انہوں نے دل خراب کر دیا تھا چنانچہ اس کے پاس دوبارہ نہیں گیا۔ یہاں سے اکتا کر نصیب اللہ کے پاس چلا جاتا تھا۔ دو دفعہ بالکل اتفاقیہ طور پر امرتا نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر پاگلوں کی طرح دوڑ لگا دیتی تھی، آنکھوں پر ہاتھ یا دوپٹہ رکھ لیتی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

چوتھے دن ایک شخص وہ تمام چیزیں لے کر آ گیا۔ یہ تمام چیزیں کھیا سنگھ نے وصول کی تھیں مجھے اس شخص کے سامنے نہیں کیا تھا، بعد میں، میں نے ان کا جائزہ لیا۔ سب ٹھیک اور میری ضرورت کے لیے کافی تھیں۔ میں نے ایک کمرہ اپنی لیبارٹری کے لیے منتخب کیا اور تمام ضرورتیں مکمل کر لیں۔ پھر میں نے کھیا سنگھ سے کہا۔ ''اب آپ منورما جی سے پوچھ لیں کہ کیا وہ مجھ سے اپنا علاج کرانا پسند کریں گی؟''

''اگر وہ انکار کر دے تو......!''

''انہیں بے ہوش کر کے کام کیا جائے گا۔''

کھیا سنگھ نے مجھے رپورٹ دی۔ ''وہ ناراض ہو گئی۔ کہتی ہے کہ وہ ہمیں اپنی بیماری کا حل بتا رہی ہے، ہم فضول کوششوں میں مصروف ہیں اور حل وہی بے ہودہ ہے۔''

''آپ اس کی زندگی چاہتے ہیں کھیا جی؟''

''ہاں...... اور کیا چاہوں گا۔''

''پوری بستی کو یہی علم ہے کہ وہ لندن میں مر چکی ہے۔''

''ہاں......!''

''جب وہ ٹھیک ہو جائے گی تو آپ کسی اور ملک بھجوا دیں گے۔''

''یہی کرنا ہوگا۔''

''گویا وہ آپ سے دور ہو جائے گی۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''کچھ خدشات ہیں میرے ذہن میں۔''

''کیا......؟ مجھے بتاؤ۔''

''میں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ اس کا سارا اندرونی نظام شاندار ہے، اسے کوئی بیماری نہیں ہے لیکن اس کے خون میں کچھ نامعلوم تبدیلیاں ہیں۔ ایسی تبدیلیاں جن کا میڈیکل سائنس میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ مجھے ان روشن جراثیم پر شبہ ہے اور میں اس پر کام کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھا پھر؟''

''مجھے اس کا سارا خون بدلنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی کیفیت بدل جائے گی۔ فساد کی جڑ یہی روشن جراثیم ہیں، یہ اگر اس کے جسم سے خارج ہو جائیں تو وہ معتدل ہو سکتی ہے لیکن......''

''ہاں بولو۔ لیکن کیا؟''

''ممکن ہے اس کے بعد وہ سب کچھ بھول جائے۔ یہ بھول جائے کہ وہ کون ہے۔ آپ کون ہیں!'' میں نے کہا۔

''ہمیں بھول جائے؟'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''ہاں۔ امکان ہے۔ اس طرح وہ اپنے اس روایتی محبوب کو بھی بھول جائے گی۔''

''یہ تو...... یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا کہ وہ ہمیں بھول جائے۔ پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔'' وہ غم آلود لہجے میں بولا۔

''ہاں۔ یہ مشکل تو ہے۔''

''پھر کیا کریں؟''

''یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

''اجازت دو تو میں یشودھا سے بات کر لوں۔ میرا مطلب ہے اپنی پتنی سے۔''

''ضرور......!''

''تم نے میڈیکل کا یہ سامان اسی لیے منگایا ہے؟''

''سو فیصد!''

''اچھا......'' وہ مایوسی کے انداز میں بولا۔ ''میں کچھ اور سمجھا تھا۔''

''کیا......؟''

''دولہا بابا نے مجھے تمہاری طرف اشارہ کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ تمہارے ذریعے کوئی چمتکار دکھائیں گے، لیکن انہوں نے بھی چھوڑ دیا، میں ابھی تم سے ملتا ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل میں کوئی احساس نہیں تھا۔ بس یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس پر تیار نہ ہوا تو خاموشی سے آج ہی رات حسے پور چھوڑ دوں گا۔ آگے کیا کروں گا۔ یہ فیصلہ وقت کرے گا کیونکہ فیصلے وقت ہی کرتا ہے، وقت ہی تقدیر ہے۔

کھیا سنگھ نے واپس آنے میں زیادہ وقت نہیں لیا تھا لیکن اب اس کے چہرے پر خوشی تھی۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ چہکتے لہجے میں بولا۔ ''ہم نے جو ترکیب سوچی ہے، سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔''

''مجھے یقین ہے کہ آپ نے کوئی بہترین بات سوچی ہوگی۔''

''سنو...... تم اس کا خون تبدیل کرو گے۔ وہ زندہ تو رہے گی؟''

''ان شاءاللہ۔'' میں نے کہا۔

وہ مسکرا دیا، پھر بولا۔ ''مجھے اس لفظ کے معنی معلوم ہیں۔ خیر، تو تم اس کا خون بدلو گے اور وہ اپنا ماضی بھول جائے گی۔ بھول جائے، ہم اسے خفیہ طور پر دوبارہ انگلینڈ لے جائیں گے، وہاں پلاسٹک سرجری کر کے اس کا چہرہ بدلوا لیں گے۔ میں جانتا ہوں وہاں سرجری اتنی ایڈوانس ہے۔ پھر ہم اسے کھلم کھلا واپس لے آئیں گے۔ میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ یہ میرے ایسے دوست کی بیٹی ہے جو انگلینڈ میں رہتا تھا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ ماں پہلے ہی نہیں تھی، چنانچہ اس بے سہارا لڑکی کو میں اپنے ساتھ لے آیا۔ اسے یہی باور کرایا جائے گا کہ وہ میرے دوست کی بیٹی ہے۔ کم از کم......'' کھیا سنگھ مسکراتے مسکراتے رو پڑا۔ ''کم از کم وہ زندہ رہے گی۔ ہمارے پاس رہے گی۔ ہم اسے دیکھ تو سکیں گے۔ ہمیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری منورما ہے۔''

میں جانتا تھا کہ منورما ٹیسٹ کے لیے اپنے خون کا نمونہ کبھی نہیں دے گی، اس کے لیے اسے بے ہوش کرنا ضروری ہوگا لیکن انجکشن کے ذریعے بے ہوش کرنے میں خون ڈسٹرب ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے دوسرا انتظام کیا تھا اور ضرورت کی چیزیں منگوالی تھیں۔ اسے اس وقت بے ہوش کیا گیا جب اسے دوپہر کا کھانا پہنچایا گیا۔ ایک ہلکی سی گیس اس کے نتھنوں میں پہنچائی گئی اور وہ چکرا گئی۔ میں کھیا سنگھ اور اس کی بیوی کے پیچھے تھا۔ جیسے ہی وہ چکرائی، میں پھرتی سے اندر داخل ہوا اور میں نے اس کی وین سے بلڈ لے لیا۔ یہ بے ہوشی صرف چند منٹ کی تھی۔ اس نے دو منٹ کے بعد ہی گردن جھٹکی اور آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ''ارے۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''چکر سا آ گیا تھا۔''

''بھوک لگی ہوگی۔ چلو کھانا کھاؤ۔'' کھیا سنگھ کی بیوی نے کہا اور اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگی۔

میرا کام ہو گیا تھا، جو جگہ میں نے اپنی لیبارٹری کے طور پر بنائی تھی، وہاں میں نے سارے انتظامات کیے تھے، چنانچہ دروازہ بند کر کے میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بہت دن کے بعد ایسا کوئی کام کر رہا تھا، عجیب سا لگ رہا تھا۔ طویل عرصہ سے ماورائی قوتوں کے زیر اثر کام کر رہا تھا۔ جو سوچا وہ ہو گیا۔ اس انوکھے خون کا تجزیہ کرنا بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔ وہ چمکدار جرثومے بے حد حیرت ناک تھے۔

لندن کی لیبارٹریز کی رپورٹیں بھی مدِ نگاہ تھیں اور میرا تجزیہ ان سے مختلف نہیں تھا۔ یہ زہریلے جراثیم دماغ کو کوئی بھی خیال دے سکتے تھے اور انسان کسی بھی احساس کے زیر اثر آ سکتا تھا۔ بس یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ بیرونی اثرات ہیں یا کوئی قدرتی چیز، لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان جرثوموں کا خون سے اخراج کر دیا جائے تو ذہنی کیفیت بدل سکتی ہے۔ گویا آپریشن کیا جا سکتا تھا۔

اس رات ایک عجب سی بے کلی دل پر طاری تھی۔ سونے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تو اپنی جگہ سے اٹھ گیا، بس کسی قدرتی اشارے کے تحت کھڑکی پر پہنچا۔ باہر دیکھا تو ایک انسانی جسم نظر آیا۔ عجیب سے چست لباس میں ملبوس تھا، چہرہ کالے نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ ایک دم بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی، کالے نقاب والا...... کانوں میں سرگوشی سی ابھری۔

وہ اس کمرے کے عقب میں پہنچ گیا جس میں منورما تھی اور پھر اچانک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ایک دم کہاں غائب ہو گیا۔ دیر تک آنکھیں پھاڑتا رہا لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

اب کیا کروں......؟ میں نے پریشانی سے سوچا۔ ان کے کمرے کے اندر جاؤں مگر یہ بیکار ہوگا۔ پھر...... اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔

(جاری ہے)

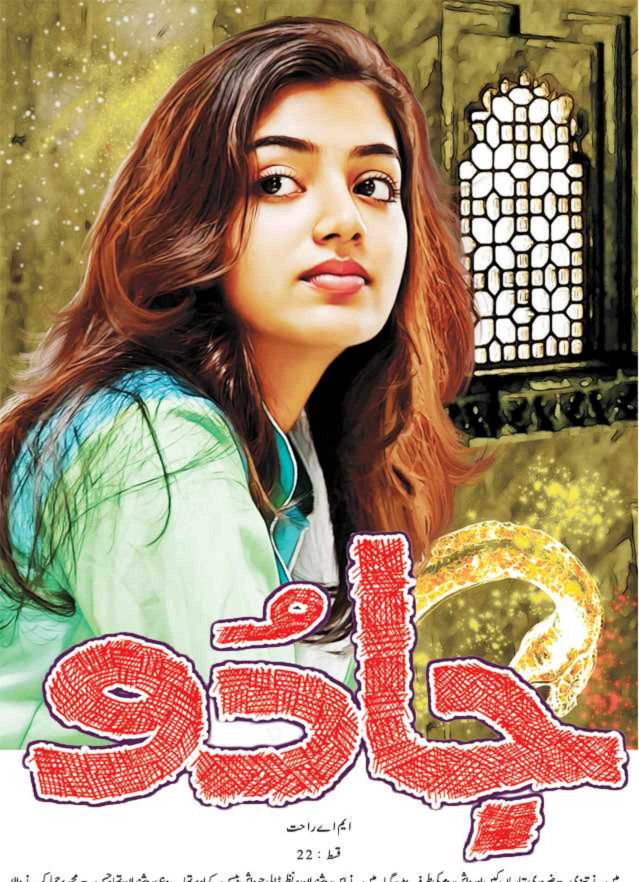

جادو

ایم اے راحت

قسط : 22

میں نے تیزی سے ضروری تیاریاں کیں اور واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس روشندان پر نظر ڈالی جو واش بیسن کے اوپر تھا۔ یہ وہی روشندان تھا جس سے مجھ پر حملہ کرنے والا سانپ باہر نکلا تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس روشندان سے میرا جسم بہ آسانی دوسری طرف نکل سکتا ہے۔ بالکل ایسا ہی روشندان منور ما کے اس کٹہرے کے اندر تھا جس سے منور ما رسی کے ذریعے دوسری طرف اتر جاتی تھی۔

میں نے واش بیسن کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور پھر اپنے بدن کو تول کر بیسن پر چڑھ گیا۔ وہاں سے ہاتھ اوپر بڑھائے۔ وہ بہ آسانی روشندان تک پہنچ گئے۔ میں ہاتھ مضبوطی سے جما کر روشندان میں داخل ہو گیا۔ دوسری طرف جھانک کر دیکھا تو کسی قدر پریشان ہوا کیونکہ زمین خاصی نیچے تھی۔ میں نے پروا نہ کی اور نیچے کود گیا۔ چوٹ لگی لیکن ایسی بھی نہیں کہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ میں نے پھولوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ راستہ وہی اختیار کیا جہاں سے منور ما کو جاتے دیکھا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں، میں پھولوں کے کنج میں جا گھسا اور احاطے کی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے مجھے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودنا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کالے نقاب والا باہر ضرور آئے گا۔ میں اس کا پیچھا کر کے اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ہمت کر کے دوسری طرف کود گیا۔ اب مجھے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں خود کو پوشیدہ کر کے اس کی واپسی کا انتظار کروں۔

تقدیر نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ ایک بالکل ناکارہ اور ٹوٹے ہوئے ٹرک کا ڈھانچہ کچھ فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ بہترین جگہ تھی، میں اس کی طرف دوڑ گیا۔ اب میں آسانی سے خود کو پوشیدہ رکھ کر اس کا انتظار کر سکتا تھا۔

میری نظریں اُدھر جمی ہوئی تھیں اور میں ایک صبر آزما انتظار کے لیے تیار تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ منور ما کا محبوب ہے، اس سے ملنے آیا ہے۔ کافی دیر یہاں رکے گا، ممکن ہے صبح تک۔

لیکن اس وقت حیرت ہوئی جب کوئی پچیس منٹ کے بعد ہی وہ اسی دیوار سے نیچے کودا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔

دوسرے لمحے ایک اور وجود دیوار سے کودا جسے اس نے سہارا دیا تھا۔ یہ منور ما تھی۔ اس نے نیچے اتر کر جوتے پہنے اور پھر نقاب والے نے جو بہت چاق و چوبند اور ورزشی بدن کا مالک نظر آ رہا تھا، منور ما کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

میں خود کو سنبھال کر ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔ منور ما بار بار لڑکھڑا رہی تھی لیکن اس کا ساتھی اسے مضبوطی سے سنبھالے ہوئے تھا۔ میں خود کو چھپاتا ہوا کامیابی سے ان کا پیچھا کرتا رہا۔ لیکن وہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بستی پیچھے رہ گئی اور اس کے آخری گھر کی روشنی بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں چلتے چلتے تھک گیا۔ پھر ایک مدھم سا شور کانوں میں ابھرا۔ یہ پانی کا شور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور عجیب سا شور سنائی دیا۔ سو فیصد یہ انسانی آوازیں تھیں، پھر کچھ اور انکشاف ہوا۔ بہت دور آسمان پر پیلی سی روشنی نظر آ رہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

لیکن اس وقت بری طرح چونک پڑا، جب اچانک وہ دونوں نگاہوں سے غائب ہو گئے۔ یوں لگا جیسے وہ زمین کی گہرائیوں میں چلے گئے ہوں۔

میں نے تیزی سے دوڑ لگائی اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ دونوں گم ہوئے تھے۔ صورت حال لمحوں میں واضح ہو گئی۔ یہاں ڈھلان تھی جس کے اختتام پر ایک پُرشور ندی بہہ رہی تھی۔ پانی کا شور اس ندی کے بہنے کا تھا۔ لیکن دوسرے شور اور روشنیوں کا راز بھی مل گیا۔ ندی کے کنارے تھوڑے فاصلے پر جھونپڑوں کا ایک شہر آباد تھا۔ بے شمار جھونپڑے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان انسان چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔

یہ کون ہیں۔ اور رات کے اس وقت یہ چہل پہل کیوں ہے۔ بظاہر کوئی خانہ بدوش قبیلہ معلوم ہوتا تھا جو طویل عرصے سے یہاں آباد ہو گا۔ ان کے جھونپڑے یہی بتاتے تھے۔ اوہ تو کیا منور ما کا محبوب اس قبیلے کا کوئی فرد ہے؟ اس کا یہاں آنا تو یہی ظاہر کرتا تھا۔ اور پھر یہ ندی؟ اسی کے بارے میں امرتا کے ماما نے بتایا تھا کہ اس میں ہر سال باڑھ آتی ہے اور انسانوں کی بھینٹ لیتی ہے۔ تو کیا یہ خانہ بدوش یہاں مستقل آباد ہیں۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن منور ما اور اس کا محبوب کہیں نہیں نظر آئے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں ڈھلان سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر میں ندی کے ساتھ ساتھ ان جھونپڑوں کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اس چہل پہل پر حیرت تھی۔ وہ روشنی ان جھونپڑوں کے دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ زیادہ تر لوگ اسی طرف جا رہے تھے۔

آخر کار میں جھونپڑی کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ دو لمبے چوڑے خانہ بدوش کسی طرف سے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں نوکدار بھالے تھے۔ چہرے بڑے خوفناک تھے۔ ان دونوں نے میرے سامنے آ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”جے رام جی کی مہاراج“

میں نے جواب میں دونوں ہاتھ جوڑے لیکن منہ سے کچھ نہ کہا تب ان میں سے دوسرا بولا۔ ”پہرے دار ہیں ہم، آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔“

”تمہاری بستی میں مہمان ہوں۔ ڈاکٹر ہوں۔“

”اوہ۔ پیش امام جی کے مہمان۔“ اس نے کہا اور میں دنگ رہ گیا۔

”ارے۔ تمہیں معلوم ہے۔“

”نہیں کے بیچ رہتے ہیں مہاراج، اور پھر پیش امام کو تو سبھی مانیں ہیں۔ سب کے سچے ساتھی۔ سب کے کام آنے والے، پر مہاراج آپ ادھر کیسے نکل آئے۔“

”بس دل چاہا۔ آج موسم بہت اچھا ہے۔“

”آج ناگ پنچھی ہے مہاراج، ہمارا تہوار۔ آج ہم ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ آج کوئی باہر والا ادھر نہیں آتا۔ ہم پہرہ دیتے ہیں اور کسی باہر سے آنے والے کو اندر نہیں آنے دیتے۔“

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ مجھے پتا نہیں تھا۔“ میں واپسی کے لیے مڑا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”رکیں بابو جی۔“ میں رک گیا تو اس نے دوسرے سے کہا۔ ”سوامی سے پوچھ لو۔ پیش امام جی کے مہمان ہیں اور تمہیں معلوم ہے سوامی، امام جی کو دیوتا سمان مانتے ہیں۔“

”تم ٹھہرو۔ میں پوچھ کر آتا ہوں۔“ دوسرے نے کہا اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑا۔ اس کے بعد خاموشی طاری رہی تھی۔ البتہ میری نظریں اب بھی منور ما اور اس کے محبوب کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہیں نظر آ رہے تھے۔ میں نے پہرے داروں سے ان کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

تھوڑی دیر کے بعد پہریدار واپس آ گیا۔ اور اس نے ادب سے کہا۔ ”آیئے مہاراج، سوامی نے آپ کو بلایا ہے۔“ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ جھونپڑے بے ترتیب بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کے سامنے احاطے تھے۔ جن میں جانور بندھے ہوئے تھے۔ بھیڑیں، بکریاں، بطخیں، مرغیاں وغیرہ۔ آخر کار جھونپڑوں کا سلسلہ ختم ہوا اور ایک بڑا سا احاطہ نظر آیا جو خاص قسم کی قد آدم گھاس سے گھرا ہوا تھا۔ عظیم الشان احاطے میں طویل و عریض دائرہ بنائے لاتعداد انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ پھٹے پرانے، میلے کچیلے لباس میں ملبوس مرد، عورتیں، بچے۔ اونچے اونچے بانس بندھے ہوئے تھے جن پر مشعلیں روشن تھیں اور دور سے جو مجھے روشنی نظر آئی تھی وہ انہیں مشعلوں سے ہو رہی تھی۔

ایک طرف ایک چوکی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک قوی ہیکل شخص بیٹھا ہوا تھا۔ یہ خاصی معقول شکل کا تھا۔ کلین شیو تھا اور آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ مجھے اس کے پاس لے جایا گیا۔ تو وہ تخت سے نیچے اتر آیا۔ جھک کر دونوں ہاتھ جوڑے پھر تخت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”پدھاریئے مہاراج۔“

”آپ سوامی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”داس ہوں آپ کا۔ آیئے۔“ اس نے کہا اور میں تخت پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہاں موجود جم غفیر مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ سوامی میرے پاس بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ ”آج ناگ پنچھی کا تہوار ہے۔ ہم رات کو چاند نکلے ناگ پوجا کرتے ہیں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ ادھر کا رخ کر کے آپ کو پریشان نہ کرتا۔“

”کوئی بات نہیں۔ مہمان بھگوان سروپ ہوتے ہیں۔ بس پہرہ اس لیے لگایا ہے ہم نے کہ بستی کے بگڑے ہوئے لڑکے دارو پی کر ہلڑ مچانے آ جاتے تھے، یہ ہمارا خاص تہوار ہوتا ہے اور کوئی سپیرا دارو نہیں پیتا۔“

”آپ سپیرے ہیں۔“

”ہاں۔ ہم باوڑے ہیں۔ سانپوں کا کام کرتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جو دوسرے سپیرے کرتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہم ناگ پکڑ کر کھیل تماشے نہیں دکھاتے پھرتے بلکہ ان کے زہر کا کاروبار کرتے ہیں۔“

”اچھا۔ وہ کیسے؟“

”بڑی بڑی لیبارٹریوں کو دوائیں اور دوسری چیزیں بنانے کے لیے سانپوں کے زہر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم انہیں سانپوں کا زہر سپلائی کرتے ہیں۔“

”وری گڈ۔ یہ تو بہت اچھا بزنس ہے۔ کب سے تم یہ کام کر رہے ہو سوامی؟“

”اب تو کوئی بیس سال ہو گئے۔“

”کیا مطلب۔ تمہارے بزرگ یہ کام نہیں کرتے تھے؟“

”نہیں۔ اس وقت یہ کام نہیں ہوتا تھا۔ اپنے قبیلے میں یہ کام میں نے شروع کیا ہے۔ مجھے بین بجا کر سانپ دکھانا پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے تھوڑا سا پڑھ لیا تھا۔“

”ہاں۔ دوسرا سوال میں تم سے یہی کرنا چاہتا تھا۔ تم پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔“

”بی اے کیا ہے میں نے۔ ویسے میری پشتوں میں کسی نے اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ میں نے یہ انوکھا کام کیا، دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ اس طرح زہر بیچنا شروع کیا۔ ہم لوگ سانپ پکڑتے ہیں۔ ان کا زہر نکال کر انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بس یہی ہماری روزی ہے۔“

”اس سے تمہاری پوری آبادی کا گزارا ہو جاتا ہے جبکہ کافی بڑا قبیلہ ہے تمہارا۔“

”یہ سب ہمارے قبیلے کے لوگ نہیں ہیں۔“

”ایں۔ یہ پھر؟“

”آج ہمارا تہوار ہے۔ بہت سے سپیروں کے قبیلے ناگ پنچھی منانے ہمارے قبیلے میں آ جاتے ہیں کیونکہ.....“

”ہاں۔ بتاؤ یہاں کیوں آ جاتے ہیں۔“

”کیونکہ شیش ناگ ہمارے قبیلے میں ہے۔ ناگوں کا سردار۔ شیش ناگ اور وہ بھی اچھا دھاری۔“ ابھی سوامی نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک دم بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ آسمان پر چاند ابھر رہا تھا۔ سوامی نے کہا۔ ”آپ آرام سے یہاں بیٹھ کر ہماری پوجا پاٹ دیکھو۔ ہمیں خوشی ہو گی۔ میں پوجا میں شریک ہوں گا۔“

”اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی ہوئی ہے تو میں چلتا ہوں۔“

”میری خوشی ہو گی اگر تم ہمارا تہوار دیکھو۔“ اس نے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے بھی یہ سب انوکھا اور خوشگوار لگ رہا تھا، میں یہاں رک کر دیکھنا چاہتا تھا، چنانچہ میں خوشی سے یہاں رک گیا۔

سپیرے اِدھر سے اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ چاند روشن ہوتا جا رہا تھا۔ اس تمام ہنگامہ آرائی کے دوران میری آنکھیں مسلسل ان دونوں کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک وہ مجھے نہیں نظر آئے تھے، البتہ مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ منور ما کا محبوب کوئی نوجوان سپیرا ہے اور اس وقت بھی وہ منور ما یعنی اپنی محبوبہ کو اپنے تہوار میں شرکت کے لیے لایا ہے۔ مگر وہ دونوں کہاں ہیں۔ نظر ہی نہیں آ رہے۔

سپیرے بھاگ دوڑ کرتے رہے، پھر ان کے اندر تنظیم پیدا ہونے لگی، وہ قطاریں بنانے لگے۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ بچے بھی تھے۔ قطاریں ایک خاص ترتیب سے بنائی جا رہی تھیں۔ جن سے فوری اندازہ ہو گیا کہ ہر قبیلے کے لوگ الگ الگ قطاریں بنا رہے ہیں۔ سب سے آگے نوجوان لڑکیاں تھیں جو پھولوں کے لباس پہنے ہوئے تھیں اور خوب سجی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے پھولوں کے انبار لگے ہوئے تھے، جن کی خوشبو سے سارا ماحول معطر ہو رہا تھا۔

اب چاند پورا نکل آیا تھا اور فضا خوب منور ہو گئی تھی۔ بے شمار افراد تھے لیکن گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ اس کے بعد سامنے کے حصے میں کچھ ہلچل سی ہوئی، پھر پھولوں کی بیلوں کے پیچھے سے کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنے کندھوں پر ایک تخت اٹھایا ہوا تھا جو بے حد سجا ہوا تھا، اس تخت پر کانسی کا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا جو سانپ کا ہیبت ناک مجسمہ تھا۔ تخت ایک جگہ رکھ دیا گیا۔ ہیبت ناک مجسمے کی آنکھوں کی جگہ دو سلگتے ہوئے یاقوت لگے ہوئے تھے جن سے شعاعیں خارج ہو رہی تھیں۔ کانسی کا مجسمہ کوئی دس فٹ کے لگ بھگ اونچا تھا اور ایک نگاہ دیکھنے سے زندہ سا لگتا تھا۔

پھر اس میں سچ مچ زندگی بیدار ہو گئی۔ تخت پر بائیں طرف سے ایک کالا ناگ اوپر چڑھ رہا تھا۔ سانپ بے حد لمبا تھا، اس کا کالا چمکیلا بدن کانسی کے مجسمے کے پیروں میں ڈھیر ہوتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے پھن اٹھا لیا اور میں بری طرح چونک پڑا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس خوفناک سانپ کو دیکھا۔ اس کے پھن کے درمیان دو سفید دھاریاں موجود تھیں۔ اس سانپ کو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس نے مجھے جگہ جگہ کاٹا تھا۔ میں بچ گیا تھا، لیکن اس نے مجھے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ وہی سانپ تھا، جس نے کھیا سنگھ کی حویلی میں مجھ پر حملہ کیا تھا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سپیرے آگے بڑھے اور سانپ کے مجسمے کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ وہ کچھ بولتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھے تو آنے والوں نے مجسمے کے پیروں میں پھول چڑھانے شروع کر دیئے۔ یہ رسمیں آخر کار ختم ہو گئیں اور لوگ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ میرا دشمن سانپ پھن ڈال کر واپس اسی طرف سے نیچے اتر گیا۔

کچھ دیر خاموشی طاری رہی، پھر لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ بڑے بڑے چنگ لائے گئے۔ ان پر تھاپ پڑی اور لڑکیاں رقص کرنے لگیں۔ رقص و موسیقی عروج پر پہنچی تھی کہ معاً میری نظر ایک طرف اٹھ گئی اور میرا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ پتھر کی ایک چٹان پر منور ما ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھی تھی اور یہ نوجوان، مردانہ حسن کا بے مثال نمونہ تھا۔ اتنا حسین اتنا پرکشش کہ جو دیکھے، دیکھتا رہ جائے۔

دونوں پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر محبت کے آثار تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے رقص و موسیقی دیکھ رہے تھے۔ میرا سر چکرا کر رہ گیا تھا۔ بہت دیر تک بیٹھا رہا، پھر اس ماحول سے اکتا گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اسی وقت سوامی کسی طرف سے نکل کر میرے پاس آ گیا۔

”معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر جی۔ بس آج وہ.....“

”نہیں سوامی جی۔ مجھے اندازہ ہے آپ کی مصروفیت کا۔ ایک اجازت آپ سے ضرور چاہتا ہوں۔“

”حکم دیں۔“

”آپ سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں۔“

”ارے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ میں ہمیشہ آپ کے سواگت کے لیے تیار رہوں گا۔“

”کل تو آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ پرسوں دن میں آپ کے پاس آؤں گا۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ سوامی نے کہا اور پھر وہ مجھے اپنے علاقے کی آخری سرحد تک چھوڑنے آیا۔ ندی کے کنارے ایک طویل سفر کرنا تھا۔ پورے وجود پر تھکن سوار تھی لیکن چلتا رہا، پھر اچانک دولہا بابا کا خیال آ گیا اور میں نے رخ بدل لیا۔ بے پور کے راستے اب میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ فاصلہ کافی تھا لیکن آخر کار مزار پر پہنچ گیا۔ پھر ایک جگہ منتخب کی۔ اور ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو گیا۔ دماغ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ نیند نے آغوش میں لے کر احسان کیا۔

جاگا تو خوب دھوپ نکل آئی تھی لیکن خود نہیں جاگا تھا۔ نصیب اللہ کا چہرہ سامنے نظر آیا تھا۔ انہوں نے مجھے جگایا تھا۔ ”معافی چاہتا ہوں۔ آپ پوری طرح دھوپ کی لپیٹ میں تھے، اس لیے جگانے پر مجبور ہو گیا۔ ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔“

”ارے۔“ میں گھبرا کر اٹھ گیا۔ نصیب اللہ سے کچھ فاصلے پر بگھی کھڑی تھی جس کے قریب کھیا سنگھ نظر آ رہا تھا۔ ”اوہ میرے سلسلے میں تو خاصی ہنگامہ آرائی ہو گئی۔ آیئے۔“ میں آگے بڑھ کر بولا۔ اور بگھی کے قریب پہنچ گیا۔

”آپ ٹھیک ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ کھیا سنگھ نے کہا۔

”ہاں۔ بالکل ٹھیک۔“

”میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ میں اور میری پتنی جب منور ما کے لیے ناشتہ لے کر پہنچے تو آپ کے کمرے کا دروازہ بند تھا جبکہ آپ عام طور سے صبح جاگ جاتے ہیں۔ پتا چلا کہ آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔ دروازہ خوب بجایا گیا نہ کھلا تو بڑی پریشانی ہو گئی۔ بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا تو آپ اندر موجود نہیں تھے۔ پوری حویلی میں آپ کو تلاش کیا لیکن کوئی پتا نہیں چلا تو میں بری طرح گھبرا گیا۔ بگھی لے کر آپ کو تلاش کرنے چل پڑا۔ پھر مسجد سے نصیب اللہ کو ساتھ لیا اور کئی جگہ گھوم کر آخر ان کے مشورے سے یہاں آ گیا۔“

”میں بہت شرمندہ ہوں۔ بس یہاں آنا تھا۔“ مجھ سے اور کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کھیا سنگھ نے احتراماً اور کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ لوگ میری روحانیت کے قائل تھے، اس لیے بات بن گئی۔

”چلیں؟“ کھیا سنگھ نے کہا۔

”ہاں۔ مجھے مسجد چھوڑ دیں۔“ نصیب اللہ بولے۔

”نہیں پیش امام جی۔ روٹی ہمارے ساتھ کھائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا۔“

”کوئی تکلف تو ہے نہیں۔“ نصیب اللہ بولے۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“ کھیا نے کہا اور ہم بگھی میں بیٹھ کر چل پڑے۔

میرے ذہن میں بے شمار سوالات مچل رہے تھے لیکن میں نے جلد بازی نہیں کی۔ منور ما کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ کیسے واپس آئی تھی، جب یہ لوگ ناشتہ لے کر گئے تھے تو اس کی کیا کیفیت تھی۔ لیکن جو کچھ دیکھ چکا تھا، وہ بتانا ممکن نہیں تھا۔

کھیا سنگھ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا لیکن اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نصیب اللہ نے کھانے کے بعد اجازت مانگی تو کھیا سنگھ نے کہا۔ ”بگھی میں چلے جایئے پیش امام جی۔“

”ارے نہیں کھیا جی۔ چلا جاؤں گا۔ کوئی بات نہیں ہے۔“ لیکن کھیا نے انہیں بگھی میں ہی بھیجا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”رات آپ نے مزار شریف پر گزاری ہے۔ بے آرام رہے ہوں گے، سو جائیں کچھ دیر۔ آپ دروازے سے نہیں گئے، گیان والوں کے لیے دیواریں، دروازے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ویسے ایک بات پوچھوں۔“

”پوچھیں۔“

”دولہا بابا کیا کہتے ہیں میری منور ما کے بارے میں۔“

”کوشش انسان کا فرض ہے باقی کام اوپر سے ہوتے ہیں۔ ہاں آپ کو ایک کام کرنا ہے۔“

”بتایئے۔“

”مجھے منور ما کے لیے خون کی ضرورت ہو گی۔“

”جتنا حکم کریں گے مل جائے گا۔ کب چاہیے؟“

”پرسوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں بندوبست کر دوں گا۔“

پھر میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ رات آنکھوں میں چبھ رہی تھی، جو دیکھا تھا وہ بہت عجیب تھا۔ سپیرے کافی دور رہتے تھے لیکن انہیں پیش امام کے مہمان کے بارے میں معلوم تھا۔ ان کا جشن۔ ان کی رسومات پھر وہ سانپ۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھ پر حملہ آور کیوں ہوا تھا۔

ایک بار پھر نیند آ گئی۔ مغرب کے وقت جاگا نماز پڑھی۔ پھر ایک دم دل میں خیال آیا کہ منور ما سے ملوں۔ سیدھا اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر منہ بنا لیا۔

”کیسی ہیں منور ما جی۔“

”دل کی بات بتاؤں۔“

”بتایئے۔“

”مجھے تم سے نفرت ہے۔“

”کیوں؟ میں نے تو آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”ترکیشی کو بھی تم سے نفرت ہے۔“

”وجہ نہیں بتائی اس نے۔“ میں نے پوچھا۔ لیکن اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ گویا اب مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔

میں کچھ لمحے وہاں رکا، پھر چلا آیا۔ ذہن میں شدید کریدتھی۔ کیا ہے یہ سب؟ بڑی پُراسرار اور عجیب کہانی تھی۔ ترکیشی سپیرا ہے۔ کتنا خوبصورت جوان ہے۔ کوئی بھی لڑکی اسے دیکھ کر دیوانی ہو سکتی ہے، کوئی بھی۔

طبیعت بوجھل تھی۔ حکیم احمد کو تلاش کر کے اس کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”حکیم بھائی رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔“

”خیر ہے سرکار؟“

”نہیں۔ بس طبیعت پر کچھ گرانی ہے۔“

”کھچڑی بنا دوں؟“

”نہیں شکریہ۔“

رات کا کھانا نہ کھانا بہتر رہا۔ صبح کو طبیعت خوشگوار تھی۔ دوسری صبح ناشتے کے بعد کھیا سنگھ میرے پاس آ گیا۔

”وہ حکیم احمد بتا رہا تھا کہ آپ نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔“

”ہاں۔ بس طبیعت بوجھل تھی۔ ایک کام ممکن ہے کھیا سنگھ جی۔“

”ہاں ہاں بتایئے۔“

”میں ندی کنارے سپیروں کی بستی میں جانا چاہتا ہوں۔“

”ارے اوہ۔ اچھا ضرور۔“ کھیا سنگھ کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس بارے میں مزید پوچھنا چاہتا ہے لیکن ہمت نہیں کر پا رہا۔ میں اسے کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے خاموش ہو گیا۔

کھیا نے فوراً ہی دوبارہ کہا۔ ”آپ بگھی میں چلے جائیں۔“

”شکریہ کھیا جی۔“ میں نے کہا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں وہاں جا کر سوامی سے ملنا چاہتا تھا لیکن فاصلے سے گھبرا رہا تھا۔ اب یہ اچھا ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تیاری شروع کر دیں۔

باہر نکلنے کے لیے تیار تھا کہ کھیا سنگھ میرے پاس آیا۔

”میں دلی جا رہا ہوں۔ رات تک واپس آ جاؤں گا۔“

”خیریت ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ خون کا بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ بات ہو گئی ہے۔ کام مجھے خود کرنا ہے، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔ تمام کام پورے ہیں۔“

میں چل پڑا۔ راستے میں، میں نے کوچوان سے پوچھا۔ ”امرتا کا کیا حال ہے۔ کیسی ہے وہ؟“

”بس جی! اب ٹھیک ہے۔ اب تو سانگی کے گھر بھی نہیں جاتی۔ اپنے ہی گھر میں بیٹھی کیرتن کرتی رہتی ہے۔“

میرا دل غم میں ڈوب گیا۔ معبود عالم میں بے گناہ ہوں، میں نے اس سے کبھی ایک ایسا لفظ بھی نہیں کہا جس سے وہ بھٹک جائے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں دولہا بابا کے مزار پر جا کر دعا کروں گا کہ اس معصوم لڑکی کے ذہن سے میرا خیال نکل جائے۔

بگھی کا سفر جاری رہا، کوچوان سے سپیروں کے اس قبیلے کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں۔ ”صدیوں سے اسی جگہ آباد ہیں۔ دادا پردادا بھی اسی ندی کے کنارے جیون بتاتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کبھی بستی کے کتے تک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پہلے آس پاس کی بستیوں میں سانپوں کا تماشا دکھا کر بھیک مانگتے تھے لیکن سوامی نے اسکولوں پھر کالج میں جا کر پڑھائی کی، پھر جب وہ سردار بنا تو اس نے سپیروں کا بھیک مانگنا بند کر دیا اور اپنی تعلیم سے کام لے کر دوسرا کام شروع کر دیا۔ اب وہ زہر بیچتے ہیں۔“

”کام چل جاتا ہے ان کا؟“

”پہلے سے اچھا۔ پہلے ان کی عورتیں بستی میں بھیک مانگنے آ جاتی تھیں، اب نہیں آتیں۔“ سفر طے ہو گیا۔ ندی آ گئی اور دور سے سپیروں کی بستی نظر آنے لگی۔

اس وقت مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب میں نے سوامی کو کچھ سپیروں کے ساتھ اپنے استقبال کے لیے کھڑے پایا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔

”ارے۔ سوامی جی۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”آپ دیوتا ہو ہمارے لیے ڈاکٹر جی۔ ہم اس عزت دینے پر آپ کے شکر گزار ہیں۔“

یہ لوگ مجھے ایک بڑے جھونپڑے پر لے گئے جس کا احاطہ بہت وسیع تھا اور وہاں گھنے درخت پھیلے ہوئے تھے، جن کی چھاؤں میں انہوں نے مونڈھے اور چارپائیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ ایک چارپائی پر چادر بچھی ہوئی تھی، تکیے لگے ہوئے تھے لیکن میں نے مونڈھے پر بیٹھنا پسند کیا۔ سوامی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ چند دوسرے لوگ بھی مونڈھوں پر بیٹھ گئے اور سوامی نے ان کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ یہ سب تجربے کار سپیرے تھے اس کے بعد میرے لیے تازہ پھل لائے گئے اور مٹی کے کورے آب خورے میں تازہ دودھ۔

”پھل پوتر ہوتے ہیں مہاراج اور دودھ شدھ۔ جناور سے کاڑھ کر کچا ہی لے آئے ہیں۔ اپنے برتن میں گرم تک نہیں کیا کہ کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”شکریہ سوامی۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ ”آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ لوگ آرام کرو۔“ سوامی نے کہا اور دوسرے لوگ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

”میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔“ میں نے کہا تو سوامی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ ”آپ نے مجھے بڑی عزت دی تھی تہوار والے دن، جس کا شکریہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے آدمیوں نے فوراً پہچان لیا تھا کہ میں پیش امام کا مہمان ہوں۔“

”ہاں۔ ہم بستی سے دور ضرور ہیں لیکن ہم ایک ہیں۔ ایک دوسرے کی خبر رکھتے ہیں۔“

”تب تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں آج کل پیش امام صاحب کا نہیں، بلکہ کھیا سنگھ کا مہمان ہوں۔“

”ہاں۔ اور اس کی بیٹی کا علاج کر رہے ہیں۔“ سوامی نے کہا اور میرے دماغ کو زور کا کرنٹ لگا۔ یہ اتنا سب کیسے جانتا ہے۔ یہ تو پوری بستی کو نہیں معلوم کہ منور ما زندہ ہے۔ میں نے سوامی سے یہ سوال کر ڈالا۔

جس کے جواب میں اس نے کہا۔ ”نہ صرف بستی کے کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم۔ بلکہ میرے پورے قبیلے میں کسی چڑیا کے بچے کو بھی نہیں معلوم۔ اور مجھے بستی کے کسی بھی آدمی نے نہیں بتایا۔“

”پھر کس نے بتایا ہے؟“

”ترکیشی نے۔“ سوامی نے ایک اور دھماکہ کر دیا۔

میرے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”ترکیشی کون ہے؟“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک باہر کے دروازے پر پیتل کی گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں سنائی دیں، پھر کوئی بگڑے ہوئے سانڈ کی طرح اندر گھس آیا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ عمر کی آخری حد کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ لباس چیتھڑوں کی شکل میں جھول رہا تھا اور اس کے پورے بدن کی کھال لٹک رہی تھی۔ گلے میں بہت سی مالائیں اور گھنٹیاں تھیں، ہاتھ میں ایک مڑا ہوا موٹا ڈنڈا۔ وہ اس طرح ڈنڈا اٹھا کر مجھ پر لپکی جیسے ڈنڈا میرے سر پر مار دے گی لیکن خدا کے فضل سے مجھے اپنے اعصاب پر قابو رہا۔ سوامی البتہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

عورت مجھے خونی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے جیسے وہ شدید غصے میں ہو۔ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پاپی، اگھوری، بھاگ یہاں سے تھیارے، گھور پاپ بھاگ، بھاگ، بھاگ۔“ وہ ڈنڈا اٹھا کر میرے گرد ناچنے لگی اور بار بار اس طرح ڈنڈا اٹھانے لگی جیسے مجھے مارنا چاہتی ہو۔

”مائی گیراں۔“ آخر سوامی زور سے چیخا اور وہ رک گئی۔ پھر اس نے سوامی کو گھورا اور اسی طرف بھاگ گئی جہاں سے آئی تھی۔ لیکن سوامی کا چہرہ اتر گیا تھا۔

”کون تھی یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”مائی گیراں۔“

”پاگل ہے؟“

”نہیں، جوگن ہے۔ پتا نہیں اسے کیا ہو گیا۔ بڑی محبت والی ہے سب سے پریم کرتی ہے پوری بستی کی رکھشا کرتی ہے۔ تین تین دن پہلے بتا دیتی ہے کہ باڑھ آنے والی ہے اور ہم لوگ بندوبست کر لیتے ہیں۔“

”ہوں۔ آپ کا کام کیسا چل رہا ہے سوامی۔“ میں نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

”کون سا کام؟“

”میرا مطلب ہے آپ کا بزنس۔“

”اوہ۔ ہاں ٹھیک ہے سپیرے جنگلوں میں ناگ پکڑتے ہیں۔ ان کا زہر نکال کر لے آتے ہیں اور پھر کمپنیوں کے ایجنٹ یہ زہر ہم سے خرید لے جاتے ہیں۔“

”ٹھیک۔ تو آپ ترکیشی کے بارے میں بتا رہے تھے۔“

”ہاں۔“

”ترکیشی کون ہے؟“

”ایک معصوم سانپ۔“

”سانپ؟“ میں اچھل پڑا۔

”ہاں ڈاکٹر بابو۔ آپ مسلمان ہو۔ آپ کا دھرم ہمارے رام لیلی سے الگ ہے۔ ترکیشی ناگ ہے۔ شیش ناگ جو ایک ہزار سال سے اسی کنٹم میں جی رہا ہے۔ یہیں وہ اچھا دھاری ہوا ہے، چھ برس باقی تھے اس کے ہزار سال پورے ہونے میں کہ اس نے کھیا رام کی بیٹی منور ما کو دیکھ لیا اور اس پر مرمٹا۔ پاگل ہو گیا وہ اس کے لیے، چھ سال پورے کیسے اس نے مر مر کر۔ پھر اس کے جیون کے ہزار سال پورے ہو گئے اور اس کی جون بدلنے کی شکتی جوان ہو گئی۔ اس نے ایک سندر جوان کا روپ دھارن کیا اور منور ما کے سامنے گیا۔ اس کی پریم تپسیا رنگ لائی اور منور ما بھی اس سے پریم کرنے لگی۔ اور اب دونوں ایک دوجے کے بنا نہیں جی سکتے۔“

میں سانس روکے یہ کہانی سن رہا تھا۔ میرا دل اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہ محض ایک کہانی معلوم ہو رہی تھی، تاہم میں نے کہا۔ ”کیا منور ما جانتی ہے کہ ترکیشی سانپ ہے۔“

سوامی نے کچھ لمحے توقف کیا، پھر بولا۔ ”نہیں۔ پر اسے من چاہے جب بتا دو۔ اب وہ اس کے پریم میں کھو چکی ہے۔ ترکیشی اس کی آتما کا حصہ بن چکا ہے۔“

”تمہیں اور بھی کچھ معلوم ہو گا۔“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔“

”کیا؟“

”وہی جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں۔ دونوں پتی پتنی کا روپ دھار چکے ہیں۔ کھیا جی اپنی سستری کو لندن لے گئے تھے، وہاں سے آ کر انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ منور ما ایک حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ انہوں نے سنسار کے من میں یہ بات بٹھا دی کہ اب منور ما جیتی نہیں ہے، پر دو پریمیوں کو کیسے دور رکھا جا سکتا ہے۔ دونوں اب بھی ساتھ ہیں۔“

”ترکیشی شیش ناگ ہے؟“

”ہاں۔ ناگ پنچھی والے دن آپ نے اسے سانپ کے روپ میں بھی دیکھا ہو گا اور ناگ آرتی کے بعد اسے بدلی ہوئی جون میں بھی۔ جب وہ اپنی پریمیکا کے ساتھ تھا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ اس نے مجھے کاٹ کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”ہاں۔ اس نے بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے زہر نے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ ان دنوں بہت پریشان ہے۔“

”پریشان ہے؟“

”ہاں۔ اس کا کہنا ہے کہ آپ ایک مسلمان عالم ہیں۔ وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ کہتا ہے وہ صرف ایک پریمی ہے۔ اپنی پریمیکا کے ساتھ جیون کے دن بتانا چاہتا ہے، وہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔“

”مگر وہ ناگ ہے اور منور ما انسان۔“

”پریمی تو ہیں نا دونوں۔ ایک مشکل ہے دونوں کے لیے، ورنہ وہ کبھی کا اپنی پریمیکا کو لے کر جنگل میں چلا جاتا، اتنی دور کہ کوئی ان کا پتا نہ پا سکتا۔“

”مشکل کیا ہے؟“

”منور ما جنگل میں جیون نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ وہ انسان ہے۔ ناگ قبیلہ کسی منش کو اپنے بیچ نہیں مان سکتا۔“

بڑی انوکھی داستان تھی۔ ناقابل یقین، ناقابل فہم۔ لیکن میں اپنے مؤقف کو نہیں بدل سکتا تھا۔ کافی دیر یہاں گزاری۔ دماغ پر بہت سے بوجھ لے کر واپس لوٹا۔ بگھی وہیں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں واپس پہنچ گیا۔ کھیا سنگھ نہ جانے کب تک واپس آئے گا۔ میں نڈھال سا بستر پر پڑ گیا۔ وہ حسین نوجوان یاد آ رہا تھا جو منور ما کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں کس قدر خوب صورت لگ رہے تھے۔ کاش وہ انسان ہوتا تو میں دونوں کو یکجا کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتا۔

مگر ہو گا کیا؟ کیا منور ما کے جسم کا خون بدل دینے سے یہ داستان ختم ہو جائے گی۔ کیا ترکیشی اس کے بعد منور ما کو چھوڑ دے گا۔ تاہم مجھے اپنا کام ضرور کرنا تھا۔

اس کے بعد خاموشی رہی۔ رات کو بھی کھیا سنگھ کی واپسی کی خبر نہیں ملی۔ لیکن دوسری صبح وہ موجود تھا۔ پتا چلا کہ رات کو ساڑھے تین بجے واپسی ہوئی تھی۔ خون کے بارے میں اسے ہدایات دی گئی تھیں۔ اب میں بالکل نارمل تھا، منور ما کا خون بدل دینا میرے لیے معمولی بات تھی کیونکہ ڈاکٹر تھا۔ کسی طرف سے کوئی روحانی امداد ہو گی، اب اس کی توقع نہیں تھی۔ مجھ پر امداد کے دروازے بند ہو گئے تھے اور میں انہیں کھولنے کی درخواست نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ کمرہ جسے میں نے اپنی لیبارٹری بنایا تھا مکمل طور سے میرے کام کے لیے تیار تھا۔ میں نے وہاں جا کر مزید تیاریاں کیں اور آخر کار میں نے کھیا سنگھ سے منور ما کو یہاں لانے کی فرمائش کی۔

کچھ دیر کے بعد منور ما کھیا سنگھ کے ساتھ آ گئی۔ اس نے یہاں کے ماحول کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی۔ وہ بولی۔ ”واہ ڈاکٹر صاحب کیا ماحول پیدا کیا ہے۔ کافی ذہانت سے کام کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ روزی کمانے کے لیے بڑے بڑے ناٹک کرنے ہوتے ہیں۔ جی سر، کیا حکم ہے۔“

”آپ یہاں لیٹ جایئے۔“

”بہتر۔“ اس نے کہا اور آپریشن ٹیبل پر لیٹ گئی۔ میں نے کھیا سنگھ کی طرف دیکھا، وہ آس بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ گویا یہاں رکنے کی درخواست کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ ساتھ رہیں۔“

کھیا سنگھ خوش ہو گیا۔ میں نے منور ما کو انجکشن لگایا اور پھر کچھ دیر کے بعد اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

یہ عمل تین گھنٹے جاری رہا۔ میں نے پھر منور ما کے اندر جھانکا۔ خدا کے فضل سے میری وہ صلاحیت قائم تھی۔ میں نے اس کی رگ رگ کو دیکھا۔ اس کا خون ان چمکدار ذرات سے پاک ہو چکا تھا۔

”ارے۔“ اچانک کھیا سنگھ کے منہ سے آواز نکلی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”یہ۔ یہ دیکھو۔“ وہ ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔ اور میں نے چونک کر اس جار کی طرف دیکھا جس میں نکلا ہوا خون جمع تھا۔ پھر عجیب بات ہے کہ میری کیفیت بھی عجیب ہو گئی۔ خون میں اب ان روشن ذرات کے بجائے چھوٹے چھوٹے سانپ کے بچے تیر رہے تھے۔

”یہ کیا ہے ڈاکٹر۔“ کھیا سنگھ نے گھبرائے لہجے میں کہا۔

میں کیا جواب دیتا۔ خاموش ہی رہا۔ کھیا سنگھ نے خود ہی کہا۔ ”مائی گاڈ۔ میری بچی اس عذاب سے گزر رہی تھی۔ مگر یہ کیسے ہوا۔ مجھے نہیں بتاؤ گے ڈاکٹر کامران۔“

”میں کیا بتاؤں۔“

”نہیں۔ تم جانتے ہو۔ تم جانتے تھے تب ہی تو تم نے اس کے بدن کا خون بدلا ہے۔ اس کے شریر میں یہ زہر گھلا ہوا تھا۔ مگر ڈاکٹر یہ زہر کہاں سے آیا۔ کچھ تو بتاؤ مجھے۔ تم جانتے ہو، پیر دولہا نے ایسے ہی تو تمہاری طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔ مجھے بتا دو، ڈاکٹر، مجھے بتا دو تمہاری مہربانی ہو گی۔“

”آپ منور ما جی کی دیکھ بھال کریں۔ ایک آدھ دن تک یہ بہت پریشان رہیں گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ شکر ہے کہ میری بچی کی صحت کی امید پیدا ہو گئی۔“

میں نے ساری چیزیں سمیٹیں۔ کھیا سنگھ سے کچھ دیر باتیں کیں۔ اس خون کے بارے میں کھیا نے پوچھا تو میں نے کہا۔ ”آپ کے پاس تیزاب مل جائے گا۔“

”ہاں۔ سینٹری کے سامان میں مل جائے گا۔ کموڈ اور بیسن صاف کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“

”مجھے خالص تیزاب چاہیے۔“

”میں بندوبست کرتا ہوں۔“ کھیا سنگھ نے کہا۔ بے چارے کو سارے کام خود ہی کرنے پڑ رہے تھے کیونکہ کسی پر منور ما کی زندگی منکشف نہیں کر سکتا تھا۔ اس خون کو تیزاب میں جلانے کے بعد میرا کام ختم ہو جاتا۔ لیکن ایک خیال اور دل میں تھا۔ وہ یہ کہ پُراسرار سانپ پر کیا ردعمل ہو گا۔ میں نے کھیا سنگھ سے کہا۔ ”ایک خاص بات میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کھیا جی۔“

”حکم کریں۔“

”کیا اب بھی منور ما اسی کمرے میں رہیں گی؟“

”ہم اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتے ہیں لیکن بس وہ جگہ رازداری کی وجہ سے رکھی گئی ہے۔ آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟“

”دو چار دن انہیں تنہا نہیں چھوڑنا ہے۔ ہم ان کا ردعمل دیکھیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر یوں کرتے ہیں ہم پتی پتنی اس کے پاس سو جائیں گے۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔ ایسا کر لیں۔“

ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ منور ما کو ہوش میں لانے کا انجکشن دے دیا گیا تھا، آہستہ آہستہ اس کے بدن میں تحریک ہونے لگی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔

کھیا سنگھ نے اس کے قریب آ کر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”منور ما۔ منوری۔“ لیکن منور ما نے اُدھر رخ بھی نہیں کیا۔

”ٹھیک ہے۔ یہ ٹھیک ہیں۔ دماغی قوتیں واپس آنے میں دیر لگے گی۔“ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ کھیا سے میں نے کہہ دیا تھا کہ کوئی خاص بات ہو تو مجھے فوری اطلاع دی جائے۔ لیکن کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

شام ہو گئی۔ پھر مجھے ایک خیال آیا۔ تو میں اس کمرے کی طرف چل پڑا۔ جہاں منور ما رہتی تھی۔ منور ما کے لیے مزید سہولتیں مہیا کر دی گئی تھیں۔ کھیا نے اپنا بھی وہیں سونے کا بندوبست کر لیا تھا۔

میں نے کھیا سنگھ سے کہا۔ ”یہ روشن دان دیکھ رہے ہیں آپ؟“

”ہاں۔“

”اسے بند کرنا ہے۔“

”کیوں؟“

”بس اسے بند کر دیں۔“

”اچھا۔“ کھیا کی آواز میں خوف کی ہلکی سی آمیزش تھی، پھر وہ بولا۔ ”یہ کام بھی میں خود ہی کرتا ہوں۔“

پھر وہ کیلیں اور ہتھوڑا وغیرہ لے آیا۔ میں خود ایسے کاموں سے ناواقف تھا۔ تاہم دونوں نے مل کر روشن دان میں کیلیں جڑ کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا۔ پھر میں نے منور ما کے قریب جا کر آواز دی۔ لیکن اس نے میری طرف نظر بھی نہیں اٹھائی۔

”یوں لگتا ہے جیسے وہ بہری ہو گئی ہے اور ڈاکٹر۔ یوں بھی جیسے وہ دیکھ بھی نہ پاتی ہو۔“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر۔ یہ کسی آواز پر متوجہ نہیں ہوتی۔ آنکھوں کا زاویہ بھی نہیں بدلتی۔“

”کچھ وقت لگ جائے گا۔“

”میں اس کے لیے بھی کام کروں گا۔“ کھیا نے کہا۔

”کیا؟“

”میں نے تمہیں بتا دیا ہے ڈاکٹر کہ میں اسے چند دنوں کے اندر ہی انگلینڈ لے جاؤں گا۔ وہاں میں اس کی شخصیت ہی بدل دوں گا۔ اگر اس خون بدلنے کے عمل سے اس کی سماعت اور بینائی متاثر ہوئی ہے تو میں اس کا علاج بھی کراؤں گا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کھیا سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات کہوں ڈاکٹر صاحب۔“

”کہیے۔“ میں نے کہا۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ انگلینڈ نکل چلیں۔ انتظامات میں کر لوں گا۔ آپ بالکل بے فکر رہیں اس بارے میں۔“

میرے چہرے پر ناخوشگوار اثرات پیدا ہو گئے۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”شکریہ کھیا سنگھ جی۔“

کھیا کو ایک لمحے میں میری کیفیت کا احساس ہو گیا، اس کے بعد اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

میں شدید سسپنس کا شکار تھا۔ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ دوسری صبح کھیا سنگھ میرے پاس آ گیا، اس کا چہرہ خوف کا شکار تھا۔

”کیا بات ہے کھیا جی؟“

”ساری رات میں اور میری پتنی نہیں سوئے۔“

”کیوں؟“

”اب بڑا عجیب سا خیال آ رہا ہے۔ منور ما کے خون میں سانپ کے بچے تیر رہے تھے اور ساری رات۔ اس روشن دان پر جس میں آپ نے کیلیں ٹھکوائی تھیں۔ کوئی ٹکریں مارتا رہا ہے۔ ساتھ میں کسی سانپ کی غضبناک پھنکاریں سنائی دیتی رہی ہیں۔ یشودھا تو چار بجے ہی وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔“

”اور آپ؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”میں بھی۔ تھوڑی دیر کے بعد۔“ کھیا نے کہا، پھر بولا۔ ”اب تو بتا دیں یہ کیا ہے۔ یہ سب کیا ہے۔“

اسی وقت ایک نوکر نے آ کر کہا۔ ”سپیرا سوامی آیا ہے، بڑی خراب حالت ہے اس کی مہاراج۔“

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 23

''سوامی۔سپیرا۔'' کھیا سنگھ کے منہ سے حیرت بھری آواز نکلی۔ ''وہ کیوں آیا ہے؟''

میرے ذہن میں نہ جانے کیوں وسوسے جاگ اٹھے۔ ملازم اطلاع دے کر چلا گیا تھا۔

میں نے کھیا سنگھ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملیں گے اُس سے۔''

''ایں۔ ہاں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔'' کھیا سنگھ جیسے چونک پڑا۔ پھر مجھ سے بولا۔ ''آؤ۔ دیکھیں۔'' میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ ملازم نے سوامی کو ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا رکھا تھا۔ وہ زاروقطار رو رہا تھا۔

''ارے کیا ہوا سوامی؟''

''انرتھ ہوگیا مہاراج۔ انرتھ ہوگیا۔ ہمارے قبیلے کی آن لٹ گئی۔ ہم آکاش سے دھرتی پر آ گئے۔ ہم کہیں کے نہ رہے۔'' وہ انگوچھے سے آنسو پونچھنے لگا۔ کھیا سنگھ کے چہرے پر غصے کے آثار پھیل گئے۔

''سنا چکے اپنی کہانی۔ اب یہ بھی بتا دو، کیا بات ہے۔''

''چھوٹا منہ بڑی بات ہے مالک۔ ہمیں پتا ہے کہ ڈاکٹر جی نے بٹیا کا علاج کیا ہے۔ انہیں بھی معلوم ہے کہ بٹیا جیتی ہیں، اس لیے ہم ان کے سامنے کہہ رہے ہیں۔'' سوامی نے کہا اور کھیا سنگھ کا چہرہ زرد ہوگیا۔

''آگے بولو۔'' اس کی گرج ابھری۔

''ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا سرکار۔ ترکیشی شیش ناگ کئی نسلوں سے ہمارے قبیلے میں رہ رہا تھا، ہمیں بڑی سہولت تھی۔ سانپ اس کے لیے آتے تھے اور ہم ان کا زہر نکال لیتے تھے۔ مگر سب لٹ گیا، ترکیشی کے جیون کے ہزار سال پورے ہوگئے۔ وہ اِچھادھاری ہوگیا اور اس نے جون بدل لی۔ تب نصیبوں کے مارے نے راجکماری جی کو دیکھ لیا اور ان کے پریم کا روگی بن گیا۔ وہ بھی اس سے پریم کرنے لگیں۔ مگر ڈاکٹر جی نے کماری جی کے من سے اس کا خیال نکال دیا اور اس کا جیون بنجر ہوگیا۔ بن پانی کی مچھلی بن گیا۔ مائی گیراں نے اسی سے کہہ دیا تھا جب اس نے جون بدلی تھی کہ منش کا روپ تجھے راس نہیں آئے گا، تجھے سنسار چھوڑنا پڑے گا، ناگ ہے ناگ رہ، اور وہی ہوا۔ سنسار چھوٹ گیا اُس سے۔ لٹ گئے ہم۔ مائی گیراں نے مجھے خبر دی ہے کہ اب......اب۔'' سوامی پھر رو پڑا۔

''آگے بول۔ آگے بول۔'' کھیا سنگھ غرایا۔

''اب وہ سنسار میں نہیں ہے۔'' سوامی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

''تو میں کیا کروں۔ یہاں کیوں آیا ہے؟''

''وہ یہیں ہے مہاراج۔ وہ۔ اس نے بٹیا کے پاس آ کر پران دیئے ہیں۔'' سوامی نے کہا۔ اور میں لرز گیا۔ کھیا کی سمجھ میں شاید بات نہیں آئی تھی، لیکن میرے دماغ میں کھلبلی مچ گئی تھی۔

''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی سوامی۔''

''مائی گیراں نے بتایا ہے۔ اس نے سارے بال نوچ ڈالے ہیں اپنے۔''

''آیئے۔'' میں نے بے اختیار کھیا سنگھ کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹنے لگا۔ ''تم بھی آؤ سوامی۔'' میں نے کہا۔

ان دونوں کو لے کر میں اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں منورما رہتی تھی۔ تالا کھول کر میں نے سامنے نگاہ ڈالی۔

منورما اپنے بستر پر لیٹی تھی اور ایک کالے رنگ کا کوئی سات فٹ لمبا سانپ اس کے بدن سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کا پھن منورما کے چہرے سے چپکا ہوا تھا۔

''کھولو۔ کھولو۔'' کھیا بھنچی ہوئی آواز میں چیخا۔ اور میں نے جلدی سے کٹہرے کا تالا کھول دیا۔ کھیا نے چھلانگ لگائی اور تیزی سے منورما کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پاگلوں کی طرح سانپ کو پکڑ کر منورما کے بدن سے جدا کرنے کی کوشش کی لیکن سانپ جیسے اس کے بدن میں پیوست تھا۔ البتہ اُس کی اس کوشش سے ایک حقیقت منکشف ہوگئی۔ منورما بھی زندہ نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد دلکش مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، جیسے اس نے اپنا محبوب پا لیا ہو، جیسے وہ پیا گھر چلی گئی ہو۔

کھیا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اُدھر سوامی حسرت بھری نگاہوں سے اس لمبے کالے ہیبت ناک سانپ کو دیکھ رہا تھا، جس کے پھن پر دو سفید دھاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

کھیا منورما کی مسہری کے پاس زمین پر بیٹھ کر بلکتا رہا۔ سوامی اور میں خاموش کھڑے تھے۔ ''یہ پاپی رات بھر پھنکارتا رہا تھا۔ غلطی ہم سے ہوئی۔ ہمیں یہاں سے جانا نہیں چاہیے تھا۔'' پھر دفعتاً کھیا نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ تم نے روشن دان میں کیلیں ٹھکوا کر بند کرایا تھا۔''

''ہاں۔''

''پھر یہ آیا کہاں سے۔ سمجھ گیا۔ واش روم کی نالی سے آیا ہوگا اگھوری۔'' کھیا سنگھ کی ذہنی رو متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مگر تم نے کیا کیا ڈاکٹر، کون سا تیر مار لیا تم نے، معلوم تھا تمہیں کہ یہ ہونا ہے تو ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ کچھ تو کرتے ہم۔ میں بچا لیتا اپنی منورما کو۔ پر اب میں کیا کروں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔''

''جھومر تو ہمارا بھی اتر گیا ہے مہاراج۔ صدیوں سے ہمارا قبیلہ سرتاج قبیلہ تھا۔ شیش ناگ، وہ بھی اِچھادھاری۔ جھومر تھا ہمارے قبیلے کا۔ اب دو کوڑی کے رہ گئے ہم لوگ۔''

''بھاڑ میں جاؤ تم سب۔ میں کیا کروں۔ اسے میری بیٹی کے بدن سے ہٹا دو ورنہ میں چاقو سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی منورما کے شریر سے الگ کر دوں گا۔'' کھیا بولا۔

''جو من چاہے کرو نمبردار۔ یہ تو مائی ہے اب۔ مائی تو مائی ہی ہوتی ہے۔''

''تجھے سب معلوم تھا۔''

''ہاں نمبردار جی۔ مگر ہم رعایا تھے آپ کی۔ ہماری ہمت کہاں تھی کہ کماری کے لیے کوئی بات کرتے۔'' سوامی نے کہا۔

''مر گئی۔ میری منورما مر گئی۔ ڈس لیا اسے موذی ناگ نے۔ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔'' کھیا سنگھ نے روتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری طرف رخ کر کے بولا۔ ''بتاؤ ڈاکٹر جی۔ کیا کروں میں۔ تمہیں سب پتا تھا تم تو گیانی تھے۔ مجھے بتا تو دیتے۔''

''کیا بتا دیتا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کیا۔

''یہی کہ میرا سنسار اجڑنے والا ہے۔ میری منورما موت کے منہ میں جانے والی ہے۔ کوئی ناگ آ کر اسے ڈسنے والا ہے۔''

''نہیں مجھے اس ناگ کے بارے میں پتا نہیں تھا کہ وہ اس طرح آ کر منورما کو نقصان پہنچائے گا۔ میں نے منورما کے بدن کا خون بدل دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس عمل سے اس کی یادداشت بدل جائے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ لیکن شیش ناگ کو پتا چل گیا کہ اس کی محبوبہ اسے بھول گئی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی اور اس کی موت کا فیصلہ کیا اور یہاں آ کر اس کے ساتھ موت کی نیند سو گیا۔''

''اب میں کیا کروں۔ کوئی بتائے۔ میں کیا کروں۔''

''ہم بتائیں مالک؟'' سوامی نے کہا۔ اور کھیا سنگھ کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بولا۔ ''یہ مائی ہمیں دیدو۔''

''کیا مطلب۔''

''برا مت ماننا مالک۔ آپ سے پوروالوں کو بٹیا کی موت کی خبر بہت پہلے سنا چکے ہیں۔ سنسار کے لیے وہ پہلے ہی مر چکی ہے۔ اب بھی وہ جیتی رہتی تو آپ اسے چھپائے چھپائے پھرتے۔ اب اگر آپ اس کی موت کا سوگ منائیں گے تو سب حیران رہ جائیں گے کہ بٹیا دوبارہ کہاں سے آ گئی۔ کیا جواب دو گے مالک؟''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو سوامی؟'' اس بار میں نے دخل دیا۔

''مائی ہمیں دیدو۔ کاٹ کر دیکھ لو۔ جیسے من چاہے کر کے دیکھ لو۔ دونوں پریمی کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ پہلے یہ کر کے دیکھ لو۔ پھر ہماری بات مان لینا۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' کھیا نے نڈھال لہجے میں کہا۔

''منورما ہماری بھی بٹیا تھی۔ ہم ان دونوں کی ارتھی ساتھ اٹھائیں گے۔ ان کی چتا ساتھ جلا دیں گے۔ شیش ناگ کی ہمیں بھی ضرورت ہے۔ اس کا کریا کرم ہم پر فرض ہے۔ اس طرح ہمارا کام بھی ہو جائے گا۔ ورنہ مہاراج۔ ایک بات کہہ دیں ہم۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''لاکھوں سانپ حویلی میں گھس آئیں گے اور شیش کو لے جائیں گے۔ کوئی انہیں نہیں روک سکے گا؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔'' کھیا کو پھر غصہ آ گیا۔

''جو سچ ہے سو کہہ رہے ہیں۔'' سوامی پتھریلے لہجے میں بولا۔

''کیا مصیبت ہے۔ مجھے بتاؤ ڈاکٹر۔ کیا کروں؟'' کھیا سنگھ نے روتے ہوئے کہا۔

''ہمیں سوامی کی بات مان لینی چاہیے۔ اس سے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہم رات کی تاریکی میں بٹیا کی ارتھی خاموشی سے لے جائیں گے۔ پھر اپنے طریقوں سے ان دونوں کا کریا کرم کر دیں گے۔'' سوامی نے کہا۔

''میں اپنی منورما کی چتا اپنے ہاتھ سے جلاؤں گا۔'' کھیا سنگھ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''نا مہاراج نا۔ یہ ضد نہ کریں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ ترکیشی کے ساتھ کون ہے۔ یہ ہماری ذمے داری ہے۔ آپ ہوں گے تو سب کو معلوم ہو جائے گا اور بات چھپی نا رہے گی۔''

''میں کتنا بدنصیب ہوں۔'' کھیا بولا۔ پھر اس نے گردن اثبات میں ہلا دی تھی۔

رات بڑی سنسنی خیز تھی۔ میں کھیا کے ساتھ رہا تھا۔ کھیا سسک سسک کر سارے کام کر رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ سوامی نے سارے انتظامات کیے تھے اور ایک گھوڑا گاڑی میں منورما کی لاش لے گیا تھا۔

''کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے کھیا جی۔ ابھی آپ کو اپنی پتنی جی کو سنبھالنا ہے، جسے جانا تھا وہ چلا گیا، جو ہیں ان کی حفاظت کرنی ہے آپ کو۔''

''ایک بات بتاؤ ڈاکٹر جی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی۔ اسے بڑی شان سے پالا پوسا، جوان کیا۔ پریم بھی کیا سسری نے تو ایک ناگ سے اور ہم اس ناگ کو کیسے روکتے اور ہمیں پتا بھی چل جاتا تو کیا اسے کسی ناگ کے ساتھ بھیج دیتے۔ کوئی پتا ایسا کر سکتا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ایک کام کرو گے؟''

''جی۔ بتایئے۔''

''یشودھا کو سنبھالنے میں تم ہمارا ساتھ دو گے۔''

''بتایئے مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''میری جو حالت ہے اس سے وہ کہیں سمجھ نہ جائے کہ کچھ ہوگیا ہے۔ میں اس کے سامنے نہ آؤں تو کیسا رہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے۔''

''ایک لمبے جھوٹ کا سہارا لینا پڑے گا۔''

''کیسے۔''

''آپ جس طرح دہلی چلے جاتے ہیں۔ فوراً وہاں کے لیے نکل جایئے۔ اپنے کسی خاص آدمی سے کہہ دیں کہ وہ شریمتی جی کو بتا دے کہ آپ منورما جی کو لے کر بمبئی چلے گئے ہیں۔ بعد میں صورت حال کو سنبھالنا بھی آپ ہی کا کام ہوگا۔''

''کتنی بڑی بپتا پڑی ہے مجھ پر۔ مگر یہ ٹھیک ہے۔ میں اسے موبائل فون پر یہ بتا دوں گا۔''

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ صبح کی روشنی ہونے سے پہلے کھیا روتا سسکتا چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس ناقابلِ یقین ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا تھا۔ ساری رات جاگتا رہا۔ نیند آنکھوں سے بہت دور تھی۔ اب کیا کروں۔ کھیا سنگھ کی حویلی میں تو ایک گھنٹہ رکنا بھی حماقت تھی۔ لیکن اب جسے پور میں بھی کیوں رکا جائے۔

جہاں تک حویلی کے معاملات تھے، ان سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیٹا سوچتا رہا۔ پھر اچانک دولہا بابا کا خیال آیا اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ذہن میں خیال آیا کہ فجر کی نماز وہیں پڑھوں۔

حویلی کے بڑے دروازے پر محافظ مستعد تھے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر مجھے ست سری اکال کیا۔ ایک نے کہا۔ ''مہاراج۔ کوچوان تو ہے نہیں۔ ہم بگھی نکال لیں؟''

''نہیں بھائی۔ ایسے ہی پیدل سیر کرنے جا رہا ہوں، تمہارا شکریہ۔'' میں نے جواب دیا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ دولہا بابا کے مزار کی طرف رخ کیا۔ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ چلتا رہا اور آخر کار مزار پر پہنچ گیا۔ صبح کے نور نے مزار کے حسن کو چار چاند لگا رکھے تھے۔ ایک گوشہ منتخب کر کے نماز پڑھنے لگا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا، نماز مکمل کر کے ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ قدموں کی آہٹ ابھری تو میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ امرتا تھی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے خود کو چھپا لیا تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ یہیں سے مزار کے اندر داخلے کی جگہ تھی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''میں آ جاؤں۔''

یہ اجازت اس نے دولہا بابا سے لی تھی۔ پھر وہ دوبارہ بولی۔ ''اچھا آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے چپل اتاری اور اندر داخل ہوگئی۔ ''یہ ملیدہ لائی ہوں۔ تم تو کھاؤ گے نہیں۔ تمہارے نام کا چڑیوں کو ڈال دوں گی۔ دیسی گھی سے بنایا ہے۔ اب میری بپتا سنو۔ میں اپنے بابوجی کو کبھی نہیں دیکھتی۔ میرے دیکھنے سے وہ مر جائیں گے نا۔ آنکھیں پھوٹ جائیں میری۔ میں کیوں دیکھوں انہیں۔ اس دن نظر آئے تو میں دیوار سے ہی کود پڑی۔ ہائے میّا۔ میری ٹانگ بھی ٹوٹ گئی، ابھی تک درد ہے۔ بس تم سے ایک بات کہنی ہے۔ میرے بابوجی کو کوئی دکھ نہ ہو۔ وہ تندرست رہیں۔ اچھے رہیں۔ میرا کیا ہے بس انہیں یاد کر لیتی ہوں، خوب روتی ہوں۔ من ہلکا ہو جاتا ہے اور بس۔ ٹھیک ہے نا۔ ویسے ایک بات کہوں دولہا بابا۔ بڑا اچھا لگتا ہے مجھے۔ من کی بات بتا رہی ہوں تمہیں۔ بہت یاد آتا ہے، من چاہتا ہے اسے چھپ چھپ کر دیکھوں۔ مگر میرے دیکھنے سے اسے نقصان پہنچ جائے گا اس لیے نہیں دیکھتی۔ اچھا چلتی ہوں۔ اور سنو۔ اس کی رکھشا کرنا، اسے کبھی کوئی دکھ نہ ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔

میرے گالوں پر کوئی چیز رینگتی ہوئی لگی تو میں نے جلدی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ آنسو تھے جو نہ جانے کب اور کیسے نکل آئے تھے۔ تبھی مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''چلتی ہوں۔ میری باتوں کا خیال رکھنا۔ پھر آؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل آئی اور میں اسے دیکھتا رہا۔ کمبخت آنسو نکلے چلے آ رہے تھے۔

میں نے بابا پردہ پوش کی مدد سے اپنے گھر کو دیکھا تھا۔ سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ سب خوش تھے میری یاد کسی دل میں نہیں تھی، سوائے ایک وجود کے۔ وہ میری ماں تھی۔ اور ادھر امرتا تھی۔ ایک معصوم لڑکی جو میرے لیے دعا گو تھی۔ کیا کروں اس کے لیے۔ کیا کر سکتا ہوں۔

وہ چلی گئی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور مزار کے اندر داخل ہوگیا۔ قبر کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور میرے ہونٹوں سے پُردرد آواز نکلی۔ ''دولہا بابا۔ پردیسی ہوں۔ مہمان ہوں تمہارا۔ میرے لیے اللہ سے دعا کر دو کہ اس معصوم لڑکی کے دل سے میری محبت، میرا جنون نکل جائے۔ اسے کسی ایسی پائیدار محبت سے روشناس کرا دو کہ یہ مجھے بھول جائے۔ خوش رہے، زندہ رہے۔''

میں نے گردن جھکا لی۔ کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ سورج نکل آیا تھا۔ کچھ دیر وہاں رکا۔ پھر باہر رکھے مٹی کے گھڑے سے آب خورے میں پانی پیا اور پھر احاطے سے باہر نکل آیا۔

باہر قدم رکھتے ہی دل کو سکون کا احساس ہوا۔ جیسے کسی نے سہارا دیا ہو۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ ذہن سپیروں کے اس قبیلے کی طرف گیا۔ میں نے ایسی روایتی قبائلی زندگی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سپیروں کی بستی میں ناگ پنچھی کا تہوار زندگی بھر نہ بھولنے والی رات کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اب وہاں ایک انوکھی رسم ہو رہی ہوگی۔ جس کے بارے میں سوامی نے بتایا تھا۔ دل چاہا تھا کہ شیش ناگ اور اس کی محبوبہ کی آخری رسومات کو دیکھوں۔ لیکن سوامی نے کھیا سنگھ تک کو منع کر دیا تھا، کیا فائدہ وہاں جا کر بے عزتی ہو۔

انہیں خیالات میں مگن کافی دیر تک چلتا رہا۔ پھر جب خیالات سے چونکا تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ مسجد میں جانے کے بارے میں سوچتا، لیکن عین سامنے لاری اڈہ نظر آیا۔ دو پرانے طرز کی بسیں کھڑی ہوئی تھیں، اکا دکا مسافر نظر آ رہے تھے، کنڈیکٹر آواز لگا رہا تھا۔

''چندوسی۔ چندوسی۔ ایک سواری رہ گئی ہے۔ چندوسی۔ آ جاؤ بابوجی آ جاؤ۔ چندوسی۔ لاری تیار ہے۔''

لاری تیار ہے۔ میرے دماغ میں آواز گونجی۔ لاری تیار ہے۔ اور وقت ہی تقدیر ہے۔ تقدیر کی لاری تیار ہے۔ وقت کے نئے سفر کا آغاز ہونے جا رہا ہے۔ لاری تیار ہے۔

''آ جاؤ بابوجی۔ آ جاؤ۔'' کنڈیکٹر مجھے دیکھ کر بولا۔ اور میں لاری میں جا بیٹھا۔ لیکن لاری میں ایک نہیں کئی سواریوں کی جگہ تھی۔ مجھے لاری میں بٹھانے کے بعد کنڈیکٹر پھر آواز لگانے لگا۔ ''چندوسی، چندوسی، ایک سواری رہ گئی ہے۔ لاری تیار ہے۔''

مجھے ہنسی آ گئی کنڈیکٹر کی چالاکی پر۔ بے چارہ اپنا کام کر رہا تھا۔ اپنا کام کرنا ہی چاہیے۔ کیا میں اپنے کام کر رہا ہوں۔ کیا مجھے اپنے کام نہیں کرنے چاہئیں۔ میرے کام کیا ہیں؟ میں ڈاکٹر ہوں۔ لوگوں کی بیماریوں کا علاج میرا کام ہے۔ باقی سب گردشِ وقت ہے، اور وقت ہی تقدیر ہے۔ تقدیر وقت کے تعاون سے عمل کرتی ہے اور وقت تقدیر کی تحریر پر چلتا ہے۔

''آخری سواری۔ آ جاؤ۔ چندوسی۔ چندوسی۔''

اپنا کام کرو۔ اپنا کام ہی تو کر رہا تھا کہ بھوریا چرن راستے میں آ گیا۔ ایک کامیاب ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ کبھی کوئی آسان راستہ اپنانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وقت اور تقدیر کا کھیل تھا۔ میں نے کبھی درویش یا ولی بننے کے بارے میں سوچا تھا اور نہ ایسی کوئی کوشش کی تھی۔ بابا پردہ پوش نے جن طاقتوں سے روشناس کرایا تھا اور ان کے بارے میں جو ہدایات دی تھیں، اللہ کے فضل و کرم سے ان ہدایات پر عمل کیا تھا اور ان سے کبھی کوئی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اب بھی یہ نہیں چاہتا تھا۔

یہاں ہندوستان میں جن حالات میں آیا تھا اور جن حالات میں ملوث ہو گیا تھا۔ سب ''بڑے'' جانتے تھے کہ ان میں میرا ہاتھ نہیں تھا۔ اب بڑوں نے مجھ سے ہاتھ کھینچ لیا یہ ان کی مرضی۔ اپنے خیال میں، میں ان میں بھی بے قصور تھا۔

اور اب، اپنا کام کرو۔ ہاں اپنا کام ضرور کرنا چاہیے۔ فیصلے وقت اور تقدیر کے ہوتے ہیں۔ میرا کام لوگوں کا علاج کرنا ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں بس انسان ہوں۔ بیمار ہوں۔ یہاں مجھے پاکستان کی سرحد عبور کرانے کی کئی پیشکشیں ہوئی تھیں، میں کسی کی پیشکش کیوں قبول کروں۔ وقت، تقدیر جب چاہے سرحد کے دوسری طرف لے جا کر پٹخ دے، مجھے اپنا کام کرنا چاہیے۔ صرف اپنا کام۔

اچانک زور کا جھٹکا لگا اور میں چونک پڑا۔ ''ارے۔'' میرے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ لاری کب چلی، آخری سواری کب پوری ہوئی، اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ جھٹکا لاری کے رکنے کا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک مرد، ایک عورت کھڑے تھے۔ انہوں نے لاری کو رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ عورت کے سر پر ایک گٹھری رکھی ہوئی تھی۔ مرد نے ٹین کا بکس پکڑا ہوا تھا۔ کنڈیکٹر نے نیچے اتر کر دونوں چیزیں ان کے ہاتھ سے لیں اور لاری کی چھت پر رکھ دیں۔ وہ دونوں لاری میں آ بیٹھے اور لاری دوبارہ چل پڑی۔

اپنا کام کرو۔ اپنا کام کرو۔ چندوسی آ گیا۔ لاری خالی ہوگئی۔ میں بھی اتر گیا۔ یہاں انسپکٹر اعظم علی تھا۔ اس کا بہنوئی امان اللہ تھا۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے مگر پھر کیا ہوتا۔ چھپ کر بیٹھ جاتا۔ سارے کام ختم۔ کام جاری رہنے چاہئیں۔

ریل کی وسل سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ نگاہ سامنے اٹھی تو کچھ فاصلے پر ریلوے اسٹیشن نظر آیا۔ میں مسکرا دیا۔ میرا قیام چندوسی میں نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ میرے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف اٹھ گئے۔

''چھک چھک۔ چھک چھک۔'' پتا نہیں ریلوے انجن کو ایجاد ہوئے کتنا عرصہ بیت گیا۔ کوئلے اور نہ جانے کون کون سی چیزوں سے انجن چلائے گئے لیکن کم از کم برصغیر میں اس کے پہیوں کی مخصوص گڑگڑاہٹ کا تصور ایک ہی رہا۔ ایک خوبصورت ردھم۔ لاکھوں کہانیوں کا رہین۔ اس گڑگڑاہٹ میں آہیں اور سسکیاں بھی سنائی دیتی ہیں۔ بچھڑنے والوں کے غم کے افسانے، جنہیں یہ گڑگڑاہٹ میلوں دور پھینک دیتی ہے۔ اور ان کے انگڑائیوں بھرے قہقہے بھی جنہیں اس گڑگڑاہٹ کے ساتھ اپنی محبوب ہستیوں کے آنے کا تصور ہوتا ہے۔ اس وقت اس گڑگڑاہٹ میں ماضی ابھر رہا تھا۔ تصویریں نظر آ رہی تھیں اور وقت گزر رہا تھا۔ پھر یہ تصویریں تاریک ہوگئیں۔ آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔

صبح ہوگئی۔ ٹرین کی بریکیں لگ رہی تھیں۔ شور ابھر رہا تھا۔ زبردست ریلوے اسٹیشن تھا۔ بہت بڑے شہر کا۔ ٹرین خالی ہونے لگی، میں بھی نیچے اتر گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ ایک خوانچہ فروش کے سامنے جا رکا، پوری بھاجی بیچ رہا تھا۔ اس سے پوریاں خرید کر کھائیں۔ پانی پیا اور ریلوے اسٹیشن سے باہر جانے والے راستے پر چل پڑا۔

بہت خوبصورت شہر تھا۔ زندگی سے بھرپور۔ پیٹ بھر گیا تھا۔ طبیعت میں ایک جولانی سی ابھر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ کوئی فکر فاقہ نہیں تھا۔ ماحول پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ میرا کیس پرانا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نیمو کا قاتل ڈاکٹر کامران کسے یاد ہوگا۔ سب میری ہی تلاش میں تو نہیں بھٹک رہے ہوں گے۔ خیال رکھوں گا اور خطرناک لمحات سے بچنے کی کوشش کروں گا۔ کوئی خاص خیال ذہن میں نہیں تھا۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک پارک نظر آیا جس میں ہرے بھرے درخت جھول رہے تھے۔ گرمی سے بچنے کے لیے اس میں داخل ہو گیا۔ یہاں خوب ٹھنڈک تھی، گھاس پر لیٹ کر سوچنے لگا، اور ایک حکایت یاد آنے لگی۔

کسی نے کسی بزرگ سے کہا کہ جب تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ وہی ملے گا جو تقدیر میں لکھا ہے تو پھر دعا مانگنے سے کیا فائدہ۔ تو بزرگ نے جواب دیا کہ ممکن ہے تقدیر میں یہی لکھا ہو کہ جو کچھ ملے گا وہ دعا مانگنے سے ہی ملے گا۔ چنانچہ عمل میں سب کچھ ہے۔ مجھے اس قنوطیت سے نکل کر عملی طور پر ہی کچھ کرنا چاہیے۔ جو میرا کام ہے وہی کروں، اور ان لمحات سے محتاط رہوں جو میری زندگی کے لیے خطرہ ہیں۔ ویسے بھی زندہ رہنے کے لیے تحریک ضروری ہے۔ جوان ہوں، تندرست ہوں، کام کرنا ضروری ہے۔

بہت سے منصوبے ذہن میں آتے رہے۔ دیر تک پارک میں بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے نکل کر سڑک پر چلنے لگا۔ گرمی کی وجہ سے سڑکوں کی رونق کم ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی بڑی دکانوں اور شوروموں کے شٹر گرنے لگے تھے۔ میں چلتا رہا۔ اچانک کسی ایمبولینس کی آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور میں اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک ایمبولینس تیزی سے آ رہی تھی۔ میرے پاس سے گزر کر وہ آگے بڑھی اور تھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ تب میں نے اس گیٹ کی عمارت پر لکھا نام پڑھا۔ ''دھرم سماج اسپتال''

اسپتال۔ ایک عجیب سا احساس میرے دل میں ابھرا۔ میں والہانہ آگے بڑھا اور میرے قدم مجھے اسپتال میں لے گئے۔ بے حد خوبصورت بنا ہوا تھا۔ جدید ترین عمارت تھی۔ میرے دل میں نہ جانے کیا کیا خیالات آنے لگے۔ اپنا کراچی، اپنا اسپتال، وہاں کے ڈاکٹر وہاں کے معمولات، ایک رقت سی طاری ہوگئی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

میں اسپتال میں گھومتا رہا۔ پھر اوپری منزل کے ایک کوریڈور سے گزر رہا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس کے ایک بڑے افسر کی وردی میں ایک شاندار شخصیت کا مالک شخص باہر نکلا۔ اس کے ساتھ اس سے نچلے رینک کے دو افسر اور تھے۔

بالکل اتفاق سے میرا اس کا سامنا ہوا اور دوسرے لمحے میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ میں نے اسے ایک نگاہ میں پہچان لیا۔ یہ پولیس کمشنر سریش چندر تھا۔ ڈاکٹر نیمو کا بھتیجا، سریش چندر جس نے آگرے میں مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب میں ڈاکٹر شکلا کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب کشیدہ ہوئے، لیکن میرے قدم نہیں رکے۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ سریش بھی آخر پولیس والا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ دفعتاً مجھے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔ ''اے مسٹر۔ رکو۔ رکو۔''

وہی تھا، اس نے مجھے پہچان لیا۔ دوسرے لمحے میں نے دوڑ لگا دی۔ اور مجھے اپنے عقب میں آوازیں سنائی دیں۔ ''پکڑنا۔ لینا۔ جانے نہ پائے۔'' پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں۔

میں برق رفتاری سے دوڑنے لگا۔ راہداری میں اکادکا لوگ آ جا رہے تھے، اس لیے مجھے امید تھی کہ سریش گولی نہیں چلائے گا۔ راہداری ایک طرف مڑی تو مجھے دو زینے نظر آئے۔ ایک اوپر جا رہا تھا دوسرا نیچے۔ ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ چنانچہ نیچے والے زینے سے نیچے اترنے لگا۔ زیادہ سیڑھیاں نہیں تھیں، نیچے پہنچ گیا۔ گراؤنڈ فلور پر آ گیا تھا۔ لیکن یہی سیڑھیاں اور نیچے گئی تھیں۔ غالباً بیسمنٹ تھا۔ باہر جانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اوپر گیلری سے مجھے دیکھا جا سکتا تھا۔ اسپتالوں کے بیسمنٹ کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔ پورے اسپتال کے نیچے پھیلے ہوتے ہیں اور جگہ جگہ اوپر جانے کے راستے ہوتے ہیں۔ اس وقت چھپنے کے لیے جگہ درکار تھی، اس لیے میں بیسمنٹ میں اتر گیا۔

میرا اندازہ ٹھیک تھا۔ عظیم الشان بیسمنٹ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ اس میں بے شمار کمرے بنے ہوئے تھے۔ لمبے چوڑے کوریڈور تھے۔ میں کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ ابھی تک کوئی ٹھوس فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

دو تین کمروں کے دروازے کھول کر اندر جھانکا۔ خالی پڑے تھے وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک کمرے پر کلوک روم لکھا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ کھول کر جھانکا تو وہاں کپڑوں کے انبار نظر آئے۔ وسیع و عریض کمرے میں الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں ایپرن لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار چیزیں تھیں۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

یہاں آ کر میں نے فیصلہ بدل دیا۔ یہاں چھپنے کے بجائے اگر باہر نکلا جائے اور حالات کا جائزہ لیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ جوں ہی موقع ملے یہاں سے نکل جایا جائے۔ میں نے الماریاں کھول کھول کر دیکھیں۔ ان میں ساری چیزیں میرے کام کی تھیں۔ چنانچہ ایک الماری سے اپنے سائز کا سفید کوٹ نکالا۔ وہیں سے ماسک بھی مل گیا تھا۔ کوٹ پہن کر ڈاکٹرز ماسک چہرے پر لگا لیا۔ ایک طرف ناکارہ اسٹیتھسکوپ بھی مل گئے۔ ان میں سے ایک اسٹیتھسکوپ اٹھا کر گلے میں لٹکایا اور پورا ڈاکٹر بن کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب مجھے اوپر جانے والے راستے کی تلاش تھی، جو مجھے فوراً مل گیا۔

سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچا ہی تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی میری طرف دوڑی۔ ''ڈاکٹر ترویدی۔ ڈاکٹر ترویدی۔ جلدی آیئے۔ پلیز جلدی آیئے۔ سرجن شا کے بیٹے کا کار ایکسیڈنٹ ہوا ہے سر کی ہڈیاں چور چور ہوگئی ہیں۔ اس کا آپریشن کرنا ہے۔ سرجن اس کا اسکین دیکھ کر بے ہوش ہو گئے ہیں۔ اگر فوری آپریشن نہ ہوا تو ان کا نوجوان بیٹا مر جائے گا۔ آیئے۔ پلیز۔ آیئے۔'' لیڈی ڈاکٹر نے میرا بازو پکڑا اور مجھے گھسیٹنے لگی۔

میرا دل چاہا کہ بے اختیار قہقہے لگاؤں۔ دل میں کہا۔ مت چھوڑو میرے مہربانو۔ مجھے مت چھوڑو۔ میں خود تمہیں کہاں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ چلو حاضر ہوں۔ اپنے منصب کو سرانجام دوں گا، اس کے بعد سزائے موت قبول ہے۔

ڈاکٹر مجھے آپریشن تھیٹر میں لے گئی۔ زخمی نوجوان آپریشن ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ بے حد خوبصورت کوئی انیس سالہ نوجوان تھا۔ آپریشن تھیٹر کا ماحول بے حد گمبھیر تھا۔ کئی ڈاکٹر اور نرسیں خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک پُروقار شخصیت کا مالک عمر رسیدہ ڈاکٹر ٹیبل پر بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اور دو ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر شا آپریشن کرنے کے لیے آئے۔ لیکن ان کے اعصاب بے قابو ہوگئے اور وہ بے ہوش ہوگئے۔'' ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ ظاہر ہے میں کیا جواب دیتا۔ میں نے خاموشی سے نوجوان پر نظریں جما دیں اور میری خوشی کی حد نہ رہی، جب میری آنکھوں نے اس کے دماغ میں جھانک کر ساری کیفیت دیکھ لی۔ خدا کی قدرت سے اس کے برین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا، بس ہڈیاں ٹوٹی تھیں۔

میں نے بڑی مہارت سے آپریشن شروع کر دیا۔ اپنا کام کرتے ہوئے میں سب کچھ بھول گیا۔ پورے دو گھنٹے تک میں نے سر نہیں اٹھایا۔ پھر اپنے کام سے فارغ ہو کر میں نے دوسرے ڈاکٹروں کو اس کی بینڈیج کرنے کا اشارہ کیا۔ اور ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ میں چارٹ پر ہدایات اور آپریشن کی تفصیل لکھنے لگا۔ دوسری تجاویز بھی میں نے لکھیں اور چارٹ ایک نرس کے حوالے کر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔

باہر نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کمبخت سریش چندر نے اور پولیس کی نفری بلا لی تھی۔ تمام گیٹ سیل کر دیئے گئے تھے اور پولیس کے جوان ہر شخص کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ اندازہ ہو گیا کہ اسپتال سے باہر نکلنا مشکل ہے، اب کیا کروں؟

اچانک سامنے سے کچھ پولیس کے جوان آتے نظر آئے۔ ایک ایک فرد کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ میں رکے بغیر آگے بڑھا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بھی شاید کسی ڈاکٹر کا کمرہ تھا اور ڈاکٹر کسی کام سے گیا ہوا تھا کیونکہ کرسی پر اس کا کوٹ لٹکا ہوا تھا۔ گہرے براؤن رنگ کے اس کوٹ کو کرسی سے اتارا اور سفید کوٹ اس کی جگہ لٹکا دیا۔ پہن کر دیکھا تو بالکل فٹ تھا۔ کمرے میں نظر دوڑائی تو واش روم کا دروازہ نظر آیا۔ واش روم میں داخل ہو گیا۔ وہاں دوسرا دروازہ نظر آیا جو راہداری میں کھلتا تھا۔ ماسک اتار کر ڈسٹ بن میں پھینکا اور اس دروازے سے باہر نکل آیا۔

خدا کی پناہ۔ یہ سریش چندر بھی کمبخت کا نا دجال تھا۔ ابھی راہداری میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے آتا نظر آیا۔ پولیس کے دوسرے آفیسر بدستور اس کے ساتھ تھے۔ میں بدحواس ہو کر پلٹنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ بائیں ہاتھ پر نیچے جانے کا راستہ نظر آیا، اور میں نے سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ یہ راستہ بھی بیسمنٹ میں جاتا تھا۔ نیچے مختلف سمت راہداریاں نظر آئیں۔ ایک راہداری کی طرف دوڑا۔ اسی وقت پیچھے ہنگامے کی آواز آئی۔ سریش نے مجھے پھر دیکھ لیا تھا اور اب وہ زینے اتر رہے تھے۔ اس راہداری کا اختتام بھی ایک اور زینے پر ہو رہا تھا جو اور نیچے جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگر مجھے غلط فہمی نہیں ہو رہی تو یہ راستہ سرد خانے کو جا رہا ہوگا۔ مردہ گھر جہاں لاوارث لاشیں رکھی جاتی ہیں۔

بالکل ٹھیک اندازہ تھا۔ ایک فولادی دروازہ جو اسٹیئرنگ سے کھلتا تھا، نظر آیا۔ خدا کرے یہ لاک نہ ہو۔ میں نے دعا کی اور اسٹیئرنگ گھمایا۔ دروازہ کھل گیا اور میں سرد خانے میں داخل ہو گیا۔ چاروں طرف حیرت انگیز مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے اسٹیل ریک نظر آ رہے تھے جن میں لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک انتہائی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لاشیں میزوں پر رکھی ہوئی تھیں، کچھ ریکوں میں تھیں۔ میں جلدی سے ایک خالی ریک میں لیٹ گیا اور میں نے برابر کے مردے کے اوپر سے چادر کھینچ کر اپنے اوپر ڈال لی۔

سریش چندر یہاں بھی آ گیا۔ میں ان لوگوں کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن خوش بختی سے وہ یہاں زیادہ نہیں رکے۔ اول تو یہاں کی بدبو، پھر ٹھنڈک۔ ان دونوں چیزوں نے میری مدد کی اور وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔ حالت میری بھی خراب تھی لیکن میں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ایسی جگہیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

تھوڑی دیر تک آہٹوں پر کان لگائے رہا۔ پھر جب اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں تو ریک سے باہر نکل آیا۔ جو کوٹ میں پہنے ہوئے تھا، اس سے بڑی مدد مل رہی تھی۔ اور سردی زیادہ نہیں محسوس ہو رہی تھی، اس لیے میں مزید کچھ دیر یہاں رکا تاکہ وہ بیسمنٹ سے بھی باہر نکل جائیں۔ پھر جب کوئی آہٹ نہ رہی تو میں نے سرد خانے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

کیا سوچا ہوگا انہوں نے۔ کیا انہیں یقین ہوگا کہ میں بیسمنٹ میں ہی ہوں۔ یا پھر انہوں نے سوچا ہوگا کہ میں اوپر جانے والے کسی راستے سے اوپر نکل گیا ہوں۔

الغرض باہر آ کر میں پھر محتاط انداز میں بیسمنٹ میں گھومنے لگا۔ اب یہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ یہ اندازہ بخوبی ہو گیا کہ سریش چندر کبھی ہمت نہیں ہارے گا اور اب کسی معجزے کا ہی انتظار کرنا ہوگا۔ کافی تھک گیا تھا۔

شام ہو گئی۔ پھر شاید رات کیونکہ بیسمنٹ میں مدھم روشنیاں جل رہی تھیں۔ کبھی کبھی آہٹیں بھی سنائی دے جاتی تھیں۔ وقت اور گزرا اور اب ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ آخر کار فیصلہ کیا اور ایک اوپر جانے والے زینے کا رخ کیا۔ اس زینے کا اختتام وزیٹرز لابی میں ہوا تھا۔ یہاں البتہ کافی لوگ نظر آ رہے تھے۔

چند ہی لمحے گزرے تھے کہ وارڈ بوائے ایک اسٹریچر دھکیلتے ہوئے آتے نظر آئے۔ اس پر سفید کپڑے سے ڈھکی لاش رکھی ہوئی تھی۔ روتے پیٹتے لوگ اس لاش کی طرف لپکے اور بین کرنے لگے۔ کچھ دوسرے لوگ انہیں پیچھے ہٹانے اور صبر کی تلقین کرنے لگے۔ مجھے فوراً تدبیر سوجھ گئی۔ میں سوگوار سی شکل بنا کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا، کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔

میں لاش کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ایک بڑی ایمبولینس کا پچھلا دروازہ کھلا اور میں سب سے پہلے اس میں داخل ہو گیا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر پیشہ ورانہ انداز میں اسٹریچر کو پکڑ کر آگے گھسیٹا اور اس کے اسٹینڈ پر فٹ کر دیا۔ وارڈ بوائے نیچے اتر گئے، اور کچھ دوسرے لوگ اوپر آ گئے۔ مرحوم کے دوسرے لواحقین اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ پچھلا دروازہ بند ہوا اور ایمبولینس اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ جس گیٹ سے وہ باہر نکلی اس پر بھی پولیس کے کوئی آٹھ دس جوان کھڑے ہوئے تھے جنہوں نے ایمبولینس پر بھی ٹارچ کی روشنی ڈالی تھی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ تب میں نے سکون کی سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا۔

ایمبولینس کا سفر کوئی بیس منٹ تک جاری رہا۔ پھر وہ ایک عمارت کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ اور اندرونی عمارت کے گیٹ کے پاس رکی، یہاں بھی خوب رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ میت اتاری گئی تو میں نے یہاں بھی سرگرمی دکھائی اور اسٹریچر اتارنے میں مدد کی اور آگے تک گیا، لیکن اندر عمارت میں نہیں گیا، حتیٰ کہ ایمبولینس واپس چلی گئی۔ البتہ کوٹھی میں خوب آنا جانا لگا ہوا تھا۔ گیٹ پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی چنانچہ میں ٹہلنے والے انداز میں عمارت سے باہر نکل آیا۔

کیا خوب دن گزرا تھا۔ زندگی کا یادگار دن۔ آج تک کی زندگی میں اتنا پُرمشقت دن کبھی نہیں گزرا تھا۔ بھوک سے جان نکل رہی تھی۔ تھوڑے سے پیسے جیب میں تھے، انہیں نکال کر دیکھا۔ زیادہ نہیں تھے، عارضی طور پر کام چل سکتا تھا۔ دفعتاً مجھے اس کوٹ کا خیال آیا جو کسی ڈاکٹر کا تھا اور میں نے صرف حلیہ بدلنے کے لیے پہن لیا تھا۔ اس کوٹ سے مجھے سرد خانے میں بھی مدد ملی تھی۔

دیکھوں تو سہی کس کا ہے۔ ہو سکتا ہے اندر نام پتا نکل آئے۔ نام پتا تو کسی کا نہیں نکلا تھا لیکن کوٹ سے کرنسی نکل آئی تھی جو کافی تعداد میں تھی۔ تھوڑی سی کشمکش دل میں ہوئی لیکن دماغ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے کسی ہوٹل کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ کچھ دور پیدل چل کر آخر کار ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ مسلم ہوٹل تھا، چنانچہ کھانے میں قباحت نہیں ہوئی۔

میں نے ہوٹل کے ویٹر سے کہا۔ ''بھائی میں مسافر ہوں۔ باہر سے آیا ہوں۔ آس پاس ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ مل سکتی ہے۔''

''کیوں نہیں بھائی میاں۔ پیچھو چلے جاؤ۔ عوامی ہوٹل کا بورڈ نظر آ جائے گا۔ ہواں کمرے بھی مل جاتے ہیں۔'' ویٹر نے اپنی زبان میں کہا۔

عوامی ہوٹل عوامی ہی تھا مگر صاف ستھرا۔ کمرے میں سہولیاتِ زندگی موجود تھیں۔ ویسے بھی اب ماضی کو دل سے نکال پھینکا تھا۔ بچپن سے خوب عیش و آرام سے زندگی گزاری تھی۔ والد درویش صفت تھے لیکن چچا صاحب کے تعاون سے کاروبار کر کے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔ بھائی تھے جنہوں نے ہمیشہ بھرپور محبت دی تھی، اس دن بابا صاحب کے تعاون سے گھر میں جو کچھ دیکھا تھا، اس پر آج تک حیرت تھی کہ انہوں نے میری جدائی کیوں فراموش کر دی۔ لیکن ٹھیک تھا، آخر کار لوگ مرنے والوں کو بھی صبر کر لیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے سب یاد آ جایا کرتے تھے اور دل اداس ہو جاتا تھا۔

عوامی ہوٹل مسلم ہوٹل تھا۔ حلال گوشت مل جاتا تھا، مسلمان باورچی تھے جو گائے کے گوشت کے علاوہ سب کچھ پکاتے تھے۔ یہاں وقت سکون سے گزرا۔ دوسرے دن ناشتے کے بعد سوچا کہ ضروریاتِ زندگی کا کچھ سامان خرید لیا جائے، کپڑوں وغیرہ کی ضرورت تھی۔ دکانیں کھلنے کے وقت کا انتظار کیا۔ پھر باہر نکل آیا۔ ہوٹل سے باہر نکلا ہی تھا کہ وہ ویٹر نظر آ گیا۔ جس نے مجھے عوامی ہوٹل کا پتا بتایا تھا۔ مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ اور میرے پاس آ گیا۔

''سب خیر ہے بھائی میاں۔''

''تمہاری دعا ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''فتح محمد۔ فتو کہویں ہیں سب۔ ہوٹل میں ٹھکانہ مل گیا۔''

''ہاں۔ فتو میاں۔ یہاں دکانیں وغیرہ نہیں نظر آ رہیں۔ بازار کہاں ہیں؟''

''لو۔ وہ کیا رہے۔ سونا منڈی کے پیچھے چلے جاؤ۔ بازار ہی بازار ہیں۔''

''اور سونا منڈی کہاں ہے؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا اور اس نے مجھے تفصیل سے سونا منڈی کے بارے میں بتایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بازار کی طرف چل پڑا۔ بازار کھل گئے۔ میں نے ضرورت کی چیزیں خریدیں اور سوٹ کیس لے کر واپس چل پڑا۔ ایک فٹ پاتھ کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک میرے قدم رک گئے۔

یہاں ایک اخبار فروش آج کے اخبار سجائے بیٹھا تھا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر ہی میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ تصویر اس وقت کی تھی جب میں ڈاکٹروں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا تھا اور میرا خصوصی استقبال کیا گیا تھا۔ اس میں، میں شاندار سوٹ میں ملبوس اور بہت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس وقت جن مصائب اور حالات سے گزر رہا تھا، انہوں نے میری شکل بدل دی تھی۔ اب آسانی سے نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

یہ اخبار اٹھایا تو اس کے ساتھ دوسرے اخبارات بھی تھے اور ان سب میں میری مختلف تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ چار اخبار خریدے اور انہیں لے کر چل پڑا۔ دل کچھ عجیب عجیب سا ہو رہا تھا۔ میں پھر اخبارات کی زینت بن گیا ہوں۔ دیکھوں اب میرے بارے میں کیا گل افشانی کی گئی ہے۔ کمرہ بند کر کے اخبارات اٹھا لیے۔ پہلے اخبار میں لکھا تھا۔

دنیا کا سب سے حیرت انگیز ڈاکٹر۔

یہ وہ شخص ہے جو پڑوسی ملک سے میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے آیا تھا لیکن یہاں ایک جرم کر بیٹھا، اور قاتل بن گیا۔ لیکن پھر اس نے پولیس کے اعلیٰ ترین لوگوں کو ایسے چکر دیئے کہ محکمہ پولیس گھن چکر بن گیا۔ یہاں اس نے بڑی بے خوفی سے کئی ایسے مریضوں کے حیرت ناک علاج کیے جو موت کی وادیوں کا سفر کر رہے تھے اور وہ صحت یاب ہو گئے۔ یہ شخص مسلمان ہے لیکن اس نے ہندو مسلمان کا فرق کیے بغیر صرف انسانی فرض ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کوئی روحانی شخصیت ہے کیونکہ یہ کئی بار گرفتار ہوا ہے مگر صاف نکل جاتا ہے۔

پچھلے دن پولیس کمشنر سریش چندر جی جو کسی سرکاری کام سے آئے تھے، نے اسے دھرم سماج اسپتال میں اچانک دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ فرار ہوا لیکن اسپتال سے نہ بھاگا بلکہ پولیس کی زبردست جدوجہد کو ناکام بنا کر اس نے اسپتال اور ہندوستان کے بہت بڑے سرجن مانک شا کے بیٹے وشال شا کے سر کا آپریشن کیا جو ایک ناقابلِ یقین مہارت کا نمونہ تھا۔ یہ ایک ایسا آپریشن ہے جو نیورو سرجری کی دنیا میں صدیوں یاد رکھا جائے گا۔ اس کے بعد وہ اسپتال سے غائب ہو گیا۔

سرجن شا نے بیان دیا ہے کہ وہ ہندوستان بھر کے ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر ڈاکٹر کامران مسعود کی رکھشا کے لیے مہم چلائیں گے۔ اس کے بعد سرجن مانک شا کا مختصر بیان تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ میرے لیے بھگوان کا اوتار بن کر آیا۔ اور میرے بیٹے کا جیون بچا لیا۔ جو آپریشن اس نے کیا، میں اس کی تفصیل بعد میں اخبارات کو بتاؤں گا۔ یہ آپریشن نہیں غیر انسانی کاریگری تھی، جو میں ہی نہیں دنیا کا کوئی سرجن نہیں کر سکتا۔ میں اس بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ اس نے میرے گھر کا دیا روشن کیا ہے۔ اس کے جیون کا دیا ہمیشہ روشن رہے۔

(جاری ہے)

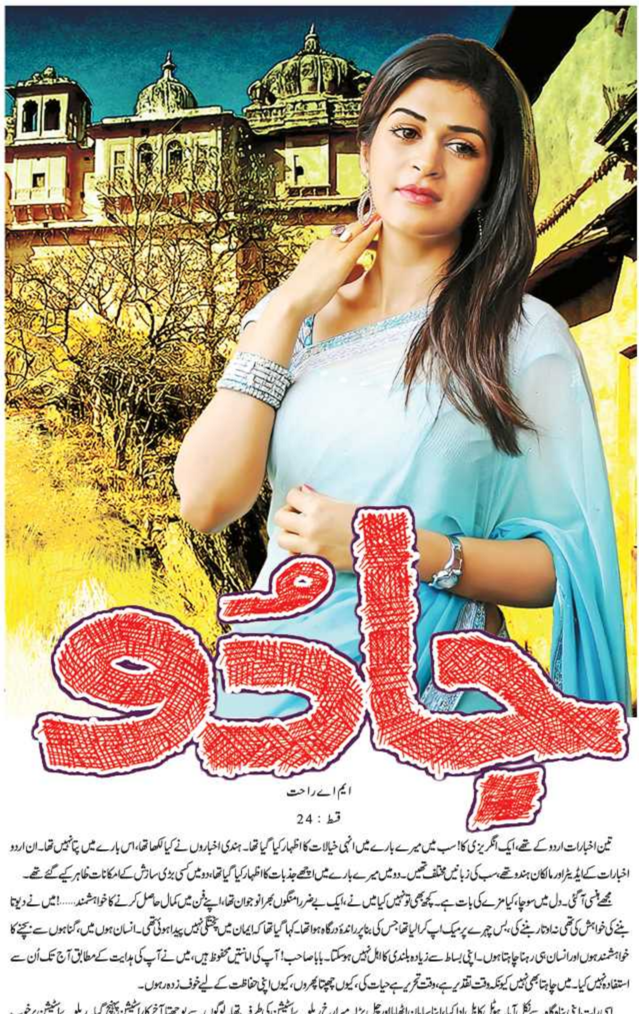

جادو

ایم اے راحت

قسط : 24

تین اخبارات اردو کے تھے، ایک انگریزی کا! سب میں میرے بارے میں انھی خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ ہندی اخباروں نے کیا لکھا تھا، اس بارے میں پتا نہیں تھا۔ ان اردو اخبارات کے ایڈیٹر اور مالکان ہندو تھے، سب کی زبانیں مختلف تھیں۔ دو میں میرے بارے میں اچھے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا، دو میں کسی بڑی سازش کے امکانات ظاہر کیے گئے تھے۔

مجھے ہنسی آگئی۔ دل میں سوچا، کیا مزے کی بات ہے۔ کچھ بھی تو نہیں کیا میں نے، ایک بے ضرر امنگوں بھرا نوجوان تھا، اپنے فن میں کمال حاصل کرنے کا خواہشمند......! میں نے دیوتا بننے کی خواہش کی تھی نہ اوتار بننے کی، بس چہرے پر میک اپ کرالیا تھا جس کی بنا پر راندۂ درگاہ ہوا تھا۔ کہا گیا تھا کہ ایمان میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ انسان ہوں میں، گناہوں سے بچنے کا خواہشمند ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی بساط سے زیادہ بلندی کا اہل نہیں ہو سکتا۔ بابا صاحب! آپ کی امانتیں محفوظ ہیں، میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق آج تک اُن سے استفادہ نہیں کیا۔ میں چاہتا بھی نہیں کیونکہ وقت تقدیر ہے، وقت تحریر ہے حیات کی، کیوں چھپتا پھروں، کیوں اپنی حفاظت کے لیے خوف زدہ رہوں۔

اسی رات اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ ہوٹل کا بل ادا کیا، اپنا سامان اٹھایا اور چل پڑا۔ میرا رخ ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا۔ لوگوں سے پوچھتا آخر کار اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریلوے اسٹیشن پر خوب رونق تھی، سارا ماحول روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ میرے دل پر بھی کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ایک بک اسٹال سے ریلوے شیڈول خریدا اور بنچ پر بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ ہندوستان کے شہروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ ابھی اسی مطالعے میں مصروف تھا کہ شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں۔ نظریں اٹھا کر دیکھا بہت سے لوگوں کا ایک گروہ نظر آیا۔ یہ ننگ دھڑنگ تھے اور صرف نچلے بدن پر دھوتی پہنے ہوئے تھے، سر گھٹے ہوئے تھے جن کے درمیان بالوں کا بس ایک گچھا تھا، ماتھے پر سرخ اور پیلے رنگ نظر آرہے تھے۔ سامان کے تھیلیان کے ہاتھوں میں لٹکے ہوئے تھے، غالباً کوئی مذہبی رسم ادا کرنے جا رہے تھے۔

میں دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے، پھر ان میں سے ایک اپنی جگہ سے چل کر چائے کے اسٹال پر پہنچا تو میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسٹال پر جا کر میں نے چائے مانگی۔ وہ شخص سب کے لیے چائے بنانے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے لیے چائے بنوالیں، میں دوسرے اسٹال سے چائے پی لوں گا۔“

”ارے نہیں ہمیں تو بیس چائے چاہئیں جو نہیں بنانی پڑیں گی، آپ کی چائے تو تیار ہے۔“ اس نے بڑے شستہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت اسٹال والے نے میری طلب کردہ چائے کا کپ میری طرف بڑھایا تو میں نے وہ کپ اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ”چلیے پھر آپ ایک کپ چائے میرے ساتھ پی لیجیے۔“

”نا نا نا......! ہم ایک ساتھ چائے پئیں گے، میں اکیلا پی لوں گا تو وہ برا مانیں گے۔“

”اوہ اچھا!“ میں نے چائے کا سپ لے کر کہا۔ ”کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ......؟“

”ہم یاترا پر نکلے ہیں، ابھی متھرا جی جا رہے ہیں، وہاں سے بندرا ون پھر گگن شری اس کے بعد کاشی جی......! آپ کا شبھ نام......؟“

”کامران مسعود۔“ میں نے جواب دیا اور وہ بری طرح چونک پڑا، پھر ایک دم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔ ”مم، مسلمان ہو تم......؟“

”الحمدللہ......!“ میں نے اس کی بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا۔

”رام رام رام......اے چائے والے، کیا نام ہے تیرا..؟“

”دھنی رام مہاراج!“ اسٹال والا بولا۔

”ہم اپنے برتن لا رہے ہیں، اس میں چائے بنانا، لا رہے ہیں ہم اپنے برتن!“ یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔ اس کے چہرے پر کراہت کے آثار تھے۔ میں خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور ریلوے کے ٹکٹ گھر پہنچ گیا۔ یہاں سے میں نے متھرا کے لیے ٹکٹ خرید لیا۔ کوئی خاص مقصد نہیں تھا، بس کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ یاترا کے لیے متھرا جانے والوں کا کمپارٹمنٹ بھی برابر میں تھا۔ ٹرین کے سفر میں وہ خوب شور مچاتے رہے تھے۔ یہ چھوٹے بڑے اسٹیشن پر اترتے اور بھاگ دوڑ کرتے۔

میں نے دوبارہ ان کے قریب جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا، پھر متھرا آ گیا۔ اپنی نوعیت کا منفرد شہر تھا۔ ویسے بھی اب کوئی کتنا بھی روایتی شہر ہو، تمام جدید ضروریاتِ زندگی سے آراستہ ہوتا ہے۔ متھرا میں ہر سطح کے ہوٹل تھے۔ دریائے جمنا کے کنارے کنارے بے شمار مندروں کے کلس جگمگا رہے تھے۔ یہاں درمیانے درجے کے ہوٹل تھے جو زیادہ تر یاتریوں سے آباد تھے۔

مجھے یہاں سے کافی دور ایک مسلم ہوٹل میں کمرہ حاصل ہو گیا تھا۔ اب میں بس ایک سیاح تھا اور کوئی خاص کام نہیں تھا۔ کچھ ایسی باتیں تھیں جنہیں میں نے گرہ میں باندھ لیا تھا۔ وقت ہی تقدیر ہے، انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، وہ وقت اور تقدیر کے اشتراک سے ہوتا ہے۔ چنانچہ کوئی تردد بے مقصد ہے۔ میں ہشاش بشاش تھا۔ ذہن سے ہر بوجھ ہٹا دیا تھا۔ یہ فکر بالکل چھوڑ دی تھی کہ مجھے پہچان لیا جائے گا۔ یہاں بھی اخبار خرید کر دیکھے لیکن میرا ذکر اب ختم ہو گیا تھا۔

پوجا پاٹ کرنے والوں اور پجاریوں کی سرگرمیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کسی نے ہرے کرشنا مندر کے بارے میں بتایا جسے ہرے کرشنا ہرے راما تنظیم کے رکن انگریزوں نے تعمیر کیا تھا، چنانچہ اسے دیکھنے کی خواہش دل میں پیدا ہو گئی۔ معلومات حاصل کر کے مندر پہنچ گیا۔ یہاں اور بھی مندر تھے لیکن یہ مندر واقعی اپنی مثال آپ تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں ہندو عبادت گزار کم تھے بلکہ مضحکہ خیز شکلوں کے انگریز مردوں اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مردوں نے سر گھٹا کر بیچ میں چوٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عورتیں سفید ساڑھیاں پہنے نظر آتی تھیں۔ شام کی پوجا کے بعد بندر ناچ شروع ہو جاتا تھا اور فضا نشہ آور ادویات، چرس وغیرہ کی بدبو سے گھٹن آلود ہو جاتی تھی۔

شام کی نسبت دن کا وقت یہاں پُرسکون ہوتا تھا۔ دن میں یہاں وزیٹرز کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، مندر کو اندر سے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے یہ مندر دیکھا۔ انگریزوں نے کمال کیا تھا۔ جگہ جگہ بت ایستادہ تھے اور اس خوبی سے بنائے گئے تھے کہ ایک ایک قدم پر انسان دھوکا کھا جائے۔

اس وقت میں مہادیو کے مجسمے کے پاس کھڑا اس کی تعمیر کی کاریگری دیکھ رہا تھا کہ ایک انتہائی سریلی لیکن پاٹ دار اور پُروقار آواز سنائی دی۔ ”ہیلو......!“

پلٹ کر دیکھا تو ایک خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ سرخ و سفید رنگت، بلند و بالا قد، بھرا بھرا بدن! عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا لیکن انتہائی پُرکشش شخصیت تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ”ڈاکٹر کامران......؟“

میرے پورے بدن میں چھنا کا سا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اعصاب ساکت ہو گئے تھے۔ یہ صرف حیرت کا جھٹکا تھا، اس میں خوف کی ذرہ بھر آمیزش نہیں تھی۔

”میں دوست ہوں ڈاکٹر کامران! سو فیصد دوست......براہ کرم ایک لمحہ بھی میرے بارے میں غلط نہ سوچیں۔“

”بہتر شکریہ......!“ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”مجھے آپ کی ضرورت ہے ڈاکٹر!“ وہ بولی۔

”تو کیا آپ میری تلاش میں یہاں آئی تھیں؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”آپ کا طنز بجا ہے لیکن میں اگر یہ کہوں کہ واقعی میں یہ معلوم کر کے ہی یہاں آئی ہوں کہ آپ یہاں موجود ہیں۔“

”زبردست انٹیلی جنس ہے آپ کی!“

”میری ذات سے آپ کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچے گا، پہلے آپ ذہن میں یہ بات بٹھا لیں اس کے بعد ہم دوسری باتیں کریں گے۔“

”چلیے ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گے؟“

”کہاں......؟“

”فی الحال میرے ہوٹل۔“

”اس کے بعد......؟“ میں نے سوال کیا۔

”نئے جہانوں کی سیر پر!“ وہ دلکش مسکراہٹ سے بولی۔

”یعنی پرلوک......؟“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

”ہندی آپ کے منہ سے اچھی لگی، ویسے دوست پرلوک نہیں لے جاتے، بشرطیکہ ان پر بھروسہ کر لیا جائے۔“

”اگر میں آپ کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں تو......؟“

”مجھے بہت دکھ ہوگا۔“

”آپ میرے بارے میں پولیس کو اطلاع دے دیں گی؟“

”پولیس......!“ وہ طنزیہ ہنسی۔ ”پولیس آج تک آپ کا کیا بگاڑ سکی ہے، جواب بگاڑ لے گی۔“

”ویسے آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے، یہ اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے، آپ کون ہیں؟“

”میری درخواست ہے کہ میرے ساتھ میرے ہوٹل چلیں، واپس آنا چاہیں گے تو کوئی دقت نہیں ہوگی، وہیں باتیں کریں گے۔“

میری زندگی حیرتوں سے بھری پڑی تھی۔ ہمیشہ ایسا عمل ہوتا تھا کہ عقل چکرا کر رہ جاتی تھی، اب یہ محترمہ! گفتگو سے خاصی معقول لگتی تھیں اور میرے بارے میں اتنا ضرور جانتی تھیں کہ میں کون ہوں۔ دیکھا جائے کہ یہ خود کون ہیں۔

”چلو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں!“ میں نے مختصراً کہا اور وہ خوش ہو گئی۔

اس نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ قدم بڑھا دیئے تھے۔ ہم مندر سے باہر نکل آئے۔ وہ ایک قیمتی کار کی طرف بڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ دولت مند عورت ہے۔ اسے دور سے ہی دیکھ کر دو آدمی کار سے اترے۔ دونوں وردی میں تھے، ایک ڈرائیور تھا جو سفید وردی پہنے ہوئے تھا، دوسرا گن مین تھا جس نے شاندار خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور گن مین ایڑیاں بجا کر الرٹ ہو گیا۔

”آیئے!“ عورت نے کہا اور ہاتھ سے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا تو وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے لباس سے انتہائی مسحور کن خوشبو آرہی تھی، جسے میں نے اب محسوس کیا تھا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور گن مین اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”ہوٹل!“ عورت نے مختصراً کہا اور کار بے آواز اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

ہوٹل بہت شاندار تھا۔ خوبصورت عورت مجھے اس کے ایک کمرے میں لے گئی جو فائیو اسٹار حیثیت کا حامل تھا۔ ”میں چینج کر لوں، آپ آرام سے بیٹھئے۔“ اس نے کہا اور واش روم کی طرف چلی گئی۔

میں اس کے واپس آنے تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ بہت پُراسرار لگی تھی وہ مجھے، میرے بارے میں کتنی معلومات حاصل تھیں، یہاں تک کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں کس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ کون ہے یہ......! آخر مجھ سے کیا چاہتی ہے؟

واپس آئی تو پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ میرے سامنے بیٹھ گئی اور بولی۔ ”کیا پئیں گے؟“

”کافی منگوالیں۔“ میں نے کہا اور اس نے روم سروس کو فون کر دیا۔

”اصولی طور پر آپ کو میرا نام اور میرے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا ڈاکٹر کامران! لیکن کوئی بات نہیں، میں خود آپ کو اپنا نام بتائے دیتی ہوں، میرا نام سندھورتا ہے، تعلق رجواڑوں سے ہے، آپ نے راجپوتانہ کی ریاست الور کے بارے میں سنا ہوگا؟“

”نہیں!“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”اچھا! یہ ریاست ٹونک کے مشرقی سمت واقع تھی، تھی میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اب ہندوستان میں ریاستوں کا وجود کہاں ہے۔“

”جی!“ میں نے مختصراً کہا۔

”الور کے نواح میں راج ونسی پریوار بہت مشہور تھا، اب بھی اس کے لوگ وہاں آباد ہیں۔“

”آپ کا تعلق اسی خاندان سے ہے؟“

”ہاں ونسی پریوار سے!“

”آپ وہیں رہتی ہیں؟“

”میں جے پور میں رہتی ہوں، وہیں کوٹھی بنائی ہے میں نے، ہندوستان کے بیشتر حصوں میں میرے کئی کاروبار پھیلے ہوئے ہیں جن کی دیکھ بھال میرے لوگ کرتے ہیں۔“

”بہت دولت مند خاتون ہیں آپ!“ میں نے کہا۔

”دولت......!“ وہ طنزیہ ہنسی۔ پھر جلدی سے بولی۔ ”آپ کو دولت سے دلچسپی ہے؟“

”نہیں!“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔“ اس کا جواب بھی پُراعتماد تھا۔

”آپ میری حیرت رفع کریں گی، آپ نے بہت سی حیرت انگیز باتیں کی ہیں جنہیں میں نہیں سمجھ سکا ہوں، آپ کو میرے بارے میں اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں، یہی نہیں بلکہ آپ نے کہا ہے کہ آپ میرے لیے ہی مندر پہنچی تھیں۔“

”صرف مندر ہی نہیں، میں جے پور سے متھرا آپ کے لیے آئی ہوں۔“

”اوہ......!“ میں نے کہا۔

”کیونکہ مجھے آپ کی ضرورت تھی۔“

”مزید تعجب ہے۔“

”ایک بات پوچھوں بلکہ پہلے میں یہ بتا دوں کہ مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے، یہ کہ آپ کا تعلق پاکستان سے ہے، آپ وہاں کے نامی گرامی ڈاکٹر ہیں اور آپ نے کئی حیرتناک علاج کیے ہیں، آپ کے بس میں کچھ پُراسرار قوتیں ہیں جو آپ کی مدد کرتی ہیں، یہاں آپ ایک میڈیکل کانفرنس میں آئے تھے۔“

اس نے ڈاکٹر نیوکے قتل اور اس کے بعد پولیس سے میری آنکھ مچولی کی پوری داستان سنا دی، پھر بولی۔ ”بس ایک بات پر مجھے بڑی حیرت ہے۔“

”وہ کیا......؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”آپ کے بس میں پوشیدہ قوتیں ہیں تو آپ ان کی مدد سے اپنے دیش واپس کیوں نہیں چلے گئے؟“

”اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”کیا......؟“

”میرے بس میں پوشیدہ قوتیں نہیں ہیں۔“

”میں نہیں مانتی۔ سوری......!“ وہ بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ”اچھا یہ بتائیے کیا آپ نے انوکھے علاج نہیں کیے؟“

”آپ انہیں انوکھا کہہ سکتی ہیں لیکن میں ایک ڈاکٹر ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت تھی، پھر جیسے خود سے کہنے لگی۔ ”میڈیکل سائنس بھی سائنس کی دوسری خصوصیات کی طرح جادوگری جیسی حیثیت اختیار کر چکی ہے، مانتی ہوں لیکن پھر دنیا آپ کی جادوگری کو کیوں مانتی ہے، دنیا کے جدید ترین ممالک میں آپ کو انوکھا کیوں کہا جاتا ہے، آپ کے طریقہ علاج کو پُراسرار کیوں کہا جاتا ہے؟“ پھر وہ جیسے چونک پڑی اور بولی۔ ”سوری لیکن آپ......!“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں ڈاکٹر ہوں، کسی نہ کسی طرح اپنے مریض کا علاج کر لیتا ہوں لیکن آپ خود کیا ہیں، آپ کے پاس کونسی قوتیں ہیں کہ آپ نے میرے بارے میں اتنا کچھ معلوم کر لیا؟“

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی۔ ”ہاں! سوال تو ہے، ایک بات پوچھوں؟“

”جی ضرور پوچھئے۔“

”آپ اپنے دیش کے کسی مشن پر کام کر رہے ہیں، یہاں آپ کے دوسرے مددگار بھی ہیں؟“

”یعنی جاسوسی......؟“ میں نے سوال کیا۔

”سوری......!“

”اگر واقعی ایسا ہے تو میں بھلا اس کا اعتراف کیوں کروں گا۔“

”پلیز بتائیں، میں اس سوال کے بعد آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”نہیں میرا کوئی مشن نہیں ہے، آپ کو علم ہے کہ میں میڈیکل کانفرنس میں اپنے وطن کے ڈاکٹروں کے ساتھ آیا تھا، جاسوس ہوتا تو اس طرح کسی کو قتل کر کے خود کو مشکوک نہ کرتا۔“

”مجھے کچھ وقت دیں گے؟“ اس نے کہا۔

”میں نہیں سمجھا!“

”میرے ساتھ جے پور چلیں گے؟“

”کیوں......؟“

”مجھے ایک مریض کا علاج کرانا ہے، ایک انوکھے مریض کا علاج جو آپ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکے گا۔“

”کیا مرض ہے اسے؟“

”اس کی تشخیص بھی آپ کریں گے۔“

”علامات کیا ہیں، تکلیف کیا ہے؟“

”یہ مریض خود بتائے گا۔“

”عجیب بات نہیں ہے؟“

”ہے لیکن آپ اگر مجھ پر بھروسہ کر سکیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں تیار ہو گیا۔ مجھے اور کیا کرنا تھا۔ تجربات ہی زندگی کی لاٹھی بنے ہوئے تھے۔ موت کا خوف ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھا۔ جو بھی ہو جائے، جس وقت ہو جائے۔

میرے راضی ہونے پر وہ ایک دم خوش ہو گئی پھر بولی۔ ”ہم کل متھرا چھوڑ دیں گے، اب میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی، میرے ملازم آپ کا سامان آپ کے ہوٹل سے لے آئیں گے اور فکر نہ کریں، میں ابھی آپ کے رات کے قیام کے لیے کمرہ حاصل کر لیتی ہوں۔“ میں نے اعتراض نہیں کیا۔

جلد ہی میں اس کے کمرے کے سامنے والی رو میں تین کمرے چھوڑ کر منتقل ہو گیا۔ بڑی حیرتناک بات تھی، پولیس اور انٹیلی جنس ہر طرف مجھے تلاش کرتی پھر رہی تھی اور مجھے پانے میں ناکام رہتی تھی لیکن میرے ضرورت مند لوگ آسانی سے مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا تو ایک آواز کانوں میں ابھری۔ ”وقت ہی تقدیر ہے، تمہاری بھی دوسروں کی بھی!“

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کتنی جلدی بھول جاتا ہوں مگر مجھے یاد دلا دیا جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ایک اجنبی آواز سی جو دل سے نکلی تھی۔ ”ضروری نہیں کہ تیری دلجوئی کی جائے، کام کرنے والے تیرے لیے کام کرتے ہیں ورنہ تو کچھ بھی نہیں ہے، کسی بھی لمحے تیری لاش کتوں کی طرح سڑک پر گھسیٹی جا سکتی ہے۔“

”ہاں! جانتا ہوں شکر گزار ہوں۔“

”تیری زبان کہتی ہے کہ ہاں جے پور چلوں گا تو تیری زبان نہیں وقت بولتا ہے، تقدیر بولتی ہے۔“

عشاء کا وقت ہو رہا تھا۔ غسل خانے جا کر وضو کیا اور نماز پڑھنے بیٹھ گیا۔ یکدم رقت طاری ہو گئی۔ نماز کے دوران بھی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی رہیں، پھر سلام پھیرا تو سندھورتا نظر آئی۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے تعجب سے دروازے کی طرف دیکھا۔ کمرے کا دروازہ لاک تو نہیں تھا لیکن اس کے کھلنے کی تھوڑی بہت آواز تو آنی چاہیے تھی۔ وہ میری آنکھوں کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ ”آپ عبادت میں مصروف تھے، آپ کو میرے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی، میں آپ کی لگن سے بہت متاثر ہوئی ہوں، اپنی عبادت میں کتنے ڈوبے ہوئے تھے آپ!“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”میرے آنے سے آپ کا حرج تو نہیں ہوا؟“

”نہیں! میں نماز پڑھ چکا تھا۔“

”بس ایسے ہی بور ہو رہی تھی، سوچا آپ سے باتیں کروں۔“

بہت دیر تک وہ میرے پاس بیٹھی رہی، پھر اس کے فون پر کال آ گئی اور وہ اٹھ کر چلی گئی لیکن میں اس کے بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔ وہ مجھے کافی پُراسرار محسوس ہوئی تھی۔

میری رات پُرسکون گزری۔ رات ہی میرے ہوٹل سے میرا سامان آ گیا تھا۔ دوسرے دن صبح کو ویٹر نے اٹھا دیا۔ وہ ناشتے کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔ دس بجے سندھورتا آ گئی۔ نئے لباس میں، بہت دلکش لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی، پھر بڑی اپنائیت سے بولی۔ ”چلیں......؟“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے جواب دیا تو وہ سیل پر ڈرائیور کو کال کرنے لگی۔ اس نے ہوٹل کا بل پے کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کچھ دیر کے بعد دو ویٹر آ گئے اور انہوں نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ نیچے گن مین اور ڈرائیور گاڑی کے پاس مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ پھر ہم چل پڑے۔ سفید راج ہنس جیسی خوبصورت کار بے آواز تیرتی سفر کرنے لگی۔ وہ میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے لباس سے اٹھنے والی خوشبو میری سانسوں سے ٹکرا کر ایک عجیب سا احساس پیدا کر رہی تھی۔

گاڑی چلتی رہی۔ متھرا سے سعد آباد پھر چھوٹے چھوٹے قصبے......! پھر تاج محل کا شہر جہاں سے گزرتے ہوئے ڈاکٹر شکلا یاد آیا اور وہ دونوں ماں، بیٹے بھی! پھر فتح پور سیکری! اکبر اور جودھا بائی کے محل، حضرت خواجہ سلیم الدین چشتیؒ کا مزار مبارک، ننانوے برج کی مسجد، بلند دروازہ......! سب کچھ نگاہوں سے گزر رہا تھا۔ کئی بار سندھورتا نے مجھے ان جگہوں کے بارے میں بتایا، پھر پھولن دیوی کی چنبل گھاٹی جہاں آج بھی حکومت کی طرف سے لگائے گئے بورڈ ایستادہ پھولن دیوی کی یاد دلا رہے تھے۔ ”خبردار......! شام پانچ بجے کے بعد ان علاقوں میں سفر نہ کیا جائے، حکومت آپ کی حفاظت کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔“

تاحد نگاہ سرخ پتھروں کے پہاڑ، بے آب و گیاہ، گھیرے کالے بادلوں کی چھاؤں میں بھی آگ برساتے ہوئے۔

طویل ترین سفر کے بعد آخر کار مختلف چھوٹے بڑے شہروں سے گزرتے حسین شہر جے پور میں داخل ہو گئے۔ شہر بے مثال روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ گاڑی مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی جس عمارت کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئی، اسے چار باوردی دربانوں نے مل کر کھولا تھا۔

چوڑی روش کے دونوں طرف گھاس کے بڑے بڑے میدان نظر آ رہے تھے جن میں جگہ جگہ پھولوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان اونچے اونچے پول لگے ہوئے تھے جن میں لگی ہوئی رنگین روشنیاں پھولوں کے رنگ نمایاں کر رہی تھیں اور رات ان پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

راج ہنس پورچ میں جا رکی۔ خوبصورت ایک جیسی وردیوں میں ملبوس نوکروں کی فوج دوڑ پڑی۔ سندھورتا نیچے اتری تو دوسری طرف سے میں بھی نیچے اتر گیا۔

”آیئے!“ سندھورتا نے کہا اور آگے چل پڑی۔ ایک لمبا چوڑا اور خطرناک سی شکل کا ملازم جس کی وردی کا رنگ دوسروں سے مختلف تھا، سندھورتا کے ساتھ چل رہا تھا۔

”دھرم!“ اس نے آواز دی۔

وہ مستعدی سے جھک گیا اور مدھم آواز میں بولا۔ ”راج رانی!“

”ہم نے تمہیں فون پر مہمان کے بارے میں بتایا تھا۔“

”کمرہ تیار ہے۔“ دھرم نامی ملازم نے کہا۔

وہ خاموش ہو گئی اور ہم اندر عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں پہلی بار روایتی راجاؤں کا محل دیکھ رہا تھا۔ ہر چیز اپنی مثال آپ تھی۔ غلام گردشوں میں بھی بڑے بڑے فانوس لٹکے ہوئے تھے، قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ کافی آگے چل کر وہ بولی۔ ”آپ مہمان ضرور ہیں کامران جی! پر میری بنتی ہے کہ خود کو مہمان نہ سمجھیں اور یہاں کوئی تکلیف نہ اٹھائیں، جس چیز کی ضرورت ہو، دھرم کو بتا دیں، یہ میرا خاص نوکر ہے لیکن اب یہ آپ کی چاکری کرے گا۔“

”شکریہ رانی جی!“ میں نے کہا۔

وہ چلتے چلتے رک گئی، پھر مجھے دیکھ کر مسکراتی ہوئی بولی۔ ”آپ نے مجھے رانی جی کہا مگر مجھے اچھا نہیں لگا، کیا آپ مجھے سندھیا کہہ سکتے ہیں؟“

”آپ چاہیں تو!“

”میں چاہتی ہوں۔“ وہ رک گئی پھر بولی۔ ”یہ میرا کمرہ ہے، دھرم آپ کو آپ کے کمرے میں لے جائے گا، ہم لمبے سفر سے آئے ہیں، آپ بھی تھک گئے ہوں گے، میں بھی تھک گئی ہوں، اب ہم کل ملیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور کمرے میں چلی گئی۔ دھرم نے گردن خم کر کے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا کمرہ اوپری منزل پر تھا۔ کمرہ کیا تھا پورا ہال تھا۔ اس قدر قیمتی اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ کہ بس دیکھتے رہو۔ قدیم و جدید کا حسین امتزاج......! دھرم مجھ سے اجازت لے کر چلا گیا۔

سندھورتا سے دوسرے دن نو بجے ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”آج ہم جے پور کی سیر کریں گے۔“

”آپ نے کسی مریض کی بات کی تھی؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں! آپ اس کا علاج کریں گے“

”علاج کی جلدی نہیں ہے آپ کو......؟“

”نہیں!“ اس نے حتمی لہجے میں کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

سندھورتا کے ساتھ جے پور دیکھا۔ بے شک خوبصورت جگہ تھی۔ تین دن تک وہ مجھے جے پور اور اس کے نواحات کی سیر کراتی رہی۔ میں حیران تھا کہ اس نے کسی مریض کا تذکرہ کر کے جھوٹ بولا ہے۔ مریض کے بارے میں میرے سوالات کے بھی اس نے عجیب جواب دیئے تھے۔

وہ ایک پُرکشش عورت تھی جو کسی کی بھی مرکز نگاہ بن سکتی تھی لیکن جس وقت سے ملی تھی، اس کے کردار میں کوئی جھول نظر نہیں آیا تھا۔ صاف ستھری گفتگو کرتی تھی جس میں شگفتگی ضرور ہوتی تھی، لگاوٹ نہیں، پھر کیا قصہ ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اگر وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی متھرا اور پھر مندر نہ پہنچتی، اگر وہ مجھے میرا پورا کچا چٹھا نہ سنا دیتی تو شاید میں اس سے بالکل متاثر نہ ہوتا۔ یہاں کی زندگی بے مثال تھی۔ اگر میرے وجود میں اضطراب نہ ہوتا، اگر میں اندر سے منتشر نہ ہوتا اور صرف ایک عیش کوش انسان ہوتا تو اس سے حسین زندگی کوئی اور نہ ہوتی لیکن میں مضطرب تھا۔

”میں پھر آپ سے اس مریض کے بارے میں پوچھوں گا جس کے علاج کے لیے آپ مجھے یہاں لائی تھیں، کیا وہ محض ایک کہانی تھی؟“

”نہیں......!“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”مگر آپ اس کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہیں، آپ اسے ایک نگاہ دکھا تو دیں مجھے!“

”ٹھیک ہے، ہم آج ہی چلتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”چلتے ہیں! کہاں......؟“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”اوہ......پھر کہاں ہے؟“

”سورج پور!“

”اور سورج پور کہاں ہے؟“

”میں نے آپ کو راج ونسی پریوار کے بارے میں بتایا تھا؟“

”ہاں......!“

”سورج پور راج ونسی پریوار کا گڑھ تھا، وقت کے ساتھ ونسی پریوار کے لوگ ختم ہوتے گئے اور پھر بالکل ختم ہو گئے، سورج گڑھ ویران ہوتا گیا، بچے کھچے لوگ الور میں آباد ہو گئے، سورج پور میں بس اب راجہ سوریا ونسی کی حویلی باقی رہ گئی ہے، آپ کا مریض اسی حویلی میں ہے۔“

”ہم کب چلیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس ابھی!“ اس نے کہا۔

کمال کی عورت تھی جس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا ہر عمل بے حد پُراسرار تھا حالانکہ نہایت خلیق اور خوش گفتار تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کی شخصیت میں ایک انوکھی کیفیت کا احساس ہوتا تھا جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکا تھا۔

سفر اسی خوبصورت کار سے کیا جا رہا تھا، ساتھ میں وہی ڈرائیور اور گن مین تھا۔ راستے بے حد خوبصورت اور خاصی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ مجھے ان سے روشناس کراتی جا رہی تھی۔ اس نے ایسے قلعے اور علاقے بھی دکھائے جہاں راجپوتوں اور مسلمانوں کی بڑی بڑی جنگیں ہوئی تھیں۔ یہیں سے ایک خوبصورت سڑک اجمیر شریف جاتی تھی پھر کئی گھنٹے کا سفر کر کے ہم الور پہنچ گئے۔ یہاں الور میں بھی سندھورتا کی ایک خوبصورت حویلی تھی۔

”اس سے آگے کا سفر ہم کل کریں گے۔“

”آپ یہاں آتی رہتی ہیں؟“

”ہاں! ماضی یاد کرنے آ جاتی ہوں۔“ وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس حویلی میں بھی بہت سے ملازم تھے اور یہاں کی شان و شوکت بھی جے پور جیسی تھی۔ جس بات پر مجھے سب سے زیادہ حیرت تھی، وہ یہ کہ ابھی تک مجھے سندھورتا کا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں نظر آیا تھا۔ یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ اس نے شادی بھی کی یا نہیں!

دوسرے دن ضروریات سے فارغ ہو کر سندھورتا نے پھر اسی اپنائیت سے کہا۔ ”چلیں......؟“

”جی!“ میں مسکرا دیا۔ وہ میرے ساتھ باہر نکل آئی۔ اس وقت کار کے ساتھ ایک لینڈ کروزر بھی کھڑی ہوئی تھی جو کار ہی کی طرح بہت شاندار تھی لیکن اس وقت ایک تبدیلی ہوئی۔ اسٹیئرنگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر سندھورتا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور مجھے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران حیران سا بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی سندھورتا نے گاڑی کو بڑی مہارت سے ریورس کر کے موڑا، پھر حویلی کے بڑے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور ہے، پھر ایک بات اور دیکھنے میں آئی۔ الور کی گنجان آبادیوں سے وہ سست روی سے گزر رہی تھی، وہاں کے لوگ راہ چلتے اس گاڑی کو دیکھتے تو احترام سے جگہ دیتے اور دونوں ہاتھ ماتھے سے لگا کر جھک جاتے۔ ان کی نظروں میں احترام اور محبت ہوتی جس کا مطلب تھا کہ وہ لوگوں کے لیے ایک پسندیدہ شخصیت تھی۔ پھر جب گاڑی الور شہر کی آبادی سے نکل آئی تو اس نے رفتار تیز کر دی۔ سڑک شفاف اور مضبوط تھی۔

”اتنے خاموش کیوں ہو؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”آپ کی ڈرائیونگ دیکھ رہا ہوں۔“

”بس جب اس طرف آتی ہوں تو خود ہی گاڑی چلاتی ہوں، جانتے ہو کیوں......؟“

”نہیں جانتا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”ان سب کی جان نکلتی ہے۔“

”کن سب کی......؟“

”ڈرائیور، گن مین اور دوسرے!“

”کیوں......؟“

”بس سورج پور کے بارے میں لوگوں نے بڑی کہانیاں اڑائی ہوئی ہیں۔“

”تو کیا سورج پور اب غیر آباد ہے؟“

”بالکل تو نہیں، کچھ گھر ہیں وہاں لیکن ان لوگوں کے جو اپنی تاریخ سے چمٹے ہوئے ہیں اور اس سے دور نہیں ہو پائے، وہ اپنی نسلوں کو یہاں آباد کیے ہوئے ہیں۔“ اس نے گول مول سے لہجے میں بتایا۔ میں خاموش ہو گیا۔

کوئی الجھن، کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس عورت کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ کوئی نارمل عورت ہے، بے وقوفی تھی۔ جو کچھ بھی ہے لیکن ہے شاندار اور ابھی تک یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ ہاں میں اس انوکھے مریض کے بارے میں ضرور سوچ رہا تھا جو سورج پور میں کسی ایسی جگہ رہ رہا ہے جہاں زیادہ انسان نہیں ہیں۔

”یہ سڑک میں نے بنوائی ہے، میرے گھر جاتی ہے اس لیے......!“ وہ بے تکے انداز میں بول پڑی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سفر جاری رہا، پھر اس نے گاڑی سڑک کے ایک موڑ سے نیچے اتار دی۔ اب لینڈ کروزر انسانی قد سے بھی اونچی جھاڑیوں کے بیچ سے گزر رہی تھی لیکن یہاں بھی پختہ اور شفاف سڑک تھی۔ میں غور سے ان جھاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ زمین آپ کی ہے؟“

”سارا سورج پور ہی میرا ہے۔“

”آپ نے یہاں کاشت کیوں نہیں کرائی؟“

”بس! میں بتا چکی ہوں یہاں کوئی نہیں آتا۔“

”میں یہی پوچھنا چاہتا تھا، یہ جھاڑیاں بہت اونچی اور بے ترتیب ہیں لیکن سڑک پر نہیں پھیلی ہوئیں جبکہ میرے خیال میں انہیں پوری سڑک پر پھیل جانا چاہیے تھا۔“

وہ تعریفی انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ”کافی گہرائی میں سوچ لیتے ہیں۔“

”ایک عام سی بات ہے۔“

”عام نہیں ہے، میں نے بتایا تھا کہ کچھ لوگ یہاں رہتے ہیں جنہوں نے تاریخ سے رشتہ جوڑ رکھا ہے اور وہ اس علاقے سے خوفزدہ نہیں ہیں۔“

”ہاں! بتایا تھا۔“

”یہاں انہیں کچھ ذمہ داریاں سونپ دی گئی ہیں جنہیں وہ پورا کرتے ہیں، جن میں اس سڑک کو جھاڑیوں سے پاک رہنے کی ذمہ داری بھی ہے۔“

دور سے کسی سالخوردہ عمارت کے بڑے بڑے برج نظر آ رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم سورج پور آ گئے ہیں اور وہ برج راج ونسی کے محل کے ہیں۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک عظیم الشان عمارت نظر آنے لگی۔ یہاں تک آتے ہوئے میں نے کسی انسان کا نام و نشان نہیں دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہاں پرندے بھی نہیں ہیں۔ ایک عجیب سی نحوست ماحول پر چھائی ہوئی تھی۔

لینڈ کروزر کی رفتار اب سست ہو گئی تھی۔ محل نما عمارت کی دیواریں بے حد بلند تھیں، سامنے ہی ایک بہت بڑا چوبی دروازہ نظر آ رہا تھا جس کے بے حد موٹے فولادی کنڈے سے کوئی ایک فٹ کا تالا جھول رہا تھا۔

سندھورتا نے گاڑی روک دی اور پھر اس نے اس کے ڈیش بورڈ سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ یہ چابیاں بھی چار، چار پانچ، پانچ انچ کی تھیں۔ وہ نیچے اتری اور دروازے کے پاس پہنچ گئی، پھر اس نے تالا کھولا اور دروازے کو اندر دھکیلنے لگی۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ وہ واپس گاڑی میں آ بیٹھی اور گاڑی اندر داخل ہو گئی لیکن دروازے کے دوسری طرف جا کر اس نے اسے پھر روک دیا۔ وہ نیچے اترنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ میں نیچے کود گیا۔

”میں بند کیے دیتا ہوں۔“

وہ مسکرا کر رک گئی۔ میرا خیال تھا کہ پھاٹک بند کرنے میں کافی طاقت صرف کرنی ہوگی لیکن وہ اتنا رواں تھا کہ آسانی سے بند ہو گیا۔ میں نے اسے بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی، اس نے اسے آگے بڑھا دیا۔

تب میں نے اس محل کی وسعتیں دیکھیں۔ کمال کی عمارت تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اس طرح رکھا گیا تھا کہ جیسے روزانہ اس کی صفائی ہوتی ہو۔ کہیں سے پتا نہیں چلتا تھا کہ یہ غیر آباد ہے لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس کا تالا سندھورتا نے خود کھولا تھا۔ وہ بتا چکی تھی کہ باہر کے لوگ یہاں نہیں آتے۔ جن لوگوں کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ یہاں آباد ہیں اور اس نے انہیں کچھ ذمہ داریاں سونپ دی ہیں تو ممکن ہے وہی یہاں آ کر صفائی ستھرائی کرتے ہوں اور واپس چلے جاتے ہوں لیکن یہاں تک آتے ہوئے ان کا بھی کوئی نشان نہیں نظر آیا تھا۔ غرض کہ یہ سب کچھ بے حد پُراسرار تھا۔ ایک اور بات میں نے محسوس کی تھی کہ کسی بھی نئی اور حیرتناک بات پر وہ میرے چہرے پر حیرت کا تاثر تلاش کرتی تھی اور اسے نہ پا کر شاید مایوس ہو جاتی تھی۔

لینڈ کروزر صدر گیٹ کے پاس رکی اور وہ نیچے اتر آئی، پھر ہم اندر داخل ہو گئے۔

”یہ ہے میرے ماضی کی کہانی، اس محل میں میری کئی نسلوں نے زندگی گزاری ہے۔“

”کئی نسلوں نے......؟“

”ہاں!“

”لیکن یہ عمارت اتنی پرانی تو نہیں ہے؟“

”بہت پرانی ہے، سورج پور وید، گیتا اور رامائن میں ملتا ہے، یہ مہابھارت کے دور کا شہر ہے اور یہ عمارت اُس دور کی ہے، کئی راجاؤں نے اسے نئے نئے روپ دیئے ہیں، میں نے اسے بالکل بدل دیا ہے، ہاں اس کی بیرونی شکل کوئی چاہے بھی تو نہیں بدل سکتا۔“

یہ سچ بھی تھا۔ باہر سے یہ کوئی قدیم تاریخی عمارت نظر آ رہی تھی لیکن اندر سے کافی جدید تھی۔ وہ میرے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گئی اور بولی۔ ”آپ اس کمرے میں آرام کریں، میں ذرا آپ کے مریض سے مل آؤں، دیکھوں کس حال میں ہے، اوکے......؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس مسہری کی طرف بڑھ گیا جس کے پائے چاندی کے تھے۔ کبھی کبھی اپنی تقدیر پر ناز کرنے کو دل چاہتا تھا۔ کوئی انسان کروڑوں کی دولت خرچ کر کے ساری عمر میں بھی اتنے عجیب عجیب مناظر نہیں دیکھ سکتا تھا، جتنے میں نے مختصر عرصے میں دیکھ لیے تھے۔

پھر میں اس عجیب مریض کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں کس طرح کا مریض ہے، کیا بیماری ہے اسے اور سندھورتا نے اسے اس ویران محل میں کیوں اور کس کے سہارے چھوڑ رکھا ہے۔ اسے کھانے پینے کے لیے کون دیتا ہے، اس کی تیمارداری کون کرتا ہے یا پھر ممکن ہے وہ خود چلتا پھرتا ہو۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ سندھورتا کے سامنے میری شخصیت کچھ ہلکی پڑ رہی ہے۔ بیشک وہ ایک بے حد پُراسرار کردار ہے، انوکھی شخصیت کی حامل لیکن میں اُس سے مرعوب کیوں ہوں۔ مجھے تو اس سے بھی زیادہ پُراسرار کردار مل چکے ہیں۔ ایک اور بات ذہن میں آئی۔

سندھورتا کچھ بھی ہے لیکن وہ بھوریا چرن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی، کہیں سے بھی اس کا شبہ نہیں ملتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ بہت دن کے بعد بھوریا چرن یاد آیا تھا۔ اوہ میرے خدا......! کہیں یہ کوئی گہری چال نہ ہو، کہیں وہ مریض بھوریا چرن ہی نہ ہو۔

کافی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا، پھر بے نیاز ہو گیا۔

سندھورتا کوئی دو گھنٹے کے بعد آئی۔ بہت سے پھل اور کافی لائی تھی۔ کافی کے ساتھ بسکٹوں کے کارٹن بھی تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کافی ہے، میں نے خود بنائی ہے، یہ پھل اور بسکٹ! یہاں اس کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا، البتہ الور میں مسلم ہوٹل ہیں، ہفتے میں ایک بار میں آپ کو وہاں لے جایا کروں گی، وہاں آپ خوب بھینسیں کھایا کرنا۔“

”ہفتے میں ایک بار......؟“ میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”ہاں کیا زیادہ بار......!“

”نہیں! کیا یہاں مجھے سال دو سال رہنا ہوگا؟“

”سال دو سال......!“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی، پھر ایک دم چونک پڑی اور کہنے لگی۔ ”نہیں! میرا مطلب ہے کہ جب تک آپ اپنے مریض کا علاج کریں گے۔“

”آپ متھرا سے یہاں اتنی دور مجھے کسی مریض کے علاج کے لیے لائی ہیں لیکن ابھی تک مجھے مریض کی جھلک تک نہیں نظر آئی۔“

”بس کچھ دیر اور پلیز!“

”وجہ......؟“

”وہ بھی کچھ دیر کے بعد ہی بتاؤں گی۔“

”ہوں!“ میں نے گہری سانس لی۔

”آپ یہ چیزیں لیں، پلیز ناراض نہ ہوں، بس رات ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔“

”یہاں بجلی تو نہیں ہے۔“

”میں نے جان بوجھ کر یہاں بجلی نہیں منگوائی تاکہ یہاں کا قدیم ماحول برقرار رہے، آپ یہ فانوس دیکھ رہے ہیں، ضرورت کی جگہوں پر فانوس روشن ہو جاتے ہیں۔“

”آپ اپنے مریض سے ملنے گئی تھیں؟“

”ہاں!“

”وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں! عام حالات میں وہ ٹھیک رہتا ہے، میں چلتی ہوں، کچھ دیر میں آپ سے ملاقات کرتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں لاکھ خود کو لاپرواہ رکھ رہا تھا لیکن اندر تجسس بے پناہ تھا۔ میں اس انوکھے مریض سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔

آہستہ آہستہ رات ہو گئی۔ یہ وقت میں نے اپنے کمرے میں ہی گزارا تھا۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے نماز پڑھنے کے لیے ایک جگہ منتخب کی اور نماز پڑھنے لگا۔ بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھی۔ نماز کے دوران میں مجھے کمرے میں روشنی کا احساس ہوا۔ سلام پھیرنے کے بعد مجھے دو چیزوں کا ادراک ہوا۔ پہلا تو یہ کہ کمرے کی چھت میں لٹکا ہوا بڑا فانوس روشن ہو گیا تھا۔ اس میں لمبی لمبی شمعیں جلا دی گئی تھیں جو خوب روشنی دے رہی تھیں۔ دوسری یہ کہ ایک کرسی پر سندھورتا بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی۔ ”میں آئی تو آپ عبادت کر رہے تھے، مجھے مسلمانوں کی نماز بہت اچھی لگتی ہے، بڑا نور جھلکتا ہے عبادت کرتے ہوئے ان کے چہرے پر!“

”یہ شمعیں آپ نے روشن کی ہیں؟“

”ہاں! یہ سارے کام میں ہی کرتی ہوں، آؤ چلیں یہاں سے!“

میں اٹھ گیا تو وہ بھی کرسی سے اٹھ گئی۔ محل نما عمارت تاریک اور بھیانک نظر آ رہی تھی۔ میرا کمرہ روشن تھا یا پھر ایک دور افتادہ کمرے سے روشنی کی کرنیں جھلک رہی تھیں۔ وہ مجھے اسی کمرے کی طرف لے جا رہی تھی، پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ یہاں تین فانوس جل رہے تھے اور روشنی خوب تیز تھی۔ کمرے میں بہترین فرنیچر تھا۔ اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”بیٹھیے!“

”شکریہ!“ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تو میں نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”آپ خاصی تجسس پسند ہیں، ابھی تک آپ نے مجھے اس مریض کی جھلک نہیں دکھائی۔“

”مریض......!“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”وہ مریض میں خود ہوں۔“

(جاری ہے)

جادو

ایم اے راحت

قسط : 25

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں غور کرنے لگا کہ میں نے یہی سنا ہے، کیا اس نے یہی کہا ہے۔ وہ ایک سنجیدہ اور پُروقار عورت تھی، اس نے آج تک کسی شوخی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا لیکن اس وقت......! میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ میری کیفیت سمجھ رہی تھی۔ کچھ لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ''مجھے احساس ہے کہ آپ پر کیا ردعمل ہوا ہے لیکن میں نے سچ کہا ہے، میں ہی وہ مریض ہوں۔''

''حیرت کی بات ہے، میرے خیال میں آپ ایک تندرست خاتون ہیں۔'' میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

''ہاں! یہی خیال کیا جاسکتا ہے لیکن اصلیت کچھ اور ہے۔'' وہ تلخی سے مسکرائی۔

''کیا......؟'' اب میں پوری طرح سنبھل گیا تھا۔

''طویل کہانی ہے، سننا پسند کریں گے؟''

''آپ کا محل، آپ کا طرز زندگی بے مثال ہے لیکن میں صرف اس مریض کے لیے آپ کے ساتھ ہوں اور اس کے مرض کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ چند لمحے خاموش رہی، پھر بولی۔ ''میرے پتا کا نام چندر سین ونسی تھا، سورج پور ہماری ریاست تھا، یہ قدیم دور کی بات ہے، ریاست کے امور بہت عمدگی سے چل رہے تھے۔ چندر سین کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی جس پر وہ بہت دکھی تھے۔ وہ بڑے بڑے کیرتن کراتے تھے یہاں تک کہ میں پیدا ہوگئی۔'' سندھورتا نے کہا۔

''کیا......؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یعنی آپ اتنی پرانی ہیں؟''

''ہاں!'' وہ اداسی سے بولی۔ اس کے انداز کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی۔ اچانک مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے ہزار سال کا سانپ ترکیشی یاد آ گیا تھا۔ کیا سندھورتا بھی اچھا دھاری سانپ ہے جس نے جون بدلی ہے۔ میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب مجھے ساری باتیں یاد آرہی تھیں۔ متھرا کے مندر میں اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا اور بتایا کہ وہ میرے لیے وہاں گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا تھا، وہ غیر معمولی تھا لیکن ایک ناگن مجھ سے کیا علاج کرانا چاہتی ہے۔

وہ پھر میری طرف متوجہ ہوگئی۔ غالباً اس دوران اس نے ماضی کے سارے نقش سمیٹ لیے تھے۔ میرا سوال نظرانداز کر کے اس نے کہا۔ ''پتا نہیں کیسی منتوں مرادوں سے میں پیدا ہوئی تھی کیونکہ میں عام بچوں سے مختلف تھی۔ مختصر یہ کہ میں جوان ہوگئی۔ چندر سین کے ہاں اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس لیے میں پورے پریوار کی بیحد لاڈلی تھی۔ میں نے ایک بار کچھ سادھو سنتوں کو دیکھا اور اسی وقت سے میرے دل میں پراسرار علوم سیکھنے کی خواہش پیدا ہوگئی۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں لگ گئی جو پراسرار علوم کے ماہر ہوں۔ بہت سے جوگیوں، سنیاسیوں سے میں نے بڑے جنتر منتر سیکھے اور ان کے تجربے کرنے لگی۔ مجھے ان میں بہت مزہ آتا تھا۔ دوسری طرف پتا جی میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں اپنی خوبصورتی کا تذکرہ کیا کروں، بہت سے راجکمار مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر مجھے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ایک مہان دیوی بننا چاہتی تھی، سو میں اپنے کاموں میں مصروف رہی، پھر جوگی گرج ناتھ سورج پور آیا۔ یہ بڑا مہان جادوگر تھا، ہر طرح کا جادو جانتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر لٹو ہوگیا۔ اس نے سورج پور میں ایسے ایسے چمتکار دکھائے کہ سب دنگ رہ گئے، دنگ ہونے والوں میں، میں بھی تھی۔ میں گرج ناتھ سے جادو سیکھنے لگی، پھر اس نے اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا اور میری آبرو لوٹنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا، مگر میری توقع کے برعکس اُس نے اس بات پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ایک مہان دیوی بننے کے لیے من کی پوتر تابڑی ضروری ہے اور میرا من بڑا پوتر ہے، میں پوری طرح دیوی بننے کے قابل ہوں۔ سو اس نے مجھے بڑے منتر سکھائے مگر اس کے من میں بدلے کی آگ سلگ رہی تھی۔

ایک رات جو اماوس کی رات تھی اور سنسار کالا ہو رہا تھا، اس نے مجھے ایک بڑا منتر سکھانے کے لیے بلایا۔ منتر سکھانے سے پہلے اس نے مجھے ایک گلاس میں کوئی چیز پینے کو دی۔ اس نے بتایا کہ یہ سوم رس ہے، اس کے پینے سے مجھے لمبا جیون مل جائے گا جو سو برس کا بھی ہوسکتا ہے، ہزار برس کا بھی اور دس ہزار برس کا بھی! مجھے یہ بات بڑی دلکش لگی کہ میں ہزاروں برس جی سکتی ہوں۔ سو میں نے رات کے اندھیرے میں سوم رس پی لیا۔ وہ عجیب سے ذائقے کا تھا۔

سات دن کے بعد جوگی گرج ناتھ نے مجھے اپنی شیطنت کے بارے میں بتایا۔ ''تُو نے مجھے تھپڑ مارا تھا، دیکھ بدلہ لے لیا میں نے اس کا!''

''گروجی مہاراج! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے شدید حیرت سے کہا۔ ''آپ نے تو کہا تھا کہ جادو سیکھنے کے لیے پوتر تا ضروری ہے۔''

وہ ہنسا اور بولا۔ ''تو اور کیا کہتا، تجھے سبق سکھانا ضروری تھا، تُو نے اس کی توہین کی تھی جس کے چرنوں میں بڑی بڑی رانیاں، مہارانیاں سر جھکانے کو ترستی ہیں۔ جو سوم رس میں نے تجھے پلایا ہے، وہ تجھے بڑا لمبا جیون دے گا لیکن تیرا جیون ایسا ہوگا کہ اسے دنیا دیکھے گی۔''

پھر وہ خاموشی سے سورج پور سے چلا گیا۔ مجھے کچھ نہ ہوا لیکن پھر میرے اندر ایک عجیب سی بے کلی، بے چینی جاگ اٹھی۔ میرا من کچھ چاہتا تھا، لیکن کیا......؟ اس کا پتا نہیں چلتا تھا، پھر میرے بدن میں درد رہنے لگا۔ میں بیمار ہوگئی، سخت چڑچڑی ہوگئی۔ کبھی مجھ پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے، ایک بار کسی نوکر نے میری مرضی کے خلاف کوئی بات کر دی، میں نے ایک وزنی گلدان اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا، اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ میرے بالکل قریب تھا، اس کے سر سے خون کا فوارہ بلند ہو کر میرے منہ پر پڑا اور اس کے کچھ قطرے میرے منہ میں بھی چلے گئے۔ ان کا ذائقہ جانا پہچانا لگا۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ اسی سوم رس کا ذائقہ ہے جو مجھے جوگی گرج ناتھ نے پلایا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے مجھے انسانی خون پلایا تھا۔ میرا دل خراب ہوا مگر مجھے یوں لگا جیسے مجھے سکون بھی ملا ہو۔ میرا دل چاہا کہ میں اس خون کے کچھ اور قطرے بھی چکھوں۔ میں نے اس عمل کو بار بار دہرایا۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہوگیا۔

نوکر مر گیا۔ پتا جی نے صورتحال جان کر نوکر کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ مجھے خود بھی بڑا دکھ تھا لیکن کچھ دن کے لیے میری وہ بے چینی، بے کلی دور ہوگئی تھی۔ گرج ناتھ نے تھپڑ کا بہت خطرناک بدلہ لیا تھا۔ اب مجھ پر دورے پڑنے لگے تھے، میں دیوانی ہو جاتی تھی اور اس دیوانگی کے عالم میں آخر کار میں خون آشام ہوگئی۔ میں محل سے باہر نکل جاتی اور کسی نہ کسی کا خون کر دیتی، آبادی میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔

میرے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا، پھر پتا جی نے مجھ سے شادی کے بارے میں کہا تو میں تیار ہوگئی اور ہمارے پریوار کے ایک نوجوان سے میرا رشتہ پکا ہوگیا۔ اس کا نام سوریا تھا، سوریا ونسی......! بڑا سندر جوان تھا۔ سہاگ رات میں مجھ پر جنون سوار ہوگیا اور میں نے اس کو قتل کر دیا۔

محل میں کہرام مچ گیا۔ میں خود سوریا ونسی کی موت کے صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ کسی کا خیال میری طرف نہیں گیا، سب کسی نادیدہ خون آشام کے بارے میں سوچتے رہے۔ میں نے سورج پور کے بہت سے معصوم انسانوں کی جان لی تھی۔ سوریا ونسی میرے ہاتھوں ختم ہوا تھا، یہ صدمہ میرے لیے بہت بڑا تھا، لمبے عرصے میں اس کے لیے پاگل رہی۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو جائے، میں اب انسانی خون سے ہاتھ نہیں رنگوں گی لیکن میری حالت خراب ہونے لگی، میرے بدن میں درد بڑھنے لگا۔ یہ درد نا قابل برداشت ہونے لگا۔ میں اپنے روگ کی دوا جانتی تھی مگر میرے دل میں میرا پتی زندہ تھا جس کے ساتھ میں سہاگ رات بھی نہیں منا سکی تھی۔

میں درد برداشت کرتی رہی۔ جوگی گرج ناتھ نے بہت برا کیا تھا میرے ساتھ! اس نے ایسا بدلہ لیا تھا اس تھپڑ کا کہ سنسار میں کسی نے کسی سے ایسا بدلہ نہ لیا ہوگا۔ میں نے اس کی تلاش کے لیے بڑے جتن کیے مگر وہ مجھے نہیں ملا، آخر کار اس کے بدلے کے اصل نتائج ظاہر ہونے لگے۔ بدن کا درد نا قابل برداشت ہوگیا اور پھر میرے پورے جسم سے ہر وقت بدبودار پانی رسنے لگا۔ سب حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پتا جی نے میرے علاج کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے، مگر مجھے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

میں نے اپنے آپ کو چھپا لیا اور وقت گزرتا گیا۔ پتا جی مر گئے، میرے پریوار کا خاتمہ ہوتا گیا۔ میرا جسم گل کر پانی ہوتا گیا، میں سب سے پوشیدہ رہنے لگی۔ صدیاں گزر گئیں، سب ختم ہوگیا۔ سورج پور ویران ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرا جیون لمبا ہوگیا ہے، پتا نہیں مجھے کب تک جینا ہوگا۔ میں نے جو پراسرار علوم سیکھے تھے، انہیں کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ بہت عرصے کے بعد میں نے ان پر غور کیا اور ان سے کام لینے لگی۔ مجھے ان سے بڑی مدد ملی اور انہی کی مدد سے اب میں آپ کو اس شکل میں نظر آ رہی ہوں۔''

میں ایک انوکھی داستان سن رہا تھا، ایک ناقابلِ یقین داستان......! حقیقت یہ ہے کہ مجھے ابھی تک اس پر یقین نہیں آیا تھا۔ میرے سامنے ایک خوش شکل خاتون بیٹھی مجھے ایک ناقابل یقین کہانی سنا رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ صدیوں سے زندہ ہے اور خون آشام رہ چکی ہے۔ کیسے یقین کر لیتا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''کوئی یقین نہیں کرے گا، یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''آپ کے خاندان میں اب کوئی نہیں ہے؟''

''راج ونسی پریوار ختم نہیں ہوا، یہ ایک ذات ہے لیکن ان میں میری پیڑھی کا کوئی نہیں ہے۔''

''اس ذات کے لوگوں کو سورج پور کے بارے میں تو معلوم ہوگا؟''

''ہاں! وہ جانتے ہیں کہ کسی زمانے میں سورج پور آباد تھا لیکن پھر وہاں بدروحوں کا بسیرا ہوگیا۔''

''بدروحوں کا بسیرا......؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں! وہ بدروح میں ہی تھی جو انسانوں کا خون پی جاتی تھی۔ بہت سے پنڈت، جوگی، سنیاسی یہاں آئے اور انہوں نے خوب پیسے بٹورے اور جنتر منتر پڑھ کر ان بدروحوں کو بھگایا مگر اصل بدروح جیون کے سب سے بڑے عذاب سے گزر رہی تھی، یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔''

''پھر سورج پور خالی کیسے ہوا؟''

''بس! اسی وقت سے لوگوں نے وہاں سے نقل مکانی شروع کر دی تھی، زیادہ تر الور میں آکر آباد ہوگئے۔''

''اور یہ حویلی......!''

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ لوگ اس حویلی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔''

''بس! میں نے ہی سے سمجھوتہ کر لیا، اس روپ میں آنے کے بعد میں نے سوچا کہ جب جینا ہی ہے تو کیوں نہ اچھی طرح جیا جائے۔ میں ایک راجہ کی بیٹی ہوں، دولت کی میرے پاس کمی نہیں تھی، میں نے ہندوستان بھر میں اپنا کاروبار پھیلا دیا۔ یہ محل میری جنم بھومی ہے، ہمارے پریوار کا جب کوئی فرد جیتا نہ رہا تو یہ راج محل سرکار کے پاس چلا گیا اور میں نے اسے سرکار سے خرید لیا۔''

''خرید لیا......؟''

''ہاں!''

''کس حیثیت سے......؟''

''جے پور کی ایک کھرب پتی پاگل عورت کی حیثیت سے۔'' وہ ہنسی۔

''لوگ جانتے ہیں کہ آپ یہاں آتی ہیں؟''

''ہاں! اسی لیے تو میں نے اپنے آپ کو پاگل کہا ہے لیکن وہ بھلے کیا جانیں کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں، اماوس کی کالی راتوں میں یہاں میرے پرکھوں کی آتمائیں اکٹھا ہوتی ہیں۔ میرے پتا جی، میری ماتا جی، سوریا ونسی اور میرے دوسرے متر! میں ساری رات ان سے باتیں کرتی ہوں، میرے جیون میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

میرے بدن میں ایک عجیب سی ٹھنڈک اتر گئی۔ یہ عورت واقعی پاگل لگ رہی تھی لیکن ایک پاگل عورت کیا اتنی مربوط کہانی سنا سکتی ہے۔

''آپ نے اپنے سیکھے ہوئے علوم سے یہ شکل اختیار کی ہے؟''

''ہاں......!''

''آپ کی دوسری شکل کیا تھی؟''

''تھی نہیں، ہے۔'' اس نے کہا اور ایک بار پھر میرے بدن میں ٹھنڈک دوڑ گئی۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے کہا۔

''میرا یہ روپ نقلی ہے، اصل روپ کچھ اور ہے۔''

''ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں، جوگی گرج ناتھ نے آپ سے کہا تھا کہ وہ جو سوم رس آپ کو پلا رہا ہے، وہ آپ کو لمبا جیون دے گا، بقول آپ کے لمبا جیون تو آپ کو مل گیا۔''

''ہاں! مگر اس نے یہ سب بدلہ لینے کے لیے کیا، کیا یہ جیون جینے کے قابل ہے جو میں جی رہی ہوں؟''

''لیکن آپ اور جینا چاہتی ہیں؟''

''نہیں! بس چار دن کا جیون مل جائے، بس چار دن کا! میں خود کو اسی حسین سندھورتا کے روپ میں دیکھ لوں جسے دیکھ کر لوگ پاگل ہو جاتے تھے، چار دن کے لیے، بس چار دن کے لیے کوئی مجھے اپنی بانہوں میں لے کر بے خود ہو جائے، بس اس کے بعد......! اس کے بعد چاہے مجھے اپنے ہاتھوں اپنا جیون ختم کرنا پڑے۔''

''ختم کرنا پڑے؟''

''ہاں......!''

''لیکن آپ کو تو لمبی عمر مل گئی ہے، آپ اپنے ہاتھوں اپنا جیون کیسے ختم کر سکتی ہیں؟''

میرے سوال پر اس نے گردن جھکا لی تھی۔ دیر تک وہ خاموش رہی، پھر بولی۔ ''کر سکتی ہوں۔''

''کیسے......؟''

''میں نے جوگیان سیکھے ہیں، ان کی مدد سے! مگر میں اپنے من کی بات بتا چکی ہوں، اب آپ مجھے بتائیے میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں!''

''بتائیے مجھے آپ کے لیے کیا کرنا ہے؟''

''مجھے ٹھیک کر دیں، بھگوان بھلا کرے گا آپ کا!'' وہ سسک پڑی۔ پھر بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''دیکھ لو...... یہ ہوں میں، یہ ہوں۔''

اس نے اپنے خوبصورت لمبے بال پکڑے اور انہیں زور سے کھینچ دیا۔ اس کے سر سے لمبی وگ اتر گئی۔ سر زخموں سے بھرا ہوا تھا، جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ اس کے جسم کی کم و بیش یہی حالت تھی۔ یہ ایک انتہائی تکلیف دہ منظر تھا۔

''یہ میں ہوں۔'' اس کی رندھی آواز سنائی دی۔ میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی تھی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی، پھر جھکی اور پٹیوں کے ڈھیر کو یکجا کرنے لگی۔ اس کے بعد اس نے وہ ڈھیر اٹھایا، بالوں کی وگ لگائی، اپنے کپڑے سمیٹے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں ایک طرف سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ گزرے وقت کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ کس قدر نفیس عورت ہے لیکن صدیوں پرانی! پہلے دل چاہا تھا کہ اس کی سنائی ہوئی کہانی کی تصدیق کروں لیکن اب اس کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، اسے جھٹلایا تو نہیں جاسکتا تھا۔

سوچ کا رخ بدلا۔ جو چیز اس جادوگر نے اسے پلائی تھی، وہ انسانی خون ہوسکتا ہے لیکن اس خون میں ایسی کون سی چیز شامل تھی جس نے اس کے بدن کو زخمی کر دیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کوئی بڑا تجربہ نہیں حاصل کیا تھا۔ میں ابھی تک ایک معمولی سا ڈاکٹر تھا۔ ہاں اب تک جو کارنامے میں نے سرانجام دیے تھے کہ پہلے بھوریا چرن نے اپنے مطلب کے لیے مجھے ایک جادوئی قوت دیدی تھی جس کے تحت میں جسم میں پوشیدہ بیماریوں کا سراغ لگا لیتا تھا اور علاج تجویز کر دیتا تھا، بعد میں روحانی طور پر وہ قوت میرے ذہن میں منتقل کر دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ مجھے عطا کیا گیا تھا، اس کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی تھی اور میں نے تعمیلِ حکم کی تھی چنانچہ اس تکلیف دہ بیماری کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اسے دیکھوں تو سہی اب وہ کیا کر رہی ہے۔ ساری باتیں اپنی جگہ! اس نے میرا بے حد احترام کیا تھا اور حالات کچھ بھی ہوں، وہ بے قصور ہے۔ ان زخموں کے بارے میں بھی میرے دل میں تجسس تھا کہ وہ کیا ہیں؟

میں اسے حویلی کے کمروں میں تلاش کرنے لگا، کہیں نہیں نظر آئی۔ ویسے حویلی یا محل بے حد وسیع تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ چلی نہ گئی ہو۔ یہ خیال بڑا پریشان کن تھا، چنانچہ میں برق رفتاری سے باہر کی طرف بھاگا۔ پورچ میں گاڑی کھڑی دیکھ کر مجھے سکون ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے بھی دیکھ لیا۔ اس کے بدن پر ایک خوبصورت ساڑھی تھی اور وہ پھولوں کے ایک کنج کے پاس دوسری طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔

میں نے دل میں ایک فیصلہ کیا اور دبے قدموں اس کی طرف چل پڑا۔ اسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے جا کر میں نے بڑے پیار بھرے لہجے میں اسے پکارا۔ ''سندھیا......!''

وہ بری طرح چونک کر پلٹی۔ اس کے چہرے کے نقوش پہلے جیسے تھے دلکش اور جاذب نگاہ! لیکن اُس وقت اس کے چہرے پر ایک انوکھی سی کیفیت تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ حیران نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''سندھیا......!'' میں نے دوبارہ اسی پیار بھرے لہجے میں پکارا اور وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھی اور میری بانہوں میں آگئی۔ میں ان جذبات، ان احساسات کو سمجھتا تھا جن کے تحت اس نے یہ عمل کیا تھا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناتے مجھ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ مریض کو زندگی کا احساس دلاؤں۔

''ایک بات کہوں؟'' وہ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ضرور کہو......!'' میں نے نرمی سے کہا۔

''بہت بڑے انسان ہو تم!''

''کیوں......؟''

''اگر تم میری بیماری جانے بغیر اس پیار سے پکارتے تو مجھے اچھا تو لگتا لیکن اتنا نہیں جبکہ میں نے بہت پہلے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے سندھیا کہو، تم نے ایک بار بھی نہ کہا اور اب......! اب تم نے میری بہت بڑی آرزو پوری کر دی۔''

''میری دعا ہے کہ آپ......!''

''دوسری بات......!'' اس نے میری بات درمیان سے کاٹ دی۔ ''دوسری بات یہ کہ میں ایک دم اپنی حد پھلانگ گئی ہوں۔''

''کیسے......؟''

''آپ سے تم پر آکر، مگر کیا کروں دیوانی ہوگئی ہوں، کتنے پیار سے تم نے سندھیا کہا ہے۔''

میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں آئے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے۔ وہ میرے ساتھ بہت خوش تھی لیکن اس کا کوئی علاج میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا اور میں نے خود کو بے بس مان لیا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا کروں؟ کتنے دن اسے خوش رکھ سکتا ہوں، بالآخر یہاں سے جانا ہوگا۔

ہم واپس جے پور آگئے۔ سندھورتا بہت خوش تھی۔ زیادہ وقت میرے ساتھ گزارتی تھی۔ ایک دن اس نے اداسی سے کہا۔ ''میں ٹھیک نہیں ہوسکتی نا......؟''

''ہاں سندھیا! میری سمجھ میں تمہارا علاج نہیں آتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

وہ اداس ہوگئی۔ بولی۔ ''اتنا سے جی لی ہوں کہ اب جیون سے نفرت ہوگئی ہے۔ جو کچھ ہوا میرے ساتھ، بتاؤ اس میں میرا کیا دوش تھا، عزت بچائی تھی ماتا، پتا کی، شوق پھر شوق ہوتا ہے، گیانی بننا چاہتی تھی، وہ نہ بن سکی، کہانی بن گئی، اب مجھے ایک مشورہ دو۔''

''ہاں بولو!''

''کیا کروں......؟''

''کیا چاہتی ہو؟''

''میرے ساتھ باقی جیون بتا سکتے ہو؟'' اس نے ایک عجیب سوال کیا اور میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں......؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں، بولو......؟''

''نہیں!'' میں نے پتھریلے لہجے میں کہا۔

وہ پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''میں جانتی ہوں یہ ناممکن ہے، ہاں تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ضرور سوچتا، پر مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟''

''انتظار......!'' میں نے کہا۔

''کس کا......؟''

''وقت کے فیصلے کا، تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، وقت تقدیر ہے، وہی راستے بناتا ہے، دکھاتا ہے۔''

''جیتی رہوں؟''

''مر سکتی ہو......؟''

''پتا نہیں!''

''وقت کو پتا ہے، اچھا ایک بات بتاؤ، اس حالت میں آنے کے بعد کبھی جوگی گرج ناتھ کو تلاش کیا؟''

''ہزاروں ہرکارے لگا رکھے ہیں اس کام پر، صدیوں سے یہ کام کر رہی ہوں، اب تک پتا نہیں چل سکا۔''

''کیوں تلاش کر رہی ہو اسے؟''

''بدلہ لینا چاہتی ہوں۔''

''گڈ......! یہی پوچھنا چاہتا تھا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جب میں کچھ نہ بولا تو اس نے کہا۔ ''سمجھی نہیں!''

''جینے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے، بیشک کچھ لوگ صرف جینے کے لیے جیتے ہیں لیکن اگر کسی مقصد کے لیے جیا جائے تو جینے کا مزا ہی اور ہوتا ہے اور تمہارے پاس جینے کا مقصد ہے، یعنی گرج ناتھ کی تلاش اور اُس سے انتقام! یہ تو طے ہے کہ وہ تمہیں امر کر گیا ہے، تو کیا وہ خود موت کی آغوش میں نہیں چلا گیا ہوگا؟''

''نہیں! وہ بھی ضرور جیتا ہوگا۔''

''بس! پھر کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا اور تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔''

''ایک بات بتاؤں؟'' اس نے رازداری سے کہا۔ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ''میں مرنا جانتی ہوں سچ! میں مر سکتی ہوں مگر دو آرزوئیں تھیں من میں، ایک یہ کہ کسی سے پریم کروں، کوئی من سے مجھے چاہے، دوسری یہ کہ مجھے وہ پاپی مل جائے اور میں اس سے بدلہ لوں۔''

''وہ ضرور ملے گا، اس کے لیے جیو۔'' میں نے کہا۔

''کتنا سچ بولتے ہو، بس اسی کے لیے جی سکتی ہوں، اپنی بیماری سے تو نجات حاصل نہیں کر سکتی۔''

''ہوسکتا ہے وقت کی کتاب میں تمہارا علاج تحریر ہو، وقت کا انتظار کرو۔''

سندھورتا کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا۔ بھول انسان سے ہی ہوتی ہے۔ اس نے پراسرار قوتیں حاصل کرنے کا سوچا تھا اور اس کے عذاب میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اس کے لیے دعا ہی کی جاسکتی تھی۔

''سندھورتا! اب میں جانا چاہتا ہوں۔'' ایک دن میں نے کہا۔

''ہاں! ضرور، تم جہاں کہو، میں تمہیں پہنچا دوں، متھرا چھوڑ آؤں؟''

''نہیں! میری کوئی منزل نہیں ہے، میں چلا جاؤں گا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی تھی۔ بہت سے سوالات میں نے اس کی آنکھوں میں مچلتے دیکھے تھے لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔

اس نے مجھے بہت سی پیشکشیں کیں لیکن میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس نے مجھے ایک بھاری رقم دینا چاہی تھی، جس میں سے میں نے تھوڑے سے پیسے رکھ لیے اور اس کے گھر سے نکل آیا۔

خوف کا کبھی میرے دل سے گزر نہیں ہوا تھا کہ میں گرفتار ہو جاؤں گا، مجھے موت کی سزا دی جائے گی۔ سچ یہ ہے کہ درویشوں نے مجھے ایسے الفاظ سے روشناس کرا دیا تھا جو سرمایۂ حیات تھے۔ اتنا اعتماد دے دیا تھا مجھے ان الفاظ نے کہ نظریۂ حیات ہی بدل گیا تھا۔ وقت ہی تقدیر ہے، وقت پر بھروسہ کرو، تقدیر اس کے تابع ہے۔

جے پور، ہندوستان کا خوبصورت شہر ہے لیکن میں اس وقت اس کے حسن پر غور کیے بغیر چلا جا رہا تھا، پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کئی بسیں کھڑی تھیں۔ بس ٹرمینل پر مختلف شہروں کو جانے والی بسیں موجود تھیں۔ جودھ پور، ٹونک، بیکانیر، اجمیر......!

ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ اجمیر...... اجمیر، خواجہ غریب نوازؒ کی نگری......! ٹکٹ خریدا اور ایئرکنڈیشنڈ بس میں جا بیٹھا۔ سوچتا رہا، بس چل پڑی۔ راجستھان کے مناظر میں کھو گیا جو منفرد تھے۔ سفر کٹتا رہا اور میں اجمیر شریف پہنچ گیا۔ مزار غریب نوازؒ پر نگاہ پڑی اور یوں لگا جیسے بینائی ہزار گنا بڑھ گئی ہو۔

مزار کے قریب پہنچا ہی تھا کہ علاقائی لوگوں کا ایک گروہ درگاہ شریف کے احاطے میں داخل ہوا۔ سادگی میں پُرکاری کی مثال! کوئی برأت تھی۔ عورتیں اور مرد صاف ستھرے کپڑے پہنے تھے۔ درمیان دولہا، دلہن، بالی سی عمریں، سانولے سلونے رنگ، مخصوص راجستھانی لباس، پھولوں سے لدے......! خواجہ کی شان میں گیت گاتے آ رہے تھے۔ پتا چلا کہ یہاں کے باشندے شادی کے فوراً بعد پہلے خواجہ صاحبؒ کے حضور حاضری دینے آتے ہیں۔

ان لوگوں کے فارغ ہونے کے بعد مزار مبارک میں داخلے کا موقع نصیب ہوا۔ اندر زیادہ رش نہیں تھا۔ فاتحہ خوانی کے بعد باہر آگیا اور آس پاس کے مقامات کی زیارت کرنے لگا۔

لنگر کی کمی نہیں تھی۔ میں نے پیٹ بھرا اور ایک گوشے میں جا پڑا۔ ذہن کو آزاد چھوڑ دیا، کوئی تردّد نہیں تھا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ کوئی ایک بجے کا عمل تھا کہ کسی نے کان کے بالکل قریب کہا۔ ''اٹھو! میرے ساتھ آؤ۔''

چونک کر دیکھا تو چند فٹ کے فاصلے پر ایک سیاہ پوش کو کھڑے پایا۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے غور سے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ عبا میں ملبوس، چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا اور نقوش بالکل نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے بمشکل کہا۔ ''مجھ سے کچھ کہا......؟''

''ہاں! آؤ طلبی ہے۔'' جواب ملا۔

ذہن کسی قدر نیند میں ڈوبا ہوا تھا، صحیح طور پر کچھ نہیں سوچ سکا، بس اٹھ کر سیاہ پوش کے پیچھے چل پڑا۔ طویل راستہ طے کر کے مزار شریف کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر تارا گڑھ کے پہاڑی ٹیلے نظر آ رہے تھے۔ انہیں ٹیلوں کے دامن میں ایک مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی، میرے راہبر کا رخ اسی طرف تھا۔ کچھ دیر کے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ ایک پرانا منظر یاد آ گیا جب اسی طرح کے درس میں پہلی بار شرکت کی تھی۔

یہاں بھی وہی ماحول تھا۔ لاتعداد افراد کالی چادروں میں لپٹے چہرے، ڈھکے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ درمیان میں ایک بڑا کانسی کا چراغ روشن تھا۔ میں بھی ایک گوشہ منتخب کر کے بیٹھ گیا۔ تب ایک سیاہ پوش نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

چاروں طرف سے جواب دیا گیا جس میں، میں بھی شامل تھا، پھر بسم اللہ شریف کے بعد کلام الٰہی کی ایک آیت تلاوت کی گئی۔ اس کے بعد حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے بارے میں توصیفی الفاظ کہے گئے۔

''حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی ذات مبارکہ ہزاروں صفات کا مرکز ہے، آپ نے اس بے آب و گیاہ ریگستانی علاقے کو اپنا مسکن بنایا، اس میں گہرا رمز پنہاں تھا، اس کی وجہ یہاں کے بے حال اور بے مایہ لوگ تھے جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں روٹی اور پانی تک سے محروم تھے۔ جان توڑ مشقت کے باوجود دو وقت کی روٹی اور بدن پوشی کے لیے ان کے پاس کچھ نہ ہوتا۔ سروں پر جہنم کی طرح دہکتا سورج اور پیروں میں آگ کی طرح سلگتی ریت ان کا مقدر تھی۔ مفلسی اور فاقہ زدگی انسان کو کفر کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے اسی حالت میں تھے اس کے علاوہ اہلِ ستم جاگیرداروں، ٹھاکروں نے ان کی نسلوں کو اپنے مظالم کا شکار بنا رکھا تھا۔ یہ دین، دھرم کو بھول گئے تھے اور اپنی جھلستی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھنے لگے تھے۔

تب خواجہ غریب نوازؒ نے اپنے مرشد پاک کے حکم سے اس سرزمین پر قدم رکھا اور اپنے بابرکت اقدامات سے ان لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا۔''

اس کے بعد کلام پاک کا ورد ہوا اور میں آنکھیں بند کیے اس محفل پاک میں شریک رہا، پھر کچھ خاموشی سی محسوس ہوئی اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولتے ہی ایک دم دھک سے رہ گیا۔ ٹیلے کے دامن میں اب کوئی نہیں تھا، وہ چراغ بھی نہیں جس کا مدھم اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب چلے گئے تھے، دل کو غم کا احساس ہوا۔ مجھے دعوت دی گئی تھی، رخصت بھی کر دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ خواجہ صاحبؒ کی شان بیان کی گئی تھی تو ان کا مہمان ہی خیال کر لیا جاتا۔

یہاں سے جانے کو دل نہیں چاہا، وہیں لیٹ کر سو گیا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو دھول، مٹی میں اٹا ہوا تھا، سورج نکل آیا تھا، خاصی تپش ہوگئی تھی۔ اپنے سامان کا خیال آیا جو اسی جگہ چھوڑ آیا تھا جہاں رات کو پڑاؤ ڈالا تھا۔ کپڑے اور دوسری چیزیں اسی میں تھیں۔ دل کو ذرہ برابر بھی تردّد نہ ہوا۔ اٹھ کر کاہلوں کے انداز میں اس طرف چل پڑا۔

سامان جوں کا توں رکھا تھا۔ درگاہ شریف میں کیا نہیں تھا۔ زائرین کے لیے ہر طرح کا بندوبست تھا۔ ایک لائن سے سیکڑوں غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ ٹھنڈے حیات بخش پانی سے غسل کیا تو تھکن بدن سے اتر گئی۔ باہر ہر طرح کے ناشتے تیار تھے۔ لوگ اس طرح نیاز مندی سے لنگر تقسیم کر رہے تھے جیسے خواجہ غریب نوازؒ نے انہیں میزبان مقرر کیا ہو۔

کیا زندگی تھی یہاں کی، قربان جائیے۔ جس قدر بے فکری یہاں تھی شاید ہی کہیں ہو۔ نہ کھانے، پینے کی فکر، لنگروں کے انبار، کھانے والوں کی کمی۔ رات کو قوالیوں کی محفل، ہندوستان بھر کے نامی گرامی قوال ہر لالچ سے بے نیاز خواجہؒ کی شان میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے آتے تھے۔

درگاہ شریف کے مغربی حصے میں عین اس جگہ جہاں اس دن درس میں شرکت کی تھی، ایک مجذوب وارد ہوئے۔ لوگ ان کے گرد جمع تھے لیکن وہ ان کی موجودگی سے بے نیاز کسی خیالی کاغذ پر خیالی قلم سے کچھ لکھ رہے تھے، پھر انہوں نے ایک خیالی کاغذ طے کر کے آواز لگائی۔ ''مرزا عظیم بیگ، کانپور والے......!''

پاس کھڑے لوگوں میں سے ایک کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ آواز دوبارہ سنائی دی اور حیران شخص آگے بڑھ آیا۔ لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وہ شخص خود شدید حیران تھا۔

مجذوب نے ہاتھ بڑھا کر اسے جیسے کچھ دیتے ہوئے کہا۔ ''معجون فلاسفہ ہمراہ عرق بادیان، بھنی ہوئی سونف زیادہ سے زیادہ، دو دن میں تین بار، ایک ماہ، نسخہ پکڑ!'' انہوں نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا اور آگے آنے والے نے عاجزی سے دونوں ہاتھ سامنے کر دیے۔ نسخہ تو خیر تھا ہی نہیں لیکن وہ بڑبڑاتا پیچھے ہٹ گیا۔

''معجون فلاسفہ ہمراہ عرق بادیان، بھنی ہوئی سونف۔'' دوسری طرف مجذوب پھر اسی طرح دوسرا نسخہ لکھنے میں مصروف ہوگئے تھے۔

میں نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ بھاری بدن، مٹیالا رنگ، چیتھڑے بدن پر جھول رہے تھے، ساتھ ایک گٹھڑی رکھی ہوئی جس میں پرانے کپڑے میل سے چیکٹے ہوئے جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں اور نہ جانے کیا کیا الم غلم۔

ایک دم ان کی آواز پھر ابھری۔ ''محمود خان ولد ابراہیم خان۔'' ایک اور حیرت کا مارا آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ بیٹھ کر اس نے سجدے جیسی پوزیشن بنائی تو مجذوب غصے میں آگئے۔ انہوں نے پاس رکھی لکڑی اٹھائی اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے ماری۔ ''سیدھا ہو، سیدھا ہو۔'' بابا کی آواز ابھری۔

لکڑی کھانے والا خود ہی بلبلا کر سیدھا ہوگیا تھا۔

''دماغ میں کیڑے پڑ گئے ہیں، کسی اچھے اسپتال جا کر آپریشن کراؤ، میں نے تفصیل لکھ دی ہے، لو یہ کاغذ رکھو۔'' ایک بار پھر ہاتھ آگے بڑھا۔ لکڑی کھانے والے نے جلدی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

پھر تو ایک ہنگامہ ہوگیا۔ کھڑے لوگ بابا پر ٹوٹ پڑے۔ ''باباجی! میری بیٹی کی شادی، نوکری نہیں لگ رہی سرکار! بڑا گھاٹا ہوگیا مہاراج، گروجی، باباجی!''

مجذوب گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے لکڑی اور گٹھڑی اٹھائی اور وہاں سے دوڑ لگا دی۔ لوگوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا، اور دور تک دوڑتے چلے گئے تھے، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ دل میں بڑی عقیدت تھی۔ ایک جگہ بیٹھ کر سوچ میں ڈوب گیا لیکن اسی رات ایک اور دلچسپ صورتحال پیش آئی۔ جمعرات کا دن تھا، رش زیادہ تھا۔ اس وقت قوالی کی محفل جمی ہوئی تھی، مگر میں اس ہنگامے سے دور ایک گوشے میں لیٹا تھا کہ کوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کالے رنگ کی چادر اوڑھی ہوئی تھی لیکن چہرہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک نگاہ میں پہچان لیا۔ وہی مجذوب بابا تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو ان کی آواز ابھری۔ ''مہمان ایک دن کا، دو دن کا، تیسرے دن وہ بلائے جان ہوتا ہے، کب سے پڑے ہوئے ہو، خیال نہیں آتا، کون جانے کس کی کہاں ضرورت ہوتی ہے، چلتے پھرتے رہا کرو، اپنے دل سے دکھ دور کرو، سارے راستے ٹھیک ہیں، ضروری تو نہیں ہے ضرورت تمہیں تلاش کرے، تم ضرورت کو تلاش کرو تو افضل ہے، دل چھوٹا نہ کرو، دل سے دکھ دور کرو، تم نے ثابت قدمی سے ہر عمل ہدایت کے مطابق کیا، تمہارے مرتبے میں کمی نہیں اضافہ ہوا ہے، ترازو کے دونوں پلڑے متوازن نہ ہوں تو نمبر کٹ جاتے ہیں، دل سے دکھ دور کرو، فیصلے دانشور کرتے ہیں اور وہی فیصلے مناسب ہوتے ہیں، مدد کبھی بھی ہوسکتی ہے لیکن حساب ہوتا ہے، عمل معطل ہو جاتا ہے تو ہڈیاں خشک ہو جاتی ہیں، بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ آنکھ نگراں ہے لیکن تحریک افضل ہے۔ دل چھوٹا نہ کرو، فیصلے حالات کے مطابق ہوتے ہیں، وقت نے کہا ہے کہ تمہیں مستقبل میں دنیادار رہنا ہے، یہ رقم ہے سو راستہ تھوڑا سا بدل دیا گیا ہے، نگاہ نہیں ہٹائی گئی۔ جو دیا گیا، وہ تمہارا ہے لیکن خزانے بھرے رہیں تو تقویت رہتی ہے۔ دل سے دکھ دور کرو، دل چھوٹا نہ کرو۔'' یہ کہہ کر مجذوب اپنی جگہ سے اٹھے اور سیدھے چلے گئے۔

میرا بدن پتھرا گیا تھا، دماغ سن ہوگیا تھا، کچھ لمحوں کے لیے خون کی روانی رک گئی تھی۔ اس کیفیت میں موت بھی واقع ہو جاتی ہے پھر رفتہ رفتہ ساری قوتیں واپس آنے لگیں۔ مجذوب کا ہر لفظ دل کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔ دلاسے دیے گئے تھے، وجہ بتائی گئی تھی، تقدیر میں دنیاداری تھی اس لیے ان بلندیوں کو روک دیا گیا تھا کیونکہ وقت آسمانوں سے اترتا ہے اور اس میں تقدیر ملفوف ہوتی ہے۔ ایک شکایت تھی، ایک غم تھا۔ سب کچھ تو مانا تھا بس چہرے پر میک اپ کرا لیا تھا، وہ بھی بادل نخواستہ......! بس کسی کا کہنا مان لیا تھا۔ دل کو واقعی دکھ تھا لیکن یہی دل اب شیر ہوگیا تھا۔ سایہ ہے، چھاؤں ہے سر پر، میرا دھوپ کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سوچتا رہا پھر ایکدم ہنسی آگئی۔ وہ الفاظ ذہن میں اترے۔ مہمان ایک دن کا، دو دن کا، تیسرے دن بلائے جان! مجھے تو یہاں سترہ دن ہو چکے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے کان پکڑے۔ اس کے بعد صبح تک جاگتا رہا۔ دماغ میں وہ سارے الفاظ گردش کر رہے تھے اور کانوں میں رس گھول رہے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا حالانکہ ساری رات جاگا تھا لیکن صبح بالکل ہشاش بشاش تھا۔ جیسا میں نے بتایا کہ مزار پاک پر چوبیس گھنٹے لنگر تقسیم ہوتا ہے، جب دل چاہے پیٹ بھر لو۔ یہی نہیں لنگر کے لیے لنگر گاہ کا رخ کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن لنگر لانے والے عقیدت مند آوازیں لگاتے پھرتے ہیں کہ کھانا، ناشتہ تیار ہے، آجائیں بلکہ اس طرح جیسے گاہک کو گھیرتے ہیں، گاہکوں کے بازو پکڑ کر لے جاتے ہیں کہ گاہک کہیں اور نہ چلا جائے۔

''آئیے! ناشتہ تیار ہے۔'' ایک آواز نے کہا اور میرا بازو پکڑ لیا۔ میں اس کے ساتھ لنگر گاہ پہنچا۔ ناشتہ، پھر چائے! فراغت ہوگئی تو مزار پاک کا رخ کیا، فاتحہ پڑھی، رخصت مانگی اور سلام کر کے واپسی کے لیے مڑا ہی تھا کہ ایک مجاور نے راستہ روکا اور گلاب کے پھولوں کی کچھ پتیاں میری طرف بڑھا دیں اور بولا۔ ''منہ میں رکھ لو۔''

میں نے فوری ہدایت پر عمل کیا اور پھر واپس مڑ گیا۔ خاصا فاصلہ پیدل طے کر کے بسوں کے ٹرمینل پہنچا اور آگرے کی بس میں بیٹھ گیا۔

وہی بے آب و گیاہ راستے، سرخ پتھروں کے پہاڑ! سارے راستے قدیم داستانوں سے سجے ہوئے۔

پھر آگرہ......! ہزاروں داستانوں کا مرکز۔ اکبر، جودھا بائی، سلیم انارکلی، نواب عاقل خان، زیب النساء، شاہجہاں، ممتاز محل اور......!

ایک ہوٹل میں کمرہ حاصل کیا اور آگرے کی داستانوں میں کھو گیا۔ اس دن اعتماد الدولہ کے مقبرے کی سیر کر رہا تھا کہ ایک حیران کن آواز سن کر چونکا۔

''تم......؟''

(جاری ہے)

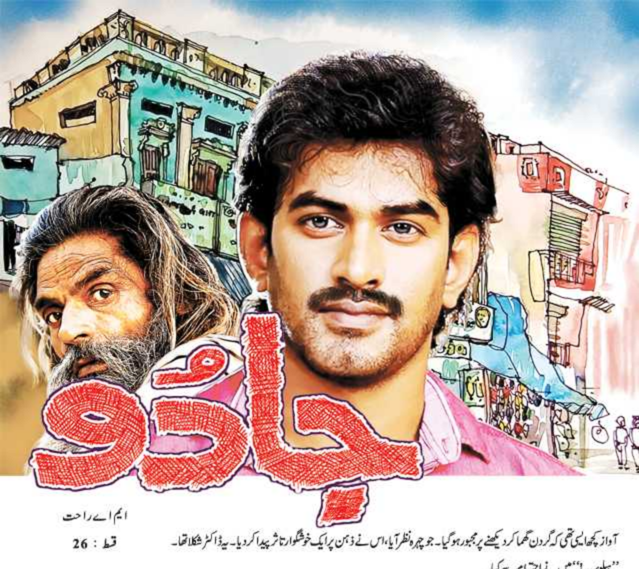

ایم اے راحت

قسط : 26

آواز کچھ ایسی تھی کہ گردن گھما کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جو چہرہ نظر آیا، اس نے ذہن پر ایک خوشگوار تاثر پیدا کر دیا۔ یہ ڈاکٹر شکلا تھا۔

''ہیلو سر۔!'' میں نے احترام سے کہا۔

''کیا تم دیوانے نہیں ہو؟ ہر طرف تمہارے دشمن پھیلے ہوئے ہیں اور تم سیر و سیاحت کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر شکلا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''مجھے آپ جیسے مخلص بزرگوں کی دعائیں حاصل ہیں، پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''احتیاط بہت اچھی چیز ہے۔ آگرہ کب واپس آئے؟''

''زیادہ وقت نہیں ہوا۔''

''آؤ، مجھے تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر خوف محسوس ہو رہا ہے۔ کیا ابھی اور سیر کرنی ہے؟''

''نہیں! آپ مل گئے، کافی ہے۔'' ڈاکٹر شکلا نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل کر اس کی کار کے پاس آ گیا۔ وہاں کار کے ساتھ ڈرائیور بھی موجود تھا، جس نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں اندر بیٹھ گئے۔

''تمہارا قیام کہاں ہے؟'' ڈاکٹر شکلا نے پوچھا۔

''ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔''

''یہ عقل کا کام کیا ہے تم نے۔ ویسے تمہیں آگرے آنا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ یہاں تمہارا سب سے بڑا دشمن سریش چندر موجود ہے۔''

''مجھے دشمنوں کا دیس بھی اچھا لگتا ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اسی لیے میں نے تمہیں دیوانہ کہا ہے۔'' ڈاکٹر نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''سریش کو تم نے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا جبکہ اسے اپنے محکمے میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔''

''تھی؟ کیا مطلب؟''

''بڑی بیٹی ہوئی ہے اُس کی۔ اس نے تمہیں اسپتال میں گھیرا تھا اور بڑی زبردست ناکہ بندی کی تھی۔ لیکن تم نے اس کے منہ پر کالک مل دی۔''

''ارے نہیں۔ بڑی مشکل سے نکلا تھا میں اس کے چنگل سے۔ ویسے آپ کو بہت تفصیل معلوم ہے۔''

''مجھے؟ صرف مجھے نہیں پورے ہندوستان کو معلوم ہے۔ جانتے ہو تمہارے بارے میں پولیس کو کیا احکامات ملے ہوئے ہیں؟''

''نہیں!'' میں نے کہا۔

''عجیب بے نیاز آدمی ہو۔ پولیس کو ہدایات ہیں کہ تمہیں دیکھتے ہی موقع پر ہلاک کر دیا جائے۔''

''اوہ!'' میں نے کہا۔

کار راستے طے کرتی رہی، پھر وہ ایک انتہائی شاداب علاقے میں بنے خوبصورت بنگلوں میں سے ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکی۔

''یہ بنگلہ بھی آپ کا ہے؟''

''ہاں! مجھے تمہارا پشت پناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے میں دن کی روشنی میں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ ویسے آگرے کے مختلف علاقوں میں میری کافی جائداد ہے۔'' شکلا نے بتایا۔

ایک ملازم نے گیٹ کھول دیا۔ کار پورچ میں جا کر رک گئی۔ میں شکلا کے ساتھ اتر کر اندر داخل ہو گیا۔ خوبصورت عمارت کا ڈرائنگ روم بھی خوبصورت تھا۔

''اسلحہ رکھتے ہو اپنے پاس؟'' شکلا نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے کہا۔

''نہیں ڈاکٹر۔ ہم تو زندگی کی حفاظت کرنے والوں میں سے ہیں۔ اپنے دشمن کی بھی زندگی نہیں لے سکتے۔ ایک ڈاکٹر صرف زندگی دے سکتا ہے، وہ کسی کی زندگی لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''ساری باتیں بے وقوفی کی ہیں۔'' شکلا نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

''میرا دشمن ہے بھی کون۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ہم رہیں چتوا۔ ارے، ہم ہیں نا تو ہار دشمن۔'' ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے سے آواز آئی، جہاں ایک خوبصورت پردہ پڑا ہوا تھا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا سانس رک گیا۔ بھوریا چرن تھا۔ سفید رنگ کے قیمتی دھوتی کُرتے میں ملبوس۔ اس کے چاروں ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ چہرے پر بھرپور شیطانی مسکراہٹ۔ آنکھ میں بجلیاں سی کوندتی ہوئی۔ وہ بڑی شان بے نیازی سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔

''ہم سے بڑا دشمن کون رہے تو ہار۔ بنسیا نے اسی لیے پوچھا تو سے کہ گولی تو نا چلاوے گا تو ہم پر ہمیں دیکھ کر۔ اور ایک جھوٹ بولا تُو نے بنسی کے سامنے۔''

''بنسی؟'' میرے منہ سے بالکل غیر ارادی طور پر نکلا۔ اور میں نے ڈاکٹر شکلا کو دیکھا کیونکہ بھوریا چرن نے اُس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میری پوری جان آنکھوں میں سمٹ آئی کیونکہ اب شکلا کی جگہ وہاں بھوریا چرن کا دست راست بنسی راج بیٹھا ہوا تھا۔

یہ دیکھ کر مجھے شدید چکر آ گیا۔ ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بھوریا چرن سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ بنسی راج ادب سے اٹھ گیا تھا اور پھر وہ بھوریا چرن کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں رے بنسیا۔ جھوٹ بولا نا اس نے تو سے؟''

''جی مہاراج۔''

''کا جھوٹ بولا۔ اسے بتا۔''

''اے کہت رہین کہ ڈاکٹر تو جیون دیویں ہیں۔ اوا پنے دشمن کے بھی پران نا لیویں ہیں۔'' بنسی راج نے کہا۔

''ہاں۔ سا باس۔ ای ہی کہت رہیں ہم۔ تو اس نے کا کری؟''

''آپ کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے۔'' بنسی راج بولا۔

''جھوٹ بولا نا سسرنے؟'' بھوریا چرن کا لہجہ یکدم غضبناک ہو گیا۔

میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہوتے جا رہے تھے۔ ایک خوفناک جال بچھایا گیا تھا۔ شیطان کا بچہ بھوریا چرن اپنے ہاتھ پاؤں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے شیطانی وجود کے ساتھ دوبارہ عمل کی دنیا میں آ گیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ جب میں اپنے پہلے اسپتال میں تھا تو بھوریا چرن یا اس کی کوئی پورنی ڈاکٹر سائرہ کے روپ میں میرے سامنے آئی تھی اور میں آسانی سے دھوکا کھا گیا تھا۔ اسی طرح بنسی راج نے ڈاکٹر شکلا کا روپ اختیار کیا تھا اور بہت خوب اختیار کیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی آواز میں نہایت شستہ الفاظ میں مجھ سے بات کی تھی جبکہ اب وہ اپنی پرانی زبان بول رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کتنے باخبر تھے۔ ایک ایک بات انہیں معلوم تھی اور انہوں نے نہایت ذہانت سے شکلا کے روپ کا انتخاب کیا تھا۔ اس خیال سے کہ میں شکلا کا بے حد احترام کرتا ہوں اور اس کے روپ میں کسی بات سے گریز نہیں کروں گا۔ میرے اور شکلا کے بارے میں کس قدر شاندار معلومات حاصل کی تھیں ان لوگوں نے۔

''کا رے؟ بولتی بند کا ہے ہو گئی تو ہار؟''

''تمہارے اس ناٹک کے بارے میں سوچ رہا ہوں بھوریا چرن۔''

''ارے پوت ای ناٹک سے تو ہمار جیون کی ڈور بنی ہے۔ تو ہم کا اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھے ہے نا؟''

''ہاں بھوریا چرن۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''کیسے مجے کی بات رہے۔ دشمن ہی کو تیرے جیون کی سب سے جیادہ فکر ہے۔ اوہی آگے تیری حفاجت کرے گا۔''

''فائدہ؟'' میں نے کہا۔

''تو جانت رہے چتوا۔ تو جانت رہے۔ بس کا کریں۔ مجبوری ہے۔''

''تم بھی مجبور ہو سکتے ہو بھوریا چرن؟'' میں نے کہا۔

''ہاں رے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''تمہیں کیا مجبوری ہے؟''

''بس کالی میا وچن لیوے ہے کھنڈولا بننے کا۔ سب سے پہلے جو کام سروع ہو، اس کو کامیاب ہونا چاہیے۔ وہ تو گنجائس نکل آئی کہ تو اپنے پتا کا ہمسکل اور پاپل نکلا اور اوبھی اماوس کی رات کو پیدا ہوا۔ ساری باتیں اوہی نکلیں جو تیرے پتا کی تھیں سب ہمارے کام کی تھیں سوائے ایک کے۔'' بھوریا چرن کی آواز میں بڑی مایوسی جھلک رہی تھی۔

''کون سی ایک؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اپنے پتا ہی کی طرح ہٹ دھرم اور جدی رہے۔'' بھوریا چرن نے دانت پیس کر کہا۔

''ناکام تو تم اب بھی رہو گے بھوریا چرن۔''

''بھول جا بٹوا۔ بھول جا ای بات کو۔ اب ہم تو کا سمجھ گئی رہیں۔ جانت رہیں کے کس طرح کا بو آئی رہے۔ دیکھ لے کیسا پکڑ بلایا آرام سے پنجرے ما۔ آ گئی رہے۔ ارے ابھی چاہیں تو تو ہار گردن موڑ کر چڑیا کی طرح مار دیں پر نا ہیں۔ پردیسی ہے۔ ہمارے پاس آئی ہے۔ ایسا نا ہی کریں گے پر جو حال کریں گے تیرا۔ مان لے گا تو بھوریا چرن کو۔ مان لے گا۔ اور سن اب بھی تو جندہ رہ سکت ہے۔ ہمارا کام کر دے۔ تو کا عجت آبرو کے ساتھ پاکستان پہنچا دیں گے۔ یہ ایک سنکھا اور ہونے والے کھنڈولا کا وچن ہے۔ کالی میا کے نام کے ساتھ۔''

''اپنے وطن واپس جاؤں گا بھوریا چرن۔ لیکن اُس وقت جب تیرا ناپاک وجود ختم ہو جائے گا۔''

''نا ہیں ہو گا رے۔ کبھی نا ہیں ہو گا۔ پر تو کا ہم دو کوڑی کا کر دیں گے۔ بنسیا۔ اے کا لے جا۔ ہمیں گسہ آ رہا ہے۔ کام کھراب نہ ہو جائے ابھو۔!'' بھوریا چرن نے کہا اور صوفے سے اٹھ گیا۔

''اٹھو۔ اٹھو۔'' بنسی راج نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اور میں اس تحقیر آمیز انداز پر غصے میں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ بھوریا چرن وہیں کھڑا رہا اور میں بنسی راج کے ساتھ باہر نکل آیا۔

تھوڑے فاصلے پر آ کر بنسی راج مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں بھی فرنیچر موجود تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ ''ڈاکٹر کامران۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہوں۔''

''زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ مان لو اس کی بات۔ تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمیں تمہاری ایک ایک جنبش کا پتا رہتا ہے۔ اگر تم اس کی بات نہیں مانو گے تو مایوس ہو کر وہ تمہیں مار دے گا۔''

''اُس کے بعد؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

بنسی راج زچ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ بس اتنا ہی کام تھا تم سے۔''

''شکریہ۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس خوبصورت بنگلے سے باہر نکلنے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ بے حد خوبصورت اور شاداب علاقہ تھا، موسم بھی بادلوں بھرا تھا۔ دریائے جمنا پوری روانی سے بہہ رہا تھا۔ لوگ سیر کرتے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف سے بڑی خوشگوار خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی۔ دیکھا تو کئی بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر پچپن سال کے قریب ہو گی۔ کچی داڑھی سر پر بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی، ہاں پھندنا گاہ موجود تھی اور ٹریفک کانسٹیبل کی طرح سیدھی کھڑی ہوئی تھی۔ بڑے خوشبودار آلو کے کباب تل رہے تھے۔ بے اختیار آلو کے کباب کھانے کو دل چاہا۔ ویسے بھی کباب فروش بزرگ روایتی قسم کے مسلمان لگ رہے تھے۔ میں قریب پہنچا تو مسکرا کر بولے۔ ''آیئے آیئے حضور من، چشم ما روشن دل ماشاد۔ ہمیں علم ہے کبابوں کی خوشبو آپ کی راہبر بنی ہے اور ہماری طرف سے صاحب ذوق کی شناخت کا یہی عمل ہے۔ تشریف رکھیے۔''

''شکریہ۔'' میں نے ان کی باتوں سے لطف لے کر کہا۔

''کباب تلیں؟ کباب کی بھی بہت سی اصطلاحیں ہیں۔ کباب لگانا، کباب تلنا، جل کر کباب ہو جانا، کباب خنداں یعنی جل کر مسکرانا وغیرہ۔ تو کیا حکم ہے؟''

''جی۔ مجھے ان کی خوشبو یہاں لائی ہے۔'' میں نے کہا۔

بزرگ آلو کے آمیزے سے کھیلنے لگے۔ پھر بولے۔ ''باتیں بھی جاری رہیں تو کیا حرج ہے۔''

''آپ کا اسم شریف؟'' میں نے بات کا آغاز کیا۔

''حکیم سرمد کہتے ہیں خادم کو۔''

''تعلق کہاں سے ہے؟''

''لکھنؤ سے۔''

''آگرے کب تشریف لائے؟''

''طویل کہانی ہے۔ ہم مختصر اً بتائیں گے جب تک کباب سرخ نہ ہو جائیں۔ ظالم شاہجہاں نے ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے تاج محل تعمیر کرایا۔ ہماری اہلیہ کا نام بھی ممتاز تھا۔ ان کی وفات پر ہم کوئی تاج محل نہیں تعمیر کرا سکے۔ بس ان کی یاد میں یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ لیجیے کباب تیار ہو گئے، کچھ لمحوں کی خاموشی رہے گی۔''

لکھنؤ کی نفاست اور تہذیب کی کہانیاں ہی سنی تھیں، اس وقت لکھنؤ سامنے تھا۔ جس قدر نفاست کے ساتھ شفاف برتن میں کباب پیش کیے گئے تھے ان کا مزہ کباب کھانے سے پہلے ہی آ گیا تھا۔

حکیم صاحب نے ان پر سبز پودینے کی چٹنی ڈالی اور بولے۔ ''یہ ہماری عقیدت گاہ کا رنگ ہے۔ اور اس پر یہ سفیدی مسلم۔'' انہوں نے اس پر سادہ سفید دہی ڈال کر کہا، پھر بولے۔ ''کاش ہم اس پر چاند تارا ڈال کر اس کا حسن مکمل کر سکتے۔ ہاں یہ میٹھی چٹنی ضرور ڈالیں گے کہ یہ مٹھاس ہر اہلِ دل کے دل میں ہے۔''

کچھ لمحوں تک تو میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ لیکن اچانک میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سبز چٹنی، سفید دہی اور چاند تارے کا حوالہ پاکستان کے جھنڈے کا نشان تھا، لیکن! ابھی کچھ سوچ نہیں پایا تھا کہ بزرگ بولے۔ ''اللہ آپ کو ہمیشہ کامراں رکھے۔ گلشن مسعود میں پھولوں کی مہک کبھی کم نہ ہو۔ ذرا چکھ کر بتایئے کہ ذائقہ کیسا ہے؟''

میں سب کچھ بھول کر حکیم سرمد کو دیکھنے لگا۔ یہ ساری باتیں اتفاق نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ میری حیرت سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ مجھے عجیب سا شبہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا اور اپنے کام میں مصروف رہے۔ پھر میں نے کباب کھائے، سبحان اللہ زندگی میں کبھی اس قدر ذائقے دار کباب نہیں کھائے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھے بغیر دو کباب اور میری پلیٹ میں ڈالے، پھر دوسرے دو گاہکوں کے لیے کباب بنانے لگے۔

میں خاموشی سے کباب کھاتا رہا، پھر ان کی آواز آئی۔ ''اور دوں؟''

''نہیں شکریہ۔ کتنے پیسے دوں؟'' انہوں نے پیسے بتائے جو میں نے انہیں ادا کر دیئے۔

''سبحان اللہ۔ اور اللہ حافظ۔ جب بھی کباب کھانے کو دل چاہے تشریف لے آیئے۔ ہم یہاں یا تاج محل میں ملیں گے۔ ممتاز جب بھی یاد آتی ہیں ہم وہیں اُن سے ملاقات کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

مزے مزے کے تجربے ہو رہے تھے بلکہ اب تو یہ تجربے کافی دلچسپ ہو گئے تھے۔ شکلا کے روپ میں بھوریا چرن کا نائب، پھر بھوریا چرن اور اس کی وارننگ اور اب یہ حکیم سرمد۔

کباب واقعی بہت اچھے تھے۔ مزہ آ گیا تھا۔ بھوریا چرن کی وارننگ کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔

رات ہو گئی۔ پیٹ اسی طرح بھرا ہوا تھا کہ کسی چیز کی حاجت ہی نہیں ہوئی، حالانکہ بدہضمی نہیں تھی بس ایک سیری تھی۔ رات کو شکلا یاد آ گیا کیوں نہ اس سے ملنے کی کوشش کی جائے۔ اس خیال نے ذہن میں جڑ پکڑ لی۔ اور میں شکلا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے معمولات میرے علم میں تھے۔ اس وقت وہ گھر پر ہی ہو گا۔

اس کے دروازے پر جا کر اسے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع کرائی، اور کہا کہ ملنا ضروری ہے۔ ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور چند منٹ کے بعد شکلا ایک گاؤن میں ملبوس اندر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا، پھر سنجیدگی سے آگے بڑھا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔

''بیٹھو۔ کیسے ہو؟''

''دیکھ لیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اخبارات سب بتاتے رہے ہیں۔ دل مطمئن تھا تمہاری طرف سے۔''

''آپ کیسے ہیں؟''

''دیکھ لو۔'' ڈاکٹر شکلا نے مسکرا کر کہا۔

''سریش چندر کا کیا حال ہے؟''

''دیوانہ ہے تمہارا۔ بہت چاہتا ہے تمہیں۔'' شکلا نے کہا اور ہنس پڑا۔

میں شکلا کی بات کا مطلب سمجھ کر مسکرایا تھا۔ شکلا نے کہا۔ ''تم نے اسے خوب رقص کرایا۔ میں نے اخبارات میں پوری تفصیل پڑھی ہے، ویسے ایک بات محسوس کی ہے میں نے۔ وہ یہ کہ اخبارات کی زبان تمہارے خلاف نہیں ہوتی۔ تمہارے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے۔ اس بات کے امکانات ہیں کہ تم بے گناہ نکلو۔''

میں نے ان الفاظ پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''آپ نے آج تک مجھ سے کبھی اس بارے میں نہیں پوچھا ڈاکٹر شکلا۔''

''کس بارے میں؟''

''یہی کہ جو الزامات مجھ پر لگائے گئے ہیں، ان کی کیا حقیقت ہے؟'' ڈاکٹر شکلا کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''ہر شخص کا شعبہ الگ الگ ہوتا ہے۔ میری پوری زندگی امراض کی تفتیش و تشخیص میں گزری ہے لیکن عمر کے ساتھ جن تجربات کا زندگی سے سابقہ پڑا ہے وہ کچھ چیزوں کا احساس دلا دیتے ہیں۔ میں تمہیں ان الزامات کا مرتکب نہیں سمجھتا۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری گہرائیاں کیا ہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے طریق علاج میں روحانیت کا عنصر زیادہ ہے۔ تم کسی مرض کی نشاندہی اور اُس کا علاج اس طرح کر دیتے ہو...... کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''میری بدنصیبی ہے شکلا صاحب کہ میں سریش چندر کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکتا۔ میں واقعی بے گناہ ہوں۔ میں نے ڈاکٹر نیوی کی بے حرمتی کی نہ اسے قتل کیا اور نہ......''

''مجھے یقین ہے۔''

شکلا نے جس لہجے میں کہا اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''سریش چندر جی کو یقین ہے کہ یہ سب میں نے ہی کیا ہے۔ آپ کی ان سے بات ہوئی؟''

''میرے اب ان لوگوں سے تعلقات کہاں رہے۔ ایشور چندر جی کا بھی جرمنی میں دیہانت ہو گیا۔ اس وقت کے بعد سے وہ لوگ مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ اور...... ارے ارے ارے۔'' شکلا جی کے منہ سے عجیب سے انداز میں نکلا اور میں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے خیال گزرا تھا کہ شاید کوئی اچانک اندر آ گیا ہے۔ لیکن کوئی نہیں تھا۔

''سوری۔ سوری۔'' شکلا جی نے کہا۔

''خیریت؟'' میں نے انہیں غور سے دیکھ کر کہا۔

''ہاں خیریت ہے، بس ایک خیال نے چونکا دیا تھا۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ کسی پولیس والے سے ملنا پسند کرو گے؟''

''ہاں۔!'' میں نے مختصراً کہا۔

شکلا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے، پھر اس نے کہا۔ ''تم سے اسی جواب کی توقع تھی، تم نے یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور میں اسے تم سے کیوں ملانا چاہتا ہوں؟''

''مجھے کسی کا خوف نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ میں ڈاکٹر شکلا کو ہی جانتا ہوں۔''

''فخر ہے مجھے تم پر، بہت بہادر انسان ہو تم۔ ہر طرف تمہارے دشمن ہیں اور تم ہر شہر میں دندناتے پھر رہے ہو۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک تمہارے جیسے بہادر پولیس افسر سے ملانا چاہتا ہوں۔''

''ضرور ملایئے!''

''ارجن ٹھاکر ہے اس کا نام۔ ماضی نہیں معلوم۔ لیکن فطری طور پر ہندوستانی فلموں جیسا پولیس آفیسر ہے۔ پاگل، دیوانہ۔ بڑے بڑے مجرموں کو پھانسی دلوا چکا ہے۔ بھیڑیوں کی بھٹ میں گھس کر بھیڑیا نکال لاتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ اس کا نام سن کر بیمار ہو جاتے ہیں۔ بے دریغ گولیاں چلاتا ہے جس پر بڑے اعتراضات ہوئے ہیں۔ لیکن جنہیں وہ مارتا ہے وہ خود بہت سوں کو مار چکے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں اُس سے ملانا چاہتا ہوں۔''

''بہتر ہے۔''

''بہادر انسان صاحب ظرف ہوتے ہیں۔ ایشور چندر کے اہل خاندان تمہیں دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔ حالانکہ وہ ان کا گھر تھا۔ انہیں اس کا خیال رکھنا تھا کہ تم ایک معتبر شخصیت کے ساتھ ایک مہمان کی حیثیت سے آئے ہو، لیکن خیر۔ تو مجھے امید ہے کہ ارجن ٹھاکر تمہیں پہچان بھی جائے گا تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔''

''جی۔!'' میں نے پھر اسی مختصر انداز میں کہا۔

''یہ بھی نہیں پوچھو گے کہ میں تمہیں اُس سے کیوں ملانا چاہتا ہوں۔'' شکلا نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں۔!''

''اچھا چھوڑو۔ میں نے تم سے کہا کہ میں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن میں نے اس کی شخصیت کی تفصیل تمہیں بتا دی۔ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ مجھ سے اپنی بہن کی علالت کے بارے میں ملا تھا، میں نے اس بچی کا کافی علاج کیا۔ لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔ وہ اسے ممبئی، دہلی اور دوسرے شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھا چکا ہے۔ غیر ملکی ڈاکٹروں کے جو وفود یہاں آتے ہیں وہ انہیں بھی دکھا چکا ہے۔ انہوں نے اس کا ٹریٹ منٹ بھی کیا تھا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''کوئی ناقابلِ فہم بیماری ہے۔''

''نہیں۔'' شکلا نے کہا اور میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ہاں! بیماری ناقابل فہم نہیں ہے لیکن اس کا صحیح علاج نہیں ہو پا رہا۔''

''براہ کرم تفصیل بتایئے۔''

''غیر اخلاقی عمل تو نہیں ہے۔ تم مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں یہ کہانیاں لے بیٹھا۔''

''نہیں۔ یہی کہانیاں ہماری زندگی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ میری بدنصیبی نے مجھے ان سے دور کر دیا ہے۔''

ڈاکٹر شکلا نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن میں نے ان کی آنکھوں میں دکھ کا تاثر ضرور دیکھ لیا تھا۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''غیر شادی شدہ ہے۔ دنیا میں صرف ایک بہن ہے، اس کے لیے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھائی کے دل میں، بہن کے لیے اتنا پیار میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بہن کی وجہ سے اس نے خود شادی نہیں کی لیکن آگرے ہی کی ایک فیملی میں اس نے بہن کی شادی کر دی۔ ابتدا بہت اچھی رہی لیکن پھر بہن کے دیور کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا۔ پولیس نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ نوجوان لڑکا تھا جذبات میں آ کر یہ عمل کر بیٹھا تھا۔ بہن کے سسرال والوں نے پاؤں پکڑ لیے کہ کسی طرح ارجن اس نوجوان کو بچا لے۔ بہن نے بھی بھائی کی بہت خوشامد کی، ارجن نے بڑی کوشش کی لیکن نوجوان کے خلاف عینی شہادتیں موجود تھیں، وہ اسے نہ بچا سکا۔ بہن کے سسرال والوں نے کہا کہ ارجن اسے فرار کرا دے، لیکن یہ عمل ممکن نہیں ہو سکا، اور اسے سزائے موت ہو گئی۔ سسرال والے ارجن اور اس کی بہن کے دشمن بن گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ارجن نے تعاون نہیں کیا۔ ورنہ پولیس کیا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے دشا کو شدید اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ بہن نے یہ بات بھائی سے چھپائی لیکن پھر انہوں نے دشا کو سانپ سے کٹوا کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے ایک سپیرے کی خدمات حاصل کی تھیں۔ گھر کی ایک نوکرانی نے یہ بات ارجن کے گھر جا کر بتا دی۔ ارجن پاگل ہو گیا۔ وہ لوگ ارجن کے مزاج کو جانتے تھے اور انہیں پتا تھا کہ ارجن ایک ایک کو بھون دے گا۔ چنانچہ سارے گھر والے سب کچھ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ نوکرانی ارجن کے گھر گئی ہے۔ دشا، ارجن کو وہیں اکیلی ملی۔ وہ بے ہوش تھی۔ ارجن بہن کو اسپتال لے گیا جہاں اس کی زبردست دیکھ بھال کی گئی۔ اس سے وہ موت کے منہ میں جانے سے تو بچ گئی لیکن اب وہ ایک انوکھی مشکل میں گرفتار ہے۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے بدن میں اچانک کسی بھی جگہ سوراخ ہوتا ہے اور اس سے سبز پانی نکلنے لگتا ہے۔ یہ سبز پانی بہہ کر جسم کے جس حصے پر لگتا ہے، وہاں بقول لڑکی کے اتنی شدید جلن ہوتی ہے جو برداشت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کسی نامانوس سانپ کا زہر اس کے خون میں شامل ہے جس کا علاج دریافت نہیں ہو سکا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ارجن دیوانہ ہو چکا ہے۔ اس نے پورے ہندوستان کی پولیس کے لیے احکامات حاصل کر لیے ہیں کہ دشا کے سسرال والوں کا سراغ لگائیں۔ اس کے علاوہ اس نے سپیروں پر جہنم کے دہانے کھول دیئے ہیں، اسے اس سپیرے کی تلاش ہے جس نے پیسے لے کر یہ کام کیا۔ کئی سپیرے اس کے تشدد سے مرتے مرتے بچے ہیں۔ دوسرے پولیس افسران نے انہیں ارجن کی دیوانگی سے بچایا ہے۔ ورنہ وہ مر جاتے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ آس پاس کے سپیرے اپنے ڈیرے چھوڑ کر آگرے سے میلوں دور بھاگ گئے ہیں۔''

''آپ نے اسے چیک کیا؟''

''بیس دن یہاں رہ کر گئی ہے۔ ہر طرح سے اس کا خون اور دوسری چیزوں کا ٹیسٹ کیا ہے مگر زہر کی قسم کا پتا نہیں چلتا۔''

''آپ نے اسے......'' میں نے ڈاکٹر شکلا سے ان انجکشنوں کے نام لیے جو جدید ترین ہیں۔ ''وہ انجکشن دیئے۔''

''ہاں...... سب کچھ کر چکا ہوں۔''

''گڈ۔'' میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دکھ بھری کہانی ہے۔''

''دیکھو گے اسے؟''

''جو آپ کا حکم۔''

''کل دوپہر کو چلیں گے۔ میں اسے فون کر کے کہوں گا کہ میں دشا کو دیکھنے آ رہا ہوں، وہ گھر پر ملے۔''

''کل کے لیے وقت بتا دیجیے۔ میں......''

''یہ بھی کہو گے۔ یہ گھر نہیں ہے۔'' شکلا نے اتنی اپنائیت سے کہا کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر میں نے اور کچھ نہیں کہا۔ میرے لیے آرام کا بندوبست کر دیا گیا۔ دوسرے دن دو بجے کا وقت طے ہوا تھا۔ میں ڈاکٹر شکلا کے ساتھ چل پڑا۔

ارجن ٹھاکر نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ چونکا۔ میرا ہاتھ، ہاتھ میں لیے رکا رہا۔ پھر ڈاکٹر شکلا کی طرف دیکھا، پھر بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''ڈاکٹر کامران!''

''ہیلو۔'' میں نے پروقار لہجے میں کہا۔

''آیئے۔'' اس نے کہا اور ہم دونوں اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ اس نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر حسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے میری دشا کو جیون ملنے والا ہے۔ بھگوان نے میری سن لی۔'' یہ کہہ کر وہ رو پڑا۔ شکلا نے بھی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ میں خاموشی سے دونوں کو دیکھتا رہا۔

''تم ایک بڑے انسان ہو ارجن ٹھاکر۔''

''میں انسان نہیں۔ صرف ایک بھائی ہوں۔ اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ صاف کہہ رہا ہوں۔ سنیں گے بھائی کی دکھی کہانی۔ پتا جی پولیس افسر تھے، میں تھا، دشا تھی، ماتا جی تھیں۔ ماتا جی مر گئیں، پتا جی نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں نے سوتیلے پن کی ریت نبھائی۔ بڑے ظلم کیے ہم بہن بھائی پر۔ دشا کے سوا میرے سنسار میں اور کوئی نہیں تھا۔ پھر پتا جی ڈاکوؤں کی گولیوں سے ہلاک ہو گئے۔ ماتا جی نے سب کچھ اپنے قبضے میں کر لیا اور ہم دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ میں اتنا تھا آشرم جانا چاہتا تھا کہ ایک کانسٹیبل امرناتھ نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور ہمیں اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ میں کبھی اس پر بوجھ نہیں بنا۔ میں نے اپنا اور اپنی دشا کا بوجھ خود اٹھایا۔ پڑھتا بھی تھا اور کام بھی کرتا تھا۔ جوان ہو گیا۔ امرناتھ نے بڑے افسر کو میرے پتا کے بارے میں بتایا اور ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر مجھے پولیس میں بھرتی کر لیا گیا۔ بچپن سے ظلم کی چکی میں پسا تھا، دماغ میں خرابی تھی۔ بس ترقی کرتا گیا۔ باقی کہانی شکلا جی نے ضرور بتا دی ہو گی۔ کیا پئیں گے۔''

اُس کے اِس اچانک اور بے تکے سوال پر مجھے ہنسی آئی لیکن میں نے اس پر قابو رکھا۔ ''میں ابھی آیا۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ ڈاکٹر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا تھا۔

''تم نے اس کے کرب کو محسوس کیا؟'' شکلا نے پوچھا۔

''اور اس کے پیار کو بھی۔ وہ اپنا فرض بھول گیا ہے۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

''انسان بہت کمزور ہوتا ہے کامران۔ اور پھر وہ ٹھاکر ہے۔ میں یہ بھی بتا چکا ہوں تمہیں کہ وہ بے حد بہادر ہے۔ بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں اس نے۔ بہادر شکار کو گھیر کر للکار کر مارتے ہیں۔ اپنے گھر کے دروازے پر نہیں۔'' شکلا نے شاید میری بات کا برا مانا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ ہمیں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ ایک ٹرے لے کر اندر آیا تھا جس پر رکھے برتنوں میں پھل اور بسکٹ وغیرہ موجود تھے اور ساتھ میں جگ میں فریش جوس۔

''ہم بہن بھائی ملازموں کے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ ملازم صرف گھر کے کاموں کے لیے رکھتے تھے۔''

''آپ آئندہ بھی مل کر گھر کے کھانے اپنے ہاتھوں سے تیار کریں گے ان شاء اللہ۔'' میں نے خلوص سے کہا۔

اس کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔ اس نے ٹشو سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔ ''میں ہندو ہوں، مگر مجھے ان شاء اللہ کے معنی معلوم ہیں۔ لیجیے ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے ڈرائی فروٹس کی تھالی میری طرف بڑھا دی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا۔ ''دشا کو دیکھ سکتا ہوں۔''

''آیئے ڈاکٹر صاحب!'' ارجن نے بھاری آواز میں کہا۔ اور ہم تینوں اندر چل پڑے۔ اندر ایک کمرے میں دشا بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیاری سی شکل کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں والی۔ ہوش میں تھی اور کرب کا شکار تھی۔

شکلا کو دیکھ کر بولی۔ ''انکل جی۔ انکل جی۔ میں ٹھیک کیوں نہیں ہوتی۔ کیا میرا کوئی علاج نہیں ہے۔ انکل جی۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ انکل جی۔ مجھے مار دیں۔ اب مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر انکل۔ بھگوان کے لیے مجھے مار دیں۔''

''اور۔ مجھے بھی۔'' ارجن ٹھاکر نے کہا۔

میرا دل بھر آیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور تمہیں ان شاء اللہ کے معنی معلوم ہیں ارجن۔''

وہ چونک پڑا۔ کچھ لمحے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی آس سے مسکرا دیا۔ اور دشا کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''تُو ٹھیک ہو جائے گی دشا۔ تُو اب ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ دشا میری بٹی، تُو ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔''

بڑا غم انگیز ماحول ہو گیا تھا۔ دشا خاموشی سے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ حیران تھی شاید۔ جس دلیر انسپکٹر کو ہمیشہ آگ کی زبان میں بات کرتے دیکھتی تھی، اس کی آنکھیں پانی برسا رہی تھیں۔

''بڑا درد ہوتا ہے ڈاکٹر انکل۔ برداشت نہیں ہوتا۔'' کچھ دیر کے بعد دشا نے پھر کہا۔ شکلا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے شکلا سے کہا۔ ''میں دیکھ لوں؟''

''ہاں۔'' شکلا بولا۔ اور میں دشا کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کے کندھے، گردن وغیرہ پر زخموں کے وہ نشان دیکھے۔ دونوں نظریے ذہن میں رکھے تھے۔ یہ بھی کہ کہیں یہ کوئی جادوئی اثر نہ ہو اور زہر تو ذہن میں تھا ہی۔ میں دنیا بھر کے مختلف علاقوں کے سانپوں کے زہر کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا جن کے اثرات حیرت انگیز ہوتے تھے لیکن بہت زیادہ نہیں جانتا تھا۔ تھوڑی دیر تک دشا کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''انہیں اسپتال لے چلیں ڈاکٹر شکلا۔''

شکلا نے میری بات کے جواب میں ارجن کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ضرور ڈاکٹر جی۔''

''ٹھیک ہے۔ تمہیں تکلیف ہو گی۔ ان کے کچھ کپڑے اور ضرورت کی چیزیں پیک کرا دو۔ میں اسپتال فون کر کے ایمبولینس منگا دیتا ہوں۔'' ارجن نے گردن ہلا دی۔ شکلا اسپتال فون کرنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے ارجن سے کہا۔ ''ہم لوگ چلتے ہیں۔ اسپتال میں تمہارا انتظار کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسے لا رہا ہوں اور ڈاکٹر کامران۔'' وہ رکا، پھر بولا۔ ''کسی طرح کی چنتا مت کرنا۔'' میں بس مسکرا دیا تھا۔

کلینک پہنچ کر شکلا نے دشا کے لیے کمرے کا بندوبست کیا۔ ایک نرس اس کے لیے مخصوص کی۔ میرے لیے بھی اسپتال کی اوپری منزل پر کمرہ مخصوص کر دیا گیا۔ پھر دشا کا انتظار کیا جانے لگا۔ دشا آ گئی اور اسے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ارجن کو اطمینان دلایا گیا کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے۔ یہاں کی فکر نہ کرے۔ ارجن کے جانے کے بعد میں اور شکلا، دشا کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دشا کے کمرے میں جا کر میں نے دوبارہ اس کا معائنہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ بھی ڈاکٹر ہیں انکل؟''

''ہاں دشا!''

''کیا یہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں؟'' اس نے معصوم لہجے میں پوچھا۔ شکلا مسکرا دیا، پھر بولا۔ ''یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''بھیا نے بڑے مان سے کہا تھا۔ لگتا ہے میری دشا کو جیون ملنے والا ہے۔ بھگوان نے میری سن لی۔ ایسا اُنہوں نے انہیں دیکھ کر ہی کہا تھا۔''

''یہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔''

''چھوٹے سے تو ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ بڑی پیاری مسکراہٹ تھی اُس کی۔ پھر اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ ''میرے جیون کی تو بھگوان جانے، پر بھگوان انہیں لمبا جیون دے۔ ڈاکٹر بھیا ایک بنتی کروں تم سے؟'' اس نے یہ الفاظ مجھے مخاطب کر کے کہے تھے۔

''ہاں دشا۔ کہو۔''

''ارجن بھیا سے مت کہنا۔ مجھے لگتا ہے میں ٹھیک نہیں ہوں گی۔ مجھ پر دیا کرو۔ مجھے مار دو، میں جو کرب برداشت کر رہی ہوں، اب مجھ سے نہیں ہوتا۔ مجھ پر دیا کرو۔''

''اور مجھے لگتا ہے تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

اس کے بعد ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں نے اس کے کئی ٹیسٹ تجویز کیے۔ شکلا نے خود اپنی لیب میں یہ ٹیسٹ کر کے مجھے رپورٹ دی۔ اس کی روشنی میں، کچھ نئی دوائیں تجویز کی گئیں اور دشا کو استعمال کرائی جانے لگیں۔

لیکن دو دن گزر گئے، کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ دشا کے بدن میں جب کوئی نیا سوراخ نمودار ہوتا تو اس پر ہذیان طاری ہو جاتا۔ وہ چیختی۔ ''مار دو۔ آہ مجھے مار دو۔ زہر دے دو مجھے آہ۔ نسیں کاٹ دو میری۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ زہر دے دو مجھے بھگوان کے لیے، مجھے زہر دے دو۔'' میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اب تو ارجن کو تسلیاں دیتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دشا سو رہی تھی۔ نرس ساوتری کسی کام سے گئی تھی۔ پورے اسپتال میں گرمی کی وجہ سے سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ شکلا سرکاری اسپتال میں تھا اور میں دشا سے کچھ فاصلے پر کرسی ڈالے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر مدھم سی آہٹ ہوئی۔ دروازہ اس طرح نوک کیا گیا جیسے اندر آنے کی اجازت مانگی جاتی ہے۔

''آ جاؤ۔'' میں نے یہ سوچ کر کہ ساوتری ہو گی کہا۔ اور کوئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا، لیکن اسے دیکھ کر میرے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ وہ بھوریا چرن تھا۔ سوکھا سڑا، دبلا پتلا ڈھانچے نما انسان۔ باریک کُرتے سے اس کی پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دھوتی سے سوکھی تیلیوں جیسی ٹانگیں لیکن چہرے پر وہی مکروہ مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہی غضب کی چمک۔

''جے میا کالی۔ میاں جی کیسے ہو۔''

''تم یہاں کیوں آ مرے بھوریا چرن؟'' میں نے غصے سے کہا۔ وہ ہنس پڑا۔ ''لو بھیا کی باتیں۔ ارے ای سنسار ہمار رہے۔ ای دیس بھی کالی مہارانی کا رہے۔ ہم کہاں نا ہیں جا سکت ہیں۔ بات کرت ہو۔ پاگلن کی۔''

''کیسے آئے ہو؟''

''دروجے سے۔ اور کیسے۔'' اس نے مذاق کیا اور ہنس پڑا۔ پھر آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تم سے بات کرن کو من چات تھا۔ سو آ گئے۔''

''بات کرو۔'' میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''دوستی کا ہاتھ بڑھانے آئے ہیں۔ ای سچ رہے کہ تُو اپنے پتا مسعود سے جیادہ بکٹ رہے۔ اوسے ہماری لڑائی بڑی رہی۔ اس نے بھی ہم پر بڑے وار کرے اور ہم نے بھی۔ پر انتا برا اس نے ہمارے ساتھ نا کرا جتنا تے نے۔ سسر ہاتھ پاؤں ہی توڑ ڈالے۔ پر ہمارا بھی جگرا دیکھ۔ پھر تو سے دوستی کرنے آ گئے۔''

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہمار کام کر دے پوت۔ تو ہار کچھ نا بگڑے گا۔ ہماری جیون بھر کی منوکامنا پوری ہو جاوے گی۔ تو بھی عیس کرے گا۔ جد کرنے سے کوئی فائدہ نا ہیں۔''

''بہت دور کی بات ہے بھوریا چرن۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔''

''تو بھی مارا مارا پھرے گا اور ہم۔ ہم تو دیکھ لے کشٹ سے نکل آئے۔ پر تو ہے کچھ نا ملے گا اس جد سے۔ تُو تو ہماری جرورت رہے اس لیے تیرا جیتا رہنا جروری ہے۔ پر او سسر ٹھور مر جائیں گے جن کے جیون سے تجھے پریم ہو گا۔''

''ہم مسلمانوں کا ایمان ہے بھوریا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر پوری دنیا مل کر بھی چاہے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر کھیل سروع۔ تھک جائے تو بتا دیجیو۔ جھگڑا کھتم کر دیں گے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک گیا۔ جہاں رک کر مجھے دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔

میں خاموشی سے دروازے کو دیکھتا رہا۔ کمبخت کی باتیں بے حد پریشان کن تھیں لیکن مجھے کوئی تشویش نہیں تھی بس ڈاکٹر شکلا کا خیال تھا، میری وجہ سے وہ مشکل میں گرفتار نہ ہو جائے۔ لیکن مجبوری تھی۔ کیا کرتا۔

اس واقعے کو دو دن گزر گئے۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ البتہ میں ذہنی طور پر منتشر رہا تھا۔ اس دوران دشا کے سلسلے میں بھی پریشانی رہی تھی۔ مجھے اس کی اندرونی کیفیت جاننے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ پتا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے اور میں اپنے علم کے مطابق اسے ایسی دوائیں اور انجکشن دے رہا تھا جو زہر کا توڑ ہوتے ہیں۔ شکلا بھی اس سے متفق تھا۔ لیکن دشا کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ ویسی ہی تھی اور ارجن بدستور غمزدہ تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ میں کلینک کی اوپری منزل میں رہتا تھا اور میں نے اپنے طور پر اپنے کام کا طریقہ متعین کر لیا تھا۔ ناشتہ وغیرہ میں اپنے کمرے میں ہی کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا کہ دروازہ آہستہ سے بجا۔ برتن اٹھانے والے کو آنا تھا۔ اس کے خیال سے میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی لیکن اندر آنے والا بھوریا چرن تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''جے کال کندھیری۔ کیسے ہو؟''

''کیوں آئے ہو؟''

''پہلا پتھر پھینک دئی ہے۔ بڑا انتجار کیا۔ پر تم کچھ بولتے ہی نہیں ہو۔'' وہ منحوس آواز میں بولا۔ اور میں چونک پڑا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔

''او تو ہار سسریا گجر گئی۔''

''کون؟''

''ارے اوہی۔ ارجن واری۔ کہتی تھی نا کہ موہے مار دو۔ موہے مار دو۔''

''دشا!'' میرے حلق سے آواز نکلی۔

بھوریا چرن ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''جہر کا ٹیکہ لگوا دئی ہم اوکا۔ سدھار گئی پر لوک۔ اب ٹھیک کر لو اسے۔ ہاہاہا۔'' وہ ہنسا لیکن مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔

''کتے کے بچے۔ تُو نے دشا کو مار دیا۔'' میں اس پر لپکا اور وہ گھبرا گیا۔

میں اس پر جا پڑا تھا، میں نے اسے ایک زوردار لات ماری اور وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ مگر دوسرے لمحے اس نے کروٹ بدلی اور دیوار سے چپک گیا، پھر دیوار پر چڑھنے لگا اور اس کا بدن چھوٹا ہوتا گیا اور چھت تک پہنچتے پہنچتے وہ صرف دو انچ کا بدنما مکڑا بن گیا۔ لیکن میں خونخوار ہو گیا تھا۔ میں نے زمین پر پڑا ہوا جوتا اٹھایا اور پوری قوت سے اس پر پھینک مارا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ میں نے دوسرا جوتا اٹھایا لیکن اس دوران وہ برق رفتاری سے چھت پر دوڑتا ہوا ایک روشندان کے رخنے میں گھس کر باہر نکل گیا۔

میرے بدن میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے دشا کو مار دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ بدن میں لرزش تھی۔ کمبخت نے ایسا وار کیا تھا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ بمشکل سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچا تو ڈاکٹر شکلا نظر آئے۔ اس وقت وہ تھوڑی دیر کے لیے یہاں آتے تھے اور گشت کر کے مریضوں کی خیریت معلوم کر کے سرکاری اسپتال چلے جاتے تھے۔ نرس ساوتری ان کے سامنے پریشان کھڑی تھی۔

ڈاکٹر شکلا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولے۔ ''جلدی آؤ کامران۔ دیکھو یہ ساوتری پاگل ہو گئی ہے۔ کیا بک رہی ہے، اس سے پوچھو۔ او مائی گاڈ۔''

''کیا ہوا سر؟'' میں نے قریب جا کر پوچھا۔

ڈاکٹر شکلا نے ایک خالی وائل مجھے دکھایا اور بولے۔ ''اس نے یہ انجکشن دشا کو لگایا ہے۔ اور ایک عجیب کہانی سنا رہی ہے۔'' میں نے سہمی ہوئی نظروں سے وائل کو دیکھا۔ یہ انتہائی مہلک زہر کا انجکشن تھا۔ اتنا طاقتور اور بھیانک کہ ایک طاقتور گھوڑے کو بھی لگا دیا جائے تو وہ ہلاک ہو جائے۔

میں کیا جواب دیتا۔ مجھے تو انجکشن کی کہانی معلوم تھی۔ ڈاکٹر شکلا نے کہا۔ ''اوپر سے یہ ایک عجیب کہانی سنا رہی ہے۔ جانتے ہو کیا کہہ رہی ہے یہ۔''

میں سوالیہ نظروں سے شکلا کو دیکھنے لگا۔

(جاری ہے)

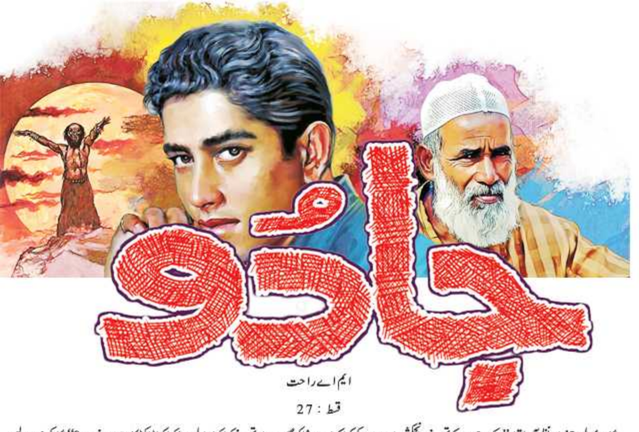

ایم اے راحت

قسط : 27

شکلا بری طرح نروس نظر آ رہا تھا۔ ’’یہ کہہ رہی ہے کہ تم نے یہ انجکشن اسے دے کر کہا کہ اسے دشا کو لگا دے، اور تم نے کیا کیا۔ بول، بتا کیا کہا ڈاکٹر کامران نے......؟‘‘ شکلا کرخت لہجے میں ساوتری نرس سے مخاطب تھا۔

’’ہم نردوش ہیں بڑے ڈاکٹر صاحب! آپ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ کامران صاحب کا ہر حکم مانیں۔‘‘ ساوتری نے کہا۔

’’جو مجھے بتایا ہے تم نے، وہ بتاؤ۔‘‘

’’رات کو ڈاکٹر صاحب نے دشا دیوی کا معائنہ کیا اور مایوسی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ اس سمے بھی دشا جی تکلیف سے کراہ کراہ کر کہہ رہی تھیں کہ مجھے مار دو ڈاکٹر! بھگوان کے لیے مجھے مار دو، مجھے زہر کا ٹیکہ لگا دو، میں جینا نہیں چاہتی، مجھے بڑی تکلیف ہے، ڈاکٹر صاحب بہت دکھی ہو گئے تھے، پھر وہ اوپر چلے گئے، میں ڈیوٹی روم میں آ گئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے اور مجھے یہ انجکشن دے کر کہا کہ میں اسے دشا دیوی کے لگا دوں۔ سر! مجھے اس انجکشن کے بارے میں معلوم تھا مگر مجھے حکم ماننا تھا، میں نے انجکشن لگا دیا لیکن بھگوان کی سوگند ایک لمحے کے لیے مجھے سکون نہیں آیا، میں رات بھر بے کل رہی، اگر میں آپ کو فون کرتی تو یہ ڈاکٹر کامران کے خلاف بات ہوتی، میں جانتی تھی کہ آپ کامران جی کا کتنا سمان کرتے ہیں، میری ہمت نہیں پڑی مگر میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔‘‘

نرس رونے لگی۔ میں سناٹے کے عالم میں تھا۔ بھوریا چرن مجھے سب کچھ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے آخری بار دشا کو چیک کیا تھا، وہ اس وقت بھی بڑی تکلیف میں تھی اور وہی الفاظ کہہ رہی تھی جو ساوتری نے بتائے تھے۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ میں نہیں تھا جس نے ساوتری کو یہ حکم دیا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھوریا چرن یا اس کا کوئی بیر ہو گا جو میری شکل میں ساوتری کے پاس گیا ہو گا۔ یہ اُس کے لیے کیا مشکل تھا۔

’’اس کے بعد تم اس کے کمرے میں گئیں ساوتری......؟‘‘ میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

’’نہیں ڈاکٹر جی! ہماری ہمت نہیں پڑی۔‘‘

’’آیئے ڈاکٹر شکلا!‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔ کیا کر سکتا تھا۔ بھوریا چرن مجھے بتا چکا تھا کہ اس نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب میرے پاس کرنے کو کیا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا، برا ہوا تھا، برا ہو گیا تھا۔ دشا مر گئی تھی اور ایک بھائی......!

ہم کمرے میں داخل ہو گئے لیکن دوسرا لمحہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ دشا بیڈ پر بیٹھی تھی۔ ہماری آہٹ سن کر وہ جلدی سے بیڈ سے نیچے اتر آئی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

’’میں ٹھیک ہو گئی انکل جی! میں ٹھیک ہو گئی ڈاکٹر جی! دیکھو سارے زخم سوکھ گئے...... رات، رات میں چمتکار ہو گیا، دیکھیں دیکھیں!‘‘ وہ جوش میں اپنے بدن کے کھلے حصے دکھانے لگی۔

ہمیں سکتہ ہو گیا تھا۔ کچھ لمحے ہم دونوں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے تھے پھر ڈاکٹر شکلا نے آگے بڑھ کر اس کے کھلے بازو دیکھے، دیکھتا رہا، پھر بھاری لہجے میں بولا۔ ’’بدن کے دوسرے حصوں کا کیا حال ہے؟‘‘

’’سب ٹھیک ہو گئے، میں واش روم جا کر دیکھ چکی ہوں، مجھے یوں لگتا ہے جیسے اب مجھے کمزوری بھی نہیں ورنہ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا تھا، میں ٹھیک ہو گئی ہوں انکل جی!‘‘ وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

میں نے اور شکلا نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ میری نگاہ شکلا کی طرف اٹھی تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اتنی عقیدت تھی اس کی آنکھوں میں جیسے وہ کسی دیوتا کے سامنے کھڑا ہو۔

اسی وقت دشا کی آواز دوبارہ ابھری۔ ’’میرے بھیا کو بتا دیا کہ میں ٹھیک ہو گئی؟‘‘

’’نہیں!‘‘ شکلا نے کہا۔

’’میں بتا دوں......؟ میں بتاؤں گی۔‘‘ وہ لاڈ سے بولی۔ پھر کہنے لگی۔ ’’مجھے موبائل فون چاہیے مل سکتا ہے، سسٹر! کیا آپ کے پاس ہے؟‘‘

’’ہاں! ہے۔‘‘ ساوتری نے جھجک کر کہا۔

’’آپ مجھے دیں گی پلیز......؟‘‘

’’آؤ!‘‘ شکلا نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

’’سیل دے دوں سر......؟‘‘ ساوتری نے پوچھا۔

’’ہاں۔‘‘ میں نے جواب دیا اور شکلا کے پیچھے باہر نکل گیا۔ شکلا اپنے آفس کی طرف جا رہا تھا۔ آفس میں پہنچ کر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’بھگوان کی سوگند! اب من نہیں مانتا، بتا دو انسان ہو بھی یا نہیں! مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔‘‘

’’کیا......؟‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ حال میرا بھی خراب تھا۔ کیا ہوا، کیسے ہوا، میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا۔ ڈاکٹر شکلا مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گیا۔

’’پہلے آئے تھے ان ماں، بیٹوں کی جنت بنا کر چلے گئے، جیسے بھگوان نے سورگ سے بھجا ہوان کے لیے، اب اچانک آئے اور یہ کر ڈالا۔ سچ بتاؤں میرے ہاتھوں کے تو طوطے اڑ گئے تھے، میں نے سوچا تھا کچھ دن پہلے کہ یہ تجربہ کروں مگر ہمت نہیں کر سکا، ارجن ٹھاکر کا آدھا جیون بہن میں ہے، میرے کلینک میں اگر اسے کچھ ہو جاتا تو نہ جانے اس کا کیا ردعمل ہوتا، تم نے جتنی جرأت سے اُس پر یہ زہر آزما ڈالا، وہ تمہارے ہی جگر کی بات ہے، یہ زہر تو ہاتھی کو بھی گلا دے مگر کام ہو گیا، دشا کے بدن کا اس سے کہیں زیادہ خطرناک زہر مل گیا اور وہ تریاق بن گیا، وہ ٹھیک ہو گئی۔‘‘

میرے دماغ میں بجلی کوندگئی۔ ’’زہر کو زہر مار دیتا ہے۔‘‘ کے فارمولے سے میں بھی واقف تھا۔ میرے ذہن میں بیشک ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی لیکن آ بھی جاتی تو میں بھی اتنی بڑی جرأت کبھی نہ کر پاتا۔ خیر وقت ہی تقدیر ہے اور وقت کا فیصلہ دشا کی زندگی کے لیے تھا، سو اسے زندگی مل گئی۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔

بھوریا چرن نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اس زہر کی نوعیت کیا ہے۔ جس کا انجکشن اس نے اپنے بیر سے منگوا کر ڈرامہ کیا اور میری شکل میں نرس کو یہ انجکشن دشا کو لگانے کی ہدایت کی۔ اپنی دانست میں اس نے دشا کو موت کے گھاٹ اتار کر مجھے چوٹ دی مگر اس کی یہ حرکت دشا کی زندگی بن گئی۔ یہی ہونا تھا اور اس کا سارا کریڈٹ مجھے مل گیا۔

میں دشا کی زندگی کا سہرا اپنے سر نہیں باندھنا چاہتا تھا لیکن کیا کرتا، بھوریا چرن کی کہانی تو کسی کو نہیں سنا سکتا تھا، خاموشی کے سوا چارہ کیا تھا، البتہ ایک پریشانی لاحق ہو گئی۔ اس طرح تو بھوریا چرن کہیں بھی میری شکل اختیار کر کے کوئی بھی واردات میرے نام سے کر سکتا تھا۔ شکلا بڑی عقیدت سے میری صورت دیکھ رہا تھا۔ شکر ہے اس نے یہ نہیں پوچھا کہ زہر کا یہ انجکشن میرے پاس کہاں سے آیا۔

’’میں بہت خوش ہوں کامران! میرا دل چاہتا ہے کہ پورے آگرے میں ڈھنڈی پٹوا دوں کہ ایک مسیحا آکاش سے اترا ہے، آؤ اور نیا جیون حاصل کر لو۔‘‘

میں ہنس پڑا۔ شکلا نے چونک کر مجھے دیکھا پھر خود بھی مسکرا کر پوچھا۔ ’’ہنسے کیوں......؟‘‘

’’میں سوچ رہا تھا کہ جب آپ ڈھنڈی پٹوائیں گے تو سب سے پہلے نیا جیون حاصل کرنے کون آئے گا، جانتے ہیں؟‘‘

’’کون......؟‘‘ شکلا حیرت سے بولا۔

’’پولیس کمشنر سریش چندر!‘‘ میں نے کہا اور شکلا میری بات پر خوب ہنسا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر میں شکلا کو بتا بھی دوں کہ دشا کو انجکشن دینے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گا۔ خاموشی میں بہتری تھی۔

پھر حیرت کا دوسرا لمحہ وہ تھا جب اچانک آفس کا دروازہ کھلا اور دشا اور ارجن ٹھاکر اندر گھس آئے۔ ارجن کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں بھی سرخ اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اندر آتے ہی وہ شکلا کے پیروں سے لپٹ گیا۔

’’کیا کہوں، کیا دوں آپ کو......! آپ نے مجھے میری دشا دیدی...... آپ...... آپ!‘‘

’’غلط کر رہے ہو ارجن! جس کا حق ہے، اسے نہیں دے رہے، میں تو پہلے ہی ہاتھ کھڑے کر چکا تھا...... دشا جس طرح اس سمے تمہارے ساتھ کھڑی ہے، اس کا کارن کامران ہے۔‘‘ ارجن کھڑا ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مجھ پر جھپٹنے والا ہے۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ’’اور میں نے کہا تھا کہ شاید بھگوان نے دشا کو جیون دینا ہے، یہ میں نے آپ کو دیکھ کر کہا تھا۔‘‘

’’اور میں نے کہا تھا کہ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘

’’اور میں نے کہا تھا کہ مجھے ان شاء اللہ کے معنی معلوم ہیں۔‘‘ ارجن نے کہا اور آگے بڑھ کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔

’’کیسی ہو دشا......؟‘‘ میں نے دشا سے پوچھا۔

’’میں بیار ہی کب ہوئی تھی؟‘‘ دشا ہنس کر بولی۔

دونوں بیٹھ گئے۔ ارجن خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ’’میں اسے ساتھ لے جاؤں؟‘‘

’’کیوں ڈاکٹر کامران......؟‘‘

’’نہیں! کچھ وقت رہنے دیں ارجن جی! یہ میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں، ان کی فزیکل فٹنس کا بھی جائزہ لینا ہو گا، بس دو ایک دن!‘‘ ارجن فوراً مان گیا تھا۔

بعد میں میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ بھوریا چرن کو بدترین شکست ہوئی تھی، اپنی دانست میں اس نے میرے دل پر چرکہ لگانے کے لیے بہت بڑا قدم اٹھایا تھا لیکن قربان جاؤں اس تخلیق کنندہ کے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی مخلوق کو محفوظ رکھے، آگ کو گلزار بنا دے۔ اُس نے اسی زہر سے دشا کو زندگی عطا کی۔ یہ اس کی عطا کا ایسا اظہار تھا کہ کافر کو مسلمان بنا دے۔ زہر کو زہر مارتا ہے، وہی زہر دشا کے لیے تریاق بن گیا۔

شیطان کو لمبی عمر دی گئی ہے، بندوں کے امتحان کے لیے ہی سہی اور بھوریا چرن شیطان کا بھیانک روپ تھا۔ میں نے دشا کو آبزرویشن میں رکھنے کے لیے روک لیا تھا لیکن اس وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے وہ دشا کا دشمن نہ بن جائے، اسے کسی دوسرے طریقے سے نقصان نہ پہنچا دے۔ اسے بیشک دشا سے کوئی دشمنی نہیں تھی، بات صرف میری تھی اور اس کا بہترین حل تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔

اچھی طرح غور کرنے کے بعد بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ کلینک چھوڑ دوں بلکہ آگرہ ہی چھوڑ دوں۔ ڈاکٹر شکلا اب میرا عقیدت مند بن گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں کوئی دھرماتما ہوں جو انسان کے بھیس میں پھر رہا ہے۔ اگر میں اسے بتا کر جانے کی کوشش کروں گا تو وہ مجھے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ اسے بتائے بغیر نکل جانا مناسب ہو گا۔ اس فیصلے کے بعد دشا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اکیلی تھی اور کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کتاب رکھ دی اور بڑے خلوص سے بولی۔ ’’آیئے بھیا جی!‘‘

’’کیسی ہے میری بہن!‘‘ میں نے بھی اسی پیار سے کہا۔

وہ بے حد خوش ہو کر بولی۔ ’’ارے آپ نے بھی مجھے بہن کہہ دیا؟‘‘

’’کیوں، نہیں کہنا تھا؟‘‘ میں نے اس کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’نہیں! میں نے تو ایک تجربہ کیا تھا۔‘‘

’’کیسا تجربہ......؟‘‘

’’بس یہ سوچا تھا کہ دیکھوں کہ بھیا جی کہنے سے آپ پر کیا ردعمل ہوتا ہے، اصل میں مجھے پہلے آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا، بعد میں ارجن بھیا نے بتایا کہ آپ پاکستان کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں جو یہاں متعصب ڈاکٹروں کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں، وہ برے لوگ آپ کی شہرت اور کامیابیوں سے جل گئے ہیں اور انہوں نے آپ کے خلاف سازشیں کر کے آپ کو مجرم بنا دیا ہے، ارجن بھیا نے مجھے بتایا ہے کہ مجھے آپ نے ٹھیک کیا ہے۔‘‘

’’یہ باتیں تمہیں ٹھاکر نے بتائی ہیں؟‘‘

’’ہاں! وہ آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔‘‘

’’کیوں......؟‘‘ میں نے چونک کر کہا۔

’’وہ آپ کو حفاظت سے پاکستان پہنچانا چاہتے ہیں۔‘‘

’’ہوں...... تم کیسی ہو؟‘‘

’’ٹھیک، ہوں، آپ کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہونے کے بعد میرا من چاہا کہ میں آپ کو بھیا کہوں، پر میں ڈرتی تھی کہ آپ کہیں برا نہ مان جائیں۔‘‘

’’بہنوں کے پیار کا بھلا کوئی برا مانتا ہے؟‘‘

’’بھگوان اچھوں کو ہی اتنا بڑا سمان دیتا ہے، آپ بہت اچھے ہیں بھیا جی!‘‘

’’اور میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں، آخر پولیس والا ہوں نا!‘‘ دروازے سے ارجن ٹھاکر کی آواز سنائی دی اور وہ بہت سے پھل اٹھائے اندر آ گیا۔

’’ارے بھیا جی! اتنا بوجھ آپ کیوں اٹھا کر لائے، کسی اردلی کو ساتھ کیوں نہیں لے لیا؟‘‘ دشا بولی۔

’’نہیں بیٹا! کسی اور کو میں یہاں نہیں لا سکتا تھا، مگر تو بڑی خوش نصیب ہے، بڑے بھاگ ہیں تیرے، تیرے دو دو بھیا ہو گئے، ایک بات کہوں کامران جی! جب تک دشا یہاں ہے، آپ بیشک یہاں رہیں، اس کے ساتھ میں آپ کو گھر لے جاؤں گا اور آپ اُس وقت تک میرے ساتھ رہیں گے جب تک میں آپ کے لیے کوئی بہتر راستہ نہ نکال لوں۔‘‘

’’بالکل ٹھیک بھیا جی!‘‘ دشا نے تائید کی۔

اسی شام پانچ بجے کے قریب میں کلینک سے نکل آیا۔ شکلا اس وقت موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنا ہلکا سا سوٹ کیس ساتھ لے لیا تھا اور بچتا بچاتا باہر نکل آیا تھا۔ یہ حقیقت ہے ایک عجیب سی بے اطمینانی میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ سڑکوں پر نکل کر مجھے ذرہ برابر خوف کا احساس نہیں ہوتا تھا حالانکہ ہر طرف دشمنوں کا بسیرا تھا۔ سریش چندر جیسا شخص یہاں موجود تھا۔ بے خیالی کے عالم میں چلا جا رہا تھا کہ ایک عجیب سی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی اور میری نظریں بھٹکنے لگیں۔ بالکل اتفاق سے میں اس علاقے میں نکل آیا تھا جہاں حکیم سرمد سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان کے بنائے ہوئے آلو کے لذیذ کباب کھائے تھے۔ دور سے حکیم صاحب نظر آ رہے تھے۔ دو تین گاہک بیٹھے ہوئے تھے اور حکیم صاحب کباب تل رہے تھے۔ میرے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے دور سے ہی مجھے دیکھ لیا۔ بنچوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ایک بنچ خالی کرائی اور کپڑے سے اسے صاف کیا۔ میں قریب پہنچا تو انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’بڑی افسردگی ہو گئی تھی عزیزم! چلو ہم میں کوئی خوبی نہیں لیکن اپنی اس تخلیق پر بڑے نازاں تھے یعنی ہمارے کباب، جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ جو ایک بار کھالے، آتا رہے گا مگر تم نے ہمارا غرور توڑ دیا۔‘‘

’’ارے نہیں حکیم صاحب! بس مصروفیت تھی جس کی بنا پر نہیں آ سکا ورنہ آپ اور آپ کے کباب دونوں کیسے بھولے جا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے ان کی صاف کی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر کہا۔

حکیم صاحب نے دوسرے گاہکوں کو فارغ کر کے میرے لیے کباب تیار کیے، پھر بولے۔ ’’کبھی کبھی احساسات انسان کو پست کر دیتے ہیں، بیشمار گاہک آتے ہیں لیکن دل کمبخت جس کی طرف مائل ہو جائے، تمہیں بہت یاد کیا۔‘‘

’’بس مصروف ہو گیا تھا۔‘‘

’’کچھ وقت لیں گے تمہارا، امید ہے انکار نہ کرو گے۔‘‘

’’حاضر ہوں، فرمایئے......؟‘‘

’’اٹھاؤ چولھوں جیسی بات نہ کرو، ہمارے ساتھ ہمارے غریب خانے چلو گے، کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارو گے، بولو منظور ہے؟‘‘

حکیم صاحب نے ایک بار پھر مجھے حیران کر دیا۔ پچھلی بار انہوں نے ہری چٹنی، سفید دہی کے ساتھ چاند تارے یعنی پاکستان کے جھنڈے کے رنگ بتائے تھے پھر گلشن مسعود اور کامرانی کی بات کی تھی اور مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکا تھا اور وہاں مصروف ہو گیا تھا لیکن اس وقت انہوں نے ایک عجیب پیشکش کی تھی، یعنی انہیں معلوم تھا کہ میں بے ٹھکانہ ہوں۔

وہ پھر دوسرے گاہکوں میں مصروف ہو گئے۔ مجھ سے انہوں نے اور کبابوں کے بارے میں پوچھا لیکن میں پہلے ہی کافی کھا چکا تھا، انکار کر دیا تو بولے۔ ’’تو پھر یہ سامان یہاں رکھ دو، ہم حفاظت کریں گے اور دریائے جمنا کی سیر کرو، دیکھو کیسی رونق ہے، ہم نے اپنے کبابوں کے ہاضمے کے لیے دریائے جمنا یہاں بہا دیا ہے، اس کے کنارے کنارے سیر کرو، بس اس آمیزے کا خاتمہ ہو جائے تو گھر چلیں گے۔‘‘

بڑا اعتماد تھا اُن کے لہجے میں! چنانچہ میں خاموش ہو گیا، پھر سامان وہاں چھوڑ کر کچھ فاصلے سے گزرتی جمنا کے کنارے پہنچ گیا۔ جہاں سیر کرنے والوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ عجیب اتفاق تھا، کچھ بھی تو تعلق نہیں تھا حکیم سرمد سے میرا، ایک کباب فروش سے کباب خریدے تھے بس...... اس کے بعد اور کچھ نہیں تھا۔ ہاں اس وقت حکیم صاحب کے کچھ الفاظ نے احساس ضرور دلایا تھا کہ ان کی شخصیت میں کوئی خاص بات ہے لیکن اس کے بعد انہیں بھول گیا تھا۔ اس وقت بالکل اتفاق سے اِدھر سے گزر ہو گیا تھا اور کباب کی خوشبو ان کے پاس لے آئی تھی۔ انہوں نے گھر لے جانے کی پیشکش کر دی تھی۔ میں نے نعرہ لگایا کہ وقت اپنے فیصلوں کے لیے آزاد ہے اور وقت سے سمجھوتہ کامیابی کی ضمانت......!

کبھی کبھی ہر عمل کے بارے میں تجسس ضرور ہوتا ہے۔ اپنے بارے میں بخوبی اندازہ تھا کہ کچھ پراسرار قوتوں نے میرے گرد احاطہ کیا ہوا ہے اور میں ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوں چنانچہ اب ہر لمحے کسی نئے ہنگامے کا انتظار رہتا تھا۔ اس وقت بھی ہر آس پاس سے گزرنے والے کو دیکھ رہا تھا کہ دیکھوں کونسی نئی بات ہوتی ہے۔ بہت وقت اسی طرح گزر گیا، پھر حکیم صاحب میرے پاس آ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ’’لگتا ہے جمنا دیوی بہت پسند آ گئیں؟‘‘

’’ارے آپ فارغ ہو گئے؟‘‘

’’زندگی سے......؟‘‘ وہ ترکی بہ ترکی بولے۔

’’نہیں! کبابوں سے۔‘‘

’’ہاں! ہو گئے، بہت بیچ لیے کباب، سارا وجود کباب ہو گیا ہے، آؤ چلیں۔‘‘ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گئے۔ میرا سامان انہوں نے اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر سامان کا بیگ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دور پر آٹو رکشہ مل گیا اور ہم چل پڑے۔ کچے پکے مکانوں کی ایک آبادی میں اتر کر حکیم سرمد نے ایک چھوٹے سے گھر کا تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا لیکن بہت صاف ستھرا گھر تھا۔ ہر چیز سے قرینہ جھلک رہا تھا۔

’’بڑی نفاست ہے یہاں!‘‘ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

’’قرض محبت ادا کرتے رہے ہیں آج تک!‘‘ حکیم صاحب بولے۔

’’سمجھا نہیں......؟‘‘

’’اہلیہ سے عشق کے بارے میں بتایا تھا۔‘‘

’’جی......!‘‘

’’بے حد نفاست پسند تھیں، ایسے ہی گھر سجا رہتا تھا، اُن کے جانے کے بعد ان کی یادوں کو سینے سے لگا رکھا تھا لیکن......!‘‘ وہ افسردگی سے خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ’’پتا نہیں ممتاز محل نے موت کے بعد شاہجہاں سے کیا کہا کہ اس نے تاج محل بنا دیا، ہم نے تو لاکھ بار کہا کہ خوابوں میں ہی آجایا کرو مگر وہاں پیروں میں مہندی لگی ہوئی ہے یا پھر بھول گئیں جنت کے مزے لیتے ہوئے اپنے سرمد کو!‘‘ حکیم صاحب کی آواز سسکی میں بدل گئی۔

میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولے۔ ’’کیا فائدہ کسی کے لیے تڑپنے سے، چھوڑ دوں گا ممتاز کے اس شہر کو!‘‘

حکیم صاحب کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان کی شخصیت کیا ہے۔ کبھی ان کی باتوں پر ہنسی آتی تھی لیکن پھر ان کی سنجیدگی کا احساس ہوتا تھا۔ ٹھیک طرح کے دنیادار انسان نظر آتے تھے۔

دوسرے دن انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بنایا۔ میرے ساتھ بہت خوش تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے بہت اچھا بنایا تھا۔ کہنے لگے۔ ’’اکثر ممتاز کے لیے خود کھانا بناتا تھا، بہت خوش ہوتی تھی، کھانا پسند آیا؟‘‘

’’بہت عمدہ ہے، آپ اپنی دکان پر کب جاتے ہیں، مجھے تیاری نہیں نظر آ رہی؟‘‘

’’وہ جو بیچتے تھے کباب دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔‘‘ وہ مسکرا کر بولے۔

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’ختم کر دیا کاروبار، ہمیں کیا کرنا ہے، تاج محل بنانا تھا مگر اب ارادہ ملتوی کر دیا، ان کے لیے کوئی کیا کرے جنہیں خوابوں میں آنا بھی گوارہ نہیں۔‘‘

حکیم صاحب اپنے کام پر نہیں گئے، دوسرے دن بھی نہیں! تیسرے دن وہ بولے۔ ’’مجھے ایک بات بتاؤ کامران! تم کنویں کے مینڈک کیوں بنے ہوئے ہو؟‘‘

’’میں نہیں سمجھا!‘‘

’’دِلی، آگرہ، بریلی، چندوسی، ہندوستان اتنا چھوٹا تو نہیں ہے، بے پناہ وسیع ہے...... لکھنؤ، کانپور، بنارس، بمبئی، کلکتہ گھومو، پہاڑی مقامات کی سیر کرو، ہر جگہ حسن ہی حسن بکھرا ہوا ہے اسے دیکھو۔‘‘

میں پھر حیران ہو گیا تھا۔ بڑے پتے کی بات کہی تھی انہوں نے، واقعی ہندوستان بہت بڑا ہے اور مجھ پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ زندگی موت کا تو تصور ہی چھوڑ دیا تھا۔ بھوریا چرن میرے ساتھ کیا کرے گا، اس کا بھی کوئی خوف نہیں تھا، پھر یہیں کیوں چکرا رہا ہوں، کہیں اور نکلوں لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ حکیم سرمد نے انہی جگہوں کے نام لیے تھے جہاں میرا زیادہ وقت گزرا تھا۔ یہ اتفاق نہیں ہے، وہ دوسری جگہوں کے نام بھی لے سکتے تھے لیکن انہوں نے انہی جگہوں کے نام لیے تھے جہاں جہاں میں گیا تھا۔ حکیم صاحب ویسے تو عام ہی سے انسان تھے لیکن میں اس وقت شک میں پڑ گیا تھا جب انہوں نے پاکستان کے جھنڈے کے رنگ بناتے تھے اور اب ان کے یہ الفاظ مجھے دوبارہ شک میں ڈال رہے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے صبر اور ظرف کی بات تھی کہ انہوں نے اب تک مجھ سے میرے بارے میں چھان بین نہیں کی تھی۔ ان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

’’کس سوچ میں ڈوب گئے؟‘‘

’’آپ کی بات پر غور کر رہا ہوں۔‘‘

’’سچ! بڑی بد دلی ہو گئی ہے، آگرے میں دل نہیں لگ رہا، چلو کسی پہاڑی مقام پر چلتے ہیں، چلو گے؟‘‘

’’چلیے!‘‘ میں نے کہا۔

وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ’’چلو تیاری کرتے ہیں۔‘‘

حکیم صاحب نے نینی تال جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ان راستوں سے واقف نہیں تھا۔ حکیم صاحب نے خود ہی سارے انتظامات کیے اور ہم نے سفر کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کہاں سے ٹرین سے سفر کیا جائے گا اور کہاں سے بسوں اور ٹیکسیوں سے...... میں بہت خوش تھا اور ٹرین کے سفر سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اجنبی شہر، اجنبی راستے اور ان کے روایتی مناظر بڑی لطف دے رہے تھے لیکن اسی شام طبیعت پر تھوڑا سا تکدر چھا گیا۔

مغرب کا وقت تھا، ماحول کلایا ہوا تھا۔ ٹرین کسی ہل اسٹیشن پر رکی اور چھوٹے سے پلیٹ فارم پر ہنگامہ آرائیاں نظر آنے لگیں۔ میں باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا کہ میری نظریں ایک طرف اٹھ گئیں۔

وہ دو افراد تھے۔ بہترین ململ کے دھوتی، کرتوں اور واسکٹوں میں ملبوس! سروں پر ٹوپیاں پہنے ہوئے لیکن ان میں ایک بھوریا چرن تھا، دوسرا بنسی راج...... ! بھلا ان منحوس چہروں کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہے تھے اور ٹرین کے رکنے پر نیچے اترے تھے۔ میں ان پر نگاہیں جمائے ہوئے ہی تھا کہ انہوں نے مجھے دیکھا۔ دونوں کے لبوں پر میں نے مسکراہٹ دیکھی، جیسے وہ اس بات سے واقف ہوں کہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ اسی وقت ٹرین نے وسل دی اور وہ دونوں عجلت سے ٹرین کی طرف لپکے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن کچھ لمحوں کے لیے حیرت میں ڈوب گیا۔ بھوریا چرن میرا تعاقب کر رہا ہے۔ ظاہر ہے اس کی زندگی کا مقصد میں تھا۔ وہ کھنڈولا بننا چاہتا تھا اور اس وقت تک نہیں بن سکتا تھا جب تک میں اس کے ناپاک وجود کو مطلوبہ مزار تک نہ لے جاؤں۔

اور میں بھوریا چرن! اگر سو بار بھی مجھے گردن کٹانی پڑے تو یہ غلیظ حرکت نہیں کروں گا، تو ہے کس خیال میں! حکیم صاحب کی طرف دیکھا تو وہ آرام سے آنکھیں بند کیے سو رہے تھے۔ ٹرین چل پڑی۔ رات کو حکیم صاحب کھانے کے لیے جاگ گئے۔ اٹھتے ہی بولے۔ ’’کسی بھی میٹھی چیز کو لے کر چل پڑو، مکھیاں پیچھے لگی رہیں گی، جہاں تک جا سکتی ہیں۔‘‘

’’میں نہیں سمجھا حکیم صاحب......؟‘‘

’’میں خود نہیں سمجھا، تمہیں کیا سمجھاؤں، کھانا نکالو، بھوک لگ رہی ہے۔‘‘ کھانے سے فارغ ہو کر وہ پھر سو گئے۔

راستے طے ہوتے رہے۔ ہم نینی تال پہنچ گئے۔ ہر طرف پہاڑی حسن بکھرا ہوا تھا۔ ہوٹل تھے کہ لاجواب اور مناظر کمال کے حسین......! ہم ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ حکیم صاحب بے حد زندہ دل تھے۔ خوب سیر ہوئی، مجھے بھی بے حد لطف آیا لیکن میری نظریں مسلسل بھوریا چرن کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ وہ مجھے ابھی تک دوبارہ نہیں نظر آیا تھا۔

پھر ہمیں ایک فیملی ملی۔ یہ رحمان علی کا خاندان تھا۔ یہ لوگ پاکستان سے آئے تھے۔ رام پور میں ان لوگوں کے رشتے دار تھے، جہاں انہوں نے قیام کیا اور پھر سیر کرنے نینی تال آ گئے۔ اسی ہوٹل میں ان کا قیام تھا جہاں ہم تھے۔ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں بھی پاکستانی ہوں، بس پڑوسی ہونے کی وجہ سے سلام دعا ہو گئی تھی۔ دو ماہ قبل رحمان علی کی شادی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے بجیلا سے بچپن سے پیار تھا، خاصی رکاوٹوں کے بعد ان کی شادی ہوئی ہے، دونوں ایک جان دو قالب ہیں اور اب ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ میں ان لوگوں سے گھل مل گیا، زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتا تھا۔ بجیلا مجھے ’’بھائی جان، بھائی جان‘‘ کہتی تھی اور مجھ سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔

اس شام بادلوں کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جو مجھے چھو کر گزر رہے تھے اور خوب بھگو رہے تھے۔ انتہائی بلندی پر بنے ہوئے اس ہوٹل کے پہاڑی پارک کی ایک بنچ پر بیٹھ کر میں قدرت کی صناعی کے نظارے کر رہا تھا کہ کوئی میرے برابر کی بنچ پر آ بیٹھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا اور سنبھل گیا۔

وہ بھوریا چرن تھا اور آتشیں نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا، پھر میں نے کہا۔ ’’تلاش کر رہا تھا میں تمہیں بھوریا چرن! ریل میں نظر آنے کے بعد تم مجھے دوبارہ نظر نہیں آئے؟‘‘

’’تو سے دور کیسے رہت ہیرا! کالی میا نے بڑا کشٹ ڈال دیا ہے ہم پر کہ تو جیسے کمور منوئی سے بھینٹ رہے۔‘‘

’’میرے دین، میرے ایمان کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی بھوریا چرن تو میں تیری مدد ضرور کر دیتا مگر ہم تو ان بزرگان دین کی حرمت پر قربان جاتے ہیں جن کے سائے میں ہمارا ایمان پل رہا ہے۔‘‘

’’ارے تو ہم کا کری رہیں، لاکھ تو کا سمجھائی کہ کا کا! جیون کے چار دن ہو ویں ہیں، ان کا مجالے، بادشاہ بن جا اپنے دیس کا......! کن چکر امیں پڑی ہے۔‘‘

’’جس کی بادشاہت میں جی رہے ہیں بھوریا چرن! اسی کو بادشاہت جچتی ہے، ہم حقیر ذرے اسی کے سائے میں رہنا چاہتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’پاگل ہے تُو، پاگل ہے، نا ہُوا نا! ماننا پڑے گا تو کا، ایک دن ماننا ہی پڑے گا، ہم تو ہے نا چھوڑیں گے، جس سے تو پریم کرے گا، ہم او کا مٹی ملا دیں گے، سمجھ لئی رہیں؟‘‘

’’تو یہ نہیں کر سکے گا بھوریا! یہ تیری کالی گند ہے اور وہ میرا بادشاہ ہے جو تیرے ہر ارادے کو نا کام بنائے گا۔‘‘

’’مان لے گا تو، مان لے گا۔‘‘ وہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں اسے جاتے دیکھتا رہا، پھر نہ جانے کتنی دیر تک میں اُس کی باتوں پر غور کرتا رہا تھا اور مجھے دشا یاد آئی تھی جسے اس نے ایک موذی زہر کا انجکشن لگوا دیا تھا اور وہی اس کی زندگی بن گیا تھا۔

دوسرے دن رحمان علی اور بجیلا میرے کمرے میں آئے۔ رحمان علی نے کہا۔ ’’کامران جی! آپ نے جھیل کشوری دیکھی؟‘‘

’’نہیں......!‘‘

’’نینی تال کا دل ہے، صرف ہمت والے ایڈونچر پسند ہی وہاں جاتے ہیں، نینی تال آنے والے یہی دعویٰ کرتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں سیف الملوک ہے...... پراسرار، طلسمی روایتوں کی حامل سیف الملوک! آپ کبھی پاکستان آئیں تو ہم سے ضرور ملیں، ہم آپ کو سیف الملوک دکھائیں گے جہاں چاندنی راتوں میں پریاں اترتی ہیں، ویسے آپ کبھی نینی تال نہیں آئے ہندوستانی ہوتے ہوئے......؟‘‘

’’ہاں!‘‘ میں نے مختصراً کہا۔

’’تو ہم آپ کو کشوری کی دعوت دینے آئے ہیں، آپ کو ضرور ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔‘‘

’’ارے نہیں، آپ کے ساتھ آپ کے میزبان ہیں۔‘‘

’’جی نہیں! آج آپ ہمارے میزبان بن جایئے، وہ غدار ساتھ چھوڑ گئے، انہوں نے کسی اور پوائنٹ کا پروگرام بنا لیا تھا مگر بجیلا کشوری جانا چاہتی تھی، ہم نے ان سے معذرت کر لی اور اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔‘‘ رحمان نے کچھ اس طرح خلوص سے کہا کہ مجھے خاموش ہونا پڑا۔ ویسے بھی یہاں اور کوئی کام تو تھا نہیں۔ حکیم صاحب سے کہا تو انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

’’میاں! ہم کہاں سینگ کٹا کر بچھڑے بنیں گے، ویسے بھی ہمیں پانی سے ڈر لگتا ہے۔‘‘

رحمان علی نے انتظامات کر لیے تھے۔ کرائے کی جیپ، کھانے پینے کا سامان پیک تھا۔ دونوں میاں، بیوی بے حد خوش مزاج تھے، راستے بھر لطیفے سناتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ قدم قدم پر نینی تال اور پاکستان کے شمالی علاقوں کا موازنہ کرتے اور ان پر تبصرے کرتے آ رہے تھے اور وہاں کی تعریفیں کر رہے تھے جو مجھے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ایک بار رحمان علی نے کہا۔ ’’کامران! آپ برا تو نہیں مان رہے، ہم ہندوستان یا نینی تال کو برا نہیں کہہ رہے بلکہ صرف موازنہ کر رہے ہیں سوری!‘‘ میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

جھیل کشوری کافی وسیع تھی۔ اس کے اطراف میں گھنے درختوں کے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ جگہ واقعی خوبصورت تھی لیکن قدرے بھیانک تھی۔ کناروں پر جگہ جگہ وارننگ کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ کشتی کے بغیر جھیل میں قدم رکھنے کی سخت ممانعت تھی اور اسے جرم قرار دیا گیا تھا۔

رحمان علی نے ایک کشتی والے سے بات کی اور ہم اس چھوٹی سی کشتی میں آ بیٹھے۔ موسم بھی بیحد خوشگوار تھا۔ نوخیز جوڑا اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے مناظر میں کھویا ہوا تھا اور اپنے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کیوں بے مقصد جی رہا ہوں، گھر بار چھوٹ چکا ہے، اب میری پاکستان واپسی بھی میرے اہل خاندان کے لیے عذاب بن جائے گی، کیا کرنا چاہیے، کیا ہے یہ سب......!

جھیل کے اطراف میں خوب درخت تھے۔ درخت جیسے سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کشتی سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ جھیل روایتی طور پر ساکن تھی۔ ہم ساحل سے بہت دور نکل آئے تھے۔ ویسے بھی جھیل میں ہمیں اکا دکا کشتیاں نظر آئی تھیں۔ اچانک کشتی سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر پانی میں ایک بلبلا سا اٹھا اور بلند ہوتا چلا گیا۔ بالکل یوں لگا جیسے پانی سے کسی عفریت نے سر ابھارا ہو۔

کشتی کھینے والا بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کے منہ سے خوف زدہ انداز میں بے معنی الفاظ نکلے اور پھر سب کچھ بے معنی ہو گیا۔ کشتی ہوا میں اچھلی اور اوندھی نیچے گری۔ رحمان اور بجیلا کی چیخیں ابھریں۔ میں خود بھی تیرنا نہیں جانتا تھا، یکدم حواس باختہ ہو گیا تھا اور پانی کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا تھا، آنکھیں بند ہو گئیں، سانس رکنے لگا لیکن اسی وقت کلائی پر کسی کے ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی۔ سوچنے سمجھنے کا تو موقع ہی نہیں ملا، بس یوں لگا جیسے کسی مشین نے کھینچ کر خشکی پر لا ڈالا ہو۔ پیٹ میں پانی بھر گیا تھا، سانس رک رہا تھا لیکن مجھے یہاں تک لانے والے نے مجھے اوندھا لٹایا اور کمر دبا کر پانی نکالنے لگا۔

نہ جانے کتنی دیر کے بعد سانس بحال ہوئی۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو گزرے لمحوں کا احساس ہوا۔ کوئی ہمدرد تھا جس نے بروقت مدد کی تھی، ورنہ جھیل کے کنارے لگے سائن بورڈ یاد آ گئے جن پر اس خطرناک جھیل کی خصوصیات لکھی ہوئی تھیں۔ اجنبی ہمدرد کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا اور دوسرے لمحے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ لعنت ہے اس وقت پر جب یہاں آنے کے بارے میں سوچا تھا۔ سامنے بھوریا چرن نظر آ رہا تھا۔

’’کیسے ہو میاں جی......؟‘‘ اس کی مکروہ آواز ابھری۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ’’اے ہی سوچا ہے ہم نے، جس سے تو ہار پیار چلی ہے، او سروا کو ہم نرک پہنچا دئی رہے، اتنے دکھ دئی ہے تو کا کہ تیری چیخیں نکل جائیں، نا ہیں تو مان لے ہماری بات، کر دے ہمار اکام!‘‘

’’تو یہ حرکت تیری تھی؟‘‘ میں نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

’’تیرے متر کی، تو کا بچا لائی رہے ہم، اور تیری وجہ سے اوئی سرپتی، پتنی پرلوک سدھار گئے۔‘‘

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، آنکھوں میں سرخی آ گئی اور تو کچھ نہیں ملا۔ پھرتی سے پاؤں سے جوتا اتارا اور پوری قوت سے آرام سے بیٹھے بھوریا چرن پر دے مارا جو بالکل اتفاقیہ طور پر صحیح نشانے یعنی اس کے منہ پر لگا چونکہ اس میں پانی بھرا ہوا تھا اس لیے پچاک کی آواز آئی اور بھوریا چرن پیچھے الٹ گیا۔

اس کے منہ سے کریہہ آواز میں نکلا۔ ’’اوئی تو ہار مہتاری......!‘‘

میں اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر ایک لمبی سی سوکھی درخت کی ٹہنی نظر آئی۔ میں اس کی طرف لپکا تو بھوریا چرن نے چھلانگ لگائی اور کہیں دور بھاگنے کی بجائے ایک بلند درخت کے تنے تک پہنچا اور بندر کی طرح اس پر چڑھنے لگا۔

’’کمینے کتے! تو نے ان بے چاروں کو کیوں مار دیا، تیری لڑائی مجھ سے ہے، تو نے......!‘‘ یہ کہہ کر میں نے لکڑی اس پر پھینک ماری جو اس کے سوکھے بدن پر لگی اور اس نے گالی بکی۔ میں نے نیچے گرنے والی لکڑی دوبارہ اٹھائی تو وہ اوپر چلا گیا، پھر میں نے اس کے بدن کو گھٹتے ہوئے دیکھا۔ وہ چھوٹا ہو رہا تھا اور چند لمحوں کے بعد وہ مکڑا بن گیا، پھر اس کی ہنسی سنائی دی۔ ’’اب بول پوت! لگا نسانے......‘‘

میں غصے سے دانت پیسنے لگا تو وہ بولا۔ ’’کالی میا کی سوگند، بڑی کھوسی ہو رہی ہے تو ہے دکھ ما دیکھ کر، من ما سانتی اتر رہت ہے، اب تک تُو نے ہمیں دکھ دئیے ہیں، اب تیرے دکھ سہنے کا سے آ گیا ہے، سودا کریں گے تو سے!‘‘

میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ درحقیقت میرا دل رو رہا تھا۔ وہ اتفاقیہ حادثہ نہیں تھا، کشتی بھوریا چرن نے الٹی تھی اور ان دونوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ میری وجہ سے ان کی جان گئی تھی۔ بھوریا چرن پھر بولا۔ ’’تو ہے جس سے پیار ہو گا، ہم او کی جان لے لئی رہے مگر تو سے پوچھیں گے جرور کہ بول! ہمیں پیر پھکوا دوارا پہنچاوت رہے یا نہیں؟‘‘

’’کبھی نہیں بھوریا چرن! مجھے تیرا چیلنج منظور ہے...... جو تُو چاہتا ہے، وہ کبھی نہیں ہو گا۔‘‘

وہ خاموش ہو گیا۔ کمبخت اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ مکڑی بن کر درخت کے پتوں میں چھپ گیا تھا بس اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں پھر رحمان علی اور بجیلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ کشتی الٹ گئی تھی۔ کشتی بان اکیلا تھا، زیادہ سے زیادہ اس بیچارے نے اپنی جان بچا لی ہو گی، پتا نہیں وہ ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہو گا یا نہیں! پتا نہیں انتظامیہ کو اس حادثے کی خبر ہوئی ہو گی یا نہیں......!

بھوریا چرن خاموش ہو گیا تھا۔ پتا نہیں درخت پر ہے بھی یا نہیں، ہو سکتا ہے مکڑی بنے بنے خاموشی سے نیچے اتر کر بھاگ گیا ہو۔ اب کیا کروں۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ یہاں سے لمبا راستہ طے کر کے وہاں تک جاؤں جہاں ٹرمینل بنے ہوئے ہیں اور اس حادثے کی اطلاع دوں۔ پاؤں سے دوسرا جوتا اتار کر اس کا پانی جھٹکنے لگا۔ لباس شرابور ہو رہا تھا، ہر چیز بھیگ گئی تھی، اب اسے خشک کرنا ممکن نہیں تھا۔ جتنا فاصلہ پیدل طے کر کے جانا تھا، وہاں تک جاتے جاتے لباس خود بخود خشک ہو جائے گا۔

دوسرا جوتا جو بھوریا چرن کے منہ پر پڑا تھا، اٹھایا، پہن کر تیار ہی ہوا تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے دوسری طرف آہٹیں سنائی دیں اور پھر مدھم آوازیں جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھنڈ سے رحمان علی اور بجیلا برآمد ہوئے تھے۔ ان دونوں کے بدن بھی پانی میں شرابور تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، ڈگمگاتے قدموں سے اسی طرف آ رہے تھے۔ پھر ان دونوں نے مجھے دیکھ لیا۔ بجیلا کے منہ سے سریلی چیخ نکلی اور دونوں میری طرف دوڑ پڑے۔ میں یقین نہ کرنے والی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ نظریں دھوکا ہو یا بھوریا چرن کی کوئی چال!

دونوں قریب آ گئے۔ رحمان نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ’’خدا کی قسم تم خیریت سے ہو کامران، تم! او میرے خدا! او میرے خدا تیرا شکر ہے۔‘‘

مجھے ڈھارس ہوئی۔ خدا کا نام لیا گیا تھا، اب بھوریا چرن کی کسی چال کا امکان نہیں تھا۔ دونوں بری طرح تھکے ہوئے تھے، وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔

’’آپ بالکل ٹھیک ہیں کامران صاحب......؟‘‘ بجیلا نے کہا۔

’’ہاں! آپ لوگوں کے لیے رو رہا تھا۔‘‘ میں نے حواس پر قابو پا کر کہا۔

’’زبردست ایڈونچر رہا مگر یہ ہوا کیا تھا آپ کی سمجھ میں آیا، پانی میں بگولہ اٹھا اور کشتی الٹ گئی، جھیل ساکن تھی، وہ بگولہ کہاں سے آیا، کچھ سمجھ میں آیا......؟‘‘

’’آپ دونوں!‘‘ میں نے کہا۔

’’تجربہ دلچسپ تھا، ہم دونوں سوئمر ہیں اور سوئمنگ میں گولڈ میڈلسٹ ہیں بلکہ ہم دونوں کی پہلی ملاقات ہی جاپان میں اولمپکس گیمز میں ہوئی تھی جہاں ہم نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی اور سونے کے تمغے حاصل کیے تھے لیکن یہ سب کچھ اچانک ہوا اور اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا تھا، بس یوں سمجھیں قدرت کو بچانا منظور تھا، ہماری مشق کام آ گئی لیکن اس کا مطلب ہے آپ بھی معمولی سوئمر نہیں ہیں۔‘‘

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن کئی بار میری نگاہیں بھوریا چرن کی تلاش میں بھٹکی تھیں۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز ہوا کے دوش پر سنائی دی۔ میرے علاوہ رحمان اور بجیلا کے کان بھی کھڑے ہو گئے اور وہ دور تک نظریں دوڑانے لگے، پھر جھیل کی طرف سے موٹر بوٹس کے انجنوں کی آوازیں ابھریں اور رحمان علی بول پڑا۔ ’’شاید ہماری تلاش شروع ہو گئی ہے۔‘‘

جھیل میں تین چار موٹر لانچیں نظر آئیں۔ وہ کشتی بان بھی ایک لانچ میں موجود تھا جس کی کشتی میں ہم سیر کو نکلے تھے اور یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ ابھی ہم ان لانچوں کو دیکھ رہے تھے کہ ایک جیپ درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوئی۔ جیپ والوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور آخر کار ہم واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

رحمان علی اور بجیلا کے لیے یہ ایک ناقابل فراموش حادثہ تھا لیکن اس کی اصلیت مجھے معلوم تھی، البتہ رات کو آرام کرتے ہوئے میرے ذہن میں بہت سے خیالات گردش کرنے لگے اور میں ان کی ترتیب کرنے لگا۔ ماضی کا ہر نقش مجھے یاد آنے لگا۔ اسپتال کی ایک برستی رات کو ذلیل سادھو پہلی بار میرے سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بھیانک کہانی شروع ہو گئی تھی اور اس کے مرکزی کردار میں اور بھوریا چرن تھے۔ میری شخصیت ہی بدل گئی۔ میں ایک کامیاب ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن کیا بن گیا۔ مجھے مجلس عمل کا رکن بنایا گیا اور پھر یہ عہدہ واپس لے لیا گیا۔ پہلے تو مجھے یہی لگا کہ میں معتوب ہوں اور اب میری سزا شروع ہو گئی ہے لیکن میری غلطی تھی۔ مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا گیا، ہر جگہ میری مدد کی گئی جس کا آخری مظاہرہ آج کا واقعہ تھا۔ بھوریا چرن نے کہا تھا کہ جسے میں چاہوں گا، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے معصوم دشا کو ہلاک کرنے کے لیے زہریلا انجکشن لگایا، وہ دشا کی زندگی بن گیا۔ اس نے رحمان اور بجیلا کو جو میرے ساتھ گئے تھے، ڈبو کر مارنا چاہا، وہاں بھی وہ ناکام رہا اور مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

دوسرا دن معمول کے مطابق تھا۔ رحمان علی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پتا نہیں وہ کہاں تھے، بعد میں معلومات کیں تو پتا چلا کہ وہ گروپ واپس چلا گیا۔ اسی دوپہر میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ’’جی جناب! نینی تال میں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’کیوں...... دل اکتا گیا؟‘‘

’’ہاں! اس سے زیادہ قیام نہیں کیا جا سکتا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، جب چاہو گے بوریا بستر سمیٹ لیں گے۔‘‘

’’تو پھر سمیٹ لیں، کہاں جائیں گے؟‘‘

’’بمبئی!‘‘ حکیم صاحب نے فوراً کہا اور ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ جھیل والے حادثے کے بارے میں حکیم صاحب کو نہیں بتایا تھا، غرض یہ کہ تیاریاں ہو گئیں اور ہم نے نینی تال چھوڑ دیا۔ دوران سفر میری آنکھیں بھوریا چرن کی تلاش میں بھٹکتی رہیں لیکن وہ مجھے کسی روپ میں نہیں نظر آیا۔ حکیم صاحب دنیا سے بے خبر سفر کے نظارے لے رہے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ’’آپ نے ایک لمحے رکے بغیر بمبئی کا نام لے دیا، اس کی کوئی خاص وجہ......؟‘‘

’’بس منہ سے نکل گیا، تم ہی تو کہتے ہو وقت میں تقدیر ہے اور وقت ہر لمحے کا فیصلہ کرتا ہے۔‘‘ حکیم صاحب نے کہا اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ مجھے یقین تھا یہ جملے میں نے حکیم صاحب سے کبھی نہیں کہے تھے۔

دیر تک میں سوچتا رہا، پھر میں نے کہا۔ ’’بعض کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں حکیم صاحب! انسان صبر و سکون سے ان کے ساتھ سفر کرتا ہے لیکن اگر اس کا صبر ختم ہو جائے تو وہ کیا کرے؟‘‘

’’اس کا جو بھی عمل ہو گا، وہ وقت کے فیصلے کے مطابق ہو گا۔‘‘

’’غلط ہو یا درست......؟‘‘

’’یہ انسان کی فطرت پر منحصر ہے۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’جیسے تم ہو۔ صابر، اپنے عزم میں مستحکم! تمہارے فیصلے ہمیشہ انسانیت کی بھلائی میں ہوتے ہیں۔‘‘

’’انسان کتنا امتحان دے سکتا ہے، وہ ہر لمحہ سوچتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو، اس کا عمل کسی طرح اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو لیکن کسی شدید الجھن کے عالم میں غلط فیصلہ ہو جائے تو کیا اس غلطی کی تلافی ہو سکتی ہے؟‘‘

’’ارے معصوم انسان! کتنی معصومیت کی بات کی ہے، وہ رحیم و کریم تو معافیوں کے خزانے کھولے بیٹھا ہوتا ہے، وہ تو وقت کے ہر لمحے اپنے بندوں کے گناہوں کو درگزر کرتا ہے ورنہ انسان تو گناہوں کی پوٹ ہے، وہ جانتا ہے کہ شیطان اپنی کارگزاری سے کبھی غافل نہیں ہوتا، وہ اپنے بندوں کو شیطان کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔‘‘

’’کوئی کیسے جان سکتا ہے کہ اس کا امتحان کب ختم ہو گا؟‘‘ میں نے سوال کیا تو حکیم صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ مشکل سوال ہے جس نے حکیم صاحب کو پریشان کر دیا ہے۔ میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔‘‘

’’کسی سے وہ مانگو جو اس کے پاس نہ ہو تو وہ شرمندگی سے آنکھیں ہی بند کر سکتا ہے۔‘‘ حکیم صاحب نے جواب دیا اور میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

بمبئی پہنچ گئے۔ دل تڑپ گیا۔ جگہ جگہ کراچی جھلک رہا تھا، بہت سے مناظر کراچی جیسے تھے لیکن لوگ کراچی جیسے نہیں تھے۔ وہاں چہروں اور لباس میں ایک تمکنت، سلیقہ، یہاں سو میں سے بس ایک دو شفاف، غربت اور امارت وہاں بھی ہے لیکن وہاں رکھ رکھاؤ اور یہاں......!

ہوٹل راسپوتین میں تیسری منزل پر کمرہ مل گیا۔ ہوٹل البتہ بہت عمدہ تھا، کمرہ بھی اعلیٰ درجے کا! دو الگ الگ بیڈ لگوائے تھے۔ حکیم صاحب بچوں کی طرح خوش تھے۔ کہنے لگے۔ ’’یہاں سارے مشہور اداکار ملتے ہیں، دیکھیں گے انہیں۔‘‘

’’آپ کو ان سے بھی دلچسپی ہے؟‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’ہاں۔ کیوں نہیں!‘‘ وہ بولے۔

میرے ذہن میں بار بار بھوریا چرن کا خیال آیا تھا۔ وہ کہاں رہ گیا یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ مجھے مس کر دے۔ نینی تال والے واقعے کے بعد سے وہ مجھے ابھی تک نہیں نظر آیا تھا۔

میرا یہ خیال ٹھیک نکلا۔ ہوٹل کے قیام کا دوسرا ہی دن تھا کہ میں نے اپنے کمرے سے باہر کا نظارہ کرتے ہوئے اسے دیکھ لیا۔ وہ ہوٹل سے باہر ایک قیمتی کار میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ اس کا مطلب ہے کہ بمبئی میں بھی میرے اور اس کے درمیان معرکہ آرائی رہے گی۔ مجھے اس کے لیے تیار رہنا تھا۔

(جاری ہے)

ایم اے راحت

قسط : 28

حکیم سرمد کی شخصیت کمال کی تھی۔ درحقیقت میں انہیں نہیں سمجھ پایا تھا۔ کبھی وہ مجھے ایک عام سے انسان نظر آتے تھے، کھلنڈری سی فطرت کے مالک، لاپرواہ اور زندگی سے سمجھوتہ کرنے والے اور کبھی کوئی ایسی بات کہہ جاتے کہ کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ عام انسان کے بجائے خاص انسان نظر آنے لگتے۔

''ممتاز سے محبت کی شادی ہوئی تھی، ہماری جوانی کے وقت کی محبتیں موبائل فون پر نہیں ہوتی تھیں، عام طور سے گھر کی چھتوں پر یا دیوار کے سوراخوں سے ہوتی تھیں، بس ایسا ہی کیس اپنا تھا، چھوڑ کر چلی گئیں اور ہم کباب بیچتے رہ گئے، چلو جو بیت گیا، سو کل...... بمبئی کی سیر کریں گے، ہندوستان کے کروڑوں لوگ بمبئی دیکھنے کی آرزو دل میں رکھتے ہیں مگر عمر کٹ جاتی ہے، نہیں دیکھ پاتے۔''

حکیم صاحب کے ساتھ میں بھی یہ روایتی شہر دیکھ رہا تھا۔ کئی بار سمندر پر فلموں کی شوٹنگ دیکھی جہاں معروف اداکار نظر آجاتے تھے۔ حکیم صاحب انہیں دیکھ کر دیوانے ہو جاتے تھے، وہ ان کے پیچھے لگے لگے پھرتے تھے۔ میں البتہ ایسے اوقات میں ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں نے یہاں آتے ہی بھوریا چرن کو دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھ سے دور نہیں رہ سکتا تھا اور اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا۔

اس دن بھی ہم چوپاٹی پر موجود تھے۔ کچھ فاصلے پر سمندر کے کنارے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ پولیس کے جوانوں نے ایک مخصوص حصے کو حفاظت میں لے رکھا تھا اور اس طرف کسی کو نہیں جانے دے رہے تھے۔ مجمع پیچھے ہٹ کر شوٹنگ دیکھ رہا تھا۔ حکیم صاحب بھی اسی مجمع میں شامل تھے کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھوریا چرن تھا۔ بہت نفیس دھوتی، کرتے میں ملبوس......! آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے۔ اس کا یہ حلیہ دیکھ کر میں بے اختیار مسکرا دیا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا۔

''سارے مصیبتا کے مارے میرے ہی بھاگ میں لکھ گئے سسرے!'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا

''کیا ہوا بھوریا چرن......؟'' میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''جان جلائے رہے، کا ہوا بھوریا چرن! تیرا اپنا سسر بھی باؤلا رہے، سارا جیون مسکل مارے پر ہمری بات نہ مانی اور اب تُو او سے بھی جیادہ بکٹ! ارے دیا رے دیا!''

''میں اسی باپ کا بیٹا ہوں بھوریا چرن!''

''پر ایک بات سن لے بیرا۔ ہم بھی تیرا پیچھا نا ہی چھوڑیں گے، اپنا جیون بھی کھراب کری ہے تو ہار بھی!''

''وہ تو ہو رہا ہے''

''تُو کھوس رہے؟''

''دنیا میں کتنے ہیں جو خوش ہیں، سب کی مشکلیں الگ الگ ہیں، میری بھی مشکل ہے۔''

''مسکل نا رہے جدر ہے، ارے سب نے اپنا ایمان بیچ دیا ہے، سب اپنے کام سے کام رکھے ہیں، تو سے پہلے بھی کہہ رہیں بروا۔ تیرے سامنے تھوڑا سا جیون رہے، بوڑھا ہووے گا مر جاوے گا، ہمارے سامنے لمبا سنسار ہے، ہمارا کام کا ہے کھراب کرت ہے، کردے ہمارا کام سسروا۔ بادسا بنادئی ہے تو کا!''

''تم خود کہہ چکے ہو بھوریا چرن! میرے سامنے تھوڑی سی زندگی ہے، بوڑھا ہوں گا مر جاؤں گا، اس تھوڑی سی زندگی کے لیے اپنا ایمان کیسے بیچ دوں، تم خود بتاؤ؟''

''مانے گا سسرہ جرور مانے گا، ٹھیک ہے دیکھتے ہیں۔'' وہ اٹھ گیا اور ایک طرف چلا گیا۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر وہ اچانک نگاہوں سے گم ہو گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاش کرنے لگا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اسی وقت پیچھے سے آواز آئی۔

''مدھو بالا جیسی بات کہاں، کتنی آئیں، کتنی گئیں، پردہ، ہائے، پیار کیا تو ڈرنا کیا، پیار کیا کوئی چوری نہیں کی! کیا کہتے ہو پیار کیا تو ڈرنا کیا...... ایں......! پیار کرتے رہو، پیار کی کوئی ایک قسم تو نہیں ہوتی، سب سے اچھا پیار اللہ سے ہوتا ہے، اللہ سے پیار کرو، ایمان قائم رہے گا، ایمان قائم رہے بس......!''

''شوٹنگ ختم ہو گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی کہاں......؟ شوٹنگ تو دنیا کے آخری دن تک جاری رہے گی، کہانیاں بدلتی رہیں گی، اداکار بدلتے رہیں گے۔''

ہم چوپاٹی سے واپس چل پڑے۔ حکیم صاحب کی باتیں عجیب احساس دلا رہی تھیں۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا......! واقعی ایمان پیارا ہو تو ہر تکلیف ہیچ ہوتی ہے۔

اسی رات ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ حکیم صاحب پر اس وقت بھی فلمی ماحول سوار تھا اور مختلف اداکاروں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہوٹل میں پاس پاس میزیں لگی ہوئی تھیں اور ان پر خوب رش تھا۔ اچانک ایک شخص ہمارے قریب آ گیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، چالاک سا آدمی لگتا تھا۔

''پانچ منٹ بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس نے کہا اور ہم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''تشریف رکھیے۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ! میرا نام بابو خان ہے، انڈسٹری کا جانا مانا آدمی ہوں، جھانسی کا رہنے والا ہوں۔''

''اماں! کیوں جھانسا دے رہے ہو، جھانسی میں تو میری سسرال ہے۔'' حکیم صاحب بولے اور بابو خان چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''یہ کیا بات ہوئی، میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''آپ بتائیے بابو بھائی! کیا بات ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں ہے، بس آپ لوگ فلموں اور اداکاروں کی باتیں کر رہے تھے، میں پاس کی میز پر بیٹھا تھا، آپ کی باتوں میں مزا آیا تو سوچا دو منٹ آپ سے باتیں کروں۔''

''اچھا...... اچھا! آپ انڈسٹری کے آدمی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''بالی ووڈ اپنے نام سے چل رہی ہے، کہیں بھی کھڑے ہو کر بابو خان کا نام پوچھ لو، آج کل سمترا دیوی کے ساتھ کام کر رہا ہوں، چھ فلمیں اناؤنس کی ہیں انہوں نے ایک ساتھ! سارا انتظام بابو خان کے کندھوں پر ہے، یوں سمجھیں سمترا دیوی کی ناک کا بال ہوں۔''

''توبہ...... توبہ! یہ سوچ کر ہی چھینک آرہی ہے کہ آپ کسی کی ناک کا بال ہیں بخدا......!'' حکیم صاحب بولے بنا نہ رہ سکے۔

''یہ کافی دلچسپ آدمی ہیں۔'' بابو خان نے پینترا بدل لیا۔ ''یہی اداکاروں کی باتیں کر رہے تھے، ملیں گے اداکاروں سے؟''

''ایں...... تم ملوا دو گے؟'' حکیم صاحب خوش ہو کر بولے۔

''نام لو...... جس سے کہو گے، ملوا دوں گا، بابو خان نام ہے، آج کل سارے کے سارے سمترا دیوی کے گرد چکرا رہے ہیں اور بابو خان کے ترلے کر رہے ہیں...... بابو خان! یہ چانس دلوا دو، بابو خان! وہ چانس دلوا دو۔''

''ہمیں بھی کوئی چانس مل سکتا ہے؟'' حکیم صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا اور میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''آپ کو......؟'' بابو خان نے کہا اور انگوٹھے اور انگلیوں سے فریم بنایا اور حکیم صاحب کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر بولا۔ ''سمترا پروڈکشن کی ایک فلم ہے 'بندر کی ناک' اس کا اسکرپٹ گووند بھائی لکھ رہے ہیں، پانچ سات ہزار ان کی ناک پر ماریں گے اور تمہارا کردار لکھوا دیں گے، فکر ہی مت کرو۔''

''وہی بندر کی ناک ہیں؟'' حکیم صاحب نے رازداری سے پوچھا۔

''ایں......!'' بابو خان نے حیرت سے حکیم صاحب کو دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ''نہیں پیارے بھائی! 'بندر کی ناک' فلم کا نام ہے، آپ لوگ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟''

''ہاں......!''

''کمرہ نمبر کیا ہے؟''

حکیم صاحب نے جلدی سے کمرہ نمبر بتا دیا تو بابو خان بولا۔ ''کل ڈیڑھ بجے آجاؤں گا، آپ لوگوں کو 'راج منڈل' لے چلوں گا، وہیں میرا آفس ہے، سمترا دیوی سے بھی ملوا دوں گا۔''

''بڑی مہربانی ہوگی۔'' حکیم صاحب نے عاجزی سے کہا۔ بابو خان اٹھ کر اپنی میز پر چلا گیا۔ میں نے کہا۔ ''اس میں بھی کوئی رمز ہے حکیم صاحب!''

''یار! بمبئی بلاوجہ تو نہیں آئے ہیں، جوانی سے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے، پورا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔'' میں خاموش ہو گیا۔ حکیم صاحب کی یہ حرکت مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ حکیم صاحب نے میرے بگڑے ہوئے موڈ کو محسوس کر لیا تھا۔ رات کو کمرے میں بستر پر لیٹ کر انہوں نے کہا۔ ''دوست کی دلجوئی بھی عبادت ہوتی ہے کامران میاں! ہم آپ کے ساتھ سب کچھ چھوڑ کر چلے آئے اور آپ ہماری چھوٹی سی خوشی پوری کرنے سے گریزاں ہیں۔''

''نہیں حکیم صاحب! میں نے کب انکار کیا ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ دل میں سوچا کہ کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے البتہ دوسرے دن بڑی تیاریاں کی تھیں۔ باہر جا کر خط بنوایا، لانڈری سے کپڑے استری کرائے اور ڈیڑھ بجے بن ٹھن کر بیٹھ گئے۔ میں بھی تیار تھا۔

بابو خان وقت کا پابند نکلا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اندر آ کر اس نے مسکرا کر ہم دونوں کو دیکھا پھر اپنے مخصوص انداز سے فریم بنا کر حکیم صاحب کو دیکھا۔

''فٹ لگ رہے ہو قسم سے، چلیں......؟''

ہوٹل سے باہر نکل کر ٹیکسی کی اور راستہ طے کر کے ہم اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ بہت بڑا اسٹوڈیو تھا۔ ایک آفس پر سمترا پروڈکشن کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بابو بھائی ہمیں لے کر آفس میں داخل ہو گئے۔ کافی بڑا آفس تھا۔ دیواروں پر چاروں طرف تصاویر آویزاں تھیں۔ دو تین اداکار قسم کے لوگ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ بابو خان کی یہاں واقعی چلتی تھی۔ اس نے ہونٹ سکوڑ کر ان اداکاروں کو دیکھا، پھر کرخت لہجے میں بولا۔ ''چلو بھائی لوگ اُٹھا کھاؤ، میڈم آنے والی ہیں، چلو فوراً کھڑے ہو جاؤ۔''

وہ لوگ ایک دم کھڑے ہو گئے، پھر باہر نکل گئے۔ بابو بھائی نے ہمیں ایک بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر باہر کی طرف منہ کر کے بولا۔ ''مجیرے...... ابے او مجیرے!''

دروازے سے ایک مجیرے نے اندر جھانکا تو بابو بھائی بولا۔ ''تین چائے فنافٹ ملائی مار کے، جلدی......!''

مجیرا غائب ہو گیا اور بابو بھائی دوسری بینچ پر بیٹھ کر گریبان میں پھونکیں مارنے لگے۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سمجھے کہ مجیرا چائے لے آیا مگر دروازے سے ایک چہرے نے اندر جھانکا۔ سانولا رنگ، تیکھے نین نقش، جوانی کی عمر لیکن جوانی مرجھائی ہوئی، آنکھوں کے گرد حلقے، ہونٹ خشک......! ابھی وہ اندر داخل بھی نہیں ہوئی تھی کہ بابو بھائی پھنکارے۔

''پھوٹ پھوٹ! ابی میڈم نہیں آئیں، مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔''

وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی مگر وہ چہرہ......! نہ جانے اس چہرے میں کیا تھا۔ جس مایوسی سے وہ پیچھے ہٹی تھی، وہ بے حد کربناک تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی انوکھی کہانی موجود تھی۔ میرے دل کو بے چینی سی ہونے لگی۔

''یہ کون تھی بابو بھائی......؟'' میں نے پوچھا۔

''مینا سسری...... ایکسٹرا گرل ہے۔'' بابو بھائی نے کہا۔ پھر چونک کر مجھے دیکھنے لگا، پھر بڑے بھونڈے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ''ایں...... ایں...... ایں!'' یہ کہہ کر ہنس پڑا۔ ''حسن بنگال ہے، اس کا میاں شادی کر کے لایا تھا کلکتہ سے، اس نے خوب کمائی کی اور یہ ڈھانچہ بن گئی، اب وہ ماغ پتی سینی ٹوریم میں پڑا ہے اور یہ کام مانگتی پھرتی ہے۔''

''اوہ...... وہ بیمار ہے؟''

''آخری اسٹیج چل رہا ہے ٹی بی کا، بچے گا نہیں۔'' بابو بھائی نے کہا۔ اسی وقت وہ آدمی جسے بابو بھائی نے مجیرے کہہ کر بلایا تھا، شیشے کے تین گلاسوں میں چائے لے آیا جس پر پیلے رنگ کی موٹی ملائی تیر رہی تھی۔

''او تیری خیر مجیرے! کتنے پیسے ہوئے؟''

''اسی روپے۔'' مجیرے بولا۔

''سو روپے دے دو اسے بابو جی!'' وہ ہماری طرف رخ کر کے بولا۔

ایک لمحے کے لیے حیرانی ہوئی لیکن حکیم صاحب نے جلدی سے سو کا نوٹ نکال کر مجیرے کی طرف بڑھایا، جسے اس نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر لے لیا۔

بابو خان نے کہا۔ ''چل بھاگ لے، پُھکار کھ لیجو۔'' مجیرے فوراً باہر نکل گیا۔ بابو خان نے اپنا گلاس اٹھا لیا اور چائے سڑپنے لگا۔ ہم نے چائے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تو وہ بولا۔ ''چائے لے لو بھائی جی! گلاسوں کی طرف توجہ مت دو، یہ تو انڈسٹری کا تبرک ہے، بڑے اداکار انہی گلاسوں میں چائے پی کر سپر اسٹار بنے ہیں۔''

''اچھا......!'' حکیم صاحب نے جلدی سے گلاس اٹھا لیا۔

مجھے پہلی بار ان پر غصہ آیا تھا۔ میں نے کچھ لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ''تم نے اس کا نام مینا سسری بتایا تھا؟''

''ایں......!'' بابو خان نے کہا۔ پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا۔ ''مینا صرف مینا! سسری تو ہم نے اسے پیار سے کہا۔ آپ کے دماغ میں اسی کی فلم چل رہی ہے، بھیج دیں گے آپ کے پاس، لو جی سمترا دیوی آ گئیں۔''

ایک بھاری بھرکم عورت قیمتی ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک سوکھا سڑا کوئی انیس سال کا لڑکا اس کا بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک اچٹتی نظر ہم تینوں پر ڈالی اور اپنی میز کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھی۔ ہماری طرف توجہ دیئے بغیر اس نے بریف کیس کھولا اور اس سے کچھ کاغذات نکال کر میز پر رکھے۔ لڑکا باہر نکل گیا تھا۔ کچھ دیر مصروف رہنے کے بعد اس نے بابو بھائی کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''جی بابو بھائی! کیسے آنا ہوا؟''

''یہ دو مہمان ہیں، آپ کے پاس لایا ہوں، سفارش کرنی تھی آپ سے......!''

''ہاں...... بولو!''

''انہیں فلم میں کام کرنے کا شوق ہے، میری آنکھوں میں 'بندر کی ناک' تھی، میں نے بتا دیا کہ میڈم ہی تمہاری مشکل حل کر سکتی ہیں۔''

سمترا دیوی نے مجھے غور سے دیکھا، دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''نین نقش تو بہت اچھے ہیں، باڈی بھی فٹ ہے مگر میری مشکل بھی انہیں بتائی؟''

''فلم میں کام کرنے کی خواہش ان کی نہیں، ان بابو کی ہے، رائٹر سے کہہ کر کوئی رول لکھوا لیں گے۔'' بابو بھائی نے حکیم صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

سمترا دیوی نے چونک کر حکیم صاحب کو دیکھا۔ صاف پتا چلا کہ اس نے قہقہہ حلق میں دبایا ہے، پھر وہ بولی۔ ''اچھا اچھا کیا حرج ہے، ویسے دوسرے صاحب بھی بہت فٹ ہیں، میں دعوے سے کہتی ہوں کہ کسی فلم میں ہیرو آ سکتے ہیں۔''

''آپ نے آج تک جو کہا، سولہ آنے ٹھیک نکلا، اب یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے۔''

''کسی اچھے کردار میں انہیں بھی لیا جا سکتا ہے مگر بات وہی ہے بابو بھائی جو آپ کو معلوم ہے۔'' سمترا نے حکیم صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''آپ بتا دیں انہیں۔''

''ہاں! بتانا مجبوری ہے۔'' سمترا دیوی نے کہا پھر بولی۔ ''اصل میں، میں نے ایک بہت بڑا رسک لیا ہے اور ایسا میں نے انڈسٹری کے چیلنج پر کیا ہے، میں نے بیک وقت چھ فلمیں اناؤنس کی ہیں، ان پر کام ہو رہا ہے لیکن اس کے لیے مجھے فنانس کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان ہمدردوں اور دوستوں کو تلاش کیا جائے جو میری مالی مدد کریں، میں ان لوگوں کو ان کے سرمائے کی مناسبت سے پارٹنر کا درجہ دوں گی اور جس فلم میں انہوں نے سرمایہ لگایا ہوگا، اس کے منافع میں حصہ دوں گی، آپ لوگوں کو بھی میں دعوت دیتی ہوں، میرے ساتھ مالی شرکت کیجیے، کوئی قید نہیں ہے کہ آپ کتنا سرمایہ دے سکتے ہیں، جو بھی ممکن ہو۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر کچھ گڑبڑ ہوئی اور پھر وہ لڑکی اندر گھس آئی۔ اس کے پیچھے مجیرا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

''یہ مجھے دھکا دے کر اندر گھس آئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم جاؤ۔'' سمترا دیوی نے کہا اور وہ لڑکی کو خونی نظروں سے دیکھتا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سمترا نے کرخت نظروں سے لڑکی کو دیکھ کر کہا۔ ''ہاں مینا! کیا بات ہے؟''

''مالکن جی، مائی باپ! خدا کے نام پر، اللہ کے نام پر میری مدد کر دیں، میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں ہے، تین دن، پورے تین دن میڈم جی، مالکن جی!''

''تم جانتی ہو مینا! میں آج کل خود کتنی پریشان ہوں، تمہارا پچھلا سارا حساب پورا ہو چکا ہے، تمہارے شوہر کے کفن دفن کے لیے بھی میں نے تمہیں ہزار روپے دیئے تھے اور کیا کروں؟''

''تھوڑا سا ایڈوانس...... تھوڑا سا!'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''ہوں!'' سمترا دیوی نے پرس کھول کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور اسے دے کر بولی۔ ''یہ لے جاؤ اور سنو اب دوبارہ یہاں مت آنا، میں مجیرے سے کہہ دوں گی کہ وہ تمہیں اندر نہ آنے دے۔''

مینا، میڈم کو دعائیں دینے لگی تو میڈم نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، جاؤ۔''

''وہ...... وہ باہر مجھے مارے گا۔'' مینا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''نہیں مارے گا، مجیرے!'' میڈم نے آواز دی اور مجیرا اندر آ گیا۔ ''اسے کچھ مت کہنا، آرام سے جانے دو، خیال رکھنا۔''

''جی میڈم......!''

''اسے یہیں...... یہیں روک لیں، میں نکل جاؤں۔'' مینا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''او ٹھیک ہے مجیرے! تُو اِدھر رک...... چل مینا! بھاگ جا۔'' وہ بچ مچ بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی اور میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میرے دل سے آواز نکل رہی تھی۔ میرے مالک! تیری تخلیق کی اتنی تحقیر......! لیکن سب کچھ تُو جانتا ہے اور جو تُو جانتا ہے، وہی ٹھیک ہے۔

اسی وقت میڈم کی آواز ابھری۔ ''سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہوگا، فلم میں کام بھی ملے گا، آپ لوگ زیادہ سے زیادہ سرمائے کا بندوبست کریں، ٹھیک ہے گڈ بائی، بابو بھائی!'' سمترا دیوی نے بابو بھائی کی طرف دیکھا تو بابو بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آیئے!'' انہوں نے کہا اور ہم باہر نکل آئے۔

میری نظریں دور دور تک بھٹکنے لگیں لیکن مینا کہیں نظر نہیں آئی۔ بابو بھائی بولے۔ ''کتنی رقم لگا سکتے ہو فلم میں؟''

''مشورہ کر کے بتائیں گے بابو بھائی!'' میں نے فوراً کہا۔

''جلدی کرنا، میڈم کا نام بڑا ہے، بہت سے فنانسر آ جائیں گے، شمشو ابے او شمشو!'' بابو بھائی نے ایک گزرتے ہوئے آدمی کو آواز دی اور وہ قریب آ گیا۔

''کیسا ہے بے......؟''

''ٹھیک ہوں، یہ کون ہیں؟'' اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مہمان ہیں، ایک بات بتا؟''

''ہاں بول!''

''ابھی میڈم نے بولا کہ مینا کا گھر والا مر گیا، کیا وہ مر گیا؟''

''لو بابو بھائی کی باتیں......! اسے مرے ہوئے تو بیس دن سے زیادہ ہو گئے۔''

''میرے کو نہیں معلوم تھا، ابی مینا کیا کر رہی ہے؟''

''پتا نہیں۔''

''صاب لوگ کو ادھر چھوڑنا ہے۔''

''کب......؟'' شمشو نے پوچھا۔

''شام سات بجے!'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، کدر سے پکڑنا ہے؟'' شمشو اپنی زبان میں بولا۔

''ہوٹل راسپوتین سے۔'' بابو بھائی نے کمرے کا نمبر بتایا۔

''ایڈوانس......؟'' شمشو بولا۔

''دو سو روپے دے دو اس کو، تین سو شام کو دے دینا۔''

وہاں سے ہم راسپوتین آ گئے۔ کمرے میں آ کر حکیم صاحب بری طرح ہنسنے لگے اور میں غصے سے انہیں دیکھتا رہا۔ جب وہ خوب ہنس لیے تو بولے۔ ''چلو ہم فلم پروڈیوسر بننے جا رہے ہیں۔''

''کتنی رقم ہے آپ کے پاس......؟''

''لاکھوں...... کمایا ہی کمایا ہے، خرچ کہاں کیا ہے، اگر وہ خوابوں میں آ جاتیں تو چھوٹا سا ایک تاج محل بنا دیتے، سارے پیسے بچ گئے، اب ایک فلم بنا دیتے ہیں۔''

''اس کا نام تاج محل رکھ دیجیے۔''

''تاج محل تو بن چکی ہے۔'' حکیم صاحب بولے۔

''تو تاج محل بھی تو بن چکا ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''اچھا! ایک بات بتاؤ تم رات کو مینا کے ہاں جا رہے ہو؟''

''ہاں......!''

''تو بھائی! میں بھی تو اسی کے لیے وہاں گیا تھا، اسے ہماری ضرورت تھی نا!''

''کیسے......؟'' میں اچھل پڑا۔

''مینا کو!'' حکیم صاحب بولے اور پیٹ پکڑ کر واش روم کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ سر بری طرح چکرا گیا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ حکیم صاحب کوئی اونچی چیز تھے۔ انہوں نے اپنی شخصیت پر شوخی کا خول چڑھا رکھا تھا لیکن جب بھی اس خول سے نکلتے کچھ اور لگنے لگتے۔ میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ وہاں کوئی مظلوم لڑکی ملے گی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو جاؤں گا لیکن حکیم صاحب نے پہلے سے اپنی منصوبہ بندی کر لی تھی۔

میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب حکیم صاحب سے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ واش روم سے باہر آئے اور مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنے بیڈ پر جا بیٹھے۔

پونے سات بجے شمشو نے دروازے پر دستک دی اور ہمارے بلانے پر اندر آ گیا۔ ''چلیں صاحب......؟'' وہ بولا اور ہم تیار ہو گئے۔ ''دونوں......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں......!''

''مجھے ڈبل بھاڑا دینا ہوگا''

''دیں گے۔'' میرے بجائے حکیم صاحب بولے۔

سفر کافی لمبا تھا۔ آخر کار آٹو رکشا ایک کچی آبادی میں داخل ہو گیا۔ آبادی کے ماحول سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہاں کس طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک جگہ ہم رکشے سے اتر گئے۔ شمشو ہمیں لے کر ایک بوسیدہ سے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے آواز دی۔

''مینا...... اری او مینا!''

کچھ لمحوں کے بعد مینا باہر نکل آئی۔ اس نے ہم تینوں کو دیکھا اور بولی۔ ''کیا ہے شمشو جی......؟''

''مہمان آئے ہیں۔'' شمشو بولا۔

''میں عدت (عدت) میں ہے شمشو جی! اب میں دھندہ نہیں کرے گی، معافی مانگتی صاب جی!'' اس نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''پھر کیا رانی گیری کرے گی، خوامخواہ نخرے کر رہی ہے، چل پیچھے ہٹ!'' شمشو کو اپنا معاوضہ خطرے میں نظر آنے لگا۔

''ہاتھ جوڑتی صاب جی! میرا گھر والا جیسا بولتا، میں وہ کرتا، اب وہ نہیں ہے، میں یہ نہیں کرتا۔''

''ہمیں آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں بہن! ہم آپ کے پاس کسی بری نیت سے نہیں آئے۔'' حکیم صاحب نے کہا اور وہ سکتے میں رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ دوسری طرف میں نے شمشو کا چہرہ دیکھا۔ وہ بھی ہکا بکا رہ گیا تھا۔ حکیم صاحب نے جیب سے شمشو کا معاوضہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا مگر شمشو کا ہاتھ آگے نہیں بڑھا بلکہ اس کے منہ سے رندھی ہوئی آواز نکلی۔ ''آپ اس کو بہن بولا صاب!''

''ہاں شمشو! تم یہ پیسے لو۔''

''نہیں لیں گا صاب! نہیں لیں گا، دنیا میں سب اچھے ہیں، ایک ہم ہی برے ہیں، نہیں لیں گا۔'' اس نے روتے ہوئے کہا اور جیب سے دو سو روپے نکال کر زمین پر پھینکے اور روتا ہوا بھاگ گیا۔

حکیم صاحب ہنسنے لگے۔ پھر بولے۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، دنیا میں کوئی برا نہیں ہے، کوئی ہے ہی نہیں...... مینا! اندر آنے کو نہیں کہو گی؟''

وہ راستے سے ہٹ گئی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک غریب زدہ گھر جیسا ہو سکتا تھا، ویسا ہی گھر تھا۔ مینا سنبھل گئی تھی۔ اس نے ہمیں تخت پر بیٹھنے کے لیے کہا اور بولی۔

''میں ابی آتا صاب! بس پانچ منٹ!'' وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اس کمرے کی طرف چلی گئی جو سامنے نظر آ رہا تھا۔ ہم دونوں خاموشی سے اس نیم تاریک ماحول کو دیکھتے رہے۔ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔ دو منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ سے بھی زیادہ گزرے تو میں کھڑا ہو گیا۔

''یہ کہاں گئی؟''

''پتا نہیں دیکھیں......؟'' حکیم صاحب بولے اور ہم دونوں دبے پاؤں کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اندر جھانکا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مینا جائے نماز پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کے قریب ایک چارپائی پر دو بچیاں جن کی عمریں تین اور پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوں گی، بیٹھی تھیں۔ حکیم صاحب نے میری طرف دیکھا، پھر اشارے سے چلنے کے لیے کہا۔ ہم دونوں خاموشی سے واپس تخت پر آ بیٹھے۔

کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ گئی اور ایک ٹوٹے مونڈھے پر بیٹھ کر بولی۔ ''معافی چاہتی صاب! میں نے آپ لوگ کو میڈم کے آفس میں دیکھا تھا۔''

''ہاں......!''

''معافی چاہتی صاب! آپ میرے کو......!'' وہ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

''ہاں! ہم دونوں نے تمہیں بہن بولا۔'' حکیم صاحب نے کہا۔

''معافی چاہتی صاب! انڈسٹری میں کوئی کسی کو بہن نہیں بولتا۔''

''اب تم اور زیادہ معافی مت مانگو کیونکہ ہم انڈسٹری کے لوگ نہیں ہیں۔''

''فرمان مر گیا صاب! میں دھندہ چھوڑا، اب میں بس ایکسٹرا کا کام کرتا۔''

''فرمان کون تھا؟''

''میرا خاوند تھا، کولکتہ سے میرے کو نکاح کر کے اِدھر لایا، میرے کو مارا، بولا دھندہ کرو، میں دھندہ کیا صاب! اپنی خوشی سے نہیں کیا، وہ میرا خاوند تھا بس!''

''تم نے لو میرج کی تھی اس سے؟''

''نہیں صاب! وہ میرے ابا کو ملا تھا، اس کو جھوٹ بولا کہ وہ بمبئی میں کام کرتا، ابا نے میرا اس سے شادی کیا۔''

''تم نے اپنے ابا کو نہیں بتایا کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟''

''ابا کولکتہ رہتا۔''

''کتنے سال ہو گئے تمہاری شادی کو......؟''

''نہیں معلوم صاب!''

''تم کبھی اپنے ماں، باپ سے ملنے نہیں گئیں؟'' حکیم صاحب نے پوچھا اور اس کے چہرے کی جو کیفیت ہوئی، اس نے میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلے اس کے چہرے پر ایک والہانہ کیفیت پیدا ہوئی، اپنے ماں، باپ سے ملنے کے تصور سے ایک اشتیاق سا ابھرا جو لمحوں میں بے بسی سے بدل گیا۔

''نہیں گئیں؟''

''نہیں!''

''جب وہ تمہارے ساتھ اتنا برا سلوک کرتا تھا تو تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟''

''ابا میرے کو بولا مینا بیٹا! آپ مسلمان ہو، شوہر کا اطاعت کرنا، اس کا گھر سے مر کر نکلنا، اس کا ہر حکم کا تعمیل کرنا، میں نے ابا سے وعدہ کیا۔''

اب حکیم صاحب کی قوتِ برداشت بھی جواب دے گئی، ان کی آواز بند ہو گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مینا کے سر پر ہاتھ رکھا اور آنسو پینے لگے۔ وہ معصوم ابھی تک ہم دونوں کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔ ظاہر ہے جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا، وہ سب کو ایسا ہی سمجھتی تھی۔ بمشکل تمام حکیم صاحب کی آواز ابھری۔ ''مینا بیٹی! ہم تمہیں کلکتہ لے جائیں گے، تمہارے ابا کے پاس، تمہارے گھر!''

وہ کچھ نہیں بولی بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

''ہم تمہیں تمہارے گھر لے جائیں گے۔'' حکیم صاحب پھر بولے۔

وہ بے اختیار ہو گئی۔ اس نے جھک کر حکیم صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے بولی۔ ''نہیں صاب! میں ہاتھ جوڑی، میں پاؤں پکڑی صاب! میں اب دھندہ نہیں کرتا، میرے کو معاف کر دو۔'' بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے دوبارہ کہا۔ ''بابو لوگ آتا، میں ان کو خوش کرتا تو وہ میرے کو بولتا میں تمہارے کو کلکتہ لے جائے گا، تمہارے باپ کا گھر لے جائے گا، صبح کو وہ ہنستا چلا جاتا۔''

بات اب سمجھ میں آئی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا۔ ''وہ تمہیں بیٹی کہتے تھے، بہن کہتے تھے؟''

''ایں......!'' وہ چونکی۔ ہمیں دیکھتی رہی، پھر بلک بلک کر رو پڑی۔ بڑی مشکل سے ہم اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو سکے کہ ہم اسے سچ مچ کلکتہ لے جائیں گے۔

اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے چال میں ہی چھوڑنا پڑا، انتظامات کرنے تھے۔ حکیم صاحب نے اس کے لیے اور اس کی دونوں بچیوں کے لیے اچھی خاصی خریداری کی۔ اسے ہوٹل لانا ممکن نہیں تھا لیکن حکیم صاحب زیادہ وقت اسی کے پاس گزار رہے تھے۔

اس وقت بھی وہ وہیں گئے ہوئے تھے اور میں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دیدی۔ اندر داخل ہونے والا بھوریا چرن تھا۔ اسی صاف ستھرے لباس میں ایک مہذب آدمی نظر آ رہا تھا۔

میں اسے دیکھ کر چونکا تو ضرور تھا لیکن میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا اور مسکرا کر کہا۔ ''آؤ بھوریا چرن! اب تو تم ایک شریف آدمی نظر آنے لگے ہو؟''

''جروری کام سے آت رہیں تورے پاس!''

''بیٹھو کافی پیو گے؟''

''تو کلکتہ نا ہیں جائے گا۔'' وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

''کیا......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''او سسریا کو ریل ما بٹھائی دے، ہم کا اعتراج نا ہیں، پر تُو کلکتہ میں قدم نا ہیں رکھ سکتا۔''

''وجہ......؟''

''ہماری تیری لڑائی ہمارے بیچ، اُدھر کالی نواس رہے، اُدھر تیرا جانا ہمارے لیے ٹھیک نا رہے۔''

''ارے واہ! میں نے تو یہ سوچا بھی نہیں تھا، تمہاری کالی دیوی تو کلکتے والی کہلاتی ہے مگر میرے وہاں جانے سے کیا ہو جائے گا؟''

''ہم جو تو کا کہت رہیں تو اُدھر نا ہیں جائے گا۔''

''اب تو مجھے وہاں ضرور جانا ہوگا کیونکہ تیری بات نہ ماننا ہی میرا ایمان ہے۔''

''تو پھر سن لے، انرتھ کر دئی رہیں ہم مینا اور اس کی دوئن چھوکریاں ہیاں بمبئی ماہی کھتم کر دیں گے ہم!''

''نہیں کر سکو گے تم ایسا بھوریا چرن! کیونکہ مینا نماز پڑھتی ہے، وہ ان بیٹیوں میں سے ہے جو باپ کے حکم پر اپنے آپ کو مٹا دیتی ہیں، ایسی بیٹیاں اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوتی ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

یہ آواز میری نہیں تھی، کوئی اور بولا تھا میرے اندر سے......!

''پوری ریل الٹ دئی تھی ہم نے تیرے باپ کی جد (ضد) پر سسروا برسوں پاگل رہا تھا، بڑے منوئی مارے گئے تھے، پھر ہم نے کہی اوکا ہم سے جھگڑا نا لے، لاکھن کٹ گئی رہے لاکھن تب پاکستان بنا!''

میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''تُو کسی گدھے کی اولاد ہے بھوریا چرن! ان لاکھوں کا خون پاکستان کی بنیادوں میں پڑا ہے، اس خون کے گارے سے پاکستان کی تعمیر ہوئی ہے اور تُو نے یہ سہرا اپنے سر باندھ لیا تُو جو پاکستان کے ایک معمولی سے بیٹے کے ہاتھوں سے ہاتھ، پاؤں تڑوا کر بھیک مانگتا پھرا ہے۔''

بھوریا چرن کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ وہ مجھے گھورتا رہا پھر واپس مڑا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے بھی غصہ آیا لیکن پھر میں نارمل ہو گیا۔ تشویش ہونا قدرتی امر تھا لیکن اللہ پر بھروسہ تھا، البتہ یہ سوچ رہا تھا کہ بھوریا چرن کو میرے کلکتے جانے سے کیا خطرہ ہے۔ یہ بھی میں نے سن رکھا تھا کہ کالی کلکتے سے منسوب ہے اور بھوریا چرن کالی پنتھ سے ہے یعنی کالی کے مسلک سے جو کالے جادو کی دیوی ہے۔

بے شمار باتیں ذہن میں فلم کی طرح چلنے لگیں۔ نینی تال سے بمبئی آنا، پراسرار شخصیت حکیم سرمد نے یکدم ممبئی کا نام لیا تھا اور ہم ممبئی آ گئے تھے پھر ان کا بے تکے انداز میں فلم انڈسٹری سے دلچسپی ظاہر کرنا اور اس طرح ہمارا مینا تک پہنچنا اور مینا کی وجہ سے کلکتے جانے کا فیصلہ کرنا، پھر بھوریا چرن کی پریشانی......! وہ ہمیں کلکتے جانے سے روکنا چاہتا تھا، کیوں......؟ ایک دلچسپ صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔

مراحل طے ہوئے۔ بھوریا چرن دوبارہ میرے پاس نہیں آیا۔ حکیم صاحب نے خود ہی سفر کے سارے انتظامات کیے۔ مینا تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ہر وقت اپنے گھر، ماں، باپ اور بہن، بھائیوں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ اب تک خوف و ہراس کی زندگی گزارنے والی بچیوں کے چہرے بھی پھول کی طرح شگفتہ ہو گئے تھے۔ بھوریا چرن نے دھمکیاں دی تھیں کہ وہ ان تینوں ماں بیٹیوں کو مار ڈالے گا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ اب مجھے حکیم سرمد پر بھی پورا بھروسہ ہو گیا تھا۔

کلکتے تک کے سفر میں پوری طرح محتاط رہا۔ راستے میں کئی جگہ ایسے شبہات ہوئے جیسے ٹرین کو کوئی حادثہ پیش آنے والا ہو لیکن خیریت رہی۔ ایک بات خاص طور سے محسوس کی کہ حکیم صاحب پورے سفر میں ہمارے ساتھ نہیں رہے تھے، البتہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ آ جاتے تھے۔

''آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں حکیم صاحب......؟'' ایک بار میں نے پوچھا۔

''بھئی انجن ڈرائیوروں کو ریل چلانا سکھانا پڑ رہا ہے، پٹریوں کی نگرانی بھی کرنی پڑ رہی ہے۔'' انہوں نے اپنے مست انداز میں جواب دیا تھا۔

پھر ہم کلکتہ پہنچ گئے۔ بالکل مختلف شہر، اپنی خاص روایات کا حامل! مینا کے گھر کی داستان طویل تھی۔ اس کا باپ رکشہ چلاتا تھا، تین بھائی محنت مزدوری کرتے تھے۔ مینا اپنے ماں، باپ سے ملی۔ رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے لیکن ہم وہاں زیادہ نہیں رکے۔ حکیم صاحب نے مینا کو بہت بڑی رقم دی تھی اور یہ کہہ کر نکلے تھے کہ وہ ان کی اور بھی مدد کریں گے، پھر ہم ایک ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔

پُرسکون ہونے کے بعد میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ''آپ بمبئی مینا کے لیے ہی آئے تھے نا......؟''

''وقت ہی تقدیر ہے اور وقت کے فیصلے ناقابلِ فہم اور مستحکم ہوتے ہیں، سارے عمل ایک سسٹم کے تحت ہوتے ہیں۔''

''آگے کیا کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سوال تم مجھ سے کر رہے ہو؟''

''مطلب......؟''

''آگے کیا کرنا ہے، کسی کو معلوم ہے؟''

''آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟'' میں نے جھلا کر کہا اور حکیم صاحب مسکرا دیئے۔

''نہیں!'' انہوں نے کہا۔

''کیوں......؟''

''کیونکہ اس کا جواب نہیں دے سکوں گا اور اگر میں بھی تم سے ایسا ہی کوئی سوال کروں تو تم بھی اس کا کوئی جواب نہیں دے سکو گے۔''

میں انہیں دیکھتا رہا اور وہ مسکراتے رہے، پھر بولے۔ ''اچھے بچے غصہ نہیں کرتے اور تمہیں جو غصہ آیا ہے، وہ کسی اور ہی بات کی علامت ہے۔''

''کس بات کی......؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم!''

میں خاموش ہو گیا۔ واقعی اب تک مجھے کسی بات پر غصہ نہیں آیا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں حکیم صاحب پر غصہ آ گیا تھا۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ عجیب لگ رہے تھے، پھر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''آپ سوتے وقت بھی یہ ٹوپی نہیں اتارتے، کیا یہ بھی آپ کی اہلیہ کا تحفہ ہے؟''

''نہیں! یہ کسی اور کا تحفہ ہے۔''

''کم از کم اس میں پھندنا ہی لگوا لیجیے، یہ ٹونٹی سی کھڑی بری لگتی ہے۔''

''ارے نہیں عزیزم! اس کے بہت سے عمل ہیں، خطرے کے وقت یہ راڈار کا کام کرتی ہے اور دشمن کے حملہ آور ہونے کا پتا چل جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ انٹینا کا کام بھی کرتی ہے اور مجھے ضروری پیغامات موصول ہوتے رہتے ہیں، مزید یہ میموری کارڈ بھی ہے، اس میں بہت سی یادداشتیں محفوظ رہتی ہیں، تجربہ کرو گے؟'' انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''کیسا تجربہ؟''

''اس ٹوپی کا......!''

''لایئے۔'' میرا موڈ بدل گیا اور انہوں نے ٹوپی سر سے اتار کر مجھے دیدی۔ تیل سے چکٹی ہوئی، میلی کچیلی سی لیکن میں نے اسے سر پر رکھ لیا۔

''واہ! بالکل لنگور لگ رہے ہو۔'' حکیم صاحب نے ہنس کر کہا، پھر بولے۔ ''اچھا چلو آنکھیں بند کرو۔''

ان کے کہنے سے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بولا۔ ''جی فرمایئے......؟''

''اس نے کسر تھوڑی چھوڑی تھی۔ مینا اور اس کی بچیوں پر سانپ چھوڑا تھا مگر نیولا آ کر سانپ کے ٹکڑے کر گیا، دیکھو!''

اور بند آنکھوں میں فلم چل پڑی۔ مینا اپنی چال کے ایک حصے میں اپنی بچیوں کو نہلا رہی تھی کہ ایک نالی کے سوراخ سے ایک کالے ناگ نے منہ نکالا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کی ننھی چمکدار آنکھیں مینا اور اس کی بچیوں پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک وہ مضطرب ہو گیا اور پیچھے کھسکنے لگا۔ تب باہر کا منظر سامنے آیا جہاں ایک نیولا سانپ کو دم سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ جونہی سانپ پورا باہر نکلا، نیولا اس پر حملہ آور ہو گیا۔ دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ سانپ بھی نیولے پر حملے کر رہا تھا، دونوں پینترے بدل رہے تھے، آخر نیولے کو موقع مل گیا۔ اس نے سانپ کے پھن کو پکڑ لیا اور اسے زمین پر رگڑنے لگا۔ پھر اس نے سانپ کے پھن کو اس کے بدن سے الگ کر دیا اور ایک طرف بھاگ گیا۔ پھر منظر بدل گیا۔ مینا کی چال میں ایک گھڑونچی رکھی ہوئی تھی جس میں پینے کے پانی کے دو گھڑے موجود تھے۔ اچانک گھڑونچی کے پیچھے کی دیوار سے پیلے رنگ کی ایک بڑی مکڑی گھڑے پر گری اور گھڑے پر چلتی ہوئی اُس کے اندر چلی گئی۔ ابھی کچھ لمحے گزرے تھے کہ اس دیوار سے ایک اینٹ گھڑے پر گری اور گھڑا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

''زہر بن گیا تھا اس گھڑے کا پانی! ایک گھونٹ اندر چلا جاتا تو بندہ دوسرا سانس نہ لے پاتا اور دیکھو!'' حکیم صاحب نے کمنٹری کی اور منظر پھر بدل گیا۔ اب ایک ٹرین نظر آئی جو برق رفتاری سے پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔ آگے ریل کی چمکدار پٹری کوئی بیس فٹ کے قریب اکھڑی پڑی تھی۔ ریل اس سے تھوڑے فاصلے پر تھی کہ دور پڑی پٹری کے ٹکڑے آپس میں مل گئے اور ریل بغیر رکے آرام سے اس پر سے گزر گئی۔

''اور دیکھو گے؟'' حکیم صاحب نے کہا۔

''ہاں......!'' میرے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ مجھے بھوریا چرن کی وہ وارننگ یاد آ گئی تھی جو وہ مجھے ہوٹل کے کمرے میں دے کر گیا تھا۔ تو یہ سب کچھ ہوا تھا اور اس کا تدارک بھی کیا گیا تھا۔

''آنکھیں بند ہیں؟'' حکیم صاحب کی آواز ابھری۔

''جی......!'' میں نے کہا۔

''کسی نے کسی سے کہا کہ جب بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز مقرر کر دی ہے کہ جسے جو ملنا ہے، اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے، پھر دعا مانگنے سے کیا فائدہ......! اسے جواب ملا کہ ممکن ہے تقدیر میں لکھا ہو کہ جو ملے گا، وہ دعا مانگنے سے ہی ملے گا، دعا کا بہت بڑا مقام ہے اور تمہارا ہر لمحہ تمہیں دعاؤں کی آغوش میں لیے گزر رہا ہے، ویسے تو اللہ کے فضل سے تمہارا دامن دعاؤں سے بھرا ہوا ہے لیکن کچھ ایسی دعائیں ہیں جو تمہارے سر پر چھتری بنی ہوئی ہیں اور وہ ہمیشہ تم پر سایہ فگن رہتی ہیں، جاننا چاہو گے کونسی......؟''

''ہاں!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آنکھیں مت کھولنا جب تک میں نہ کہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

میرے دل میں بڑی عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ حکیم سرمد بہت پہنچے ہوئے انسان تھے۔ صحیح معنوں میں اب ان کے بارے میں اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کی آواز ابھری۔ ''جن دعاؤں کا میں نے خصوصی تذکرہ کیا ہے، ان میں دو دعائیں ایسی ہیں جنہیں رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اول...... منظر بدل گیا۔ یہ ڈاکٹر شکلا کا کلینک تھا جہاں اوما دیوی بیماری سے اٹھ کر آنکھ کھول رہی تھی اور جے راج اس کا بیٹا اس کے پیروں سے آنکھیں رگڑ رہا تھا۔ اوما دیوی کی آواز ابھری۔ ''بھگوان! جس ماں کے لعل نے تیری مدد سے مجھے نیا جیون دیا ہے، اس کی ماں کے کلیجے کو ٹھنڈا رکھنا بھگوان! اسے سنسار کی ہر مشکل سے بچانا ہے۔ بھگوان! تُو نے جس طرح میرے جے راج کو اچھا انسان بنا کر میرے سینے سے لگایا ہے، اسی طرح اسے اپنی ماں کے سینے سے لگا کر دونوں کو خوشیاں دینا۔''

''اور دوسری دعا......!'' حکیم صاحب نے کہا۔ اور منظر بدل گیا۔ یہ میرا گھر تھا۔ مٹے مٹے نقوش نمایاں ہونے لگے۔ امی نظر آئیں۔ جائے نماز پر خاموش بیٹھی خلا میں گھور رہی تھیں۔ زبان خاموش تھی لیکن آنکھیں بول رہی تھیں اور بولتی آنکھوں کا ہر لفظ سمجھ میں آ رہا تھا۔

''معبودِ عظیم نے یوں تو ساری کائنات کو ذرے ذرے سے سجایا ہے۔ جو کچھ اُس نے اس کائنات کو بخشا ہے، اس کی تفصیل کائنات کے آخری دن تک نہیں جانی جا سکتی۔ انسان لاکھوں بار پیدا ہو کر لاکھوں سال کی زندگی بھی پا لے، تب بھی مالکِ دو جہاں کی نعمتوں کے بارے میں نہیں جان پائے گا، لیکن ان ساری نعمتوں کو سمیٹ کر اس نے ایک وجود تخلیق کر دیا اور اسے ''ماں'' کا نام دیدیا۔ اگر ان تمام نعمتوں کو دیکھنا اور جاننا چاہو تو ایک بار پوری عقیدت، پورے اعتماد سے ماں کو دیکھ لو، یہی وجود کائنات ہے، یہی کائنات ہے، ان آنکھوں کو دیکھو، ان میں دعا ہے۔''

میرے پورے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی، آنکھیں ابلنے کے لیے تیار ہو گئیں تبھی حکیم صاحب کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''میری ٹوپی دیدے بھائی! بائیسکوپ ختم!'' میں نے لرزتے ہاتھوں سے ٹوپی اتاری اور حکیم صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا۔ کوشش کے باوجود میرے آنسو نہیں رکے اور میں روتا رہا۔ امی کی آنکھوں کی بے بسی میرا کلیجہ چیر رہی تھی۔

کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی۔ خاصی دیر اسی طرح گزر گئی۔ حکیم صاحب بھی کچھ نہیں بولے تھے۔ طبیعت کچھ سنبھلی تو میں نے حکیم صاحب کو پکارا لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ میں نے انہیں کمرے میں پھر واش روم میں ہر جگہ دیکھا، نظر نہیں آئے شاید باہر نکل گئے تھے۔ جب بہت وقت گزر گیا۔ میں نے باہر نکل کر انہیں تلاش کیا، وہ نہیں ملے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ رات کو بھی واپس نہیں آئے، دوسرے دن صبح کو بھی پھر پورا دن، پھر تین دن بعد میں مایوس ہو گیا۔

جہاں مینا کا گھر تھا، وہاں جا کر بھی دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھے۔

حکیم صاحب شاید مجھے چھوڑ گئے تھے، ان کا میرا اتنا ہی ساتھ تھا۔ سخت الجھن کا شکار ہو گیا۔ اب کیا کروں...... بھوریا چرن مجھے کلکتہ آنے سے کیوں روک رہا تھا۔ ایسی کیا وجہ تھی، اس خاص بات کی تلاش میں سڑکوں پر نکل آیا۔

کلکتہ ایک بہت ہی گنجلگ اور بڑی آبادی کا شہر ہے۔ ہر طرف سڑکوں پر ہتھ رکشے، سائیکل رکشے اور گھوڑے والے تانگے، ہر سڑک پر بے پناہ رش......!

دیر تک گھومتا رہا، پھر اچانک میں نے ایک لڑکی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف متوجہ تھی۔ میں چونک کر رک گیا۔ گہری آبنوسی رنگت، تیکھے نقوش، شربتی آنکھیں، بے حد سحر انگیز اور پرکشش شخصیت تھی۔ میرے قریب آ کر وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''میرا نام کالی ہے۔''

(جاری ہے)

ایم اے راحت

آخری قسط

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی سحر انگیز آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک میرے ذہن کو کرنٹ لگا۔ کالی! کلکتے والی......! اور میں کلکتے میں تھا۔

''کسی کا سندیس لائی ہوں آپ کے لیے۔'' اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

''کون ہیں آپ! کیسا سندیس؟'' میں نے سنبھل کر کہا۔

''ایک پوتر آتما، جو آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں آپ کو نہیں جانتا۔''

''جانتے ہیں مہاراج! پوری بات میرے گھر چل کر ہو جائے گی، آیئے...... اے تانگے والے!'' اس نے پاس سے گزرنے والے تانگے کو روکا اور تانگہ رک گیا۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''آپ کی مہانتا کو میں جانتی ہوں، مجھے پتا ہے کہ آپ کسی سے ڈرتے نہیں، پر اس سمے آپ کا ڈر میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''چلیے آپ کی خوشی بھی پوری کر دی جائے۔'' میں نے کہا اور تانگے میں سوار ہو گیا۔

''کالی کنڈل!'' لڑکی نے تانگے والے سے کہا اور تانگے والے نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ ''آپ کالی کے نام سے ڈر گئے تھے شاید! یہ کالی رانی کی جنم بھومی ہے، یہاں ہر تیسری لڑکی کا نام کالی ہے، ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اب میں مطمئن ہو گیا تھا۔ کسی اجنبی شہر میں ایک خوبصورت لڑکی اگر کسی کو ساتھ چلنے کی پیشکش کرے تو برے خیالات دل میں جنم لیتے ہیں لیکن اب اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اور ہی کھیل ہے۔ راستے میں بہت سے خیالات دل میں آ رہے تھے۔ بھوریا چرن مجھے کلکتے آنے سے روکنا چاہتا تھا، ضرور اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔

راستے طے ہوتے رہے اور پھر تانگہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے خود ہی تانگے والے کو پیسے دیئے اور بڑے پیار سے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم پیدل چل پڑے، خاصے فاصلے پر کالی نواس نظر آ رہا تھا یعنی کالی کا مندر......! راستے بڑے غلیظ تھے، کبھی کوئی گائے سامنے آ جاتی، کبھی کوئی ٹھیلہ! ہر طرف دھوتی بردار لوگ نظر آ رہے تھے۔ کالی کے مندر کے سامنے بھکاریوں کی فوج موجود تھی۔ مرد، عورتیں، بچے انتہائی گندے اور کریہہ......!

مندر کی عمارت بے حد پرانی لیکن بہت وسیع و عریض تھی مگر سامنے کے رخ پر سنہرے اور نقرئی کلس نظر آ رہے تھے، سونے اور چاندی کے کلس......! ہم آگے بڑھے تو بھکاری بھرّا مار کر ہماری طرف لپکے لیکن پھر ایک دم رک گئے۔ ان کے چہرے خوف سے سکڑ گئے تھے۔ کالی سنجیدگی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی تو بھکاری دونوں سمت ہٹ گئے اور ہم ان کے درمیان سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔

آخر کار ہم مندر میں داخل ہو گئے تھے۔ اندر بھی خاصی بھیڑ تھی، ہر طرف قربانی کی غلاظت بکھری ہوئی تھی۔ کالی مجھے لے کر آگے بڑھی اور پھر اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ اندر نیم تاریک ماحول تھا۔

یہاں مجھے کالی کا اصل مجسمہ نظر آیا۔ دنیا کی بھیانک ترین تخلیق! یہ سنہری مجسمہ چار فٹ اونچا تھا، کئی آنکھیں، بہت سے ہاتھ، کھلا ہوا منہ، باہر نکلی سرخ زبان......! میں نے اسے دیکھا اور پھر کالی کی طرف......! وہ سرد نگاہوں سے اس مجسمے کو دیکھ رہی تھی پھر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ہر طرف خاموشی پھیلتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب سی خاموشی، جیسے بے شمار لوگ یہاں سے چلے گئے ہوں۔

میں نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے سو گئی ہو، پھر وہ چند قدم آگے بڑھی اور کالی کے مجسمے کے بالکل پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کے منہ سے چند نامانوس الفاظ نکلے اور فضا میں سفید دھواں بلند ہونے لگا۔ دھوئیں میں بڑی تیزی تھی، آنکھوں میں مرچیں لگنے لگیں اور میں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ ایسا صرف چند منٹ ہوا، پھر ایک دم ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا لیے پھر ایک دم حیران ہو گیا۔

مندر کی شکل بدل گئی تھی۔ وہ بھیانک مجسمہ اب وہاں موجود نہیں تھا بلکہ اس کی جگہ ایک زرنگار تخت نظر آ رہا تھا اور اس پر وہی لڑکی نظر آ رہی تھی لیکن بڑی شان کے ساتھ......! تخت کے ساتھ کئی پجاری یوگا کے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کالی کے چہرے پر جلال نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کسی نامانوس زبان میں کچھ کہا اور کہیں دور سے آواز آئی۔

''جے مہا کالی......!'' کالی کے ارد گرد بیٹھے پجاریوں نے بلند آواز میں ان الفاظ کو دہرایا۔

تب کالی کی آواز ابھری۔ ''بھوریا چمار کو لاؤ۔''

میں چونک پڑا۔ بھوریا چمار یقیناً بھوریا چرن کو کہا گیا تھا۔ میری نگاہیں مندر میں بدلے ہوئے اس ماحول کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہی تھیں۔

کچھ دور کوئی تحریک محسوس ہوئی پھر کچھ لوگ نظر آئے جن کے درمیان بھوریا چرن موجود تھا۔ اس وقت اس کے نچلے بدن پر صرف چھوٹی سی دھوتی تھی۔ سوکھا چرخ لیکن اس وقت اس کے چہرے پر خوف نظر آ رہا تھا۔ اسے لانے والے قریب آ گئے اور اسے کالی کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ میں نے بھوریا کے بدن میں تھرتھری دوڑتے دیکھی۔ وہ سہمی نظروں سے کالی کو دیکھ رہا تھا۔

''کہا تھا تجھ سے اس سمے چمار کی اولاد، کہ بڑائی بڑوں کو ملتی ہے، نیچ نیچ ہی رہتے ہیں، منع کیا تھا کہ یہ تپسیا نہ کر، جھوٹ کہا تھا ہم نے......؟''

''ہم نے ہار کب مانی رہے کالی ماں!'' بھوریا چرن منمنایا۔

''کتنا بدنام کر دیا تو نے کالی پنتھ کو، کتنی بار جوتے کھائے ہیں اس ملچھ سے!'' اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا اور میں نے حیرت سے کالی کو دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت تھی۔ ''کیا بگاڑ لیا تو نے اس کے پتا کا اور کیا بگاڑ لیا تو نے اس کا!''

''مگر اب ہو ہمار کام کرے گا کالی ماں!'' بھوریا چرن بولا۔

''بے شرم ہے تو، شنکھا ہو کر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا بلکہ اس کے ہاتھوں لولا لنگڑا ہو کر بھیک مانگتا رہا، سارے کال نگر میں تجھ پر تھو تھو ہو رہی ہے، تو نے کھنڈولا بننے کے لیے پہلا کام ہی غلط کیا اور دیکھ لے، یہ کالی نواس تک آ گیا تو اسے یہاں آنے سے نہیں روک سکا۔''

''میں اپنا کام کرتئی ہے کالی ماں! ابھو تک میں نے نرمی سے کام لیا پر اب......!''

''اب......؟'' کالی نے زہر خند سے کہا۔ ''اب اس کا سمے کہاں رہ گیا ہے، ان لوگوں کو دیکھ رہا ہے، یہ کون ہیں؟'' اس نے کالی سنگھاسن کے گرد یوگا کے آسن میں بیٹھے پجاریوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

پھر وہ ان کے نام اور ان کی صفات دہرانے لگی۔ یہ سب کالی کے داس اور کالے جادو کے ماہر تھے۔ کالی جب بھی کسی کا نام اور اس کے ملک کا نام لیتی، تب میں غور سے اس کی شکل دیکھتا۔ اس سے پہلے میں نے ان پر غور نہیں کیا تھا۔ ان کا تعلق کئی ملکوں سے تھا۔ ''یہ سب تیرے لیے آئے ہیں، ان سب نے تیرے بارے میں فیصلہ کیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ......؟''

''تو جانتا ہے بھوریا چرن! تو جانتا ہے، بھاگا بھاگا پھرتا رہا ہے کلکتے آنے کے ڈر سے، تیرا انت تو کہیں بھی ہو سکتا تھا، پر تو جانتا تھا کہ تجھے سزا کالی نواس سے ہی ملے گی پر تو اتنا نکما نکلا کہ اسے یہاں آنے تک سے نہ روک سکا۔''

''ہم نکمے نا ہیں رہیں کالی متا......! دیکھ لے اندھ مچا دیا تھا ہم نے ہندوستان بھر ماں، اتنے جیون تیری بھینٹ کیے کہ دھرتی لال ہو گئی تھی، بھولی نا ہیں ہو گی۔''

''ہاں! پر اس کے پتا کو تو اپنے کام کے لیے مجبور نہیں کر سکا، یہ کون سی کامیابی تھی تیری! نردوش تو سنسار میں ہر جگہ ہی مرتے ہیں، تو نے کون سا نیا کام کیا، تو نکما ہے، نکما ہے! سب کا یہی فیصلہ ہے کہ تجھے کال پنتھ سے نکال دیا جائے اور اسے بدنام کرنے کی سزا دی جائے۔''

''ایسا نہ کرو ماں! میں نے دو جنم جھیلے ہیں، بڑے کشٹ اٹھائے ہیں، دو بار سنکھا سکتی حاصل کی ہے۔'' بھوریا چرن بولا۔

''نہیں! تیرے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔''

''کا فیصلہ ہوئی رہے ماں......؟'' بھوریا چرن کا لہجہ بدل گیا۔

''اب سنسار کو تیری ضرورت نہیں ہے۔''

''سنسار کی بات مت کرو میّا! یوں کہو کال پنتھ میں ہماری جگہ نا ہیں رہی۔''

''نہیں! تجھے سنسار سے جانا ہو گا۔''

''تم جانت رہو کالی میّا! سنکھا کے تین جنم ہوویں ہیں، ای ہمار دوسرا جنم رہے، تم ہم کا سجادی دو پر ہم تیسرا جنم لیں گے اور اس تیسرے جنم میں ہم کالی پنتھ مانا ہیں گنیشوری گرنتھ ما چلے جائی رہے، کالی پنتھ پر بہت برا سمے آ جائی رہے۔'' بھوریا چرن نے خطرناک لہجے میں کہا۔

کچھ لمحے خاموشی طاری رہی، پھر کالی کی آواز ابھری۔ ''تم نے دیکھا شکتی مانو! اس نے کیا کہا ہے، یہ ٹھیک کہتا ہے، یہ تیسرا جنم ضرور لے گا اور اس تیسرے جنم میں یہ ہمارے دشمن پنتھ میں ہو گا، دشمنی کا اعلان اس نے کالی نواس میں کھڑے ہو کر کیا ہے، دشمن کے ساتھ کیا سلوک کرو گے تم لوگ......؟''

یوگا کے آسن میں بیٹھے تمام پجاری کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی تھیں اور وہ خونی نظروں سے بھوریا چرن کو دیکھ رہے تھے۔

بھوریا چرن نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہماری بات مان لیتا تو ای نا ہیں ہوت رہے، تیرا سارا سنسار کالا کر دئی رہیں، گنیشوری میّا کی سوگند!''

''امرت جل پلاؤ اسے رے، گنیشوری کا حل ہے۔'' کالی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اور ایک طرف سے دو پجاری نمودار ہوئے۔ دونوں نے ایک طشت سنبھال رکھا تھا جس میں چاندی کا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا۔ اس پیالے سے اس طرح تپش اٹھ رہی تھی جیسے اس میں انگارے دہک رہے ہوں۔ وہ یہ پیالہ لے کر بھوریا چرن کے پاس آ گئے۔

''ای کا رہے؟'' بھوریا چرن خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''امرت جل ہے، یہ تجھے سیدھا گنیشوری کے چرنوں میں پہنچا دے گا۔''

''ارے دیا رے دیا! ای تو تیجاب (تیزاب) رہے، نا کالی ماتا نہ......! ایسا نا کر جیون بھر تو ہار جاپ کری رہے نا، ارے نا......!'' بھوریا چرن مچلنے لگا۔ اپنے آپ کو ان دونوں پجاریوں سے چھڑانے لگا جو اسے پکڑے ہوئے تھے۔

ایک بار وہ ان کے چنگل سے نکل کر بھاگا تو سارے پجاری اس کے پیچھے دوڑ پڑے اور اسے آن کی آن میں جا لیا، پھر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کالی سنگھاسن کے سامنے لے آئے۔

بھوریا چرن چیخ رہا تھا۔ ''نا کر کالی مائی...... نا کر ایسا...... نا کر!''

لیکن پجاریوں نے اسے نیچے لٹا دیا۔ وہ لاتیں گھونسے چلا رہا تھا لیکن بے شمار پجاریوں نے اسے دبوچ رکھا تھا۔ انہوں نے زبردستی اس کا منہ کھولا اور سیال اس کے حلق میں انڈیل دیا۔

اس کی آنکھیں ابل پڑی تھیں، آواز گھٹ گئی تھی۔ قاتل سیال جو تیزاب تھا یا زہر، اس کے حلق میں جا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ ساکت ہو گیا۔ اس کے بدن سے جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کے بعد پجاریوں نے اسے پیروں سے کوٹنا شروع کر دیا اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئیں۔

''گنیشوری کے ہونے والے پنچھی کو ہم نے پیدا ہونے سے پہلے ختم کر دیا۔'' کالی کی آواز ابھری۔

میں نے بھوریا چرن کا انجام دیکھ لیا۔ اسے اسی نے مارا تھا جس کے بل پر وہ دنیا کا سب سے طاقتور شیطان بننا چاہتا تھا۔ یہ سب میرے سامنے ہوا تھا لیکن میرے دل میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ تب کالی نے نفرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''تجھے یہ سب دکھانے کے لیے میں یہاں لائی تھی، اس کا انت تیرے سامنے ہونا تھا، یہاں کوئی دین دھرم کا کام مت کرنا، ابھی تجھے یہاں سے باہر نکال دیا جائے گا، یہ پوتر استھان ہے، یہاں کسی ملچھ کے لیے جگہ نہیں ہے۔''

میں ہنسنے لگا۔ ''تو گھبرا رہی ہے کالی! اپنے گھر میں ہو کر گھبرا رہی ہے، تو جسے پوتر استھان کہہ رہی ہے، ہم اسے ایک انتہائی ناپاک جگہ تصور کرتے ہیں، کالے جادو کا کوئی دھرم نہیں ہوتا، اس کا بانی شیطان ہے اور اس کے پیروکار شیطان کے چیلے جن کا کوئی مذہب نہیں۔''

''بھوریا چرن ختم ہو گیا لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ ایسا تیری وجہ سے ہوا ہے، تو کیا سمجھتا ہے میں تجھے چھوڑ دوں گی، جا نکل جا یہاں سے، باہر تیرے لیے نرکھ تیار ہے۔''

''جاؤں......؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جنگا سری اسے دروازے سے باہر نکال دو۔'' کالی نے کہا اور تخت سے نیچے اتر گئی۔

ایک پجاری نے کہا۔ ''آؤ۔''

میں اس کے ساتھ آگے بڑھا اور اس ہال نما جگہ سے باہر آ گیا۔ بہت سے اجنبی راستوں سے گزر کر جنہیں میں نے یہاں تک آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، میں باہر نکل آیا۔

لیکن......! باہر کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا، یوں لگتا تھا جیسے ڈاکوؤں کے کسی پورے گروہ سے نمٹنے کی تیاریاں ہوں۔ جہاں تک نگاہ جاتی، پولیس کے جوان نظر آ رہے تھے۔ بے شمار پولیس والے رائفلوں سے پوزیشن لیے مستعد تھے۔

میں نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا۔ مندر کے دروازے سے چند گز دور پولیس کے اعلیٰ عہدیدار نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم آفیسر نے جس کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا، مجھ پر پستول تان کر کرخت لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر کامران مسعود! تمہیں حراست میں لیا جاتا ہے، کسی بھی فرار ہونے کی کوشش پر تمہیں فوری ہلاک کر دیا جائے گا۔''

''ایک ہی بات ہے ایس ایس پی صاحب! ہلاک کر دیں یا حراست میں لے لیں کیونکہ حراست میں لینے کے بعد بھی آپ یہی عمل کریں گے۔'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا اور ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

دوسرے افسران نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ آس پاس کے گھروں سے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے، بہت سے لوگ چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ پولیس کے جوان سمٹنے لگے۔ میں نے اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ جو تماشا میں نے کالی نواس کے اندر دیکھا تھا، وہی ابھی تک دماغ کو چکرائے ہوئے تھا۔ کچھ دیر کے لیے حواس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لایا گیا، لاک اپ کیا گیا جہاں میرے پیروں میں وزنی بیڑیاں ڈالی گئیں اور دوسرے ایسے انتظامات کیے گئے کہ اگر میں فرار ہونے کی کوشش کروں تو ساری انتظامیہ حرکت میں آ جائے۔

لاک اپ میں رات ہو گئی۔ جو کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں، وہ بڑا خوفناک تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پولیس کی جان پر بنی ہو کہ میں فرار نہ ہو جاؤں اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ بھوریا چرن کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، کیا وہ سب حقیقی تھا۔ کیا بھوریا چرن اچانک کسی طرف سے نمودار نہیں ہو جائے گا، اس کے علاوہ اب میرے ساتھ کیا ہو گا۔ وہ سب کچھ تو عرصے سے ختم ہو گیا تھا جس کے تحت میں ہر طرح کی قید سے ایسے نکل جاتا تھا جیسے مکھن سے بال!

پھر حکیم سرمد یاد آئے۔ کوئی شک نہیں رہا تھا کہ ان کا کام مجھے کلکتہ تک پہنچانا تھا۔ کام ختم کر کے وہ واپس چلے گئے۔ ایک ایک بات یاد آئی۔ بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک تھے، ان کی کوئی بات سنجیدہ نہیں تھی۔ آلو کے کباب، نینی تال، فلمی زندگی سے دلچسپی......! بمبئی صرف اس لیے آئے تھے کہ مینا کو اس کے گھر پہنچا دیں اور اب......!

رات گزر گئی۔ دوسرے دن پھر اسی افسر اعلیٰ نے مجھ سے ملاقات کی۔ مجھے لاک اپ سے باہر نہیں نکالا گیا تھا بلکہ وہ خود لاک اپ میں آ گیا تھا۔

''میرا نام بلراج گوسوامی ہے مسٹر کامران!''

''جی بلراج جی!'' میں نے کہا۔

''ایک بات بتائیں آپ کے بارے میں سنا ہے کہ جیل، ہتھکڑیاں یا بیڑیاں آپ کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں پھر آپ نے ہمارے لاک اپ میں ایک پُرسکون رات کیسے گزار لی؟''

''آپ کی مہمان نوازی مجھے بہت اچھی لگی ہے، آپ جب تک خود مجھے یہاں سے نہیں نکالیں گے، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''ذاتی طور پر میں آپ سے بہت متاثر ہوں ڈاکٹر کامران! لیکن قانون، قانون ہے، آپ کی گرفتاری، آپ کی نگرانی میرا فرض ہے، میں آپ سے کوئی درخواست نہیں کروں گا کہ آپ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ آپ جو کرنا چاہیں کریں، میں وہ کروں گا جو دوسرے نہیں کر سکے یعنی میں آپ کو فرار ہونے سے روکوں گا۔ ہمارے بیچ یہ دلچسپ کھیل ہو گا، البتہ ایک بات ضرور کہوں گا۔''

وہ رکا تو میں نے کہا۔ ''جی مسٹر گوسوامی......؟''

''آپ ایسی کوشش نہ کریں۔''

''آخر کیوں......؟'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''بھگوان کی سوگند! یہ شبد میں عقیدت سے کہہ رہا ہوں، آپ نے فرار کی کوشش کی اور میرے ہاتھوں مارے گئے تو مجھے جیون بھر افسوس رہے گا اور اگر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو میرا سارا کیریئر تباہ ہو جائے گا، بنگال پولیس میں میرا ایک نام ہے، میرے پاس کامیابی کے اتنے میڈل ہیں کہ انہیں گننا مشکل ہو جائے، آپ میرے چنگل سے نکل گئے تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔''

''ارے گوسوامی جی! اچھا ایک بات بتایئے میرے اوپر یہیں کلکتہ میں مقدمہ چلے گا؟''

''نہیں! دہلی میں، کیوں......؟''

''ایسے ہی پوچھ لیا تھا، ایک بات کہوں؟'' میں نے رازداری سے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔ ''میں نہیں بھاگوں گا۔''

بلراج بہت اچھا انسان تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کے اس لاک اپ کی نگرانی اتنی سخت تھی کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکے لیکن بلراج نے میرے لیے بہترین بندوبست کیا تھا۔ مجھے سبزی وغیرہ کھانے کو دی جاتی تھی، پھل اور چائے بھی باقاعدگی سے ملتی تھی، شیو کا بھی بندوبست کیا گیا تھا، پھر میری خواہش پر میرے لیے اردو اخبار بھی مہیا کیے گئے جو میرے لیے سب سے بڑا تحفہ تھے۔ یہاں بنگلہ اور ہندی اخبار ملتے تھے۔ گوسوامی نے یہ اخبار دہلی سے منگوائے تھے۔ اخبارات نے میرے بارے میں جو لکھا تھا، وہ بہت دلچسپ تھا۔ بڑی مزیدار سرخیاں جمائی گئی تھیں۔

پراسرار قوتوں کا مالک کالی کے دیس میں پھنس گیا۔

اس نے بڑا اودھم مچایا تھا مگر کالی ماتا نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

ڈاکٹر نیمو کا قاتل پکڑا گیا۔

اخبارات میں میرے خلاف نہ جانے کیا کیا لکھا تھا۔ میں بے گناہ تھا، بس اپنے ایمان کی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ بھوریا چرن کتے کی موت مارا گیا تھا اور اب میری تقدیر کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ بلراج گوسوامی نے لاک اپ میں مجھے نماز کی آسانی بھی فراہم کی تھی۔ جائے نماز، لوٹا اور ٹوپی مجھے فراہم کیے گئے تھے۔ اخبار باقاعدگی سے مل جاتے تھے جن سے مجھے اپنے بارے میں پتا چل جاتا تھا۔

انتظامیہ میرے لیے پوری طرح انتظام کر رہی تھی کہ اس بار میں موت کے شکنجے سے نہ نکل سکوں۔ آخر کار مجھے پتا چلا کہ آگرہ پولیس کمشنر سریش چندر مجھے لینے آ گیا ہے۔ اس نے یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی اور پھر سریش چندر میرے سامنے آ گیا۔

''تمہیں موت کی سزا دلوا کر ترقی پانے کی کوئی خواہش میرے من میں نہیں ہے ڈاکٹر کامران! بس میں اپنی موسی کی آتما کو شانت کرنا چاہتا ہوں۔''

''میری موت کے بعد جب تک زندہ رہو گے سریش چندر! بے سکون رہو گے کیونکہ یہ پتا تمہیں ضرور چلے گا کہ اسے میں نے قتل نہیں کیا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

کیا زبردست انتظامات کیے تھے۔ سریش چندر نے مجھے دہلی لانے کے اور کیا ہی شاندار جگہ مجھے لاک اپ کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی قہقہہ بار عمل اور کیا گیا تھا، وہ یہ کہ میری نگرانی کے لیے پولیس تو تھی ہی، بہت سے سادھو سنتوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا جو ان پراسرار قوتوں سے مقابلے کے لیے بلائے گئے تھے جو نامعلوم طریقے سے مجھے ہر قید سے آزادی دلا دیتی تھیں۔

پھر اور بھی بہت سی خبریں اخبارات کے ذریعے سامنے آئیں۔ میرے بارے میں مختلف رائے تھیں۔ کچھ لوگ میرے ہمدرد بھی تھے اور میرے بارے میں اپنی رائے بلا جھجک پیش کرتے تھے۔ عوام نے یہ بھی کہا کہ مجھے ٹی وی پر پیش کیا جائے لیکن انتظامیہ نے اپنے خدشات کی بنیاد پر یہ مطالبہ منظور نہیں کیا۔ آخر کار مجھے عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

ابتدائی کارروائی کے بعد مجھ سے پوچھا گیا۔ ''کیا آپ نے یہ قتل کیا ہے؟''

''نہیں!'' میں نے جواب دیا۔

''کیا آپ اس بات پر روشنی ڈال سکتے ہیں ڈاکٹر کامران کہ اگر آپ نے ڈاکٹر نیمو کو قتل نہیں کیا تو پھر وہ آپ کے بستر پر مردہ کیسے پائی گئیں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر بہت سے سوالات مجھ سے کیے گئے مگر میں نے ان کے جواب دینے سے معذرت کر لی۔ میں نے کہا کہ اس ایک جواب کے بعد میں کوئی اور جواب نہیں دوں گا کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا، اگر ثبوت اور شواہد میرے خلاف ہیں تو مجھے سزا دے دی جائے۔

سریش چندر نے میرا ریمانڈ لے لیا۔

لیکن دوسرے دن ہی خبر ملی کہ پورے ہندوستان کی میڈیکل آرگنائزیشن نے چار گھنٹے کی ہڑتال کی ہے۔ اس کا مطالبہ تھا کہ ایک پُروقار اور بے پناہ قابل ڈاکٹر کی شخصیت کا احترام کیا جائے اور اسے کوئی جسمانی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ میرے لیے کوئی قابل وکیل کیا جائے اور جب تک میرے بارے میں سزا کا فیصلہ نہ کیا جائے، مجھے ہر طرح کی سہولت دی جائے۔

میں اس خبر سے بہت متاثر ہوا تھا۔

دوسری پیشی کے بعد مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ سریش سے اس بار میری ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن جیل میں اس نے مجھ سے ملاقات کی۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''آپ ابھی تک نہیں بھاگے......؟'' وہ بولا۔

''موقع کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اس بار دیر ہو گئی۔'' اس نے طنز کیا۔

''ہاں! اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ ہنس پڑا۔

''آپ یقین کریں ڈاکٹر! اگر آپ میری موسی کے قاتل نہ ہوتے تو آپ سے دوستی کرتا لیکن موسی مجھے بہت پیاری تھی اور اب......!'' اس نے اپنا الٹا ہاتھ سامنے کیا جس میں جست کا ایک کڑا پڑا ہوا تھا۔ پھر بولا۔ ''یہ ایک سوگند ہے، ہتھکڑی ڈالی ہے میں نے اپنے ہاتھ میں، اس وقت اتاروں گا اسے جب آپ کو سزائے موت ہو جائے گی۔''

''گڈ......!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

وہ مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

جیل میں مجھے انتہائی خطرناک قیدی کی حیثیت دی گئی تھی اور ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں چوبیس گھنٹے سخت نگرانی کی جاتی تھی۔

یہاں آئے ہوئے آٹھویں رات تھی۔ بس سوتا جاگتا رہتا تھا۔ اکثر جب نیند نہیں آتی تھی تو نفل پڑھنے بیٹھ جاتا تھا اور میرے وجود میں سکون کا سمندر موجزن ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ کے سامنے سربسجود تھا کہ لاک اپ کے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ سجدے سے اٹھ کر سلام پھیرا اور سلاخوں کے دروازے کی طرف دیکھا۔

باہر ہر وقت تیز روشنی رہتی تھی تاکہ مجھ جیسے خطرناک قیدی پر نگاہ رکھی جا سکے۔ اس تیز روشنی میں، میں نے ان لبادہ پوشوں کو دیکھا جن کے چہرے تک ڈھکے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک سلاخوں والے دروازے کو کھول رہا تھا۔ لمحوں کے اندر دروازہ کھل گیا اور پانچ افراد اندر داخل ہو گئے۔ پورے قید خانے میں سحر انگیز خوشبو پھیل گئی تھی۔

میں آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''چلو......!'' ان میں سے ایک نے آہستہ سے کہا لیکن یہ آواز مجھے جانی پہچانی محسوس ہوئی البتہ یہ یاد نہیں کہ کس کی آواز تھی۔ میں نے باہر گشت کرتے مسلح سنتریوں کو دیکھا۔ وہ اسی طرح اپنی ڈیوٹی پر مستعد تھے۔

''آؤ!'' اسی لبادہ پوش نے کہا اور میری کلائی پکڑ لی۔ میں ہچکچائے قدموں سے آگے بڑھا اور لاک اپ سے باہر نکل آیا۔ کسی بھی سنتری کے انداز سے یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ اسے لاک اپ کھلنے کا علم ہے یا اس نے ہمیں باہر نکلتے دیکھا ہے۔ یہ کیفیت تمام راستے رہی، پھر ہم باہر نکل آئے۔ جیل سے باہر خاموشی طاری تھی البتہ ایک کار کھڑی نظر آ رہی تھی۔

''جاؤ اس کار میں بیٹھ جاؤ۔'' لبادہ پوش نے کہا اور میں خاموشی سے کار میں جا بیٹھا۔ وہ سب وہیں کھڑے رہے تھے۔ کار اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔ نہ جانے کتنی دیر کار کا سفر جاری رہا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں، پھر وہ ایک تاریک عمارت میں داخل ہو کر رک گئی۔ کسی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

''نیچے اتر آیئے۔'' میں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ افلاک تھا۔ میں نیچے اتر آیا۔ میں نے افلاک سے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ عمارت قطعی غیر مانوس تھی بس افلاک جانا پہچانا تھا۔ وہ مجھے لیے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ جس ہال میں وہ داخل ہوا تھا، وہ بے حد وسیع تھا۔ فرش پر دریاں اور چاندنی بچھی ہوئی تھی، تیز روشنیاں جل رہی تھیں۔

''آپ کے لیے کھانا لاتا ہوں۔'' افلاک نے کہا۔

''نہیں افلاک! چنداں بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی مشروب......؟''

''حاجت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''آیئے وہاں بیٹھ جایئے۔'' وہ بولا اور مجھے ہال کے دوسرے سرے پر لے گیا جہاں تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر خوشنما قالین موجود تھے۔ مجھے وہاں بٹھا کر افلاک چلا گیا۔

کوئی پانچ منٹ کے بعد ہی دروازے سے لاتعداد لبادہ پوش اندر داخل ہونے لگے۔ یہ سب دراز قامت تھے اور ان کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ ہال کی چاندنی پر بیٹھتے چلے گئے، ان کی تعداد بڑھتی گئی اور پورا ہال بھر گیا۔

پھر ہال کے ایک اندرونی دروازے سے وہی پانچوں لبادہ پوش اندر داخل ہوئے جو مجھے جیل سے باہر لائے تھے۔ ہال میں بیٹھے لبادہ پوش احتراماً کھڑے ہو گئے۔ پانچوں لبادہ پوش انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئے۔

پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ''مجلس عمل نے متفقہ فیصلے کے تحت کامران مسعود کو مجلس عمل کا ایک فعال رکن بنایا تھا اور انہوں نے بحسن و خوبی اپنے فرائض بڑی استقامت سے سرانجام دیئے لیکن پھر کچھ ایسی ناگزیر قباحتیں رونما ہوئیں جن کے تحت اس فیصلے میں ترمیم کرنی پڑی، تاہم انہیں نگاہ میں رکھا گیا کیونکہ یہ صرف اپنے جذبۂ ایمانی کے تحت اس سے نبرد آزما تھے اور یہ تنہا ہی نہیں بلکہ ان کے والد بھی ایمان کی سلامتی میں ان سے پیچھے نہیں تھے، مجلس عمل نے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ان کی رکنیت معطل کر دی جائے اور ایسا ہی کیا گیا لیکن کچھ اور فیصلے بھی کیے، جن کی وجہ صیغۂ راز میں رکھی گئی جو از حد ضروری تھی، اس وقت انہیں الوداع کہنے کے لیے زحمت دی گئی ہے، ہم آپ کے کردار اور عمل سے بہت خوش ہیں اور آپ کو پورے خلوص سے الوداع کہتے ہیں۔'' چاروں طرف سے الوداع کی آوازیں آنے لگیں۔

پھر یہ مجلس ختم ہو گئی لیکن مجھ پر سحر طاری تھا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ مجھے جس طرح لایا گیا تھا، اسی طرح واپس لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ مجھ پر کڑی نگاہ رکھنے والے اسی طرح مستعد تھے۔ لاک اپ میں آنے کے بعد مجھے جیسے ہوش آ گیا۔

اس پورے عمل میں نہ جانے کتنی دیر لگی تھی، اس کا اندازہ نہیں ہو سکا، ہاں ہوش آنے کے بعد میں نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ روشنیاں ایسے ہی جل رہی تھیں، محافظ ایسے ہی گشت کر رہے تھے۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ میرے لیے بھی خواب جیسی کیفیت میں سب کچھ ہوا تھا لیکن خواب میں نہیں ہوا تھا۔ اتنا غیر حاضر ذہن نہیں تھا، سب کچھ عالم ہوش میں ہوا تھا۔

پھر دوسرا خیال آ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے الوداع کہنے کے لیے یہ مجلس برپا کی تھی۔ الوداع......! یعنی رخصت...... دنیا سے روانگی......! بڑے خشوع خضوع سے کلمہ پاک پڑھا۔ میرے معبود......! حاضر ہوں، تیری تخلیق ہوں، واپس بلا رہا ہے۔ لبیک، لبیک معبود پاک......! وضو کرنے کی سہولت تھی، وضو کیا اور پھر نماز پڑھنے لگا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

اس دن دوپہر کے بعد وہ وکیل میرے پاس آیا جسے سرکاری طور پر میرے لیے کیا گیا تھا۔ ''اس وکالت نامے پر دستخط کر دیجیے۔''

''کیوں......؟'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کس نے......؟''

''عجیب آدمی ہو، کیا تمہیں وکیل کی ضرورت نہیں ہے؟''

''نہیں......!''

''مرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں......!''

''کیوں......؟''

''اس کا جواب میں آپ کو کیوں دوں، ایک شکل میں آپ کو جواب دے سکتا ہوں، پوچھیں گے کیا؟''

''جی بتایئے۔'' وکیل صاحب نے طنزیہ کہا۔

''ضمانت دیں آپ مجھے بچا لیں گے۔'' میں نے کہا۔ وکیل کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بولا۔ ''تمہیں صرف ایک ضمانت دے سکتا ہوں کہ تمہارا کیس جتنا خراب کر سکتا ہوں، کروں گا تاکہ موت سے تمہاری بچت نہ ہو سکے۔''

''ارے واہ گریٹ! مگر کیوں؟'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''اس لیے کہ مجھے تم سے نفرت ہے۔'' وکیل نے کہا۔

اس بار پیشی میں کمرۂ عدالت میں مجھے ڈاکٹر شکلا کی صورت بھی نظر آئی تھی۔ مجھے زبردست سیکورٹی میں عدالت لایا جاتا تھا، پریس کو مجھ سے دور رکھا جاتا تھا، پولیس کے جوان مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر شکلا نہ جانے کس طرح اندر آ گئے تھے۔

میری ان سے نگاہ ملی تو میں نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے مگر نہیں بتایا نہیں کیونکہ وہ اپنے آنسو نہیں روک سکے تھے۔ میرے وکیل صاحب بھی موجود تھے۔ مجھے کٹہرے میں پہنچا دیا گیا۔ سب سے پہلے میرے وکیل کی طلبی ہوئی اور وہ کھڑے ہو گئے۔

''میرے علم میں آیا ہے کہ سرکاری طور پر آپ کو ڈاکٹر کامران کا وکیل مقرر کیا گیا ہے؟'' جج صاحب نے کہا۔

''جی جج صاحب!''

''لیکن آپ نے وکالت نامہ پیش نہیں کیا۔''

''ڈاکٹر صاحب نے مجھے وکیل بنانے سے انکار کر دیا اور وکالت نامے پر دستخط نہیں کیے۔''

جج نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں نے وکیل کی طرف! میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر وکیل نروس ہو گیا۔

''کیا آپ وکیل کی ضرورت نہیں محسوس کرتے ڈاکٹر کامران......؟''

''نہیں جناب عالی۔''

''کیا آپ اپنا جرم قبول کرنے پر تیار ہو گئے ہیں؟''

''نہیں!'' میں نے کہا۔

''تم نے سی پی بھلا صاحب کو وکیل بنانے سے کیوں انکار کر دیا؟'' وکیل سرکار نے سوال کیا۔

''میں نے ضرورت نہیں محسوس کی، میں نے پہلی ہی پیشی پر عرض کر دیا تھا کہ میں نے ڈاکٹر نیمو کو قتل نہیں کیا لیکن اگر شواہد میرے خلاف ہیں تو مجھے سزا دی جائے۔''

''مجھے یہ بھی ملزم کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے سر! تمام ثبوت موجود ہیں، ساری رپورٹیں گواہی دیتی ہیں کہ ملزم نے ہماری مایہ ناز ڈاکٹر نیمو کو وحشیانہ طریقے سے قتل کیا...... یہ بے حد شاطر انسان ہے، آج تک اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے گروہ کے دوسرے لوگ کہاں پوشیدہ ہیں، میری درخواست ہے جناب والا کہ اسے بدترین سزا دینے میں دیر نہ کی جائے، ورنہ یہ فرار ہو جائے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی یہ کئی بار پولیس کے چنگل سے شاطرانہ طور پر فرار ہو چکا ہے، اس کے گواہ پولیس کمشنر سریش چندر جی ہیں۔'' وکیل سرکار نے سریش کی طرف اشارہ کیا اور سریش نے گردن خم کی۔

اس سے پہلے کہ فاضل جج اس بارے میں کچھ کہتے، کمرۂ عدالت میں آگرے کا پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ہیرو ارجن ٹھاکر داخل ہوا۔ چونکہ وہ پولیس کی وردی میں تھا اس لیے اسے اندر داخل ہونے سے نہیں روکا گیا۔ جج نے اسے ناخوشگوار انداز میں دیکھا تھا۔

''معذرت چاہتا ہوں سر! اسی کیس کے سلسلے میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کیس کے سلسلے میں؟'' جج نے پوچھا۔

''جی می لارڈ......!'' ارجن ٹھاکر نے کہا اور جج صاحب نے گردن ہلا دی۔

ارجن نے ایک فائل درمیان سے کھول کر پیشکار کی طرف بڑھا دی۔ پیشکار نے اسے ادب سے جج کی خدمت میں پیش کی۔

پورے کمرۂ عدالت میں تجسس کی لہر پھیل گئی تھی، لوگ سوالیہ نظروں سے جج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خود جج کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ درخواست پڑھنے کے بعد وہ کچھ لمحے خاموشی سے سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے ارجن ٹھاکر کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''ٹھیک ہے مسٹر آفیسر! اسے مکمل خفیہ رکھا جائے گا، پرسوں اس کیس کی دوبارہ سماعت ہو گی۔''

''شکریہ می لارڈ!'' ارجن ٹھاکر نے کہا اور سلوٹ کر کے تیز رفتاری سے باہر نکل گیا۔

شدید سنسنی پھیل گئی، ہر چہرہ مجسم تجسس نظر آ رہا تھا۔ خود میں بھی حیران تھا۔ پولیس نے مجھے تحویل میں لے لیا اور باہر نکال لائے۔ میں بارود کا بکس بنا ہوا تھا، کسی کے سائے سے بھی دور رکھا جا رہا تھا۔

وقت گزر گیا۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس درخواست میں کیا ہے، تاہم مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ میری زندگی کے اختتام کی مجھے خبر مل گئی تھی۔ بزرگوں نے مجھے الوداع کہہ دیا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو مجھے اپنی پناہ میں لے کر کہیں بھی روپوش کر سکتے تھے جیسا کہ پہلے کرتے رہے تھے۔ اب گنجائش نہیں تھی۔ پیشی کے وقت تک میں عبادت کرتا اور مغفرت کی دعا مانگتا رہا تھا۔

میری ہر پیشی پر اخباری نمائندوں کا بے پناہ رش ہوتا تھا لیکن انہیں سیکورٹی کو مدنظر رکھ کر قریب نہیں آنے دیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کی بھیڑ تھی۔ ارجن ٹھاکر کی درخواست کی خبر چھپی نہیں رہ سکی تھی۔

اسٹیج سج گیا، جج بلاتاخیر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ سریش چندر کا موڈ بہت خراب لگ رہا تھا۔ جج نے کارروائی شروع کرنے کا حکم دیا۔

وکیل سرکار نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''ڈاکٹر کامران کے کیس میں بڑی حیران کن تبدیلیاں ہوئی ہیں جن سے کیس کی نوعیت بدل گئی ہے، یہ تبدیلی آگرہ پولیس کے ایک نیک نام اور شاندار ریکارڈ کے حامل آفیسر ارجن ٹھاکر کی مداخلت پر ہوئی ہیں، میں عدالتِ عالیہ سے درخواست کرتا ہوں کہ ارجن ٹھاکر کو عدالت میں پیش کیا جائے۔''

جج کے حکم پر ارجن کو طلب کیا گیا اور وہ کٹہرے میں آ گیا۔ سرکاری وکیل نے کہا۔ ''آفیسر ارجن ٹھاکر......! آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ ڈاکٹر کامران مسعود روز اول سے بے گناہ ہیں، انہوں نے شروع سے اب تک کوئی جرم نہیں کیا ہے بلکہ وہ کچھ پراسرار قوتوں کے طلسم میں گرفتار ہو کر اب تک بدنصیبی کا شکار رہے ہیں، آپ اس دعوے کی تصدیق کیسے کریں گے؟''

''جناب والا! بھگوان کی دیا سے میں نے اپنے بدن پر پہنی ہوئی وردی کو ہندوستان اور اپنے ماتا پتا کی لاج سمجھا ہے اور ہر وہ کام کیا ہے جو سچ ہو، پہلا سچ یہ ہے کہ ڈاکٹر کامران نے میری مردہ بہن کے شریر میں نیا جیون پھونکا ہے، ان سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر نیمو کے قاتل نہیں ہو سکتے، میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن بھوانی ماں مجھ سے ایک بڑا کام لینا چاہتی تھی، کچھ سے پہلے میں آگرہ کے ایک نواحی علاقے کا تھانیدار تھا جن میں کئی چھوٹے قصبے وغیرہ بھی شامل تھے، ایک چھوٹے قصبے سے مجھے خبر ملی کہ وہاں کچھ لوگ اغوا ہوئے، ان کی لاشیں مل گئیں جن میں سے کسی کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے، کسی کے پاؤں......! ہم نے تفتیش شروع کر دی تو ہمیں ایک ایسے فقیر کا پتا چلا جس کے چاروں ہاتھ، پاؤں کٹے ہوئے تھے اور اس کا ساتھی اسے گاڑی میں ڈال کر بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ میں نے اس کی جھونپڑی پر ریڈ کیا تو مجھے وہ فقیر اور اس کا ساتھی مل گیا۔ ساتھ ہی وہ ہاتھ، پاؤں بھی جو لوگوں کو قتل کر کے حاصل کیے گئے تھے، انہیں ابال کر چھوٹا کیا جا رہا تھا، ہم نے فقیر کو گرفتار کر کے اس کے ساتھی سمیت لاک اپ کیا لیکن وہ سخت پہرے کے باوجود اسی طرح گم ہو گیا جس طرح مسٹر کامران پولیس کی گرفت سے نکل جاتے تھے، لاکھ کوشش کے باوجود وہ لوگ مجھے دوبارہ نہیں ملے، پھر تقدیر کی خوبی کہ اب سے کچھ دن پہلے میں کسی کام سے دہلی آیا، مجھے غازی آباد میں بھی کام تھا، غازی آباد میں، میں نے اس مجرم فقیر کے ساتھی کو دیکھا جو اس اپاہج کی گاڑی دھکیلتا تھا۔ میں نے پولیس کے جوانوں کے ساتھ ہوشیاری سے اس کا پیچھا کیا تاکہ اُس کے ساتھ اس اپاہج کو بھی گرفتار کر لوں۔ وہ غازی آباد کے ایک قدیم گھر میں داخل ہو گیا جو ایک ویران سے علاقے میں ہے، میں نے وہاں چھاپہ مارا اور جناب والا وہاں مجھے ڈاکٹر نیمو مل گئیں۔ جناب والا! وہ ڈاکٹر نیمو جن کے قتل اور آبرو ریزی کے الزام میں پاکستان کا ایک قابل اور مایہ ناز نوجوان ڈاکٹر جو ہمارا ایک معزز مہمان تھا، ملوث کیا گیا اور اسے دربدر کیا گیا۔'' ارجن ٹھاکر یکا یک بہت پرجوش ہو گیا۔

کمرۂ عدالت مچھلی منڈی بن گیا۔ سریش چندر بے اختیار آگے بڑھا لیکن جج صاحب کے حکم پر خاموشی طاری ہو گئی۔ ''بیان جاری رکھا جائے۔''

''جو شخص گرفتار ہوا، اس کا نام بنسی راج ہے، ان لوگوں نے ڈاکٹر نیمو کو قید کر رکھا تھا، پھر مزید انکشافات ہوئے۔ اس کے دوسرے اپاہج ساتھی کا نام بھوریا چرن تھا، وہ کالے جادو کا ماہر تھا اور اس کے مدارج طے کر رہا تھا، اسے اپنے ایک ناپاک عمل کے لیے ایک خاص مسلمان کی ضرورت تھی اور اس کا ٹارگٹ ڈاکٹر کامران بنے، جنہوں نے اس کے ناپاک عمل کا ساتھی بننے سے انکار کر دیا تو یہ اس کے عتاب کا شکار ہو گئے۔''

''جناب والا! مداخلت کی گستاخی کر رہا ہوں، کیا ڈاکٹر نیمو، ارجن ٹھاکر کو دستیاب ہو گئیں؟''

''میں انہیں ساتھ لایا ہوں، باہر ہیں سر!'' ارجن نے کہا۔

''انہیں اندر بلایا جائے۔'' جج نے حکم دیا۔ چوبدار نے آواز لگائی اور تین لیڈی کانسٹیبل ڈاکٹر نیمو کے ساتھ اندر داخل ہو گئیں۔ لوگوں میں پھر ہلچل مچ گئی۔ تب جج صاحب نے ہتھوڑی بجا کر کہا۔ ''عدالت کے آداب کو ملحوظ رکھا جائے۔''

خاموشی طاری ہو گئی۔ سریش چندر کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اس پر جو کیفیت طاری تھی، وہ ناقابل بیان تھی۔

''کارروائی جاری رکھی جائے۔''

''بنسی راج نے بڑے انوکھے انکشافات کیے ہیں می لارڈ!''

''کیا بنسی راج آپ کی تحویل میں ہے؟''

''جی! میں اسے بھی ساتھ لایا ہوں۔''

''پیش کیا جائے۔''

بنسی راج نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر لمبی کہانی سنائی جو میرے والد صاحب کے زمانے کی تھی اور مجھ تک پہنچی تھی۔ اس نے بھوریا چرن کے خاتمے کی خبر بھی سنائی۔

وکیل سرکار نے اُس سے پوچھا۔ ''وہ لاش کس کی تھی جو ڈاکٹر نیمو کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی؟''

''پورنی تھی وہ! سات پورنیاں قبضے میں تھیں مہاراج بھوریا چرن کے، جادو کی عورتیں تھیں وہ، جو سو بار مر سکتی تھیں، سو بار جی سکتی تھی، کوئی بھی شکل بنا سکتی تھیں۔''

ڈاکٹر نیمو کا بھی مختصر بیان لیا گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔ ''کاش آپ کو میرے نام کے ساتھ ملوث نہ کیا گیا ہوتا۔''

وکیل سرکار نے از راہِ تفنن مجھ سے کہا۔ ''کیا یہ سب کچھ درست ہے ڈاکٹر کامران......؟''

''میں نے ڈاکٹر نیمو کو قتل نہیں کیا جناب والا! لیکن اگر شواہد مجھے مجرم ثابت کرتے ہیں تو مجھے سزا دے دی جائے۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا اور عدالت میں قہقہہ بلند ہو گیا۔

جج نے کہا۔ ''اور اب اس بات کی قطعی گنجائش نہیں ہے کہ ڈاکٹر کامران کو ایک منٹ بھی گرفتار رکھا جائے، انہیں اس کیس سے باعزت بری کیا جاتا ہے، بنسی راج کو پولیس کی تحویل میں لے لیا جائے، میں سفارش کرتا ہوں کہ عارضی طور پر ڈاکٹر کامران کو ایک باعزت مہمان کی حیثیت سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں فل پروٹوکول کے ساتھ رکھا جائے اور اس کے بعد انہیں پاکستان روانہ کر دیا جائے۔''

کمرۂ عدالت سے باہر قدم رکھتے ہی ڈرامے کا دوسرا ایکٹ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر شکلا نے مجھے سینے سے لگایا اور دیر تک لپٹائے رہے پھر رُشا میرے پاس آ گئی۔ بالکل صحت مند اور تروتازہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

''میرے بھیا...... میرے ڈاکٹر......!'' وہ بولی۔

سب سے زیادہ متاثر سریش چندر نے کیا جو ڈاکٹر نیمو کے ساتھ میرے پاس آیا اور میرے پیروں میں بیٹھ گیا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اسے معافی دے دیں کامران جی! یہ مجھ سے پاگلوں کی طرح پیار کرتا ہے۔''

''یہ ایک قابل فخر پولیس آفیسر ہیں، میری دعا ہے کہ یہ خوب ترقی کریں۔'' میں نے سریش کو اٹھا کر سینے سے لگا کر کہا، پھر میں خود آگے بڑھ کر ارجن ٹھاکر کے پاس گیا اور اسے سینے سے لگا کر کہا۔ ''تم نے تو تھوڑے ہی وقت میں میرا قرض ادا کر دیا ٹھاکر!''

''سو جیون ملیں ڈاکٹر! تب بھی آپ کا قرض ادا نہیں ہو گا، آپ نے مجھے میری رُشا دے دی۔''

اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں مجھے بڑے احترام سے رکھا گیا۔ اتنے بڑے بڑے حکام نے مجھ سے ملاقات کی کہ میں دنگ رہ گیا۔ ان کے علاوہ نواب عظیم اللہ خان، رئیسہ بیگم، ڈاکٹر سہیل، ارشاد علی اور ان کی بیٹیاں ملیں جنہیں میں نے پاکستان آنے کی دعوت دی تھی۔

دل تو چاہتا تھا کہ ایک بار پھر مجھے وہ محفل مہیا ہو جس میں مجھے الوداع کہا گیا تھا۔ یہ الوداع دنیا سے نہیں، ہندوستان سے جانے کی تھی۔

اور پھر کراچی قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ......! جہاں میرے سب موجود تھے۔ تمام ڈاکٹر، امتیاز احمد اور وہ لوگ جن سے میری تھوڑی سی بھی شناسائی تھی لیکن میری آنکھیں جسے ڈھونڈ رہی تھیں، وہ اس ہجوم میں سب سے پیچھے کھڑی تھیں۔

میری امی، میری کائنات، میری ماں، میری جنت......! اور میں سب کو پیچھے چھوڑ کر اپنی امی کے پاس پہنچ گیا جن کی آنکھوں میں اپنے اعتماد کا غرور تھا۔

''تم لوگ کچھ بھی کہتے رہو، وہ ایک صاحب کردار مسلمان ہے، میرا بیٹا ہے، مسعود کا ہم شکل ہے، آ جائے گا، واپس آ جائے گا۔''

واپس آنے کے کوئی بیس دن کے بعد مجھے موبائل پر ایک کال موصول ہوئی۔ اجنبی نمبر تھا، لیکن آواز اجنبی نہیں تھی۔

''میں حکیم سرمد بول رہا ہوں، سرمد کبابیا، آلو کے کباب کھانے کو دل چاہے تو برنس روڈ کے چوراہے پر آ جانا، میں چشمے والے کی دکان کے سامنے بیٹھتا ہوں۔''

''حکیم سرمد......!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

(ختم شد)